سجاد ظہیر کا دورِ اسیری
ڈاکٹر اندر بھان بھسین

سجاد ظہیر کا دورِ اسیری

ڈاکٹر اندر بھان بھسین

{ایم اے (فلاسفی)، ایم اے (اردو)، پی ایچ ڈی (فلاسفی)، پی ایچ ڈی (اردو)}

قلم پبلی کیشنز، ممبئی

2013

نام کتاب : سجاد ظہیر کا دورِ اسیری

اشاعتِ اول : نومبر ۲۰۱۳ء

مصنف : ڈاکٹر اندر بھان بھسین

سرورق : ظفر عباس

ناشر : قلم پبلی کیشنز ممبئی

قیمت : ۴۰۰/روپے

مصنف کا پتہ :

1st floor, Dimond Palace, Hill Road, Bandra (W) Mumbai- 400 050.

Web: www.drinderbhanbhasin.com

SAJJAD ZAHEER KA DAUR-E-ASEERI

by

DR. INDER BHAN BHASIN

(M.A.Philosophy. M.A.Urdu. Ph.D.Philosophy. Ph.D.Urdu.)

First Edition Published in Nov 2013.

ISBN-13-978-81-924661-7-0.

تقسیم کار

قلم پبلی کیشنز : ۱۷/۱۷، ایل، آئی، جی کالونی، ونوبا بھاوے نگر، کرلا (مغربی) ممبئی ۴۰۰۰۷۰

نئی کتاب پبلشرز : Z-326/3 اوکھلا مین روڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

کتاب دار : ۱۰۸/۱۱۰، جلال منزل، ٹیمکر اسٹریٹ، ممبئی ۴۰۰۰۰۸

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ : ممبئی، دہلی، علی گڑھ

سیفی بک ایجنسی : ۱۱/ امین بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، ممبئی ۴۰۰۰۰۳

(ادبی پرنٹنگ پریس، شیفرڈ روڈ، ممبئی ۸ میں طبع ہوئی)

انتساب

اپنے بچوں
اور ان کے بچوں کے نام
جو میری زندگی ہیں

فہرست

☆☆☆☆

حرفِ تشکر

اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے تحقیقی مقالے کا موضوع تلاش کرنے میں مجھے کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ سجاد ظہیر ہمیشہ سے میرے محبوب ادیب رہے ہیں جنہوں نے اپنی تمام زندگی ملک کے پسماندہ انسانوں کو اپنا حق دلوانے میں صرف کر دی تھی۔ اس لیے میں ان کی زندگی کے کسی خاص گوشے میں ریسرچ کرنا چاہتا تھا جو اب تک تاریکی سے اُبھر نہیں پایا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جوہی ببر جو نادرہ ببر اور راج ببر کی بیٹی اور سجاد ظہیر کی نواسی ہے اس نے میری بڑی مدد کی ہے۔ سجاد ظہیر پر ہندوستان اور پاکستان میں کل ملا کر تقریباً بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن ان میں زیادہ تر میں ان کی حیات و خدمات اور ادبی صلاحیتوں کو ہی اجاگر کیا گیا ہے۔ جوہی کا خیال تھا کہ سجاد ظہیر نے ایک طویل عرصہ ہندوستان اور پاکستان کی جیلوں میں گزارا تھا جس کا محض سرسری طور پر ہی ذکر کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان کی زندگی کے اس پہلو پر ریسرچ کی کافی گنجائش ہے۔ بات معقول تھی جو فوراً ہی مجھے پسند آئی اور میں نے جوہی کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ علاوہ دیگر پہلوؤں کے سجاد ظہیر کے دورِ اسیری پر ہی تحقیقی مقالہ لکھوں۔ اس معاملے میں میری مدد کرنے کے لیے جوہی کے پاس جو بھی اس موضوع سے متعلقہ رسائل و جرائد موجود تھے لا کر مجھے دیئے جن سے مجھے بہت استفادہ ہوا۔ میں جوہی اور اس کی والدہ نادرہ کا بہت مشکور ہوں۔ لیکن جوہی نے جو مواد میرے لیے مہیا کیا وہ بالکل ناکافی تھا۔ اس لیے یہ فکر پیدا ہوئی کہ ضروری کتابیں کہاں سے طلب کی جائیں۔ یہ ایک غیر معمولی مسئلہ تھا کیوں کہ ہندوستان میں سجاد ظہیر کے بارے تقریباً سبھی کتابیں دستیاب نہیں۔ ممبئی میں ہر سال

صابوصدیق انسٹی ٹیوٹ میں کتابوں کا میلہ لگتا ہے جس میں پورے ملک کے پبلشرز اپنی کتابیں لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ میں بھی کتابوں کی تلاش میں اس میلے میں شرکت کرتا ہوں۔ اس میلے میں مَیں سجاد ظہیر کی تخلیق کردہ چند کتابیں ہی حاصل کر پایا۔ کچھ کتابیں ساہتیہ اکادمی کے وثوق سے دستیاب ہوئیں لیکن ان سے میرا مطلب حل نہیں ہوسکتا تھا۔

سن 2008 میں مولانا ابوالکلام آزاد اردو یونیورسٹی کے زیر اہتمام دہلی میں ایک سیمینار منعقد ہوا جس میں شمولیت کے لیے مجھے بھی دعوت نامہ بھیجا گیا تھا۔ وہاں میری ملاقات ایک جناب بدکی سے ہوئی جو اس وقت پوسٹل بورڈ کے ممبر تھے اور سیمینار میں مہمان اسپیکر کے طور پر مدعو کیے گئے تھے۔ خوش قسمتی سے ہم دونوں کو ملحقہ کرسیاں مل گئیں۔ بات چیت میں انہوں نے میرے شغل کے بارے معلومات طلب کیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں سجاد ظہیر کے دورِ اسیری پر ریسرچ کر رہا ہوں لیکن مجھے ضروری مواد نہیں مل رہا۔ انہوں نے مجھے کسی نارنگ ساقی صاحب سے رابطہ قائم کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ ساقی صاحب ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ ساقی صاحب اتنے نفیس انسان ثابت ہوئے کہ انہوں نے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ محسوس ہونے دیا کہ ہم پہلی بار ایک دوسرے سے بات چیت کر رہے ہیں۔ سجاد ظہیر کے پرانے ساتھیوں میں جو لوگ ابھی بقید حیات ہیں ان سب سے ساقی صاحب نے میرا بذریعہ ٹیلیفون تعارف کرایا اور مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنی ضروریات ان پہ واضح کروں۔ ان کے پاس 'نقوشِ زنداں' کی ایک کاپی تھی جو انہوں نے مجھے بھیج دی۔ یہ کتاب ہندوستان میں اس وقت کہیں بھی دستیاب نہیں ہے۔

سب سے پہلے انہوں نے مجھے حمید اختر کا فون نمبر دیا تاکہ میں ان سے اپنے موضوع پر تبادلہ خیالات کروں۔ حمید اختر تمام عمر انجمن ترقی پسند مصنفین سے جڑے رہے اور ایک طویل عرصے تک سجاد ظہیر کے ساتھ مل کر انجمن اور کمیونسٹ پارٹی کے لیے انہوں نے کافی کام کیا۔ اس وقت وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے اور لاہور میں رہائش پذیر تھے۔ سننے اور سمجھنے میں کافی دقت محسوس کرتے تھے۔ میں نے جب انہیں فون کیا تو انہیں پہلے سے ہی میرے متعلق ساقی صاحب سے اطلاع مل چکی تھی۔ وہ نہایت شفقت اور رفاقت سے پیش آئے اور جتنی کتابیں ان کے پاس تھیں یا اپنے ذرائع سے حاصل کر سکے مجھے بھجوا دیں۔ میری درخواست پر کہ وہ سجاد ظہیر کے متعلق جو کچھ جانتے ہیں وہ بھی

مجھے بھیجیں۔انہوں نے سودا اپنے ہاتھوں سے ایک خو [illegible] تیار کیا جو اس میں شامل کردیا گیا ہے۔ مجھے مناسب الفاظ نہیں سوجھ رہے جو ان کے تئیں میرا شکریہ اور احسان کا اظہار کرسکیں۔تاہم میں تاحیات ان کا شکر گزار رہوں گا۔حمید اختر کی ایک کتاب 'آشنائیاں کیا کیا' ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے سجاد ظہیر پر بھی ایک مضمون شامل کیا ہے جس میں راولپنڈی سازش کیس میں ان کی گرفتاری اور پھر قید کی کچھ تفصیل دی گئی ہے۔ان کے پاس اس کتاب کی کوئی کاپی موجود نہیں تھی لیکن انہوں نے رانا عبدالرحمٰن کا نمبر دیا اور کہا وہ اس کتاب کے ناشر ہیں جن سے شاید وہ کتاب مل جائے۔ان کے پاس وہ کتاب تو تھی لیکن لاہور سے ممبئی بھیجنا بہت مہنگا پڑتا تھا۔رانا صاحب بہت فراخ دل انسان ثابت ہوئے اور پوری کتاب مجھے ای میل کردی۔ بدقسمتی سے جناب حمید اختر تھوڑا عرصے پہلے ہی وفات پا گئے ہیں۔

مجھے اس بات کا علم تھا کہ راولپنڈی سازش کیس میں جو پندرہ اشخاص قید ہوئے تھے ان میں سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کے علاوہ ایک کیپٹن ظفراللہ پوشنی بھی تھے جنہوں نے رہائی کے بعد ایک کتاب 'زندگی زنداں دلی کا نام ہے' شائع کی تھی جس میں ابتدا تا انتہا اس مقدمے کی روداد درج تھی۔ میں نے اس کتاب کو سب جگہ تلاش کیا لیکن کہیں نہیں ملی۔ دہلی کی جامعہ مسجد کے گرد اردو بازار میں ایک ایک دکان بذات خود میں نے چھان ماری لیکن کسی کے پاس وہ کتاب نہیں تھی۔ایک دن جب میں اپنی یونیورسٹی کی لائبریری میں کتابیں دیکھ رہا تھا تو اچانک میری نظر ایک کتاب پر پڑی جس کا سرورق بہت خوبصورت تھا۔ یہ ایک ناول تھا جس کا نام ہے 'دوڑتا چلا گیا'۔ یہ ناول کیپٹن ظفراللہ پوشنی کا تخلیق کیا ہوا تھا جس پر انکا فون نمبر بھی درج تھا۔ میں نے فوراً پوشنی صاحب کو فون کیا۔ بڑی محبت سے پیش آئے اور میری درخواست پر اپنی دونوں کتابوں کی ایک ایک نقل مجھے ارسال کردی۔اگرچہ پوشنی صاحب عمر رسیدہ ہیں لیکن ان کی آواز میں پرانی لچک اور مٹھاس اب بھی موجود ہے۔ میں پوشنی صاحب کا اس مدد کے لیے بہت احسان مند ہوں۔

مجھے بتایا گیا کہ میجر محمد اسحاق جو راولپنڈی سازش کیس میں ملوث تھے انہوں نے بھی ایک کتاب 'رودادِ قفس' کے نام سے لکھی ہے لیکن وہ کتاب مجھے کہیں دستیاب نہ ہوسکی۔ بہرحال میں نے تلاش جاری رکھی۔ سجاد ظہیر کے ساتھ ترقی پسند تحریک میں ایک عبداللہ ملک کافی عرصے تک کام کرتے

رہے تھے جواب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کے چھوٹے بھائی عبدالرؤف ملک ابھی بقید حیات ہیں اور لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔ کسی طرح مجھے ان سے رابطہ قائم کرنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے بھی ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام انہوں نے 'سجاد ظہیر۔ مارکسی دانشور اور کمیونسٹ رہنما' رکھا ہے۔ ان سے معلوم ہوا کہ 'روداد قفس' کوئی کتاب نہیں بلکہ ایک مضمون ہے جو سابق میجر محمد اسحاق نے فیض احمد فیض کے مجموعہ کلام 'زنداں نامہ' کے لیے لکھا تھا۔ انہوں نے مجھ پر بڑا احسان کیا کہ اپنی کتاب کی ایک نقل اور 'روداد قفس' کی زیروکس مجھے بھیج دی۔ ساتھ ہی مجھے مکتبہ دانیال کراچی کا مکمل پتہ بھی دیا تاکہ میں اس کی مالک حوری نورانی سے مزید معلومات حاصل کرسکوں۔ وہاں سے مجھے یہ بتایا گیا کہ سجاد ظہیر کے بارے میں جتنا ڈاکٹر سید جعفر احمد جانتے ہیں اتنا حوری نورانی نہیں جانتی۔ لیکن مجھے اس بات کا یقین نہ ہوا کیونکہ حوری نورانی کے والدین ملک نورانی اور ممتاز نورانی سجاد ظہیر کے خاص دوستوں میں تھے۔ حمید اختر نے اپنی کتاب 'آشنائیاں کیا کیا' میں بھی بنے بھائی اور ان کی ملک نورانی سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ کراچی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر یہ طے ہوا کہ بنے بھائی ریلوے ریٹائرنگ روم میں آرام فرمائیں گے اور حمید اختر ملک نورانی کا گھر ڈھونڈنے کے بعد انہیں دوبارہ آکر لے جائیں گے۔ یہ 1948 کی بات ہے لیکن بنے بھائی کے ساتھ ان کے تعلقات بہت دیرینہ تھے۔ ملک نورانی نے بعد ازاں مکتبہ دانیال قائم کر کے ترقی پسند ادیبوں کے لیے تخلیقات شائع کر کے بہت نام پیدا کیا تھا۔ خیر میں نے حوری نورانی سے ذاتی طور پر بات چیت کی اور انہوں نے بھی مجھے ڈاکٹر سید جعفر احمد سے ہی بات کرنے کا مشورہ دیا۔ جعفر احمد صاحب بہت نامور ادیب ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے 'سجاد ظہیر۔ شخصیت اور فن'۔ سجاد ظہیر کے متعلق جو کچھ وہ اپنی یاداشت اور مطبوعہ کتابوں سے اخذ کرسکے اس سے مجھے فراخدلی سے نوازا۔ میں ان کا بے حد مشکور ہوں۔ بعد میں ان کی کتاب مجھے فیض احمد فیض کی بیٹی سلیمہ ہاشمی کے وثوق سے مل گئی۔

جوہی ببر کے ساتھ میرے بچوں کے نہایت قریبی اور دوستانہ تعلقات ہیں۔ انہی کی معرفت اس کی والدہ نادرہ ببر سے بھی واسطہ پیدا ہوا اور ان کا ہمارے گھر میں آنا جانا بھی ہوتا رہا۔ نادرہ ببر نے میری ہر طرح سے مدد کی اور کافی غیر مطبوعہ مواد بھی فراہم کیا۔ میں کسی بھی صورت میں ان کا احسان نہیں چکا سکتا۔ ایک دن جوہی ہمارے گھر آئی اور مجھے بتایا کہ فیض صاحب کی بڑی بیٹی

سلیمہ ہندوستان آئی ہوئیں ہیں اور ایک دو دن میں لاہور لوٹ جائیں گی۔ جوہی نے بتایا کہ اس نے میری غیر حاضری میں ہی میرا تعارف سلیمہ سے کروادیا ہے اور مجھے مشورہ دیا کہ میں اس کے لاہور لوٹنے پر اس سے رابطہ قائم کروں کیونکہ وہ میرے موضوع کے متعلق میری معلومات میں بہت اضافہ کر سکتی ہے۔ چنانچہ میں نے جلد ہی اس سے فون پر بات کی اور پھر کافی عرصے تک ای میل کے ذریعے ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ سلیمہ نہایت مہذب، شائستہ اور نیک سیرت شخصیت کی مالک ہیں اور آج کل بیکن ہاؤس یونیورسٹی کے School of Visual Arts & Designs کی Dean ہیں۔ ان سے جو میل کے ذریعے خط و کتابت ہوئی اس کا ضروری حصہ میں نے اپنے مقالے میں شامل کر لیا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ سلیمہ کا ایک سیمینار میں شرکت کے لیے پونا آنے کا پروگرام بن گیا۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ اگر میں 11 اگست 2010 کو پونا آجاؤں تو ان سے ملاقات کر سکتا ہوں اور وہ میرے لیے تمام کتابیں لے آئیں گی جو اپنے ذرائع سے حاصل کر پائیں گی۔ یہ سنہری موقع مجھے سلیمہ نے خود اپنی خوشی سے فراہم کیا لیکن اس میں جوہی کا رول بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ سلیمہ سے ملنے میں اور میرے بیوی بچے سب لوگ پونا گئے۔ وہ شام ہم سب کے لیے ایک یادگار شام بن کر رہ گئی۔ سلیمہ کا بات چیت کا لہجہ نہایت نرم اور دل پسند تھا۔ اس نے ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی احساس ہونے نہیں دیا کہ ہم اسے پہلی بار مل رہے ہیں۔ بلکہ جیسے کئی سالوں سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ وہ میرے لیے کوئی چھ سات کتابیں دستیاب کر پائی جو مجھے دونوں ممالک میں کہیں نہیں مل رہی تھیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ ایک غیر مطبوعہ مرثیہ لائی جو سجاد ظہیر نے فیض صاحب کے بڑے بھائی طفیل احمد خان کی وفات پر لکھ کر جیل سے فیض صاحب کو بھیجا تھا۔ وہ ایک نظم بھی لائی جو مخدوم محی الدین نے اپنے ہاتھوں سے لکھ کر فیض کو بھیجی تھی۔ یہ نظم بھی غیر مطبوعہ ہے۔

سلیمہ نے جو نایاب تخلیقات میرے حوالے کیں ان میں چند ایک کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ صلیبیں میرے دریچے میں	فیض
۲۔ کال کوٹھری	حمید اختر

۳۔ شمشیر سے زنجیر تک — کرنل مرزا حسن خان
۴۔ سجاد ظہیر۔ شخصیت اور فن — ڈاکٹر سید جعفر احمد
۵۔ Rawalpindi Conspiracy-1951 — حسن ظہیر

یہ تمام کتابیں ہندوستان میں کہیں بھی حاصل نہیں ہو سکیں۔ ان کتابوں میں میری ضرورت کے لیے کافی مواد تھا جسے میں نے اپنے مقالے میں استعمال کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلیمہ میری مدد کرنے میں سب پر سبقت لے گئی۔ میں نہیں سمجھ پایا کہ میں اس کا کیسے اور کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں۔

نادرہ ببر سے معلوم ہوا کہ سجاد ظہیر کی تمام تخلیقات اور ان کا پورا ادبی خزانہ ان کی بڑی بہن نجمہ علی باقر کی تحویل میں رہتا ہے اور ان کے منجملہ حقوق بھی انہی کے پاس ہیں۔ نادرہ کے وسیلے سے ہی میری نجمہ تک رسائی ہوئی اور انہوں نے میری عمر کے پیشِ نظر ایک بزرگ کا درجہ دیا اور نہایت ہی عزت اور نفاست سے پیش آئیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کی تصنیف Sajjad Zaheer - Pen & Vision کی ایک کاپی مجھے بھیج دی۔ اس کے علاوہ بھی وہ جو کر سکیں وہ میری مدد کے لیے کیا اور آئندہ بھی اپنے ابا کا غیر مطبوعہ مواد فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ میں ان کا بہت مشکور ہوں۔

جناب ارشد جاوید ایک وقت پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائینس کے چیف منیجر تھے اور ممبئی آفس کے صدر بھی تھے۔ ایک روز میں نے ان سے اپنی مایوسی کا ذکر کیا اور کہا کہ اگرچہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں نے مجھے کافی مقدار میں ضروری کتابیں ارسال کی ہیں، تاہم ابھی تک میری تحقیق کا ایک آدھ پہلو گوشہ تاریکی میں ہے جس کے لیے مجھے خاطر خواہ کوئی لٹریچر نہیں مل رہا۔ انہوں نے میری حاضری میں اپنے ایک دوست ہدایت بلوچ کو کراچی فون کیا اور اس سے میری گفتگو کرائی۔ ہدایت بلند پائے کے یار باش اور علم دوست ثابت ہوئے اور جو تھوڑی کمی میں محسوس کر رہا تھا وہ انہوں نے پوری کر دی۔ ایک مختصر عرصے میں انہوں نے پاکستان کے کونے کونے سے کتابیں ڈھونڈ نکالیں اور مجھے ارسال کر دیں۔ انہوں نے علاوہ ازیں 'فیض نامہ' کی بھی ایک نقل بھیجی جس میں لاہور اور حیدرآباد جیل میں فیض صاحب اور سجاد ظہیر کی سرگرمیوں کا بہترین تذکرہ بھی ہے۔ 'فیض نامہ' ڈاکٹر ایوب مرزا (مرحوم) نے تخلیق کیا ہے اور کلاسیک پبلیشرز لاہور نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ میرے علم میں تھی لیکن ہندوستان میں کہیں بھی دستیاب نہیں

تھی۔اس کے علاوہ انہوں نے سبط حسن کی دو کتابیں بھی مہیا کیں جن کو ڈاکٹر سید احمد جعفر نے ترتیب دی ہے۔ان تمام حضرات کی محنت سے اب میرے پاس وہ تمام ساز و سامان اکٹھا ہو گیا تھا کہ جیسی تحقیق میں درج کرنا چاہتا ہوں وہ بخوبی مرحلہ تکمیل تک پہنچ سکے۔میں ان سب کا تہہ دل سے احسان مند ہوں۔

جناب علی احمد فاطمی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ہندوستان اور پاکستان کے تمام ادیب ان سے ذاتی طور پر واقف ہیں۔آج کل وہ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ہیں۔انہوں نے سجاد ظہیر پر دو کتابیں تخلیق کی ہیں جن کے نام ہیں' سجاد ظہیر۔ایک تاریخ ایک تحریر' اور' ترقی پسند تحریک۔سفر در سفر'۔ میرے نگراں ڈاکٹر صاحب علی صاحب سے ان کے دوستانہ تعلقات بھی ہیں۔جن دنوں میں اپنا مقالہ ترتیب کر رہا تھا ممبئی میں ایک سیمینار منعقد ہوا تھا جس میں فاطمی صاحب بھی شامل ہونے والے تھے۔فاطمی صاحب کی نگرانی میں ایک محترمہ زیب النسا نے سجاد ظہیر پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔بعد ازاں ان کا مقالہ ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوا تھا جس کا نام' سجاد ظہیر۔ حیات و خدمات' تھا۔اپنے نگراں کے توسط سے میں نے ان سے رابطہ قائم کیا اور ان تینوں کتابوں کے لیے التجا کی۔فاطمی صاحب بہت شائستہ اور ادب شناس انسان ہیں اور میرے جیسے لوگوں کی مدد کے لیے بیشتر سرگرداں رہتے ہیں۔وہ آتے وقت تینوں کتابیں میرے لیے لے آئے اور سجاد ظہیر کے متعلق بہت اہم معلومات اپنے حافظے سے مہیا کرائیں۔ان کتابوں کے حصول کے بعد اب مجھے مزید مواد کی ضرورت نہیں تھی۔میں علی احمد فاطمی صاحب کا بہت مشکور ہوں اور ان کی محبت اور ادب دوستی کی قدر کرتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب علی ممبئی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ہیں اور فاطمی صاحب کی طرح ادبی دنیا میں ایک خاص مقام کے حامل ہیں۔وہ اپنے کام کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں اور اپنی معلمی ذمہ داریوں کو نبھانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے۔میرے نگراں کی حیثیت سے انہوں نے میری مکمل رہنمائی کی اور میرے تحقیقی مقالے کو خوش اسلوبی سے مکمل کرنے میں میری بے انتہا پیروی کی۔ان سے جس قدر ہو سکا میرے لیے اپنے وسیلے سے ضروری کتابیں منگواتے رہے۔نتیجے کے طور پر میرے پاس اتنا ساز و سامان اکٹھا ہو گیا کہ میں نے اپنا مقالہ وقت سے پہلے ہی تیار کر لیا اور اس وجہ

سے میرے پاس کافی وقت بچ گیا کہ میں اسے دوہرا کر اس کی کمی بیشی کو درست کر سکوں۔ یہ ڈاکٹر صاحب علی کا ہی فیض ہے جس کے لیے میں ان کا انتہائی شکر گزار ہوں۔ وہ لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں جنہیں صاحب علی صاحب کی نگرانی دستیاب ہوتی ہے۔

جناب الیاس شوقی میرے بہت ہی عزیز دوست ہیں۔ میری اردو ایم اے کی طالب علمی کے دوران وہ میرے استاد بھی رہے ہیں۔ اردو زبان و ادب سے میرا بہت پُرانا رشتہ ہے۔ عارضی طور پر نامساعد حالات نے کچھ تعطل پیدا کیا لیکن پھر سے ادب سے قریب لانے میں شوقی صاحب کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ اس تھیسس کی تکمیل میں ان کے مشورے ہمیشہ شاملِ حال رہے۔ مَیں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

اب صرف اس شخص کی تلاش باقی تھی جو میرے دستی مقالے کو کمپیوٹر پر ٹائپ کر دے۔ اس میں بھی میں خوش قسمت ثابت ہوا، میرے نگراں ڈاکٹر صاحب علی نے اس کام کے لیے ایک قابل نوجوان خلیل الرحمن خان کو میرے سپرد کر دیا۔ یہ لڑکا اپنے فن کا ماہر ہے اور اس نے اس سلسلے میں لاجواب کام کیا ہے۔ اس نے جس صداقت اور نفاست سے میرا تحقیقی مقالہ کمپیوٹر پر تیار کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے اور اپنی مثال آپ ہے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر کام اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ میں خلیل الرحمن کا احسان مند ہوں اور دل سے دعا دیتا ہوں کہ اسے زندگی میں ہر قدم کامیابی کا سامنا ہو۔

ایک اور ہستی ہے جس کا شکریہ ابھی تک باقی ہے اور جس کی نگہبانی کے بغیر انسان کا کوئی کام مکمل نہیں ہو سکتا وہ ہے ہمارا معبود جسے لوگ مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ کوئی اسے اللہ کہہ کر دستِ دعا دراز کرتا ہے تو کوئی ایشور کہہ کر اس کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے۔ ایسے تمام نام اس ایک ہی ہستی کے ہیں جو اپنی واحد شخصیت رکھتا ہے اور جس کا دوسرا کوئی شریک نہیں۔ وہی سب کا کارساز ہے اور جس کے در سے کوئی بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔ میں سب سے زیادہ اس واحد ہستی کا شکر گزار ہوں کہ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اس نے مجھے قوت بخشی کہ میں اپنی منزل مقصود کو حاصل کر سکا۔

اندر بھان بھسین

ایک دشت کی سیاحی

شب وروز کی یکسانیت، زندگی میں ایک طرح سے ہمیں یک رنگی کا شکار بنادیتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا بالکل ایسی ہی ہے جیسی ہم جی رہے ہیں، لیکن ایک ذرا ٹھہر کے دیکھیں تو حقیقت اس سے مختلف ہوتی ہے۔ موجودہ زمانے کے بارے میں عام خیال ہے کہ یہ مسابقت اور خودغرضی کا زمانہ ہے۔ دنیاوی ترقی کا جنون ایسا سر چڑھا ہوا ہے کہ اس کے سامنے آدمی کو کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ کسی قدر درست بھی ہے لیکن استثنائی صورتیں تو ہمیشہ سے موجود رہی ہیں۔ یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آج انٹرنیٹ اور گلوبلائزیشن کے زمانے میں بہت کچھ بدل گیا ہے۔ ایک ایسے دور میں بلا کسی انعام یا ستائش کی خواہش کے، ترقی پسندی، اور ترقی پسند تحریک کے حوالے سے اتنا بڑا کام کرنا جو اندر بھان بھسین نے کیا ہے قابلِ تحسین ہی نہیں قابلِ تعجب بھی ہے اور میری نگاہ میں یہ کسی دشت کی سیاحی سے کسی طرح کم نہیں ہے کیوں کہ آج تو نام نہاد ترقی پسندوں میں بھی اکثریت ان کی ہے جو اپنے مفادات کو مقدم جانتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک ایک ایسی تحریک تھی جس کا اثر اپنے آغاز میں ہی بہت تیزی سے پھیلا۔ اس وقت کے حالات نے بھی اس تحریک کے فروغ میں ایک نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ پُرانے سماج میں فرسودہ رسوم ورواج کی بے جا جکڑ بندیوں اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کے مظالم نے جس طرح عام آدمی کی زندگی بے وقعت کردی تھی اور چند لوگوں کی اقتدار پرستی اور دولت کی ہوس نے عوامی زندگی کو

ارزاں کر دیا تھا۔ آج اس پر نظر ڈالتے ہیں تو کراہیت محسوس ہوتی ہے۔ بالآخر سماج میں پلنے والی یہ بُرائیاں لوگوں کو نا قابلِ برداشت لگنے لگیں، اس بوسیدہ نظام سے چھٹکارا پانے اور سب کچھ بدل کے ایک نئے سماج کے تصور نے ذہنوں میں جڑ پکڑنا شروع کر دیا۔

آزادی کے بعد نئے ہندوستان کا جو خواب لوگوں کی نگاہوں میں بسا تھا، اُس وقت اس کی تعبیر اسی تحریک کی جد و جہد میں انھیں نظر آ رہی تھی۔ کمیونسٹ نظریے کا مساواتی نظام یقیناً متاثر کرنے والا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بہت کم وقت میں کم و بیش ہر طبقے کے افراد کو متاثر کیا، لیکن اس کی اثر پذیری اور ترویج میں سجاد ظہیر کی شخصیت کو بھی بڑا دخل رہا ہے۔ انھوں نے دل و جان سے اس نظریے کو نہ صرف مانا بلکہ تحریک کے ذریعے اسے پھیلانے کی بھی کامیاب کوشش کی۔ خاص طور پر اس وقت کا پڑھا لکھا طبقہ اس سے متاثر ہوا اور ان کے اردگرد جمع ہونے لگا۔ ان کی ذات ایک ایسا مرکز ثابت ہوئی تھی جہاں سے اس نئے رجحان کی بنیاد پڑی۔ یہ درست ہے کہ سجاد ظہیر کی بے لوث خدمات اور تحریک سے وابستگی نے ہی حقیقی معنوں میں اسے ہند و پاک میں کامیاب کیا۔ سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے روحِ رواں تھے لیکن افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان کی زندگی کے مختلف گوشوں اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالنے کی کماحقہٗ کوشش اردو میں آج تک نہیں ہوئی۔ اُن کے معاصرین اور رفقا نے تحریک کی کارگزاریوں کے حوالے سے اُن کا تذکرہ کیا تو ہے لیکن وہ خاطر خواہ نہیں ہے۔ اُن کی اپنی تصنیف ''روشنائی'' بھی ایک طرح سے تحریک کی کارگزاریوں کا تذکرہ ہے۔ اس لیے اندر بھان بھسین صاحب کی یہ کتاب اس سلسلے کی ایک اہم کوشش ہے جس سے سجاد ظہیر کی زندگی کے چند پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ حالاں کہ اس کتاب کا موضوع ''سجاد ظہیر کا دورِ اسیری'' ہے۔ اس کتاب میں سجاد ظہیر کی زندگی کے ایک ایسے دور اور پہلو کو انھوں نے اپنا موضوع بنایا ہے جو اپنے آپ میں کافی دلچسپ ہے، لیکن اندر بھان بھسین صاحب نے اپنے موضوع کو یہیں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت سی معلومات انھوں نے سجاد ظہیر کی بیٹیوں اور دیگر لوگوں سے ملاقات کے ذریعے یا خط و کتابت سے حاصل کیں اور ایک ایسا مواد یک جا کیا جو اَب تک لوگوں سے مخفی رہا تھا۔ چوں کہ سجاد ظہیر کے انتقال کو ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ اُن کے معاصرین اور تحریک سے وابستہ بہت سے لوگ یا تو گزر چکے ہیں یا گوشہ نشین ہو چکے ہیں۔ اس لیے اس بیڑے کو پار لگانا اتنا آسان

نہیں تھا۔ دوسری طرف جو کچھ انھوں نے اپنی کوششوں سے حاصل کیا اس کی تصدیق بھی اہم تھی تا کہ سند پر اعتبار قائم ہو سکے۔ اسی لیے جن لوگوں سے انھوں نے اس کتاب کی تصنیف میں مدد لی ہے اُن کے انٹرویوز اور تحریر کردہ مواد کو بھی انھوں نے سند کے طور پر کتاب کے متن میں شامل کر دیا ہے تا کہ ناقدین و محققین کو کسی طرح کا اشتباہ نہ رہے۔

اندر بھان بھسین صاحب نے اپنی نوجوانی میں ترقی پسند تحریک کا وہ زمانہ دیکھا ہے۔ اس کے اُتار چڑھاؤ سے بھی واقف ہیں۔ حالاں کہ وہ اس تحریک سے باضابطہ طور پر منسلک نہیں رہے۔ لیکن اس کے اثر سے بچ بھی نہیں سکے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور ان کے دو شعری مجموعے: ۱) گلدستۂ سخن اور ۲) اِک شعلہ سیاہ پوش، شائع ہو چکا ہے۔ جس میں رومانیت کے ساتھ ترقی پسند تحریک کے اثرات بہ آسانی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ شاید اسی لیے انھوں نے اپنی تحقیق کے لیے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا جو گو کہ آج کے لیے بظاہر فرسودہ ہو چکا ہے، لیکن اپنے آپ میں اہم ہے۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے جس میں سے چھ ابواب ان کی تحقیق اور تھیسس کا متن ہے اور ساتواں باب ان مواد کو پیش کرتا ہے جو انٹرویوز اور تحریری دستاویز کے طور پر کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کی ادبی اور تحقیقی اہمیت کے بارے میں بس اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ آئندہ سجاد ظہیر یا ترقی پسند تحریک کے حوالے سے جب بھی بات ہوگی اس کتاب کو ایک ریفرنس بک کی حیثیت حاصل رہے گی۔

الیاس شوقی

پہلا باب

ابتدائی زندگی

- ۱۔ گھرانہ، بچپن، تعلیم اور شادی
- ۲۔ شخصیت اور حب الوطنی
- ۳۔ سیاسی اور فکری سرگرمیاں
- ۴۔ ادبی خدمات، تحریریں، رسائل و جرائد

۱۔ گھرانہ، بچپن، تعلیم اور شادی

اردو ادب میں ابھی ایسے کئی موضوعات ہیں جو اہم ہونے کے باوجود ابھی تک تشنۂ تحقیق ہیں۔ سجاد ظہیر کی شخصیت اور زندگی کا ایک خاص پہلو اُن کی اسیری کا دور ہے۔ اس موضوع کی طرف کوئی نمایاں توجہ نہیں دی گئی۔ صرف ان کی شخصیت، ادبی خدمات اور ان کی ترقی پسند تحریک پر ہی زور دیا گیا ہے۔ اردو ادب کے لیے اُن کی شخصیت بہت اہم ہے کیونکہ وہ اردو کی سب سے اہم ادبی تحریک ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ اس تحریک نے اردو ادب پر جتنے گہرے اثرات ڈالے ہیں وہ اظہر من شمس ہے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ جتنا مواد ہمیں ترقی پسند تحریک پر ملتا ہے سجاد ظہیر پر نہیں ملتا جو اُن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈال سکے۔ اُن کے ساتھیوں اور معاصرین نے جو کچھ لکھا ہے اُس میں بھی ترقی پسند تحریک کی سرگرمیاں اور کمیون کی زندگی سے متعلق معلومات ہی زیادہ ملتی ہیں۔

سجاد ظہیر کے نام سے جتنی کتابیں چھپ چکی ہیں اِن سب میں سجاد ظہیر کی زندگی کے وہی واقعات دہرائے گئے ہیں جو ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں کچھ حد تک اُن کی ادبی خدمات اور تنقید نگاری کا بھی ذکر ملتا ہے۔ لیکن اِن سب میں ایسی کوئی ٹھوس بات سامنے نہیں آتی جو اسیری سے اخذ کی گئی ہو۔ دورِ اسیری کے حالات اور اُن حالات کے ردِ عمل کے بارے میں تو بالکل کچھ نہیں ملتا۔ 'نقوشِ زنداں' سے اُن کے دورِ زنداں کے چند حالات سے ضرور واقفیت حاصل ہوتی

ہے لیکن ایسی کوئی بات سامنے نہیں آتی جس کا پہلے سے کسی کو علم نہ ہو۔ ایک طرح سے سجاد ظہیر کی زندگی کا یہ پہلو گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا تھا اور اِسے اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لانے کی چنداں ضرورت تھی۔ 'نقوشِ زنداں' اُن کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو سن 1940 سے 1942 تک سجاد ظہیر نے لکھنؤ کی سینٹرل جیل سے اپنی رفیقۂ حیات رضیہ بیگم کو لکھے تھے۔ اِن میں زیادہ تر اُن کی آپس میں انتہائی محبت کا تذکرہ ہے۔ جیل کے حالات پر محض طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ کسی بھی ادیب نے اُن کے اُس دور کو وضاحت سے پیش نہیں کیا۔ اگرچہ اِس کتاب میں اُن کی اسیری ہی کو خاص موضوع بنایا گیا ہے لیکن چند ابواب اُنکی شخصیت' اُنکی سرگرمیاں' اور اُنکی تخلیقات کے متعلق بھی شامل کیے گئے ہیں تا کہ اُن کی مکمل زندگی کی تصویر کشائی بھی ہو سکے۔

اس لیے اسے محض سجاد ظہیر کے دورِ اسیری تک ہی محدود نہیں ہونے دیا گیا بلکہ اس سے متعلقہ بھی بہت سی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر ملک کے بٹوارے سے پیدا شدہ حالات پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے اور اس بٹوارے سے جو خون خرابہ ہوا، کتنی جانیں تلف ہوئیں اور دونوں طرف عوام کا جو مالی نقصان ہوا وغیرہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آزادی کی مہم جو ترقی پسند تحریک سے بہت پہلے عمل میں آچکی تھی اس نے ہندوستانی عوام اور بعد میں ترقی پسند تحریک کو کیسے متاثر کیا اور اس کا ردِعمل کیا رہا۔

ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ سجاد ظہیر کے ساتھ جو دیگر لوگ راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے تھے، ان سب پر مقدمے کی نوعیت، اس کی سنوائی، الزامات اور سزائیں ان سب پر طویل بحث کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے سجاد ظہیر کے دورِ اسیری کا کوئی بھی پہلو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

سجاد ظہیر پڑھے لکھے اور ادبی حلقوں میں اپنے اِسی نام سے جانے جاتے تھے لیکن دوست یار انہیں 'بنّے بھائی' کہہ کر بھی پکارتے تھے۔ البتہ گھر میں ماں' باپ' بھائی بہن اور رشتہ دار اُنہیں 'بنّے میاں' کے نام سے ہی یاد کرتے تھے۔ اِن کے والد کا نام سید وزیر حسن تھا جو ایک نامی وکیل تھے اور اودھ کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے پر بھی فائز رہے تھے۔ اُن کے سات بیٹے اور بیٹیاں تھی جن میں سجاد ظہیر چھٹے نمبر پر تھے۔ صرف ایک بھائی اُن سے عمر میں چھوٹا تھا باقی سب بھائی بہن اُن سے بڑے تھے۔ اِن کا آبائی علاقہ کلاں پور تھا جسے بڑا گاؤں بھی کہتے تھے۔ یہ گاؤں ضلع جون پور

میں کھیت سرائے کے پاس واقع تھا۔کھیت سرائے وہاں کا آخری ریلوے اسٹیشن تھا۔وہاں سے کلاں پور تقریباً پیدل ہی جانا پڑتا تھا۔ان کا گھرانہ متوسط طبقے کا زمیندار گھرانہ تھا جن کے افراد نسل درنسل تعلقہ دار اور زمیندار چلے آرہے تھے۔اس گھرانے کے بزرگ زمیندارانہ عیش وعشرت ، آن بان ، وضع داری ، خوش سلیقگی وغیرہ سے لطف اندوز رہ چکے تھے اور انہیں معاشرت کے تمام طور طریقے دستیاب تھے۔لیکن وقت کے ساتھ جب صرف زمینداری سے گزراوقات مشکل ہونے لگا تو مستقبل شناس لوگ گاؤں چھوڑ کر شہر کا رُخ کرنے لگے جہاں بودوباش قدرے آسان تھی۔چونکہ جسٹس سید وزیر حسن کا پس منظر زمینداری تھا اور لکھنؤ میں بیرسٹری کا پیشہ بھی کیا کرتے تھے اس لیے ان کے خاندان کی گنتی لکھنؤ کے نہایت شائستہ اور خوش حال لوگوں میں ہوتی تھی۔لکھنؤ کی ایک اپنی ہی تہذیب تھی۔ اِس تہذیب کے طور طریقے ، بول چال اور رسم ورواج اِن کے گھرانے نے بھی بخوبی اختیار کر لیے تھے۔

سید وزیر حسن 1874 میں اِس گھرانے میں پیدا ہوئے۔اُنہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔اے پاس کیا اور پھر الہ آباد سے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کی۔شروع میں وہ جونپور میں پریکٹس کرنے لگے پھر پرتاپ گڑھ چلے گئے۔کچھ عرصہ وہاں بھی وکالت کی مگر جلد ہی گاؤں اور قصبوں کی پریکٹس سے اُوب گئے اور لکھنؤ میں بودوباش اختیار کر لی۔لکھنؤ جا کر اُنہیں بہت کامیابی حاصل ہوئی اور اُنکا شمار وہاں کے بہت قابل اور نامور وکیلوں میں ہونے لگا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اُنہیں کچھ مدد اپنے خاندانی پس منظر سے ضرور ملی لیکن اِن کی ترقی میں بیشتر حصہ اُنکی ذاتی ذہانت' انتھک محنت اور گرمجوشی کا رہا تھا۔رفتہ رفتہ اُنکی شہرت پھیلنے لگی اور وہ سر تیج بہادُر سپرو کے مقابلے کے وکیل بن گئے۔اب انکے پاس روپے پیسے ،نام ونمود اور اثرورسوخ کی کچھ کمی نہیں تھی۔چونکہ خود بھی ایک روشن خیال شخص تھے اِسلیے مسلمانوں میں تعلیم اور مذہبی رواداری کو فروغ دینے کے حق میں تھے۔کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مفاہمت چاہتے تھے۔نہ وہ ہندوؤں کی رام راج کی پالیسی کو ٹھیک سمجھتے تھے نہ مسلمانوں کی خلافت کی تحریک کو۔ان دونوں کو وہ قدامت پرستی کا درجہ دیتے تھے۔

اپنے اثرورسوخ کی وجہ سے جوڈیشل کمشنر منتخب ہوئے۔بعد میں حکومت نے اُنہیں چیف کورٹ اودھ کے جج اور چیف جسٹس کے عہدے پر فائز کر دیا۔اُن کی خدمات کی بنا پر اُنہیں 'سر' کا

خطاب بھی عطا کیا گیا۔ لکھنؤ میں ہی اُنہوں نے اپنا ایک محل نما گھر تعمیر کیا جو دریائے گومتی کے کنارے پر تھا۔ اُس کوٹھی کا نام 'وزیر منزل' رکھا جو پورے اودھ میں سب سے مشہور کوٹھیوں میں ایک تھی۔ جس سڑک پر 'وزیر منزل' قائم تھی وہ روڈ سر وزیر حسن روڈ کہلاتی تھی۔ وزیر منزل سر وزیر حسن کی خوشحالی، جاہ وجلال اور اثر ورسوخ کی نشاندہی کرتی تھی۔ وہاں ادیبوں، شاعروں، منصب داروں اور اعلیٰ سرکاری عہدیداروں کا جمگھٹ لگا رہتا تھا۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ وہ وزیر منزل اپنے درجنوں کمروں اور دالانوں کے باوجود سجاد ظہیر اور اُنکے بیوی بچّوں کو مکمل پناہ نہ دے سکی اور وہ صرف خستہ حال تین کمروں میں رہتے رہے جو کہ شاگرد پیشہ لوگوں کے لیے بنوائے گئے تھے۔

اگر سر وزیر حسن کا موازنہ موتی لال نہرو سے کیا جائے تو بالکل بیجا نہ ہوگا۔ دونوں کا معاشی' سیاسی اور سماجی ماحول ایک جیسا تھا۔ پنڈت موتی لال کے والد پنڈت گنگا دھر نہرو اپنے علاقے کے کوتوال تھے۔ سر وزیر حسن کے والد تحصیلدار تھے اور ان کا تعلق بھی ایک زمیندار گھرانے سے تھا جن کا شمار اپنے وقت کے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ موتی لال نہرو نے بھی ایک عالیشان گھر خریدا تھا جس کا نام اُنہوں نے 'آنند بھون' رکھا تھا۔ موتی لال کے گھر بھی سر وزیر حسن کے گھر کی طرح اہم لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا جن میں اعلیٰ طبقے کے ہندو مسلمان، سرکاری افسر، ادباء اور علماء بھی شامل تھے۔

سید سجاد ظہیر کا جنم 5 نومبر سن 1905 کو منجھلے صاحب کے مکان گولہ گنج لکھنؤ میں ہوا تھا۔ چار سال کی عمر میں اُنکی رسم بسم اللہ منائی گئی۔ اس رسم کی دھوم دھام کا اور مولوی صاحب سے حصولِ تعلیم کا منظر سجاد ظہیر نے خود بیان کیا ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

> ''میری بسم اللہ کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور دوسرے دِن باقاعدہ مجھے مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ میرے بڑے بھائیوں کو دینیات، عربی اور فارسی پڑھانے کے لیے ایک عالم فاضل مولوی کو ہمارے گھر پر ہی رکھ لیا۔ اُن کو بیس روپے ماہوار اور کھانا ملتا تھا۔۔۔ مولوی رضی حسن صاحب پیش امام تھے۔ ہم سب بھائی سورج نکلنے سے پہلے ہاتھ مُنہ دھو کر سیدھے اِن کے کمرے میں جاتے' ایک رکوع کی تلاوت کرتے' مولوی صاحب سُنتے رہتے اور ہمیں قرآن پڑھنا سکھاتے۔ بعد کو ہم میں سے ایک مولوی صاحب کا حقہ بھرتا اور پھر پہلے عربی

اور اُس کے بعد فارسی کا سبق دیا جاتا۔ خوش خطی کی تختیاں لکھتے۔ مولوی صاحب تخت پر بیٹھتے، ہم لوگ کرسیوں پر جو تخت کے بالکل قریب ہی لگی ہوتیں۔ کتاب ہماری گود میں ہوتی۔ ہم پڑھتے مولوی صاحب سُنتے۔ پہلے آموخت پھر نیا سبق۔ یہاں کی ساری فضا رعب دار اور تقدس کی ہوتی۔ کوئی غلطی ہوئی اور مولوی صاحب 'ہوں' کہہ کر چیں بہ جبیں ہو جاتے۔ میری جان سوکھ جاتی۔ کبھی کبھی کان اینٹھ کر چانٹا بھی مار دیتے۔ دوپہر کو ظہر و عصر اور شام کو مغرب و عشاء کی نماز کے لیے مولوی صاحب کے یہاں جانا پڑتا۔ مجھے مولوی صاحب سے بُری طرح ڈر لگتا تھا۔ حد یہ تھی کہ میں ایسے میں بھی جب مولوی صاحب کے یہاں پڑھنے کا وقت نہیں ہوتا تھا، اس طرف جانے سے کتراتا تھا۔ ان کی آواز بڑی کرخت تھی۔ دیکھ لیتے تو زور سے پکارتے " بنّے یہاں آؤ" پھر کوئی نہ کوئی فرمائش کرتے۔ "اندر جا کر اپنی والدہ سے کہو تھوڑی شکر بھیج دیں۔" یا اس قسم کی کوئی بات۔ ہماری بوبو بھی انکی فرمائشوں سے عاجز رہتیں لیکن عام طور سے ان کو پورا کرتی تھیں۔ وہ ان کا بہت احترام کرتی تھیں۔

والدہ کہتی تھیں کہ اِن کے (مولوی صاحب) کے رہنے سے گھر میں برکت ہوتی ہے۔ ہمارے بابا روزہ نماز کے پابند نہیں تھے۔ وہ صرف عید کی نماز پڑھتے تھے۔ اِس لیے ہماری اماں نے مولوی صاحب کو رکھا تھا کہ باپ کے اثر سے نہیں تو مولوی صاحب کے اثر سے ہم لوگ پابند صوم وصلوٰۃ یعنی روزہ نماز کے پابند ہوں اور اچھے مسلمان بنیں۔ لیکن ان نسخوں کا کچھ اُلٹا ہی اثر ہوا۔ البتہ کس قدر عربی فارسی ہمیں ضرور آ گئی۔ میں نے ان مولوی صاحب سے کوئی چھ سات برس تک تعلیم حاصل کی۔ دینیات اور اخلاقیات کے سبق لیے اور نمازیں پڑھیں۔ آج اتنے برس ہو جانے پر بھی اس تلخی کی یاد دل پر نقش ہے اور کوئی سبق مجھے مولوی رضی حسن صاحب مرحوم سے ملا یا نہ ملا ہو اس بات کا عملی تجربہ ضرور ہے اور اسی لیے یقین ہے کہ اچھائیاں اور نیکیاں شدت و جبر کے ساتھ ہرگز سکھائی

نہیں جاسکتیں اور یہ کہ زہد و پارسائی بسا اوقات انسان کی انسانیت کو کم کر کے اسے شکی القلب' مغرور اور خود پرست بنا دیتے ہیں۔ ہمارے مولوی صاحب بُرے آدمی بالکل نہیں تھے۔ دُنیا کو صراطِ مُستقیم پر لگانے کی دُھن نے انہیں برباد کر دیا تھا۔"(۱)

یہ تحریر سجاد ظہیر کے ایک مضمون 'وہ وقت، وہ لوگ اور میں' میں درج ہے جو پرگتی شیل وسودھا میں شائع ہوا تھا۔ 'پرگتی شیل وسودھا' بھوپال سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے چیف ایڈیٹر کملا پرشاد تھے جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ کملا پرشاد ترپاٹھی انجمن ترقی پسند مصنفین کے بہت لمبے عرصے تک جنرل سیکریٹری رہے ہیں۔ سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، پریم چند وغیرہ کی ادبی اور ثقافتی روایت کو تقویت دینے میں ان کا کافی ہاتھ رہا ہے۔ 1990 سے یہ پرگتی شیل وسودھا کی ادارت کر رہے تھے۔ مشکل سے مشکل دور میں بھی وہ انجمن کی قیادت میں سرگرداں رہے۔ انہوں نے پرگتی شیل کا سہ ماہی شمارہ اکتوبر۔ ستمبر 2005 نمبر سجاد ظہیر کی یاد میں نکالا تھا جس میں بہت سے ادیبوں کے متعدد مضامین شائع ہوئے تھے۔ زیرِ تذکرہ مضمون بھی اسی شمارے میں شامل کیا گیا تھا۔ بعد میں یہ مضمون شکیل صدیقی نے اپنی کتاب 'ترقی پسند تحریک اور سجاد ظہیر' میں بھی شائع کیا ہے۔

بنّے بھائی جو ساری عمر صرف نیکی کرنے میں ہی محور ہے اُنکا کہنا ہے کہ نیکی جبراً بالکل نہیں سکھائی جا سکتی بلکہ یہ خوبی اندرونی نفاست اور نیک کردار سے خود بخود حاصل ہو جاتی ہے۔ بچپن سے ہی 'بنّے میاں' کو کہانیاں سُننے کا بہت شوق تھا۔ اِس وجہ سے پیدائش سے ہی اُنہوں نے ادب و حکایت اور شعر و شاعری کا ذوق حاصل کر لیا تھا۔ چونکہ مذہب سے شیعہ تھے اِسلیے محرم کی مجلسوں اور میر انیس کے مرثیوں نے اُن پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ اُنہیں ننھیال زیادہ پسند تھا کیونکہ اُنکے ہاں سادگی' دیہاتی پن اور خلوص و محبت کا دور دورا تھا حالانکہ اپنے آبا و اجداد کا بھی اُنھوں نے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا۔

گھر میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ لکھنو کے گورنمنٹ جوبلی اسکول میں پانچویں کلاس میں داخل ہوئے اور 1921 میں دسویں پاس کی۔ اِس کے بعد وہ گولہ گنج میں واقعہ کرسچین کالج میں انٹر میں داخل ہوئے۔ انٹر اُنہوں نے 1924 میں پاس کیا یعنی انٹر پاس کرنے میں اُنہیں ایک سال زیادہ لگا۔ اِس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی لیکن یہ قیاس لگایا جاتا ہے کہ چونکہ وہ

ریاضی میں کافی کمزور تھے اِس لیے ممکن ہے وہ ایک سال فیل ہو گئے ہوں یا ایک سال چھوڑ کر اِمتحان دیا ہو۔ 1926 میں اُنہوں نے کرسچین کالج لکھنؤ سے بی۔اے کا اِمتحان پاس کیا۔ جس کے بعد اُنہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت جانے کا فیصلہ کیا۔ اُن دِنوں اکثر امیر لوگوں کے بچے زائد تعلیم کے لیے یورپ ہی جاتے تھے۔ سجاد ظہیر بھی امیر باپ کے بیٹے تھے، ہی اِس لیے وہ بھی ولایت جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

1927 میں وہ لندن کے لیے روانہ ہوئے۔ وہاں تعلیم کے لیے دو یونیورسٹیاں بہت مشہور تھیں۔ ایک آکسفورڈ اور دوسری کیمبرج۔ بنّے بھائی نے آکسفورڈ یونیورسٹی کا اِنتخاب کیا۔ اُن کی طبیعت جو پہلے سے ہی ناساز رہتی تھی وہاں جا کر اور بھی خراب ہو گئی۔ وہاں کے طبی مُعالجین نے تپ دق کا خدشہ ظاہر کیا اور وہ سوئٹزرلینڈ کے ایک سینی ٹوریم (sanitorium) میں داخل ہو گئے جہاں اُنہیں ایک سال تک زیرِ علاج رہنا پڑا۔ وہیں اُنہیں عالمی حالات کو جاننے کے کئی طرح کے مواقع فراہم ہوئے۔ وہاں ہی اُنہوں نے فرانسیسی زبان سیکھی ، فرانسیسی ادب کا بغور مطالعہ کیا، کمیونزم کی متعلقہ اور بنیادی کتابیں بھی پڑھیں۔ وہیں اُن کا بائیں ہاتھ کے ادب اور سیاست سے واسطہ پڑا اور جب وہ ایک سال کے بعد پھر سے آکسفورڈ لوٹے تو وہ کافی حد تک اِشتراکیت کے زیرِ اثر آ چکے تھے۔

1931 میں سجاد ظہیر نے آکسفورڈ سے بی۔اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کی۔ اور بعد میں وہاں سے اُنہیں بیرسٹری کی ڈگری بھی ملی۔ سجاد ظہیر نے دیگر بھی کئی ڈگریاں حاصل کیں۔ B.A کی ڈگری تو اُنہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ہی حاصل کر لی تھی لیکن ایم۔اے اُنہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے کیا۔ بعد ازاں بار ایٹ لاء بھی لندن سے کیا اور پھر لندن ہی سے ڈپلوما ان جرنلزم بھی سے حاصل کیا۔

سجاد ظہیر کی والدہ کا نام سکینہ الفاطمہ تھا جو جونپور کے ایک سادات گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ لوگ متوسط درجے کے زمیندار تھے جیسے وزیر حسن کے گھرانے والے تھے۔ سکینہ الفاطمہ کو تمام گاؤں والے پیار سے 'سکن بی بی' کہہ کر پکارتے تھے مگر گھر میں وہ 'بوبو' کہلاتی تھیں۔ بنّے میاں نے جو خطوط لکھنؤ سینٹرل جیل سے اپنی بیگم کو لکھے اُن میں ایک آدھ خط میں اُنہوں نے اپنی والدہ کی

لیے 'بوبو' کا لفظ ہی اِستعمال کیا۔ بنّے بھائی کے ایک دوست سبطِ حسن نے بھی یہی لفظ اِستعمال کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''دوسرے ہفتے میں بنّے بھائی سے مِلنے جیل گیا اور بوبو کے ساتھ ہونے کی وجہ سے بہت دیر تک اُن سے باتیں کرتا رہا۔ بوبو صوبائی اسمبلی کی ممبر تھیں اور وزیروں اور سرکاری حلقوں میں لوگ اُن کا بہت احترام کرتے تھے۔ کوئی شخص اُن کی بات ٹالنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ حتیٰ کہ سروزیر حسن بھی اُن سے گھبراتے تھے۔''(۲)

بوبو کے گھر کا ماحول مذہبی تھا اِسلیے وہ مذہبی ماحول میں پلی بڑھیں اور جوان ہوئیں۔ وہ اپنے بچوں میں خاص دلچسپی لیتی تھیں اِسلیے اُنہوں نے تمام بچوں کی تعلیم پر بہت توجہ دی۔ اِس مقصد کے لیے ایک عالم فاضل مولوی رضی حسن جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، مستقل طور 'وزیر منزل' میں مقرر کردیئے گئے تا کہ بچے اُن کی نگرانی میں نماز ادا کریں اور قرآن شریف کی تلاوت بھی کریں۔ اُنہی مولوی صاحب نے بچوں کو گلستان بوستان، حدیث وفقہ، اصول وقواعد، شعروشاعری اور مذہبی روایات سے واقف کرایا۔

اگر چہ گھر میں اور گاؤں میں وہ سکن بی بی کہلاتی تھیں لیکن جو کلب اُنہوں نے عورتوں میں پردے کے خلاف قائم کیا تھا وہاں کی عورتیں اُنہیں لیڈی وزیر حسن کہتی تھیں۔ لیڈی وزیر حسن مذہب کی پابندی کے باوجود بہت روشن خیال خاتون تھیں جو مسلمان عورتوں میں نئے اور ماڈرن خیالات پھیلانا چاہتی تھیں۔ وہ باقاعدگی سے کرامت حسین مسلم گرلز کالج جاتی تھیں اور ذاتی طور پر لڑکیوں کے تعلیمی ماحول پر نظر رکھتی تھیں۔ اُن کے ساتھ قرۃالعین حیدر کی والدہ لیڈی یلدرم بھی جاتی تھیں۔ یہ بات قابل تعریف ہے کہ جہاں اُنہوں نے اپنے لڑکوں کو مغربی تعلیم اور مغربی پہناوے کا درس دیا وہیں شیروانی، اچکن اور مسلمانی ٹوپیاں بھی پہنائیں۔ جہاں تک لڑکیوں کا تعلق ہے اُنہیں بھی مغربی تہذیب وتمدّن اور آداب سے واقف کرایا۔ قرۃالعین حیدر خود بھی لیڈی وزیر حسن کی تعریف میں کچھ ایسا ہی لکھتی ہیں:

''اُن کی ماں لیڈی وزیر حسن ایک روشن دماغ بیوی تھیں جنہوں نے پردہ

چھوڑ دیا تھا۔ یہ وہ دِن تھے جب ترکی دُنیا بھر میں خاص کر کے ہندوستان
کے مسلمانوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ سن 1930 میں کمال اتاترک نے
ترکی میں عورتوں کو پردے سے آزادی دلائی۔ اُس کا سیدھا اثر یہاں کے
مسلمانوں پر ہوا۔ میری ماں نے بھی اِسی دوران پردہ چھوڑا۔ شریف
گھروں کی عورتوں نے باہر نکلنا شروع کیا اور خاص کر کے لڑکیوں کی تعلیم
کی طرف دھیان دینا شروع کیا۔ میری ماں اور لیڈی وزیر حسن مل کر
کرامت حسین گرلز کالج جاتیں۔ وہاں کی لڑکیوں کے لیے پکنے والے
کھانے کی جانچ کرتیں، باورچی خانے میں صفائی وغیرہ دیکھتیں اور
ہوسٹل میں رہنے والی لڑکیوں سے بات چیت کرتیں۔ اُن کا مقصد ہوتا کہ
کوئی لڑکی اِس لیے پڑھائی نہ چھوڑ دے کہ اُسے گھر کی یاد آ رہی ہے یا اُس
کی دیکھ بھال ٹھیک سے نہیں ہو رہی ہے۔

لیڈی وزیر حسن ایک نہایت ہی خوبصورت اور خوش مزاج بیوی
تھی۔ وہ لجیسلیٹو کونسل یو پی کی ممبر بھی تھیں اور سماجی معاملات میں حصہ بھی
لیتی تھیں۔ ہمارے سامنے اُس وقت عمرانی تبدیلیاں نہایت خاموشی مگر
تیزی کے ساتھ ہو رہی تھیں۔ 1857 سے چند سال بعد ہی لکھنؤ کی سماج
میں انگریزی کی چرچا شروع ہو گئی تھی۔ لکھنؤ برطانوی کلکتے کی ایک توسیع
بن چکا تھا۔ کئی انگریزی کے اسکول بھی کُھل گئے تھے۔ لیکن لیڈی وزیر
حسن نے انگریزی تو دور کبھی اردو یا ہندی بھی بول کر نہیں دی۔ ہمیشہ
پوربی یعنی اودھی میں ہی بات کرتی تھیں۔'' (۳)

یہ امر کسی ثبوت کا محتاج نہیں کہ بنّے بھائی کے خیالات بچپن سے ہی قوم پرستانہ تھے اور
آزادی کا جذبہ ابتدائی زندگی سے اُن پر اثر انداز تھا۔ ایک طرف تو لکھنؤ کے کشادہ ماحول میں رہنے
سے اُن کا فطرتی میلان شعر و شاعری اور ادب کی طرف مائل تھا اور دوسری طرف سیاسی سرگرمیوں
سے بھی سجاد ظہیر نے بہت کچھ اخذ کیا۔

لیکن بنّے میاں نے خود بھی لکھا ہے کہ اُس وقت کی فضا سے متاثر ہو کر ہی اُنہوں نے گوشت وغیرہ ترک کر دیا تھا۔ اُنہوں نے ایک مضمون 'طویل اور مسلسل سفر کی کہانی' کے عنوان سے لکھا تھا جو ہفت روزہ 'حیات' سجاد ظہیر نمبر 1973 میں شائع ہوا تھا بعد میں جسے ڈاکٹر سید جعفر احمد نے اپنی کتاب 'سجاد ظہیر۔ شخصیت اور فن' میں شامل کیا ہے۔ اُس میں سجاد ظہیر نے لکھا ہے:

''میں نے اِن تمام حالات اور فضا سے متاثر ہو کر کھدر پہننا شروع کر دیا تھا۔ سر کے بال منڈوا دیئے تھے، گوشت کھانا ترک کر دیا تھا۔ پلنگ پر سونا چھوڑ دیا تھا، چٹائی بچھا کر زمین پر سوتا تھا۔ ہمارے خاندان والوں، بابا کے دوستوں اور شہر میں عام طور پر یہ خبر پھیل گئی کہ وزیر حسن کا چھوٹا لڑکا تو کانگریسی ہو گیا ہے۔ میں نے چرخہ کاتنا شروع کر دیا تھا اور اپنی ماں اور بہن کو بھی چرخہ کاتنے اور کھدر پہننے پر آمادہ کر لیا تھا۔ میرے والد نے میری ان حرکتوں پر کوئی اعتراض نہیں کیا نہ وہ اِس موضوع پر مجھ سے گفتگو کرتے تھے۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ مجھے کسی قدر مذہبی غلو بھی ہو گیا تھا۔ پانچ وقت کی نماز جس سے مولوی رضی حسن صاحب نے کافی بددل کر دیا تھا' اب میں باقاعدگی سے پڑھنے لگا۔ صبح کو تلاوتِ قرآن بھی کرتا۔ البتہ میں نے اسکول کی تعلیم کبھی نہیں چھوڑی۔ نان کواپریشن تحریک کے اس پہلو کو برتنے کے لیے میرا دل آمادہ نہیں ہوتا تھا میں گاندھی جی اور کانگریس کے بتائے ہوئے راستے پر پکی عقیدت رکھتا تھا۔ مجھے بھی سارے ملک کی طرح اس کا یقین تھا کہ سال بھر میں سوراج مل جائے گا۔ اس سوراج کی شکل وصورت کیا ہوگی' یہ مسئلہ صاف نہیں تھا اور جب گاندھی جی نے یہ کہہ دیا کہ ابھی اس کے صاف کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے' تو مجھے اطمینان ہو گیا۔ پھر بھی جب کبھی عام کسانوں کی بے چینی اور بمبئی میں مزدوروں کی ہڑتال کی خبریں آتیں تو میرا دل خوش ہو جاتا۔ انگریزوں یا انگریزی حکومت کے تشدد کے خلاف ہندوستانیوں کے جوابی حملے کی خبر سے بھی

خوشی ہوتی تھی۔ لیکن جب ان خبروں کے فوراً بعد گاندھی جی اور دوسرے
کانگریسی لیڈروں کی مزمت ہوتی تو میں بھی سمجھنے لگتا تھا کہ شاید ہماری
عوام نے غلطی کی ہے اور گاندھی جی ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن دل میں شبہ باقی
رہ جاتا اور ہمدردی عوام اور ان کے عمل کے ساتھ ہوتی۔''(۴)

سجاد ظہیر جب کرسچین کالج لکھنو میں تعلیم حاصل کررہے تھے اُس وقت ترکِ موالات یعنی (Non co-operation) کی تحریک بہت زوروں پر تھی۔ لیڈر لوگ جگہ جگہ جلسے کررہے تھے جن میں قوم پرستانہ نعرے لگائے جاتے تھے۔ آزادی کے تصورات سے ملک کی غلامی کا احساس اُبھر رہا تھا۔ بنّے بھائی ایسے ہر جلسے میں اپنے ہم خیال ہمجولیوں کے ساتھ موجود رہتے تھے۔ آزادی حاصل کرنے کی بے کلی اُن پر پوری طرح غالب تھی۔ ہر جلسے میں یہ اعلان ہوتا تھا کہ جب تک ہندوستان کو غلامی کے چنگل سے نجات نہیں ملتی نیتا لوگ زندگی کی ہر لذت سے گریز کریں گے۔ چونکہ بنّے بھائی ہر اُس چیز کے جو انگریزی تھی سخت خلاف تھے اِس لیے اُنہوں نے انگریزی کپڑے پہننا ترک کردیا اور کھدر پہننا شروع کردیا تھا۔ گوشت کھانا اور پلنگ پر سونا بھی موقوف کردیا تھا۔

اُن دِنوں ہندوستان سے آئے ہوئے طالب علموں کا ایک وسیع حلقہ لندن میں قائم ہوگیا تھا۔ یہ ہندوستانی بائیں بازو کی سیاست میں دِلچسپی رکھتے تھے۔ یہ لوگ لندن کے مختلف اداروں میں موجود تھے اور اُن کا مقصد ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانا تھا۔ محمود الظفر جو ایک امیر اور ترقی یافتہ گھر کے فرزند تھے اُس زمانے میں آکسفورڈ میں ہی پڑھ رہے تھے۔ اُنہوں نے بھی حصولِ آزادی میں دِلچسپی ظاہر کی۔ لہٰذا لندن میں بنّے بھائی کے ہم خیال دوستوں کا بہت فعال گروپ بن گیا تھا۔ اُنہوں نے ہندوستانی دوستوں کو سامراجی طاقتوں کے خلاف منظم کرنا شروع کردیا تھا۔ بنّے بھائی کو لندن جانے کے بعد ہندوستان کی ذلت آمیز حالت کا بہت زیادہ احساس ہوا اور اُن میں حب الوطنی کا جذبہ مضبوط ہوتا چلا گیا۔ اُنہوں نے ایک مضمون 'یادیں' رقم کیا تھا جس میں اُن کے لندن میں قیام کی روداد بیان کی گئی ہے۔ اُس میں اُنہوں نے کمیونسٹ پارٹی سے اپنی وابستگی کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کے کس طرح انہوں نے لندن کے ہندوستانی طلباء کو یکجا کرکے سامراجی طاقتوں کے خلاف منظم کیا۔ 1930 میں وہ برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے ہندوستانی شعبے کے

رکن بنے۔ ہندوستانی طلباء کے علاوہ اُنھوں نے لندن کے بائیں بازو کے ادیبوں سے بھی تعلقات پیدا کیے۔ ان میں سٹیفن سپنڈر، رالف فوکس، جیک لن سے، ڈیوڈ گیسٹ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ہندوستانیوں میں خاص نام ملک راج آنند، محمود الظفر، زیڈ-اے-احمد اور محمد اشرف کے ہیں۔ زیڈ-اے-احمد کا اصلی نام زین العابدین تھا۔ اُنھوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات 'میرے جیون کی کچھ یادیں' کے نام سے قلمبند کی ہے۔ جس میں اُنھوں نے لندن کی فضائی صورتِ حال اور سجاد ظہیر کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''سجاد ظہیر اچھے پڑھے لکھے اور پورے طور پر کمیونسٹ ہو چکے تھے۔ اُنھوں نے مشورہ دیا کہ لندن اور آکسفورڈ کی اِشتراکی نظریات والی ہندوستانی مجلس کی ایک مِلی جُلی نشِست ہونی چاہیے اور آگے چل کر ہم سب کو ایک متحدہ گروپ کی شکل میں کام کرنا چاہیے۔ لندن گروپ میں مَیں، اشرف اور شوکت عمر تو تھے ہی، اس کے علاوہ ہم نے نہار بندو، دتا موضمدار (بنگال) اور مزدور علاقے کے کامریڈ بنرجی کو اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ اِس طرح پانچ آدمیوں کا ایک کمیونسٹ گروپ لندن میں بن گیا۔ آکسفورڈ کا گروپ کچھ ڈھیلا ڈھالا تھا۔ سجاد ظہیر اور محمود الظفر تو کمیونسٹ خیالات میں پکّے تھے اور اُنھوں نے اپنے اثر میں کچھ دیگر نوجوانوں کو بھی لے لیا تھا جن میں جنرل حبیب اللہ (مغربی پاکستان کے وزیر) کے چھوٹے بھائی عشرت اللہ اور احمد آباد کے ہتھی سنگھ جنھوں نے آگے چل کر جواہر لال نہرو کی چھوٹی بہن کرشنا سے شادی کی، شامل تھے۔ لندن کے گروپ نے طے کیا کہ صرف سجاد ظہیر اور محمود الظفر کو ہم اپنی میٹنگوں میں بلائیں گے۔ دوسروں کو ابھی نہیں بلائیں گے۔ بعد میں ہم لوگوں نے سوچا کہ جب ہمارے خیالات اشتراکی ہو گئے ہیں اور ہر پروگرام میں ہم بھی حصہ لیتے ہیں تو کیوں نہ کمیونسٹ پارٹی کی ممبر شپ حاصل کرنے کی درخواست کریں۔ اِس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم نے لندن کی

کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں آنا جانا شروع کردیا۔ برٹش کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں سے ذاتی تعلقات قائم کیے اور ان سے کہا کہ ہمیں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بنا لیجئے۔۔۔۔‘‘(۵)

یہ تھا پس منظر جس میں ہندوستانی طلباء لندن میں زیرِ تعلیم تھے اور بائیں بازوں کی سیاست کی طرف رجوع کر رہے تھے۔ چنانچہ 1929 میں ہندوستانی مارکسٹ طلبہ کا ایک پریشر گروپ بن گیا جسے بنانے میں سجاد ظہیر پیش پیش تھے۔ 1935 میں وہ باقاعدہ طور پر کمیونسٹ پارٹی (لندن) کے رکن تسلیم کر لیے گئے۔

1930 یا 1931 میں سجاد ظہیر چھ ماہ کی رخصت پر ہندوستان آئے اور پروفیسر احمد علی، پروفیسر محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں کے معاون سے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کیا جس کا نام ’انگارے‘ رکھا۔ انگارے کی اشاعت سے پورے ملک میں ہلچل مچ گئی۔ اِن افسانوں کے خلاف مذہب اور اخلاقیات کے پیروکاروں نے بہت زوروں سے احتجاج کیا۔ علماء اور قدامت پسند عناصر نے بہت شوروغُل مچایا۔ لکھنؤ کے اخبارات میں خاص کر ہفت روزہ اخبار ’سچ‘ اور سہ روزہ ’سرفراز‘ میں اِس مجموعے کے خلاف کئی مضامین شائع ہوئے جن میں ’انگارے‘ کی کہانیوں کو مسلمانوں کی روایات اور اُنکے عقائد پر زبردست حملہ قرار دیا گیا۔ نتیجے کے طور پر یوپی کی حکومت نے اِس کتاب کو ممنوع قرار دیا اور اِس کی تمام کاپیوں کو ضبط کر لیا۔ سجاد ظہیر کہتے ہیں کہ ’انگارے‘ کی کہانیوں میں مذہب اور اخلاق کے خلاف کچھ بھی نہیں تھا بلکہ بیشتر کہانیوں میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ کم اور سماجی رجعت پرستی اور دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان زیادہ تھا۔ مولوی عبدالماجد دریا آبادی تو پوری طرح اِن کے خلاف اکھاڑے میں اُتر آئے تھے۔ مسجدوں میں ریزولیشن پاس کیے گئے اور کہانیوں کے مصنفین کو قتل کی دھمکیاں بھی دی گئیں۔ احمد علی تو اِس تحریک سے اِس قدر گھبرا گئے کہ اُنہوں نے دو ڈھائی برس تک گوشہ نشینی اختیار کر لی اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے قطع تعلق کر لیا۔ تاہم افسانوں کے باقی تخلیق کاروں نے ہمت برقرار رکھی۔ اِس میں پانچ کہانیاں سجاد ظہیر کی تھیں، رشید جہاں کی ایک کہانی، احمد علی کی دو کہانیاں اور محمود الظفر کی ایک کہانی، کل ملا کر نو (۹) کہانیاں تھیں۔ ’انگارے‘ کا شائع ہونا تھا کہ اردو کے رجعت پرست لوگوں میں تہلکہ مچ گیا۔ لکھنؤ میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی

نے اور علی گڑھ میں 'خشماف' نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ 'انگارے' کے خلاف مہم میں 'خشماف' سب سے پہلے اور آگے تھا۔ ویسے تو 'انگارے' کی کہانیوں کے مصنفین کو طرح طرح کی گالیوں سے نوازا گیا تھا لیکن شیخ عبداللہ کے خاندان کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا۔ 'خشماف' نے اِس سلسلے میں ایک نمبر بہت باقاعدگی سے نکالا جس کا عنوان تھا 'آگ کھائیں انگارے' اور یہ نمبر کئی مہینوں تک جاری رہا۔ اس میں رشید جہاں پر خاص حملے کیے گئے۔ رشید جہاں کے حسن، ان کی شخصیت اور اُن سے اپنی پہلی ملاقات کے بارے میں جناب سبط حسن لکھتے ہیں:

''چنانچہ ایک روز محسن عبداللہ نے مجھ سے کہا کہ چلو تمہیں اور اختر کو ڈاکٹر رشید جہاں آپا نے بلایا ہے۔ ہم لوگ محسن کے ساتھ شیخ عبداللہ کی کوٹھی پر گئے اور ابھی ڈرائینگ روم میں بیٹھے ہی تھے کہ اندر کا دروازہ کھلا اور ایک نہایت حسین وجمیل خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ سفید ساڑھی پہنے ہوئی تھیں۔ ان کے گھنگھرالے بال شانوں تک پھیلے ہوئے تھے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہم دونوں کو بڑی حیرت سے دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ یہ ڈاکٹر رشید جہاں تھیں۔ میں نے اس وقت تک اِتنی خوش رو اور خوش اندام عورت کبھی نہیں دیکھی تھی اور شاید اختر کا تجربہ بھی اِسی قسم کا تھا۔ ہم دونوں کے مُنہ حیرت سے کُھلے ہوئے تھے اور ہم ایک سکتے کے عالم میں اُن کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ نہایت بے تکلفی سے آگے بڑھیں اور اختر کی طرف اُنگلیوں کا اِشارہ کر کے پوچھا تمہارا نام کیا ہے۔ اختر نے نام بتایا تو میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگیں تو پھر تم سبط حسن ہو گے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ اُنہوں نے کھڑے کھڑے وہیں سے چیخ کر نوکر کو پکارا اور چائے کا حکم دیا۔ پھر وہ ہماری طرف مخاطب ہوئیں اور اُنہوں نے اِس بے تکلفی سے گفتگو شروع کی گویا ہم سے برسوں کی ملاقات ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اِن کو نہ اپنے حسن کا احساس تھا نہ ہمارے اجنبی ہونے کا اور جب اُنہوں نے باتیں شروع کیں تو پھر کرتی چلی گئیں۔ ہم لوگ بیچ بیچ

میں بس جی ہاں، جی نہیں کہتے رہے۔

دو تین گھنٹے کے بعد جب ہم دونوں واپس لوٹے تو ہمیں یقین ہو گیا کہ بڑی دبنگ خاتون ہیں اور ان کو نہ تو کوئی اپنے اصول سے ہٹا سکتا ہے اور نہ ناک کاٹنے اور قتل کی دھمکیاں دے کر ڈرا سکتا ہے۔"(٦)

رشید جہاں اور اُن کے خاوند محمود الظفر آخری دم تک سجاد ظہیر کے ہم قدم رہے اور ترقی پسند تحریک کے ارتقاء میں پوری ایمانداری سے اُن کا ساتھ دیا۔ رشید جہاں فیض احمد فیض کی بھی نظریاتی مرشد تھیں۔ جب فیض اور سجاد ظہیر راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں پاکستان کی جیل میں تھے تو اس دوران رشید جہاں ایک لاعلاج مرض میں مبتلا ہوئیں۔ روس کی حکومت نے انھیں ماسکو میں علاج کی بہترین سہولتیں مہیا کیں مگر وہ جانبر نہ ہو سکیں اور ماسکو میں ہی اُنکا انتقال ہو گیا۔

سجاد ظہیر کے بچپن کے دِنوں کا ایک پہلو جو پہلے نظر انداز ہو گیا تھا اب اُس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جس نے سجاد ظہیر کی ذہنی تعمیر میں قابلِ قدر کام کیا ہے۔ یہ واقعہ دسمبر 1916 کا ہے جب لکھنؤ میں کانگریس کا اجلاس ہوا تھا۔ لوک مانیہ تلک اُس زمانے کے بہت ہر دلعزیز لیڈر تھے۔ جب وہ اجلاس میں حصہ لینے کے لیے لکھنؤ پہنچے تو اُن کی گاڑی سے گھوڑوں کو ہٹا کر لوگوں نے اُسے خود اپنے ہاتھوں سے کھینچا۔ 'تلک مہاراج کی جے' کے نعرے گونج اُٹھے۔ اُسی اجلاس میں کانگریس اور مسلم لیگ کا تاریخی معاہدہ بھی ہوا۔ اُس وقت سجاد ظہیر کے والد مسلم لیگ میں اچھے عہدے پر تھے۔ سجاد ظہیر کی عُمر اُس وقت کوئی بارہ سال کی تھی۔ اُنہوں نے ملک کے اعلیٰ قائدین کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ گاندھی جی، محمد علی جناح، سروجنی نائیڈو اور مولانا آزاد کئی بار اُن کے گھر آئے تھے۔ کچھ لوگ اُن کے مکان پر رہے بھی تھے۔ اِن واقعات نے ضرور بنّے بھائی کے ابتدائی سالوں میں اُن پر گہرا اثر چھوڑا ہوگا۔ اس بارے میں سجاد ظہیر نے خود 'طویل اور مسلسل سفر کی کہانی' میں اپنے جذبات کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے:

"ہمارے گھر کی فضا آزادی خواہوں کی تھی۔ میرے والد مسلمان لیڈروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو کانگریس کے ساتھ مل کر انگریزی حکومت کے سامنے ہندوستان کے لیے ذمے دار حکومت کا مطالبہ رکھنا

چاہتے تھے۔ وہ پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں مسلم لیگ کے سیکریٹری تھے اور 1916 میں جب لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کا Pact ہوا تو وہ اس میں پیش پیش تھے۔ لکھنؤ میں قیصر باغ کی بارہ دری میں لیگ کا وہ سیشن مجھے اچھی طرح یاد ہے جس میں کانگریس کے لیڈر بھی شریک تھے۔ گاندھی جی، شریمتی سروجنی نائیڈو، بال گنگا دھر تلک، جناح صاحب کو میں نے پہلی بار اسی زمانے میں دیکھا۔ کانگریس کے اس اجلاس کے صدر بابو امبیکا چرن موضمدار تھے لیکن سب سے بڑے لیڈر تلک تھے۔ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ امین آباد میں تھا جب تلک کا جلوس وہاں سے گزرا۔ ہم پارک کے کنارے پر اپنی کار میں بیٹھے تھے کہ ایک جمِ غفیر نے ہمیں آلیا۔ لوگ والہانہ انداز میں نعرے لگا رہے تھے۔ "بولو تلک مہاراج کی جے" تلک مہاراج اور ان کے ساتھی تین چار آدمی ایک کھلی ہوئی Lando گاڑی میں ہاروں اور پھولوں سے لدے بیٹھے تھے۔ گاڑی کے گھوڑے کھول دیئے گئے تھے اور لوگ اسے خود کھینچ رہے تھے۔ مجھے یہ سب کچھ بہت ہی اچھا معلوم ہوا۔" (۷)

بنے بھائی نے اپنے مضمون میں اپنے زیرِ تعلیم زمانے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اسی مضمون یعنی 'طویل اور مسلسل سفر کی کہانی' میں لکھتے ہیں:

"ہم کو لندن اور پیرس میں جرمنی سے بھاگے ہوئے یا نکالے ہوئے مصیبت زدہ لوگ روز ملتے تھے۔ فاشزم کے ظلم کی درد بھری کہانیاں ہر طرف سُنائی دیتی تھی۔ جرمنی میں آزادی پسندوں اور کمیونسٹوں کو سرمایہ داروں کے غنڈے طرح طرح کی اذیتیں پہنچا رہے تھے۔ وہ ہولناک تصویریں جن میں عوام الناس کے ہر دل عزیز لیڈروں کی پیٹھ اور کولہے کوڑوں کے نشانوں سے کالے پڑے دکھائی دیتے، وہ خوفناک واقعات وقتاً فوقتاً کسی بڑے لیڈر کے جلاد کے ہتھوڑے سے سر قلم ہونے کے

بارے میں اخباروں میں چھپتے، وہ اندوہناک اندھیرا جو علم و ہنر کی اُس چمک دار دُنیا سے جس کا نام جرمنی تھا، پھیلتا ہوا سارے یورپ میں اپنی ڈراؤنی پرچھائی ڈال رہا تھا۔ اب سب نے ہمارے دِل و دِماغ کے اندرونی اِطمینان اور سکون کو مٹا دیا تھا۔ صرف ایک طاقت اِس شدید بربریت کے طوفان کا مقابلہ کرسکتی تھی، اور وہ تھی کارخانوں کے مزدوروں کی منظم طاقت۔۔۔۔ ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جارہے تھے۔ ہمارا دِماغ ایک ایسے فلسفے کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی دِن بدن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور اُن کو سلجھانے میں مدد دے سکے۔ ہمیں اِس بات کا اِطمینان نہیں ہوتا تھا کہ اِنسانیت پر ہمیشہ سے مصیبتیں اور آفتیں آتی رہی ہیں اور ہمیشہ آتی رہیں گی۔ مارکس اور دوسرے اِشتراکی مصنفین کی کتابوں کو ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے ہم اپنے مُطالعے کو بڑھاتے، آپس میں بحثیں کر کے تاریخی، سماجی اور فلسفیانہ مسئلوں کو حل کرتے اِسی نسبت سے ہمارے دِماغ روشن ہوتے اور ہمارے قلب کو سکون ہو جاتا تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ ایک نئے لامتناہی تحصیل علم کی ابتدا تھی۔'' (۸)

اپنی ذہنی کیفیت کا حال سجاد ظہیر نے خود ہی اوپر بیان کیا ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ بنّے بھائی نے اِشتراکیت کو بھی اپنے حصول میں شامل کرلیا تھا۔ اِسلیے جب وہ 1935 میں لندن سے تعلیم مکمل کر کے واپس ہندوستان آئے تو آتے ہی وہ ترقی پسند تحریک میں مصروف ہوگئے۔ وزیر منزل میں رہنے والے لوگ کمیونزم کو کوئی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اِس سے سر وزیر حسن کو بہت تشویش ہوئی۔ اُنہوں نے بنّے بھائی پر گرانقدر دولت خرچ کر کے اُنہیں بیرسٹری کی تعلیم دلوائی تھی اِس لیے اُن کا تقاضا تھا کہ وہ اُن کے ساتھ مل کر الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کریں اور خاندان کی جاہ وحشمت میں اِضافہ کریں۔ ویسے بھی اُن کے سب بھائی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بہت اعزازی عہدوں پر فائز تھے۔ بہنوں کی شادیاں بھی نامور گھرانوں میں ہوئی تھیں۔ تمام رِشتے داروں میں چاہے وہ

ددھیال کے تھے یا ننھیال کے خوشحالی ہی خوشحالی تھی۔ گھر والوں کی ضد پر بنّے بھائی نے کچھ عرصے کے لیے وکالت کا پیشہ بھی اختیار کرلیا اور کالا کوٹ پہن کر کورٹ میں حاضری بھی دی۔ لیکن سیاسی سطح پر انڈین نیشنل کانگریس کے رُکن بھی بن گئے۔ کورٹ اور وکالت کے ہتھکنڈے اُن کی سمجھ میں کہاں آنے والے تھے۔ اُنھیں تو ہندوستان کی چالیس کروڑ عوام کی آزادی کی دُھن لگی ہوئی تھی۔ اس لیے جلد ہی وکالت سے کنارہ کشی کرلی اور غربت اور لاچاری میں زندگی گزارنے کو ہی مناسب سمجھا۔ گھر والوں کو اس پر فکر ہونے لگی۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ اگر سجاد ظہیر کی شادی کردی جائے تو شاید وہ راہِ راست پر آجائیں۔ بنّے بھائی جو آزادی کے دلدادہ تھے وہ شادی کے بندھن میں کہاں بندھنے والے تھے۔ لیکن والدین کی ضد کے آگے اُن کی ایک نہ چلی۔ بہرحال وہ اِس شرط پر شادی کے لیے راضی ہوئے کہ لڑکی پڑھی لکھی ہونی چاہیے۔ لہٰذا ایسی ہی لڑکی تلاش کرنے کے لیے لیڈی وزیر حسن اور دوسرے رشتے دار نکل پڑے۔ اُن دنوں مسلمان گھروں میں پڑھی لکھی لڑکیوں کی بہت قلت تھی اور جہاں کوئی پڑھی لکھی لڑکی تھی بھی تو اُن کے والدین سجاد ظہیر سے اُس کی شادی کے لیے راضی نہ ہوتے تھے کیونکہ اپنی سیاست کے سلسلے میں انہیں اکثر جیل جانا پڑتا تھا جسے لوگ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔

اس سلسلے میں اجمیر سے خان بہادر رضا حسین کی بیٹی رضیہ دِلشاد پر نظر پڑی جسے لیڈی وزیر حسن نے منظور کرلیا۔ رضیہ دِلشاد اور بنّے بھائی کی شادی کا ذکر قرۃ العین حیدر نے کچھ ایسے کیا ہے:

> ''ہماری والدہ کے ایک مُنہ بولے بھائی تھے خان بہادر رضا حسین۔ یہ تھے تو بنارس کے لیکن مدتوں سے اجمیر میں رہتے تھے اور اجمیر اِسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے۔ اس زمانے میں لوگ رشتے صرف بناتے نہیں تھے اُنھیں نبھاتے بھی تھے۔ مجھے یاد ہے رضا ماموں میرے لیے میری آٹھویں سالگرہ پر ایک انگریزی کشیدے کا سیٹ لائے تھے۔ اِن کی بڑی لڑکی رضیہ دِلشاد تھیں جو اس وقت بی-اے کر رہی تھیں۔ میری والدہ سے ان کے بارے میں کھوج خبر کے لیے لیڈی وزیر حسن خود لڑکی کو دیکھنے اجمیر گئیں۔ وہ خواجہ غریب نواز کی درگاہ کی زیارت بھی کرنا چاہتی تھیں اور رضیہ آپا کا مزاج بھی بھانپ لینا چاہتی تھیں۔ میری والدہ نے رضا ماموں کو خط لکھا اور لیڈی

وزیر حسن کا اُنھی کے یہاں ٹھہرانے کا انتظام کیا۔ بہر حال رضیہ آپا کی شادی
بنّے بھائی سے طے ہوگئی۔'' (۹)

10 دسمبر 1938 کو سجاد ظہیر کی شادی رضیہ دلشاد بیگم سید رضا حسین کی بڑی صاحبزادی سے عمل میں آئی۔ سب کو اُمید تھی کہ رضیہ بنّے بھائی کو سیاست سے ہٹا کر پدری پیشے کی طرف راغب کرلیں گی لیکن ہوا بالکل اِس کے برعکس۔ رضیہ اپنی تمام تربیت جو بچپن سے شادی تک اُن کی زندگی کا اہم حصّہ تھی اس کو ترک کر کے بنّے بھائی کے رنگ میں رنگ گئیں اور اُن کی تمام سیاسی اور ادبی تحریکوں سے جُڑی رہیں۔ رضیہ تعلیم یافتہ تھیں اور پڑھنے لکھنے کی شوقین بھی تھیں۔ اِس شادی سے وہ بے حد خوش تھیں۔ جب بارات اجمیر گئی تو ایک اچھا خاصا سیاسی میلہ بن گئی تھی۔ اودھ کی اور اُن گھرانوں کی تمام رسمیں منائی گئیں۔

رضیہ سجاد ظہیر کے متعلق عبدالرّؤف ملک جو عبداللہ ملک کے چھوٹے بھائی ہیں اور جن سے بنّے بھائی کا بہت قریبی واسطہ تھا' نے بہت لمبی تفصیل لکھی ہے۔ جب میاں افتخار الدین وفات پا گئے تو بنّے بھائی نے تعزیت کے لیے اپنی بیوی رضیہ کو پاکستان بھیجا۔ اُن کے ساتھ اُن کی سب سے چھوٹی بیٹی نور ظہیر بھی تھیں۔ اُس وقت نور کی عمر کوئی آٹھ سال کی تھی۔ وہ سنہ 59-1958 کا زمانہ تھا۔ خود سجاد ظہیر نہیں جا سکے کیونکہ حکومت پاکستان نے اُنھیں ویزا (visa) نہیں دیا۔ رضیہ نے ایک ناول 'الجدید' کے نام سے شائع کرنے کے لیے عبدالرؤف کے پاس بھیجا کہ اِسے شائع کروادیں۔ جب ناول کا مسودہ پریس میں گیا تو منیجر نے چھاپنے سے انکار کردیا کیونکہ مصنف کا نام رضیہ سجاد ظہیر لکھا تھا۔ حکومت کے خوف سے منیجر کمیونسٹوں کی کوئی بھی تحریر چھاپنے سے ڈرتا تھا۔ لہٰذا عبدالرؤف نے ایک فرضی خاتون رابعہ سید کا نام لکھ کر چھپوادیا۔ بعد میں رضیہ کے اِنتقال پر ہندوستان ٹیلی ویژن اور دُوردرشن سے ایک تعزیتی پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوا اور اس ناول کا خصوصی طور پر ذکر ہوا۔

اگر چہ سجاد ظہیر اور رضیہ دِلشاد دونوں بلند پایہ کے ادیب تھے اور اچھے خاندان کے چشم و چراغ بھی تھے پھر بھی دونوں کی شخصیتوں میں بہت تضاد تھا۔ اُن کی سب سے چھوٹی بیٹی نور ظہیر گپتا نے اپنی یاداشتوں کو اِکٹھا کر کے اپنی امّی اور ابا کے بہت خوبصورت خاکے اپنی کتاب 'میرے حصّے کی روشنائی' میں درج کیے ہیں۔ وہ لکھتی ہیں کی امّی ابا ایک دوسرے سے بالکل الگ تھے۔ امّی کو غصہ

بہت جلدی آجاتا تھا اور ابا کے یہاں غصہ اور نفرت دونوں ندارد تھے۔ چاہے دونوں ادیب تھے اور اِس لیے کاغذوں سے دونوں کا نزدیکی کا واسطہ رہتا تھا لیکن اِس معاملے میں بھی دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ تھے۔ اِسی سلسلے میں وہ لکھتی ہیں کہ ابا دستاویز سنبھالنے میں ماہر تھے اور اپنی چھوٹی سی ڈائری میں کاغذوں کا اتا پتا درج کرتے رہتے تھے۔ ہزاروں کاغذوں کے ڈھیر میں سے وہ کھوئے ہوئے دستاویز کا پتہ لگا لیتے جیسے دور تک پھیلے کیچڑ میں کوئی بنگالی مچھوارہ دبے ہوئے کھوئے کو تلاش کرلیتا ہے۔ اِس کے برعکس رضیہ کاغذ پھینکتی نہیں تھی بلکہ پھاڑ دیتی تھیں۔ لکھتی ہیں کہ ایک بار تو لفافے کے ساتھ تین سو سوکے نوٹ بھی پُرزہ پُرزہ ہو گئے۔ رضیہ کو کوئی تین مہینے میں میزوں کی صفائی کا خیال آتا تو کاغذوں کی حفاظت کے بارے بنے بھائی ہمیشہ خوفزدہ ہو جاتے۔ نور ظہیر گیتا لکھتی ہیں:

''ابا اِن کی صفائی کی دورے سے خوف کھاتے۔ دو تین بار ضروری دستاویز کھونے کے بعد اُنہوں نے فیصلہ کیا۔ امّی کے صفائی کے دورے کی بھنک ملتے ہی وہ اپنے سارے Appointment کینسل کرکے اپنے لکھنے پڑھنے کے کونے میں جم جاتے۔ امّی آتیں، فائلیں کھِسکاتیں، ایک آدھ کاغذ اُٹھاتیں ''یہاں بھی صفائی ہو جاتی تو اچھا ہوتا'' یا سُنتے ہو؟ یہ سب کاغذ کام کے ہیں کیا؟ جیسے ٹوہ لینے والے فقرے ابا کی طرف اُچھالتیں۔ ابا بس ''ہوں'' میں جواب دیتے۔ کہنے کو وہ پڑھ رہے ہوتے پر اُن کی پینی نظر امّی پر ہوتی اور جہاں اُن کی انگلیاں فائلیں کھولنے کو ہوتیں کہ وہ ٹوکتے۔ ''ارے ارے یہ سب اگلے سیمینار کی کاغذات ہیں''۔ یا ''ارے انہیں ابھی نہ چھونا ایک آرٹیکل میں اِن کی ضرورت ہے'' آخر میں امی بڑبڑاتی ہوئی ''اس گھر میں تو دیوالی کی سالانہ صفائی بھی نہیں ہوتی ہتھیار ڈال دیتیں۔'' (۱۰)

نور ظہیر نے رضیہ اور سجاد ظہیر کی زندگی میں تضاد کا ذکر تو ضرور کیا ہے۔ لیکن اِس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں میں بے پناہ محبت تھی۔ سجاد ظہیر نے جو لکھنؤ جیل سے رضیہ کے نام خطوط لکھے ہیں اُن میں اِس محبت کو بار بار گردانا ہے۔ جان، میری جان، میری پیاری، جان سے عزیز وغیرہ

،ایسے القاب جگہ جگہ استعمال کیے ہیں۔ جوش ملیح آبادی جن کا تعلق اس گھر سے بہت گہرا تھا لکھتے ہیں کہ صورتوں اور سیرتوں دونوں کے لحاظ سے یہ دونوں میاں بیوی بلا کے طباع ،طرار اور بڑی نوک پلک کے ادیب تھے اور پھر اُن میں وہ محبت وخلوص کی خوشبو تھی جواب ایک جنس نایاب ہو چکی ہے۔

سجاد ظہیر اپنے بچپن سے ہی مردم شناس اور حالات شناس طبیعت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے گھرانے ،خاندان اور اپنے لوگوں کو نہایت قریب سے دیکھنے کی کوشش کی اور ان کے متعلق جو محسوس کیا اسے بلا کم وبیش تحریر کر دیا۔ اپنے والد سید وزیر حسن کے کردار کا جائزہ وہ ذیل کے الفاظ میں لیتے ہیں:

> ''جب نان کو اپریشن اور خلافت تحریک شروع ہوئی تو بابا سیاست سے علیحدہ ہو گئے۔ وہ اس تحریک سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن اس کے لیے جو قربانیاں درکار تھی یعنی وکالت چھوڑ دینا (بعد کو وہ اودھ کے جوڈیشیل کمشنر اور چیف کورٹ جج ہو گئے) اس کے لیے وہ تیار نہیں تھے۔ گھر کا خرچ ،کھانا پینا ،بچوں کی تعلیم ،کافی اونچی سطح کی امیرانہ زندگی ،ان سب کا دارومدار ان کی روزانہ کی محنت پر تھا۔ وہ بہت محنت کرتے اور بہت روپیہ کماتے تھے۔ لیکن جتنا کماتے تھے اس سے زیادہ خرچ کرتے تھے۔ پھر دو باتیں اور بھی تھی گاندھیائی نظریہ کے مطابق سادہ زندگی ،کھدر پوشی وغیرہ سے سخت چڑ تھی۔ دوسرا یہ کہ اس تحریک میں جو مذہبی رنگ تھا' خاص طور پر اس کا ظاہری پہلو' اس سے وہ قطعی ہم آہنگ نہیں تھے۔ وہ عملی طور پر epicurean تھے۔ اچھے کپڑے' لذیذ کھانے پینے ،نفیس ماحول، دوستوں اور احباب کے ساتھ خوش باشی ،موسیقی اور خوبصورت عورتوں کی محبت ، یہ سب باتیں انھیں پسند تھیں۔ مذہبی معاملات میں رواداری اور اقلیت پسندی ان کا شیوہ تھا۔ بہت اچھے قانون داں ہونے کی وجہ سے ان کی باتیں بڑی منطقی ہوتی تھیں۔ سامراج اور خلافت کا وہ ہمیشہ مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ ان باتوں کو دقیانوسیت اور قدامت پرستی معمول کرتے

تھے۔ان باتوں کی وجہ سے ہمارے گھر کی کیفیت عجیب متضاد سی تھی۔ایک طرف تو آزادی کی تحریک سے گہری ہمدردی تھی۔نان کواپریشن کی تحریک کے لیڈروں میں سے کئی بابا کے ذاتی دوست اور ملاقاتی تھے ہمارے گھر میں ان کا آنا جانا جاری رہتا تھا۔ بابا چھپا کر ان کو چندہ بھی دیتے تھے۔ دوسری طرف جج ہونے کے بعد سرکاری نوکر بھی ہو گئے تھے۔گورنمنٹ ہاؤس کی پارٹیوں میں جانا اور انگریزی سرکار کے تمام نمائشی کاموں میں دکھاوے کی شرکت بھی کرتے تھے تھوڑے دن بعد سرکار سے ان کو خطاب بھی مل گیا۔''(۱۱)

اگرچہ بنّے بھائی کے دادا اور والد لکھنؤ میں مقیم رہے لیکن ان کے گھر کا ماحول دیہاتی ہی تھا۔ والد سید وزیر حسن کے خاندان کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں زیادہ تر لوگ پڑھے لکھے تھے۔ بنّے بھائی کے دادا اپنے وقت کے علاقے کے تحصلیدار تھے۔لیکن ان تمام اوصاف کے باوجود ان کے گھر میں گاؤں کی زبان ہی بولی جاتی تھی۔باہر کے لوگوں سے خالص اردو زبان میں گفتگو کرتے تھے لیکن بنّے بھائی کی ماں ہمیشہ اودھی زبان میں ہی بات کیا کرتی تھیں۔سجاد ظہیر نے خود ان حالات کا ذکر ایسے کیا ہے:

''گوکہ میری پیدائش اور پرورش اس صدی کی پہلی دہائی میں لکھنؤ میں ہوئی 'گولہ گنج'، منشی اطہر علی کی کوٹھی میں جہاں میرے والد سید وزیر حسن رہتے تھے اور جہاں ان کی وکالت کی دکان بھی تھی، لیکن میرے گھر کا ماحول دیہاتی تھا۔میرے باپ جونپور ضلع کے چھوٹے زمیندار خاندان کے دیہاتی سادات تھے۔ یہ ایک ایسا مسلمان خاندان تھا جس میں لکھنے پڑھنے کا چرچا تھا۔میرے دادا تحصیلدار تھے اور انہوں نے میرے والد کو بڑی مشکلوں سے علی گڑھ سے بی۔اے اور الہ آباد سے ایل۔ایل۔بی پاس کرا کے وکیل بنایا۔ پہلے انہوں نے جونپور اور پھر پرتاپ گڑھ میں وکالت شروع کی، پھر لکھنؤ آئے۔میرے پیدا ہونے تک (میں سات

بھائی بہنوں میں چھٹا تھا) وہ کافی خوشحال ہو چکے تھے۔ لکھنؤ کے چوٹی کے وکیلوں میں گنے جاتے تھے اور کئی ہزاروں کی آمدنی تھی لیکن رات کو جب ہم سب بھائی بہن اپنے والدین کے ساتھ کھانے پر بیٹھتے تو بابا اپنے ابتدائی وکالت کے دنوں کی مصیبتوں کا تذکرہ کرتے۔ کبھی کبھی دو روپے فیس میں صبح سویرے اُٹھ کر ایک لحاف اوڑھ کر انہیں دس دس میل جانا پڑتا تاکہ ڈپٹی کلکٹروں اور تحصیلداروں کی عدالت میں وقت پر پہنچیں جب وہ دورہ کرتے ہوتے۔

ہماری ماں (جنہیں ہم 'بوبو' کہتے تھے) ہمیں بتاتیں کہ جب وہ اپنی ساس کے یہاں رہتی تھیں تو کیسی کیسی سختیاں انہیں برداشت کرنی پڑتیں اور ساس کی زبان کے تیر کھا کر بھی چپ رہنا ہوتا۔ بالکل ویسی ہی باتیں میری بیوی اپنی ساس کے متعلق کرتی تھی۔ ہمارے گھر میں دیہات کے نوکر نوکرانیاں ہوتی تھیں۔ اور پھر کئی بے روزگار چچا چچیاں اور اس طرح کے کئی رشتے دار۔ یہ سب جونپور کے دیہاتی سید اور سیدانیاں لکھنؤ والوں کی ہمیشہ برائیاں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک لکھنؤ والوں کے حسب ونسب کا کچھ ٹھکانہ نہیں تھا۔ ان کی بات کا کچھ اعتبار نہیں تھا۔ ہم سب لوگ گھر میں آپس میں دیہاتی زبان بولتے تھے۔ باہر والوں سے البتہ معیاری اردو بولنے کی کوشش کرتے۔ لیکن زبان کا فرق نمایاں ہو جاتا۔ لکھنؤ والے ہنس پڑتے تو ہم کو کافی کوفت ہوتی اور ہم ان سے اور بھی بگڑ جاتے اور کہتے یہ لوگ کتنا بنتے ہیں۔ بوبو کی ایک خاص نوکرانی تھی 'گوری'۔ یہ ان کی بہت منہ چڑھی تھی اور ان کے منجملہ کاموں میں ایک کام یہ بھی تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد مردانے میں جا کر دیکھ آیا کرے کہ ہم سب بھائی کیا کر رہے ہیں۔ اور پھر اندر جا کر بوبو سے ہمارے کرتوتوں کی رپورٹ کرتی۔ اس کے سامنے ہمارا سب سے بڑا جرم ہمارا لکھنؤ کے

لڑکوں کے ساتھ کھیلنا تھا۔ گوری زور سے چلا کر بوبو کو کہتی ''بوبو دیکھیے بھیا لکھنؤ کے لونڈن کے ساتھ کھلیت ہن۔'' میری ماں ہم سب کو خاص کر بڑے بھائی کو فوراً اندر طلب کرتیں اور ہم پر ڈانٹ پڑتی۔ اس زمانے میں ہم لکھنؤ کے بیچوں بیچ وزیر گنج کے محلے میں شاہی زمانے کے ایک بڑے پرانے مکان 'خاقان منزل' میں رہتے تھے۔ اس کے بعض حصے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر تھے۔ اور زنانے میں جہاں ہم لوگوں کی بود و باش تھی، امام باڑے کو رہنے کی جگہ بنالیا تھا۔ اُس کے پیچھے ایک شاہ نشین تھی جس میں علم نسب ہوتے ہونگے۔ اس میں اب گودام تھا۔ یعنی کاٹھ کباڑ، ٹوٹی پھوٹی چیزیں، پرانے اخبار اور رسالے، مٹی دھول، گندگی اور تاریکی، گرمیوں کی دوپہر میں جب بوبو سوجاتی تھی تو ہم انکے پاس سے چپکے سے اُٹھ کر کبھی اس شاہ نشین میں، کبھی باہر کے کھنڈر میں، کبھی صحن کی مہندی کی جھاڑیوں کے پیچھے معلوم نہیں کون سے دفینے ڈھونڈا کرتے۔ میرے ساتھی میرے نوکروں کے چھوٹے لڑکے ہوتے۔ یہ سب حرکتیں میری ماں کو پسند نہیں تھیں یعنی گندے کونے کھدروں میں جانا ''کمینوں' کے ساتھ کھیلنا' دوپہر میں آرام کرنے کی بجائے چپکے سے کھسک جانا اور دھوپ ولو میں بے مقصد بھٹکنا۔ لیکن یہی اس زمانے میں ہماری سب سے بڑی خوشیاں تھیں۔ اس زمانے کی کتنی ہی باتیں بھول گئیں لیکن وہ کھنڈر' وہ شاہ نشین' باغیچے کی جھاڑیوں کے پیچھے کانٹوں اور درد کی دنیا کیوں نہیں بھولتی۔'' (۱۲)

سجاد ظہیر نے اپنے گھر کے ماحول' اپنی بچپن کی یادوں اور اپنے خاندان کے بزرگوں کا حال کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ تمام مناظر تصویروں کی صورت میں یکے بعد دیگرے آنکھوں کے سامنے سے ہو کر گزرنے لگتے ہیں۔ یہی ان کی ادبی ہنرمندی کی سند ہے اور یہی ان کی ذاتی شناخت بھی ہے۔

☆☆☆☆☆☆
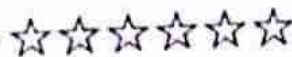
کتابیات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر رپبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر ص
۱)	وہ وقت، وہ لوگ اور میں	سجاد ظہیر	پرگتی شیل وسودھا۔ بھوپال	اکتوبر 2005	228
۲)	مُغنی آتش نفس۔ سجاد ظہیر	سبط حسن	مکتبہ دانیال۔ کراچی	2005	29
۳)	میرے حصے کی روشنائی	نور ظہیر	نئی روشنی پرکاشن۔ نئی دہلی	2005	111
۴)	سجاد ظہیر۔ فکر اور شخصیت	ڈاکٹر سید احمد جعفر	مکتبہ دانیال۔ کراچی	2005	238
۵)	انگارے سے پگھلا نیلم تک	سید مظہر جمیل	اکادمی بازیافت	2005	26
۶)	مُغنی آتش نفس۔ سجاد ظہیر	سبط حسن	مکتبہ دانیال۔ کراچی	2008	17
۷)	سجاد ظہیر۔ فکر اور شخصیت	ڈاکٹر سید احمد جعفر	پرگتی شیل وسودھا۔ بھوپال	اکتوبر 2005	235
۸)	سجاد ظہیر۔ فکر اور شخصیت	ڈاکٹر سید احمد جعفر	پرگتی شیل وسودھا۔ بھوپال	اکتوبر 2005	205
۹)	میرے حصے کی روشنائی	نور ظہیر	نئی روشنی پرکاشن۔ نئی دہلی	2005	113
۱۰)	میرے حصے کی روشنائی	نور ظہیر	نئی روشنی پرکاشن۔ نئی	2005	06
۱۱)	وہ وقت۔ وہ لوگ اور میں	سجاد ظہیر	پرگتی شیل وسودھا۔ بھوپال	اکتوبر 2005	234
۱۲)	وہ وقت۔ وہ لوگ اور میں	سجاد ظہیر	پرگتی شیل وسودھا۔ بھوپال	اکتوبر 2005	227

☆☆☆

۲۔ شخصیت اور حب الوطنی

کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جس خاندان سے سجاد ظہیر کا تعلق رہا ہے اور جس ماحول میں وہ پلے بڑے ہیں اُس لحاظ سے تو اُنہیں شاعر ہونا چاہیے تھا لیکن اُنہوں نے بہت کچھ اِس کے برعکس کیا جو خاندانی روایت کے مطابق نہیں تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے سب سے پہلے افسانوں کا مجموعہ 'انگارے' اور ایک ناولٹ 'لندن کی ایک رات' لکھا۔ باقی جو کچھ بھی لکھا اِن کے بعد لکھا۔ ظاہر ہے کہ اُن کی زندگی کے کچھ ایسے حالات تھے جو اُن پر اثر انداز ہوئے اور جنہوں نے ایک بیرسٹر کو رائٹر اور بنے بھائی کو ایک روایتی شاعر کے بجائے فکشن کار اور ناول نگار بنا دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اُس زمانے میں عالمی سطح پر بڑے پیمانے پر تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور جگہ جگہ سرمایہ داری اور رجعت پسندی کے خلاف تحریکیں چل رہی تھی جن کے زیر اثر بنے بھائی بھی اِشتراکیت کی طرف راغب ہو گئے۔ لیکن اِس کے علاوہ بھی کئی وجوہات تھیں جن کا تعلق گھریلو ماحول سے تھا۔ لہٰذا اس حوالے سے بھی سجاد ظہیر کے نقطۂ نظر کو جاننا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ہماری نگاہیں خود سجاد ظہیر کی تحریروں کی طرف جاتی ہیں جن میں اُنہوں نے اپنے خاندان اور گھریلو ماحول کا حوالہ دیا ہے اور ان حالات اور کرداروں کا ذکر بھی کیا ہے جنہوں نے اُنہیں بے حد متاثر کیا ہے۔ بال گنگا دھر تلک کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ ان کے بارے میں اپنے تاثرات سجاد ظہیر نے خود کافی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ دوسرا کردار جس نے بنے بھائی کے دل پر اپنی شخصیت کی گہری چھاپ چھوڑی تھی وہ مسز سروجنی نائیڈو تھیں۔ اس شخصیت سے ان کی ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب وہ لکھنؤ کے قیصر باغ میں آئی تھی جہاں کانگریس اور مسلم لیگ کا

متحدہ سیشن ہوا تھا۔ تب بنے بھائی نے مسز نائیڈو کو پہلی بار دیکھا تھا اور اس سے باتیں بھی کی تھیں۔ سروجنی نائیڈو کی تقریر سن کر تو وہ اس کے دلداہ ہو گئے تھے۔ بنے بھائی کے والد سروجنی نائیڈو کو جانتے تھے اس لیے اُسے اپنے گھر چائے پر مدعو کیا اور اپنی بیگم سے تیاری کرنے کی تنبیہ بھی کی۔ سروزیر حسن کے گھر میں مہمانوں کا آنا جانا روز مرہ کا معمول تھا۔ ہر مہمان کی آمد پر بہت بڑے طریقے سے اُس کی مہمان نوازی ہوتی تھی۔ چاندی کے برتن اور اعلیٰ درجے کے چینی کے برتن نکالے جاتے تھے۔ گھر کی عورتیں خاص قسم کے کپڑے پہنتی تھیں۔ لڑکے شیروانی اور ٹوپی پہنتے تھے۔ سجاد ظہیر کہتے ہیں کہ انہیں دعوت ختم ہونے کا شدت سے انتظار رہتا تھا تاکہ کسی طرح وہ نمائش اور بناوٹی فضا ختم ہو۔ سروجنی نائیڈو کی دعوت کے متعلق سجاد ظہیر یوں رقم طراز ہیں:

''لیکن مسز نائیڈو کی دعوت کے دن ان تمام رسموں کے برت جانے کے باوجود کیفیت ہی بالکل دوسری تھی۔ اس عورت میں ایک غیر معمولی حسن تو تھا ہی، بنگال کا جادو اور دکن کا رس، کنول نین، ان کی ہنسی ایسی بے ساختہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ سارا جسم ہنس رہا ہے۔ باتوں میں شگفتگی اور تازگی تھی جیسے چاروں طرف پھول کھل جائیں اور انکی مہک سے روح تروتازہ ہو جائے۔ ہمارے گھر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے چاروں طرف مسکرا کر کچھ اس طرح دیکھا اور ہماری ماں سے گلے مل کر کچھ ایسی گھل مل گئیں کہ اس کے باوجود کہ وہ خود اتنی پڑھی لکھی اتنی بڑی شاعرہ تھیں اور ہماری ماں دیہات کی ایک بی بی جو سوائے قرآن شریف اور تھوڑی بہت اردو کے اور کچھ بھی نہیں پڑھی تھیں، ہم سب سمجھے کہ وہ تو اصل ہماری خالہ جان ہیں۔''(۱)

بنے بھائی مسز نائیڈو پر جس طرح فدا ہو گئے تھے یہ قدرتی امر تھا کہ اس کی شخصیت بھی ان پر اثر انداز ہوتی۔ لیکن جس تحریک نے ان پر سب سے زیادہ اثر ڈالا وہ نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریک تھی۔ ان دنوں کانگریسی لیڈر اس تحریک کے حق میں سڑکوں پر جگہ جگہ تقریریں کرتے تھے اور طالبِ علموں کو اپنے تعلیمی ادارے چھوڑنے کی ترغیب دیتے تھے۔ انہیں انگریزی تعلیم کا بائیکاٹ کرنے اور سوراج کی لڑائی میں شامل ہونے کا مشورہ دیتے تھے۔ بنے بھائی کئی کئی گھنٹے سیاسی رہنماؤں کی ایسی

تقریروں کو سُنتے تھے۔اس زمانے میں غیر ملکی اشیاء کا انبار لگا کر اسے سُپر دِ خاک کیا جاتا تھا جو نظارے بنّے بھائی نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا تھا جب وہ صرف پندرہ برس کے تھے اور اپنی زندگی کے ابتدائی دور سے گزر رہے تھے۔اس عمر میں نو جوانوں پر انقلابی تحریکوں کا زوردار اثر ہوتا ہے جو بنّے بھائی پر بھی ہوا۔لہٰذا اس تاثر کا ذکر کرتے ہوئے وہ 'طویل اور مسلسل سفر کی کہانی' میں لکھتے ہیں:

''نان کوا پریشن اور خلافت تحریک جب شروع ہوئی تو میں میٹرک میں پڑھتا تھا۔میری عمر کوئی پندرہ سال ہوگی۔اپنے خاندان میں سب سے زیادہ مجھ پر اس تحریک کا اثر پڑا۔معلوم نہیں کیوں؟ ہم جوبلی ہائی اسکول میں پڑھتے تھے جو شہر کے اندر تھا اور ہمارا نیا گھر وزیر منزل سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا۔روز صبح تا شام ہم تانگے یا فٹن پر سوار ہو کر اسکول جاتے۔آتے جاتے راستے میں موتی محل کا پُل پڑتا تھا۔شہر کے تین مشہور کانگریسی لیڈر پنڈت ہرکرن ناتھ مشرا، چودھری خلیل الزماں اور ایک مدراسی رنگا آئیر سارے وقت اس پل کے نیچے کے ایک چبوترے پر کیتنگ کالج کے نزدیک (اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی تھی) کھڑے تقریر کرتے رہتے۔اور کالج کے لڑکوں کو کہتے کہ کالج چھوڑ کر نکل آئیں۔انگریزی تعلیم کا بائیکاٹ کریں،سوراج کی لڑائی میں کود پڑیں وغیرہ۔میں اپنی گاڑی رکوا کر ان جلسوں میں کھڑے ہو کر گھنٹے دو گھنٹے ان تقریروں کو سُنتا۔اس کے علاوہ ہر طرف غیر ملکی کپڑوں کے انبار لگا کر ان کو آگ لگا دی جاتی۔الہ آباد کے سید حسین مرحوم کی ادار یت میں Independence اخبار شائع ہوتا تھا جس میں بڑے زوردار مضمون ہوتے تھے۔اسے پڑھتا اس کے بعد جب گاندھی جی اور علی برادران پہلی مرتبہ لکھنؤ آئے تو اسکول کے سب لڑکوں کے ساتھ ہم بھی کلاس چھوڑ کر ان کے درشن کرنے اور ان کی تقریر سُننے چار باغ اسٹیشن کے سامنے میدان میں پہنچ گئے۔''(۲)

اپنے بچپن میں ہی بنّے بھائی کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ مزدور طبقہ کا وجود علیحدہ حیثیت رکھتا

ہے اور انصاف کا طالب ہے۔ مزدور لفظ کو ہی کسی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اس لیے جب بنّے بھائی کی توجہ مزدوروں کی طرف ہوئی تو انہیں شدت سے اس طبقے کی مشکلات کا احساس ہوا۔ پنڈت ہری کرن مشرا اور چودھری خلیق الزماں اس زمانے میں لکھنؤ کے مشہور کانگریسی لیڈر تھے لیکن وہ دونوں مزدور یونین اور مزدوروں کے مسائل سے تقریباً بے بہرہ تھے۔ اس لیے جب وہاں کے ریلوے ورکشاپ کے مزدوروں نے ہڑتال کردی اور جب وہ چودھری صاحب کے پاس رہنمائی کے لیے آئے تو چودھری صاحب انہیں کوئی معقول صلاح نہ دے سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ ہڑتال کرنے کے بعد مزدور کام پر واپس لوٹ گئے اور ہڑتال فیل ہوگئی۔

ہم سب کی زندگیوں کا ایک مشترکہ تجربہ یہ بھی رہا ہے کہ ہمیں بچپن اور نوجوانی کے حالات تو اس طرح یاد رہتے ہیں جیسے کل کی ہی بات ہو لیکن بڑی عمر میں چند سال پہلے کے بلکہ چند ماہ پہلے کے حالات بھی ذہن سے غائب ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ابتدائی عمر کے تجربات کے نقوش لاشعور میں محفوظ ہو جاتے ہیں اور ضرورت کے وقت حافظہ انہیں ذہنی سطح پر لے آتا ہے۔ سجاد ظہیر کو بھی اپنے بچپن کے تجربات بہت اچھی طرح یاد رہے ہونگے کیونکہ اپنی یادوں میں انہوں نے ان تاثرات کا ذکر بخوبی کیا ہے جن کے تحت ان کا رجوع کمیونزم کی طرف مائل ہوا۔ وہ کسی جذباتی امر سے مجبور ہو کر کمیونسٹ نہیں بنے بلکہ جس چیز نے ان کی کمیونسٹ بننے میں سب سے زیادہ مدد کی وہ ہندوستانی عوام تھی۔ ان میں مزدور، کسان اور دانشور لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے اپنی زندگی کو آزاد، خوشحال اور مہذب بنانے کی جدوجہد کا علَم بلند کیا تھا۔ سجاد ظہیر بھی اس جدوجہد کا ایک ناچیز حصہ بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس تنظیم کی بہترین رہنمائی کمیونسٹ پارٹی نے ہی کی تھی جسے وہ اپنے دور کی سب سے زیادہ باشعور جماعت مانتے تھے۔ ان کے مطابق کمیونسٹ پارٹی ہماری قوم کی اعلیٰ ترین تہذیبی روایتوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ بنّے بھائی کا مارکسزم اور کمیونسٹ پارٹی کے متعلق جو نظریہ ہے اس کی وضاحت انہوں نے ذیل میں کی ہے:

> ''سماج کو سمجھنے اور بدلنے اور اس کی نئی اور بہتر زیادہ مُنصفانہ اور زیادہ سائنٹیفک نظریہ نوعِ انسانی کے پاس اس عہد میں اور کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نظریے کو محض کتابوں کو پڑھ کر یا کسی الہامی اور اٹل

پیغام یا قول فعل کے ذریعے سے سکھایا سمجھایا نہیں جا سکتا۔ مارکسزم درحقیقت فطرت اور سماج میں تبدیلی، زوال اور ارتقاء کے قوانین کو سمجھنے اور اس علم کے ذریعے اور وسیلے سے اپنے فہم اور شعور کو جلا دے کر، ایسے عمل کا نام ہے جن کا تقاضہ سماجی زندگی کی ہیئت ایک خاص موقع پر کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا علم اور ایسا عمل انفرادی اور اجتماعی سعی اور تجربے کے طور پر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر ایک طرف وہ نوعِ انسانی کے تمام سابق مبلغ علم پر عبور حاصل کرنے کا متقاضی ہے تو دوسری طرف وہ علم وعمل میں جمود کا دشمن ہے۔ بلکہ نئے علوم اور مادی وسائل وآلاتِ زندگی میں مسلسل تجدید اور ثمرباری کرتا ہے۔" (۳)

سجاد ظہیر نے کمیونزم کی جو خوبیاں بیان کی ہیں وہ انہوں نے گہرے تجربے سے حاصل کی تھیں۔ کالج کے دنوں سے ہی ان پر اس تنظیم کا رنگ جمنا شروع ہو گیا تھا جو آہستہ آہستہ گہرا ہوتا چلا گیا اور آخر بنے بھائی اس تنظیم کا ایک اہم جزو بن گئے۔ ہندو مسلمانوں کے فرقہ وارانہ فسادات، مزدوروں اور کسانوں کی بے مائگی، محرومی اور لاچاری، عوام پر بے رحمانہ ظلم اور تشدد ایسے تمام حادثات نے بنے بھائی کو سوچ میں ڈال دیا کہ ان تمام مسائل کا عملی حل کیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کے کمیونزم ہی ان بیماریوں کا واحد علاج ہے۔ انہیں کمیونزم کی راہ اختیار کرنے میں کافی وقت لگا۔ وہ اچانک یا کسی فوری جذبے کے تحت کمیونسٹ نہیں بنے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں فرقہ پرستی سے سخت اذیت پہنچتی تھی۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"میں دفعتاً یا یکبارگی کسی جذباتی شورش کے ماتحت کمیونسٹ نہیں بنا۔ جب میں اسکول کی تعلیم ختم کر کے کالج پہنچا تو تب نان کواپریشن اور خلافت تحریک ختم ہو چکی تھی۔ فرقہ وارانہ تناؤ، ہندو مسلم جھگڑے ہر طرف پھیل رہے تھے۔ شدھی اور سنگھٹن کی تحریک ایک طرف اور مسلمانوں میں تنظیم کی تحریک دوسری طرف اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ انگریزی حکومت اور اس کے ٹوڈی بہت خوش تھے۔ تمام محب وطن مغموم اور مضمحل۔ ہندو مسلم سمجھوتے کی بار بار کوشش ہوتی لیکن دونوں طرف کے فرقہ پرست عناصر ہر اتحادی کانفرنس کو ناکامیاب کرا دینے میں

کامیاب ہوجاتے۔ایک بار لکھنؤ میں ہندو مسلم فساد ہوگیا۔میرے کالج کے تین عزیز دوست ہندو تھے۔ مجھے فساد کے دنوں میں اتنی روحانی اذیت ہوئی کے میں بیمار پڑ گیا۔

اُس زمانے میں یو پی ، بنگال اور پنجاب کے نوجوانوں میں ایک نئی انقلابی لہر اُٹھی۔کلکتہ میں جتن داس نے ایک انگریز کو گولی سے مار دیا اور جب اُسے پھانسی کی سزا ہوئی تو اس نے خندہ پیشانی سے اپنے بیان میں کہا کہ''میری دعا ہے کہ میرے خون کا ایک ایک قطرہ میرے ہم وطنوں کے دلوں میں آزادی کا بیج بن کر اُگے۔''اس عظیم قربانی کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔اسی طرح ہمارے اپنے ہی صوبے میں لکھنؤ کے پاس رام پرساد بسمل اور اشفاق اللہ وغیرہ کے گروہ نے ٹرین پر حملہ کیا اور سرکاری خزانہ لوٹ لیا۔بعد میں وہ لوگ گرفتار ہوئے اور ان کو پھانسی ہوئی۔کانگریس لیڈروں کے Official بیان ،ان نوجوان انقلابیوں کی 'تشدد آمیز' کاروائیوں کی مزمت کرتے ہوئے نکلتے تھے۔لیکن میں اور میری طرح کے تمام ہندوستانیوں اور خود بہت سے کانگریسیوں کے دل میں ان کے لیے عزت کا جذبہ تھا۔اور ہم سب اس پر فخر محسوس کرتے تھے کہ کم از کم چند ہندوستانی نوجوان ایسے ہیں جو سامراجی ظلم اور تشدد سے دبتے نہیں اور بیرونی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لیے جان تک کی بازی لگانے سے دروغ نہیں کرتے۔ اب میں رفتہ رفتہ اس خیال کا قائل ہوگیا کہ بغیر انقلاب کے ہندوستان کو آزادی نہیں مل سکتی۔کچھ مُبہم طریقے سے یہ خیال بھی سامنے آنے لگا کہ ہمیں بھی اپنے ملک میں روس کی طرح مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم کرنی۔''(۴)

طالب علمی کے زمانے سے ہی بنّے بھائی کو انقلابی مصنفین کی تخلیقات میں خصوصی دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔وہ اپنے کورس کی کتابیں کم اور دوسرے کارناموں کی کتابیں زیادہ پڑھتے تھے۔ان کے پسندیدہ مصنف برٹرنڈ رسل ، اناطول فرانس ، رومن رولن ، بالزک وغیرہ تھے۔اسی زمانے میں

بنّے بھائی نے ایسے کئی لوگوں کے ناول پڑھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک کتاب جس نے ان پر سب سے زیادہ اثر کیا وہ برٹرینڈ رسل کا ناول Road to Freedom تھا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے بنّے بھائی کو کمیونزم، سوشلزم، انارکزم وغیرہ کے بارے میں خاطر خواہ اور ٹھوس معلومات حاصل ہوئیں۔ یہ کتابیں پڑھ کے بنّے بھائی رسل کے شیدائی ہو گئے اور ان کی دوسری کتابیں، ان کی تحریریں اور ان کے مضامین سب پڑھ ڈالے۔ رسل کی دوسری کتاب جو انہیں بے حد پسند آئی وہ تھی Why I am not Christian۔ رسل اور اناطول کی کتابیں انہیں خاص طور پر کیوں اچھی لگیں ان کے متعلق ان کے اپنے الفاظ میں:

''رسل کی کتابیں اور اناطول فرانس کے ناولوں میں مذہبی عقیدہ پرستی خاص طور پر عیسائی مذہبی عقائد پر عقل پسندی اور سائنس کی بناء پر سخت فلسفیانہ اور اخلاقی اعتراضات کیے گئے۔ اس کا میرے اوپر بہت گہرا اثر ہوا۔ رسل اور اناطول کے بیشتر اعتراضات، ہندوستانی مذہبی عقائد پر بھی صادق آتے تھے۔ ادھر ہمارے ملک میں مذہب کا جو عملی مظاہرہ ہو رہا تھا وہ پسندیدہ تو نہیں تھا۔ مذہب کے نام لیوا ایک طرف انسانیت کشی کے لیے تو دوسری طرف ظلم اور استبداد اور بیرونی سامراجیہ کی سپر کی طرح اُسے استعمال کر رہے تھے۔ ان سب باتوں کا بھی میرے دل و دماغ پر اثر پڑا اور یہ خیال حاوی ہونے لگا کہ مذہب اپنی موجودہ شکل میں نوعِ انسانی کے لیے رحمت نہیں بلکہ لعنت ہے ایسے عقیدے جو دلوں میں گداز، نرمی، محبت اور مروت پیدا کرنے کی بجائے انسانوں اور انسانوں کے دمیان نفرت اور دشمنی پیدا کریں، ایسے عقیدے جو انسانوں کو عقل کی روشنی، تجربے، تجدید اور ارتقاء سے دور کریں بلکہ ان کی راہ میں رکاوٹ ڈالیں اور جن کو رجعت پرست، انسانوں پر ظلم اور تعدی کرنے والے اور انہیں غلام بنانے والے، اپنے ادنیٰ اور پست مقاصد کے لیے ہر موقع پر استعمال کر سکیں، کیا ان میں کوئی بنیادی کھوٹ نہیں؟۔'' (۵)

مندرجہ بالا تحریر پڑھنے کے بعد کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ سجاد ظہیر میں شاعری کا جذبہ پوری

طرح رونما نہیں تھا۔ وہ انسانی جذبات کو پوری طرح سمجھنے کے بعد ہی ان کی وضاحت کرتے تھے اور اس وقت ان کا ہر لفظ نغمہ سرا ہوتا تھا اور شاعرانہ تصور سے لپٹا ہوا ہوتا تھا۔ اپنی شخصیت کو انہوں نے مندرجہ بالا تحریر میں اس طور سے واضح کیا ہے کہ اس بارے میں کوئی اور کتاب پڑھنے کی چنداں ضرورت نہیں رہ جاتی۔

سجاد ظہیر کا رجوع فکشن کی طرف ہونے کی ایک وجہ اُن کے گھر کا ماحول بھی تھا۔ اُن کے آبا و اجداد اس گاؤں میں رہائش رکھتے تھے جہاں وہ دیہاتی بولی بولتے تھے اور دیہاتی نوکر اور نوکرانیوں سے اُن کا واسطہ رہتا تھا۔ وہ لکھنؤ میں رہنے والوں کو پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ اُنہیں لگتا تھا کہ لکھنؤ کے طور طریقے صرف بناوٹی طرز کے ہیں۔ جو بے روزگار یا بے سہارا رشتے دار اُن کے گھر رہتے تھے وہ بھی بہت کم پڑھے لکھے تھے۔ یہ بھی جان پڑتا ہے کہ رشتہ داروں کے آپسی تعلقات بھی بہت خوشگوار نہیں تھے۔ سجاد ظہیر خود لکھتے ہیں کہ اُن کی والدہ اپنی ساس کے رویے سے چنداں ناخوش رہتی تھیں، قراۃ العین حیدر جو سجاد ظہیر کے گھرانے سے بہت قریب کا واسطہ رکھتی تھیں کہتی ہیں کہ لیڈی وزیر حسن یعنی سجاد ظہیر کی ماں اگرچہ یوپی کی Legislative کونسل کی ممبر تھیں پھر بھی پوربی (اودھی) زبان ہی بولتی تھیں۔ صاف ظاہر ہے کہ سجاد ظہیر کے خاندانی گھر میں غیر شاعرانہ ماحول تھا اور اسی لیے اُنہیں شاعر بننے کی ترغیب نہ مل سکی۔ اِس ثقیل ماحول نے سجاد ظہیر کو بہت متاثر کیا۔ وہ زیادہ تر نچلے درجے کے لوگوں میں بڑے ہوئے۔ اِسلیے اُن کے ذہن پر ایسے لوگوں کا بہت زیادہ اثر رہا۔ اُن کی تخلیق میں بھی ایسے لوگ ہی اُن کے کردار بنے۔ جب بنگال میں قحط پڑا تو ایک نوجوان لڑکی جس کا نام گوری تھا، بھاگ کر جونپور پہنچی جسے اُنہوں نے اپنے گھر میں نوکرانی کے طور پر رکھ لیا۔ گوری کا کردار اور سجاد ظہیر کی کہانی دُلاری کا کردار بالکل ایک جیسا ہے جو یہ ثابت کرتا ہے کہ گوری اُن کے دل و دماغ پر بچپن سے ہی چھائی ہوئی تھی جو اُن کے افسانے 'دُلاری' میں اُبھر کر آئی۔

ایک اور کردار جس نے سجاد ظہیر کو فکشن کی طرف موڑنے میں بہت اہم رول ادا کیا وہ اُن کے 'جھینگری ماموں' تھے۔ جھینگری ماموں نے سجاد ظہیر کے معصوم ذہن کو بے اِنتہا اثر انداز کیا۔ جھینگری ماموں کی عمر کوئی چالیس برس کی رہی ہوگی۔ دُبلے پتلے تھے، رنگ گندمی، داڑھی منڈواتے تھے اور مونچھیں رکھتے تھے جو اوپر کے ہونٹ پر بکھری رہتی تھیں۔ بہت شوقین مزاج اور رنگین قسم کے

اِنسان تھے۔ سجاد ظہیر لکھتے ہیں کہ جھینگری ماموں کے تین شوق تھے۔ اُردو کے اخبار رسالے اور ناول پڑھنا، شام کو امین آباد میں سیر کو جانا اور عشق کرنا۔ کسی ستیلائن سے اُن کے عشق کے چرچے نوکروں میں عام ہوتے تھے اور یہ امر گھر والوں کے علم میں بھی تھا۔ سجاد ظہیر اُس وقت بہت چھوٹے تھے اِس لیے جب کوئی نوکر یہ کہتا کہ جھینگری ماموں ستیلائن سے پھنسے ہوئے ہیں تو اُس بیچارے کے پلے کچھ نہ پڑتا۔

جھینگری ماموں جیسے بھی تھے، چاہے حُقہ پیتے تھے اور افیون کا بھی اِستعمال کرتے تھے، تاہم سجاد ظہیر کے لیے وہ بہت دلچسپ اِنسان تھے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان کی وہ کون سی خاص خوبی تھی جس کی بنا پر جھینگری ماموں سجاد ظہیر پر اثر انداز ہوئے؟ اِس سلسلے میں ہم سجاد ظہیر کی خود اپنی تحریر پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کونسی وجہ واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔ سجاد ظہیر ایک مضمون میں لکھتے ہیں:-

> ''ایک ہمارے جھینگری ماموں تھے۔ بو بو کے رشتے کے بھائی۔ یہ بھی 'خاقان منزل' کے مردانے کی بے شمار کوٹھریوں میں سے ایک کوٹھری میں رہتے تھے۔ گاؤں سے شہر آئے تھے نوکری کے لیے۔ بابا کبھی کبھی کوشش کر کے انہیں کسی دفتر میں کلرکی دلوا دیتے تھے۔ ان کی تنخواہ کبھی پچیس تیس روپے سے زیادہ نہیں ہوتی تھی لیکن وہ زیادہ تر بے روزگار رہتے تھے۔ کسی نہ کسی بات پر نوکری چھوٹ جاتی تھی۔ کھانا رہنا تو ہمارے یہاں تھا ہی۔ بو بو بھی ان کو خرچ کے لیے کچھ دے دیا کرتی تھیں۔ بالکل نحیف اور دبلے پتلے تھے۔ چالیس سال کے رہے ہونگے۔ گرمیوں میں لکھنؤ کی دو پلی ٹوپی اور انگرکھا پہنتے تھے۔ گندمی رنگ، داڑھی منڈھی، مونچھیں اوپر کے لب پر بے پروائی سے لٹکی ہوتیں۔ وہ ہمارے گھر کے کام کاج جو شریف آدمی کے لائق ہوں کیا کرتے تھے مثلاً بازار سے کپڑے خرید کر لانا، مہینے کے شروع میں منڈی سے جنس ٹھیلے پر لاد کر لانا، اکیس رمضان (حضرت علیؓ کی شہادت کی تاریخ) کے موقع پر مجلسوں کا بندوبست کرنا، باورچی یا نوکر بھاگ جائیں تو نئے آدمی کو ڈھونڈ کر لانا، ہم سب بھائیوں کی عام دیکھ بھال کرنا وغیرہ۔ جھینگری ماموں بڑے شوقین آدمی تھے۔

حقہ تو خیر پیتے تھے۔ انکے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ یہ افیم بھی کھاتے تھے۔ انکے تین شوق تھے، اردو کے اخبار، رسالے اور ناول پڑھنا، شام کو چوک یا امین آباد کی سیر کو جانا اور عشق بازی۔ میں بہت چھوٹی عمر کا تھا اس لیے ان کی زندگی کے بارے میں براہِ راست واقفیت تو نہیں رکھتا تھا لیکن ادھر اُدھر سے لوگ بو بو سے رازدارانہ انداز میں جب آکر باتیں کرتے تو میں ان کا زانو پکڑے اور اپنا سر ان کی گودی میں چھپائے بہت سی باتیں سُنا کرتا۔ کچھ سمجھ میں آتیں اور کچھ نہ آتیں، مثلاً کسی نے جب آکر بوبو سے کہا ''اے بہن سُنتی ہیو، جھنگری میاں تو ستلائن سے پھنسے ہیں'' تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ معاملہ کیا ہے؟ لیکن اتنا ضرور سمجھا کہ کوئی ایسی بات ہے جو بُری بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ ان ستلائین کو میں بھی جانتا تھا۔ یہ تین بچّوں کی ماں تھی۔ ہمارے یہاں جو سائیس تھے ان کی بیوی۔ انکی عمر کوئی تیس برس کی ہوگی۔ گندمی رنگ، چھوٹا قد، بڑی بڑی آنکھیں، بے حد محنتی اور ہنس مکھ۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے یوں سُنا کہ ستیلائن جھنگری ماموں کے ساتھ 'پھنسی' ہے تو میں فوراً دوڑ کر باہر گیا اور ان کو دیکھتا رہا۔ وہ باہر برتن مانجھ رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ ان سے پوچھوں کہ اس بات کے کیا معنی ہیں لیکن اتنا شعور مجھے ہوگیا تھا کہ یہ کوئی بری بات ہے اس لیے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس دن کے بعد سے جھینگری ماموں اور ان کو بات کرتے ہوئے دیکھتا تو دل میں سوچتا کہ شاید اسی کو پھنسنا کہتے ہیں۔ اور میری سمجھ میں نہ آتا کہ اس میں برائی کی کونسی بات ہے؟ اس الزام کے باوجود میں اپنے ماموں اور ان کی محبوبہ کو پسند کرتا رہا۔ بلکہ میری دلچسپی ان میں بڑھ ہی گئی۔ بات یہ تھی کہ اس زمانے میں بڑی عمر کے لوگوں میں ہمارے دوست اور ہمدرد یہی دو تھے۔ جب ہماری عمر آٹھ نو برس کی ہوئی تو ہم کو اردو پڑھنا آگیا تھا۔ جھینگری ماموں کی کوٹھری میں اردو نالوں کا انبار لگا رہتا تھا۔ وہ پلنگ پر لیٹے عینک لگائے انہیں پڑھا کرتے تھے۔ میں چپکے سے ان کے کمرے میں داخل ہوتا اور کوئی نہ

کوئی ناول لے کر جیسے بھی بنتا پڑھنا شروع کر دیتا۔ اُسی زمانے میں مَیں نے ناول پڑھنے شروع کیے۔'' (۶)

جھینگری ماموں اپنی زندگی میں سجاد ظہیر کے لیے ایک تاریخی واقعہ تھے۔ اسی ماموں کی وجہ سے انہیں ناول پڑھنے کا شوق پیدا ہوا جس نے ان کی کایا ہی پلٹ دی۔ وہ عاشق مزاجی کے لیے اپنے ماموں کی تعریف کرتے ہیں اور اس کے ممنون ہیں کہ اُس نے ان کے اندر کے ماحول میں ایسی تبدیلیاں پیدا کیں جن سے ان کے ذہن میں تروتازگی پیدا ہوگئی۔ صرف اس ایک واقعہ نے سجاد ظہیر پر بہت گہرا اثر کیا اور ان کا رجوع آئندہ زندگی میں ادب کی طرف مائل ہوا۔ انہیں احساس ہوا کہ ہمارا موجودہ تعلیمی نظام گھٹیا اور فرسودہ ہے کیونکہ اس نظام کے تحت تعلیم حاصل کرنے میں کتنی ذہنی اور روحانی اذیت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ جھینگری ماموں ایک نعمت بن کر ان کی زندگی میں آئے جس کا احساس انہیں تمام عمر رہا۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''میں کبھی سوچتا ہوں کہ ہمارا نظام تعلیم اور اخلاقی اور مذہبی تربیت کا طریقہ کتنا ناقص اور مجہول ہے کہ معمولی طور پر اس سے کم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کو اگر کچھ سیکھنے کو ملتا بھی ہے تو کتنی ذہنی اور روحانی اذیت کے ساتھ۔ کیا اس عمر میں معصوموں کو اس بری طرح دکھ پہنچانا ضروری ہے؟ چالیس سال سے زیادہ گزر گئے ہیں ابھی تک اس نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ ہم اگر کچھ سیکھ سکتے ہیں اور ہمارے ذہن میں کچھ کشادگی اور روشنی بھی آتی ہے تو اس اذیت اور کوفت کے باوجود۔ شکر ہے کہ مجھے جھینگری ماموں مل گئے تھے اور اندازہ لگانا مشکل ہے کہ میرے اور میری طرح کے دوسرے افراد کے کیریکٹر کو ایسی 'تربیت' سے کتنا نفسیاتی نقصان پہنچا ہوگا۔'' (۷)

جھینگری ماموں سجاد ظہیر کے لیے ایک رومانی کردار تھے جنہیں وہ اپنے لیے ایک ماڈل تصور کرتے تھے۔ دوسری طرف گوری تھی جسے اُنھوں نے 'دُلاری' کا رول دے کر اپنے افسانے کا خاص کردار بنایا تھا۔ ساتھ میں ستیلائن اور جھینگری ماموں کا عشق۔ اِن سب باتوں نے منجملہ سجاد ظہیر پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ نثری ادب کے دِلدادہ بن گئے۔ اس لیے جب اُنہیں مکتب میں داخل کیا گیا وہ

تلملا اُٹھے۔ جس مولوی صاحب کی خدمت حاصل کی گئیں وہ اُنہیں دینیات پڑھاتے تھے۔ سجاد ظہیر کا خیال تھا کہ چونکہ اُن کے ابا باقاعدہ نماز نہیں پڑھتے تھے اس لیے اُن کی ماں نے مولوی صاحب کی ضرورت محسوس کی تا کہ وہ اُسے ایک اچھا انسان بنا سکیں۔ لیکن مولوی صاحب اِس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور جھینگری ماموں ودیگر رومانی اشخاص ہی ان کے ذہن پر چھائے رہے۔ اس طرح سجاد ظہیر بجائے شاعر بننے کے افسانہ نویس اور ناول نگار بن گئے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ سجاد ظہیر سب سے پہلے ایک اچھے ادیب تھے اور بعد میں کچھ اور پھر بھی اُن کی تخلیقات بہت کم ہیں۔ جتنا اُن کو لکھنا چاہیے تھا یا جتنا وہ لکھ سکتے تھے اُتنا اُنہوں نے نہیں لکھا۔ چونکہ وہ ترقی پسند تحریک میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے اِسلیے اُن کا ادبی پہلو اِتنی اہمیت حاصل نہ کر سکا جس کے وہ حقدار تھا۔ لیکن ترقی پسند تحریک نے سجاد ظہیر کا نام جس بلندی تک پہنچایا ادب شاید وہ کام نہ کر سکتا۔ اب یہ عالم ہے کہ ترقی پسند تحریک اور سجاد ظہیر کے نام الگ الگ نہیں لیے جاتے۔

سجاد ظہیر کے اندر ادبی تنظیم کو عمل میں لانے کی بڑی صلاحیت تھی۔ مختلف زبانوں اور گروہوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا بہت مشکل کام تھا لیکن سجاد ظہیر نے اِس کام کو بڑی آسانی سے سرانجام دیا۔ اس بارے سبطِ حسن لکھتے ہیں:

> ''سجاد ظہیر ادب اور سیاست دونوں کے بارے میں سخت غیر جانب دار تھے۔ وہ عمر بھر اپنے مقصد نظر کے لیے رزم آرار ہے۔ اور اس راہ میں انہوں نے بلاشبہ بہت قربانیاں دیں۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود اُنہوں نے اپنے دوستوں اور عزیزوں پر کبھی اپنے نظریات تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بہت روشن دماغ انسان ہونے کے ساتھ ساتھ صحیح معنی میں ذوق اور جمال پسند اِنسان تھے اِس لیے کہ زندگی کے ہر حُسن سے اُنہیں شدید پیار تھا۔ چاہے وہ کسی روپ میں کیوں نہ ہو۔ اور اِسی شدت کے ساتھ وہ لوگوں کی غربت، بدحالی اور ذہن پر پہرے بٹھانے سے نفرت کرتے تھے۔ وہ مشرقی اور مغربی موسیقی کے بڑے دلداہ تھے اور فارسی، اردو اور ہندی شاعری کو بے حد پسند کرتے تھے۔
>
> وہ عمر بھر اِنسانوں اور اِنسانیت کی سربلندی کے لیے بڑے خلوص اور

چاؤ کے ساتھ جدوجہد کرتے رہے اور کسی موقع پر بھی انہوں نے کسی قسم کی تلخی کا شائبہ تک نہیں آنے دیا۔ اردو ادب کی تاریخ میں اُن کا نام ایک ایسی زندگی بخش تحریک کے بانی کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا جس نے ابتداء سے اب تک اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں والی دونسلوں کو جنم دیا۔'' (۸)

مولوی رضی صاحب جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے سجاد ظہیر کا کچھ بھی نہیں بگاڑ پائے۔ مذہب سے اُن کا لگاؤ کبھی نہ بن پایا۔ اُنہیں دور دور تک مذہبی روایتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سجاد ظہیر کی نظروں میں مذہب ایک طرح کا نشہ ہے۔ جس کی لت سماج کو اس لیے لگائی جاتی ہے کہ وہ اپنی حالت کی اصلی وجہ ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرے۔ یہ اُن کا ذاتی عقیدہ بھی تھا لیکن اُنہوں نے زندگی بھر اپنے خیالات کسی پر نہ لادے اور اکیلے ہی اپنی روش پر چلتے رہے۔

سبطِ حسن کا واسطہ سجاد ظہیر سے ترقی پسند تحریک کی وجہ سے قائم ہوا اور بعد میں وہ اُن کے گہرے دوست بن گئے۔ 1935 میں جب اُنہوں نے انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی تو اُس کا منشور تیار کرنے میں سبط حسن نے کافی مدد کی۔ وہ منشور انہوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں میں بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کو بھیجا۔ اُن کا مقصد تھا کہ ادیب اور شاعر اپنے ادب کے ذریعے ملک کی پسماندہ عوام کے ضمیر کو اُجاگر کریں تا کہ وہ سرمایہ داری اور رجعت پسندی کے طوق کو نکال کر پھینک دیں۔ ترقی پسند تحریک کے منشور کو بہت پسند کیا گیا اور جگہ جگہ سے لوگوں کے خطوط آنے لگے جس میں اُنہوں نے منشور سے اتفاق ظاہر کیا۔

حالانکہ سبط حسن سے سجاد ظہیر کا تعارف 1935 میں ہوا لیکن سبط حسن نے جو کچھ سجاد ظہیر کے بارے میں لکھا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سجاد ظہیر کو بہت قریب سے جانتے تھے۔ سبط حسن کا پہلا مجموعہ شاید 1988 میں 'افکار تازہ۔ مقالات سجاد ظہیر' کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں سبط حسن کے اُن تمام مضامین کو اکٹھا کیا گیا تھا جو اُنہوں نے یا تو مختلف اخبارات و رسائل میں چھپوائے تھے یا ابھی تک غیر مطبوعہ تھے۔ اِن میں کافی مضامین سجاد ظہیر کے بارے میں تھے۔ بعد میں اُن کی کتاب 'ادب اور روشن خیالی' کا مرتبہ سید جعفر احمد نے کیا جس میں سجاد ظہیر کے علاوہ کئی دیگر ادیبوں پر بھی مضامین ہیں۔ اس کتاب میں سبط حسن نے سجاد ظہیر کی ذاتی خوبیوں کا بہت اخلاص سے تذکرہ کیا

ہے۔ کہتے ہیں کہ سجاد ظہیر کے مزاج میں نرمی، مٹھاس اور نفاست تھی اور فنون لطیفہ سے اُنہیں والہانہ محبت تھی۔ سجاد ظہیر کی فطرت کو دیکھتے ہوئے اُنہیں حیرت ہوتی تھی کیونکہ کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں میں حصہ لینا ایک غیر شاعرانہ فعل تھا جو سجاد ظہیر کے ادبی شعور سے میل نہیں کھاتا تھا۔ ادب اور پارٹی کی سیاست اُنہیں دو متضاد چیزیں محسوس ہوتی تھیں۔ لیکن سجاد ظہیر کا سوچنے کا طریقہ الگ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ میں کمیونسٹ اس لیے ہوں کیونکہ میں ادیب ہوں۔ وہ ان دونوں چیزوں کو ایک دوسرے سے مختلف نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے مطابق وہ ایک دوسرے کا لازمی جز تھے۔ سجاد ظہیر کی شخصیت کے بارے میں سبط حسن لکھتے ہیں:

> ''فطرت نے اُنہیں بڑا میٹھا مزاج دیا تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دور کے سب سے زیادہ پسندیدہ اور پیار کی جانے والی شخصیت تھے۔ لوگوں سے ملنے جلنے کا اُنہیں بے حد شوق تھا اور خاص طور سے نوجوان لکھنے والوں اور ذکی اور ذہین نوجوانوں سے وہ بڑے خلوص سے ملتے تھے۔ نہ صرف اُن کی بڑی کشادہ پیشانی اور خوش دلی کے ساتھ خوش آمدید کہتے تھے بلکہ اُن کے مسائل پر بڑی توجہ اور گرم جوشی سے تبادلہ خیال کرتے تھے۔ وہ بھی ایک مخلص دوست اور اُن کے برابر کے ساتھی کی حیثیت میں نہ کہ کسی فتوے باز مفتی کی طرح۔ وہ بڑے صبر سکون کے ساتھ دوسروں کی گفتگو سنتے اور کبھی کسی ملاقاتی کو اُنہوں نے ہراس کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا ہر ملاقاتی اُنہیں بڑے پیار سے 'بنّے بھائی' کہتا تھا۔''(۹)

سجاد ظہیر کے ایک اور دوست تھے حمید اختر جو بقید حیات نہیں ہیں اور جب تک زندہ تھے تو لاہور (پاکستان) میں مقیم تھے۔ اُنہوں نے اپنی تصنیف 'آشنائیاں کیا کیا' میں کئی جگہ سجاد ظہیر کا ذکر کیا ہے۔ اُنہوں نے بھی سجاد ظہیر کی خوبیوں کو اسی انداز میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''بمبئی کے ان سب دوستوں اور ادیبوں شاعروں میں بنّے بھائی کو بڑی منفرد پوزیشن حاصل تھی۔ وہ حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ ایک قسم کی مقناطیسیت اُن کے وجود میں رچی بسی تھی جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ بمبئی میں ہمارے

حلقہ احباب میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ جس نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ گھر بار، بہن بھائی، بیوی بچوں کو چھوڑ کر انہی کا ہو رہتا یا پھر کمیونسٹ پارٹی کا کُل وقتی رکن بن جاتا۔ ہوا یوں کہ اُنہوں نے میرے کندھے پر فوراً ہاتھ رکھ دیا۔ بمبئی شہر کے شبستانوں اور خوباؤں سے ابھی پوری طرح آشنا بھی نہ ہوئے تھے کہ اُنہوں نے اپنے سحر میں لے کر کام پر لگا دیا۔'' (۱۰)

چونکہ حمید اختر کو سجاد ظہیر کے بہت قریب رہنے کا موقع ملا تھا اس لیے وہ ان کی فنی صلاحیتوں اور ان کی شخصیت سے پوری طرح واقف تھے۔ لہٰذا میں نے کسی طرح ان سے لاہور میں رابطہ قائم کیا اور ان سے التجا کی کہ وہ سجاد ظہیر کے بارے میں اپنے تاثرات سے مجھے آگاہ کریں۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں انہیں ایک سوالنامہ (Questionaire) ارسال کروں جس کے جواب میں وہ جو کچھ بھی اپنی یادداشت سے اخذ کر سکیں گے مجھے لکھ بھیجیں گے۔ چنانچہ میں نے ایک سوالنامہ انہیں بھیجا جس کا جواب انہوں نے کوئی بارہ صفحات پر مشتمل اپنی تحریر میں دیا ہے۔ وہ سوالنامہ اور جناب حمید اختر کی تحریر کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تمام کارروائیوں کے روحِ رواں سجاد ظہیر ہی تھے۔ ان کے علمی مرتبے کے سبھی لوگ قائل تھے اور متنازعہ معاملات میں ان کی رائے حتمی تصور ہوتی تھی۔ اس زمانے میں یہ بات بمبئی کے ادبی اور سیاسی بالخصوص کمیونسٹ حلقوں میں بہت مشہور تھی کہ بنے بھائی جس نوجوان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیتے وہ انہی کا ہو رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ میں اپنی کتاب 'آشنائیاں کیا کیا' میں اس سے متعلق مضمون میں یہ لکھ چکا ہوں کہ انہوں نے میرے کندھوں پر شاید اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیئے تھے جن کی وجہ سے میرا ان کا بہت گہرا تعلق ہو گیا تھا۔ وہ ادبی طور سے ہی نہیں شخصی طور سے بھی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ بمبئی کے جیون ہاؤس میں وہ جس گھر میں رہتے تھے وہ سادگی اور قناعت کا نمونہ تھا۔ حمید اختر کو اُس گھر میں سجاد ظہیر، رضیہ اور تین بچیوں کے ساتھ تقریباً چھ مہینے رہنے کا موقع ملا تھا اس لیے وہ ان کی روزمرہ زندگی اور معمولات کا چشم دید گواہ تھے۔ لہٰذا سجاد ظہیر کے متعلق ان کا کلام مسلم ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جیون ہاؤس میں بنے بھائی کے گھر میں جو ابتدائی دو ماہ گزارے وہ میرے لحاظ سے ان کے لیے تکلیف دہ تھے کیونکہ میں اپنے آپ کو ان کے وسائل پر بوجھ تصور کرتا تھا۔ مگر بنے بھائی اور رضیہ آپا

کی طرف سے ان پر سخت پابندی تھی کہ وہ کھانا صرف گھر پر ہی ان کے ساتھ کھائیں۔

بمبئی میں حمید اختر ہندوستان کلا مندر میں نوکری کرتے تھے۔ اس کمپنی کے مالک کلونت رائے تھے جو ساحر لدھیانوی کے خاص دوست تھے اور اپنی فلم 'آزادی کی راہ پر' کے گانے لکھنے کا کام انہوں نے ساحر کو سونپا تھا۔ یوں تو حمید اختر ساحر لدھیانوی کے قریبی دوست تھے لیکن جب انہوں نے وقت پر اجرت نہ ملنے کے خلاف ہڑتال کی صورت میں احتجاج کیا تو ساحر سے ان کے تعلقات تقریباً ختم ہو گئے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''ہندوستان کلا مندر نامی کمپنی نے جو فلم 'آزادی کی راہ' پر بنا رہی تھی، ساحر اور مجھے رہائش کے لیے پہلے قلابہ کے سلیمان چیمبرز میں گیٹ وے آف انڈیا کے پاس ایک فلیٹ دیا ہوا تھا۔ بعد میں جلیس بھی ہمارے ساتھ رہنے لگا۔ دو تین ماہ بعد کمپنی نے وارڈن روڈ پر ایک بڑی دو منزلہ کوٹھی کرائے پر لے لی اور اسکی نچلی منزل پر ایک کمرہ ہمیں رہنے کو دے دیا۔ کمپنی کی مالی حالت بگڑنے کی وجہ سے عملے کو تنخواہیں ملنے میں دیری ہوئی تو وہاں پر ہڑتال ہو گئی جس میں مَیں پیش پیش تھا۔ ساحر کا کہنا تھا کہ ہم چونکہ کلونت رائے کی وجہ سے یہاں آئے ہیں اس لیے ہمیں ہڑتال کرنے والے عملے کی بجائے اُس کا ساتھ دینا چاہیے۔ اس بات پر میرا اس سے جھگڑا ہو گیا اور میں اپنے واجبات وصول کرنے کے بعد کمپنی ہی سے نہیں ساحر سے بھی الگ ہو گیا۔ اندھیری میں میرا ایک واقف کار کھولی نما مکان میں رہتا تھا، میں اس کے پاس چلا گیا مگر دوسرے ہی دن بعد بخار میں مبتلا ہو گیا اور ایک ڈیڑھ مہینہ بیہوش پڑا رہا۔ اس وقت دوست نے گھبرا کر بنے بھائی کو اطلاع دی تو وہ ڈھونڈتے ہوئے والکیشور روڈ سے اندھیری میں میری اس عارضی رہائش گاہ پر پہنچے۔ اگرچہ ان کی آمدنی کے ذرائع انتہائی محدود تھے اور ہمیشہ بسوں اور ٹراموں میں سفر کرتے تھے مگر میری حالت دیکھتے ہوئے انہوں نے لوکل ٹرین کی بجائے ٹیکسی میں مجھے پہنچانے کا فیصلہ کیا اور اس طرح اٹھارہ بیس میل کا یہ فاصلہ جو لوکل ٹرین میں ایک آدھ روپے میں طے ہو جاتا تھا اس پر انہوں نے بارہ

پندرہ روپے خرچ کیے جو اس زمانے میں ان جیسے آدمی کے لیے اچھی خاصی رقم تھی۔ کمپنی سے ملنے والے واجبات کی شکل میں میرے پاس دو تین سو روپے ضرور تھے مگر آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے میں نے واپس لدھیانہ جانے کا فیصلہ کیا تو سجاد ظہیر صاحب نے مجھے سختی سے منع کیا۔ چونکہ رضیہ سجاد ظہیر، ساحر لدھیانوی اور میں نے کمیونسٹ پارٹی کی رُکنیت ایک ہی وقت میں قبول کی تھی اس لیے ایک طرح سے ان کا یہ فیصلہ پارٹی مینڈیٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ مجھے مجبوراً ان کے ساتھ ان کے گھر پر رہنا پڑا۔'' (۱۱)

سبطِ حسن، کہتے ہیں کہ سجاد ظہیر بہت روشن دماغ انسان تھے وہ ادبی ذوق بھی بلند پائیہ کا رکھتے تھے اور حسن و جمال کے دلدادہ بھی تھے۔ زندگی کے ہر حُسن سے اُنہیں پیار تھا چاہے وہ جسمانی ہو یا قدرتی۔ یا پھر وہ موسیقی ہو یا آرٹ یا پھر تصویر کشی ہو۔ جس شدت سے وہ حُسن سے پیار کرتے تھے اُسی شدت سے وہ انسانی بدحالی اور ذہنی پابندیوں سے نفرت بھی کرتے تھے۔ وہ فارسی، اردو اور ہندی شاعری کو بھی بہت پسند کرتے تھے۔ تمام عمر وہ انسانیت کی ترقی کے لیے جدوجہد میں لگے رہے اور کسی موقع پر بھی اُنہوں نے کسی قسم کی تلخی کا شائبہ تک نہیں آنے دیا۔

سجاد ظہیر کی زندگی پر نظر ڈالنے سے یہ نتیجہ با آسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ آرٹسٹ تھے اور انقلابی و سیاسی سرگرمیوں کو بھی وہ ایک آرٹسٹ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ انقلاب بھی سازِ ہستی کا ایک حیات بخش نغمہ ہے۔ اس لیے وہ کہا کرتے تھے کہ ہر انقلابی کارکن کا یہ بنیادی فرض ہے کہ:

''جس طرح ایک موسیقار ستار کے مختلف تاروں کو حرکت دے کر اِن کی آوازوں میں ایک آہنگ اور حُسن پیدا کرتا ہے یا ایک پیانو بجانے والا پیانو کی پتیوں پر اپنی اُنگلیوں کی جنبش سے نئی نئی دُھنیں بناتا ہے تاکہ لوگوں کا جمالیاتی ذوق نکھرے اور ان میں زندہ رہنے اور زندگی کو حسین بنانے کا ولولہ پیدا ہو اِسی طرح ہم انقلابیوں کا بھی فرض ہے کہ عمل سے لوگوں میں زندگی سے محبت کرنے اور زندگی کے سچے اور حیات بخش اِقدار کو ترقی دینے، زندگی کو آسودہ، آزاد اور باشعور بنانے اور اِن قوتوں سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیتوں کو اُبھاریں جو

اِنسانیت کے لیے ایک جان لیوا روگ بن گئی ہیں۔"(۱۲)

جیسا کہ کہا جاچکا ہے سجاد ظہیر غصے کو کبھی پاس پھٹکنے نہیں دیتے تھے صبر کا مادہ جتنا سجاد ظہیر میں تھا کسی دوسرے میں نہیں تھا۔ اُن کے صبر کی مثال دیتے ہوئے سبط حسن ایک خاص واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"مجاز لکھنوی اُن دنوں بمبئی سجاد ظہیر کے گھر پر ہی رہتے تھے اور اکثر رات کو نشے میں جھومتے ہوئے آتے تھے۔ اُن کی اِن حرکتوں سے رضیہ بیگم کبھی کبھی تھوڑی بہت ناراضگی ضرور ظاہر کرتی تھیں مگر سجاد ظہیر کے ماتھے پر کوئی شکن نہیں پڑتی تھی۔ ایک دن صبح صبح سب کے اُٹھنے سے پہلے بنّے بھائی وہ گدّا دھور ہے تھے جس پر رات کو مجاز سوئے تھے۔ پوچھنے پر کہنے لگے" مجاز شرمندہ ہو کر بھاگ گیا ہے، بہت پی کر آیا تھا گدّا خراب ہو گیا ہے۔ رضیہ ابھی اُٹھی نہیں، میں دھو کر صاف کر دیتا ہوتا کہ رضیہ کو پتہ نہ چلے۔"(۱۳)

بنّے بھائی کی یہ خاص خوبی تھی کہ جو ترقی پسند ادیب اصطلاح طلب ہوتا وہ جی جان سے اُس کی رہنمائی کرتے۔ بہت سے نئے ادیب اور شاعر اپنی تخلیقات اُنہیں ہی دِکھاتے اور اُن کا مشورہ لیتے۔ سبط حسن کہتے ہیں کہ بمبئی میں قیام کے دوران اُنہوں نے کسی شخص، کسی شاعر یا ادیب سے بنّے بھائی کی ذات یا رائے پر کوئی اعتراض نہیں سُنا۔ دراصل اُن کی سحر انگیز شخصیت، کردار کی پختگی اور اپنی ذات سے لاتعلقی کی وجہ سے اِن کی ہر بات حق وصداقت کے طور پر قبول کر لی جاتی تھی۔ اتنے سارے لوگوں کا اِتنا اعتماد حاصل کرنا ایک حیرت انگیز بات ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کے ترقی پسند ادیب تمام کے تمام اُن سے ہی رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

. حمید اختر کے مطابق اگر بنّے بھائی کی تعریف ایک ہی لفظ میں کی جائے تو وہ لفظ ہے 'جمال'۔ وہ سرتاپا جمال ہی جمال تھے اور زندگی کی جمالیاتی قدروں کے نمائندہ تھے۔ وہ اِس دُنیا سے بدصورتی اور اِس کے مظاہر، ظلم وجبر وغیرہ کا خاتمہ کرنے کے لیے تمام عمر کوشش کرتے رہے۔ حمید اختر کی نگاہ میں بنّے بھائی خود بھی خوبصورت آدمی تھے۔ لانبا قد، فربہی مائل جسم۔ ذہین اور خوبصورت آنکھیں جو ہر وقت زندگی کے حسن کی متلاشی نظر آتیں۔ وہ کبھی اونچا نہیں بولتے تھے اور لکھنوٗ کی

شائستہ تہذیب کا مکمل نمونہ تھے۔

حمید اختر ایک اور واقعہ کا بھی ذکر کرتے ہیں، جس سے بنّے بھائی کا مزاج اور ان کی افتادِ طبع کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ یہ واقعہ بہت لوگوں اور خاص کر موجودہ نسل کے علم میں نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ کوئی 1946 کا واقعہ ہے جب ساحر لدھیانوی اور مشہور افسانہ نگار ہاجرہ مسرور کی منگنی ہوئی تھی۔ ہاجرہ اُس زمانے میں ساحر سے زیادہ شہرت مند تھیں۔ ساحر اکثر مذاق میں کہا کرتے تھے کہ شادی کے بعد اُسے شہرت دہیج میں ملے گی۔ چونکہ موضوع بنّے بھائی کے مزاج اور اُن کی شائستگی کا ہے اس لیے مناسب ہے کہ جو کچھ حمید اختر نے ساحر کی منگنی کے متعلق لکھا ہے اُسے ذیل میں درج کیا جائے:

> ''وہ مجھے بمبئی سے اپنے ساتھ لے کر اس لیے لدھیانہ آیا تھا کہ میں اُس کی والدہ کو لڑکی کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچا کر شادی کے لیے راضی کروں۔ میں نے والدہ مرحومہ کے سامنے ہاجرہ کی ظاہری و باطنی اتنی خوبیاں بیان کیں کہ وہ خود ہاجرہ بھی سُن لیتی تو شاید احتجاج کرتیں۔ چنانچہ ان کی منظوری مل گئی۔ ویسے بھی وہ بے چاری تو ساحر کی خوشی چاہتی تھی۔ وہ بیٹے کی شادی پر رضا مند ہونے ہی سے بہت خوش تھیں۔ مگر واپسی کے دو ماہ بعد ساحر خود ہی حسب عادت شادی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ میں یہ بات پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ وہ شادی سے ہمیشہ بھاگ جاتا تھا۔ عشق ضرور کرتا اور ہر عشق کے دوران ایک دو نظمیں لکھ کر فارغ ہو جاتا۔ چنانچہ ایشر کور کے بعد امرتا پریتم، لتا منگیشکر، سُدھا مہوترا وغیرہ سبھی سے اِس کا معاشقہ رہا۔ شادی کی خبریں بھی نکلیں مگر آخری وقت پر ساحر بھاگ جاتا رہا۔ ہاجرہ سے شادی پر بظاہر وہ بہت سنجیدہ تھا مگر تین ایک ماہ کے بعد وہ انکاری ہوا تو ہاجرہ کی بہنیں عائشہ جمال مرحومہ اور خدیجہ مستور مرحومہ نے بنّے بھائی سے ساحر کے رویے کی شکایت کی۔ ان کا موقف بھی درست تھا کی ساحر کی اِس غیر ذمہ دارانہ حرکت سے ہاجرہ کی بدنامی ہوگی اور منگنی اور اِس کے اعلان کے بعد اگر شادی نہ ہوئی تو ہاجرہ کے مُستقبل پر اِس کا بُرا اثر پڑے گا۔ بنّے بھائی سے ان کی بات چیت کے وقت

میں وہاں موجود نہ تھا۔ جب میں شام کو گھر پہنچا تو بنّے بھائی نے بتایا کہ ''ہاجرہ کی بہنیں تمہارے دوست کی شکایت لے کر آئی تھیں۔'' وہ اس صورت حال پر کافی مضطرب تھے اور بار بار مجھ سے ایک ہی بات کہہ رہے تھے۔ ''بھئی ان کی بات تو ٹھیک ہی ہے، ساحر کے رویے سے نہ صرف ہاجرہ اور اُس کے اہل خاندان کے لیے پریشانیاں پیدا ہوں گی بلکہ تحریک کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔'' میں نے کہا آپ ساحر سے بات کریں مگر وہ اُس کے لیے راضی نہیں تھے۔ اِن کا کہنا تھا کہ شادی کے معاملے میں کوئی کیسے زبردستی کر سکتا ہے۔ شادی تو ہر آدمی کا ذاتی معاملہ ہے اور یہ کہ'' اگر چہ میری دِلی خواہش ہے کی یہ شادی ہو جائے مگر میں اِس کے لیے کسی فریق کو مجبور نہیں کر سکتا۔''(۱۴)

حمید اختر کی مندرجہ بالا تحریر کی تصدیق ایک اور وسیلے سے بھی ہوتی ہے۔ ممبئ کے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں میں رفعت سروش کا نام بھی آتا ہے جو 1945 میں تلاش روزگار کے سلسلے میں ممبئ آئے تھے۔ اُنھوں نے اپنی یادداشتیں قلم بند کر کے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام ہے 'بمبئ کی بزم آرائیاں'۔ اُس میں وہ بھوپال کے نوجوان جرنلسٹ احمد علی سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہیں۔ احمد علی، ہاجرہ مسرور کے شوہر تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''خدیجہ مسرور اور ہاجرہ مسرور اُن دنوں لکھنؤ سے ممبئ آئیں تھیں اور اپنی بڑی بہن عشرت درانی کے ساتھ دادر میں رہ رہی تھی۔ دونوں بہنیں چونکہ لکھنؤ کے ماحول میں پلی بڑی تھیں اِس لیے نہایت مہذب اور شائستہ تھیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہاجرہ مسرور، ساحر لدھیانوی میں دلچسپی لینے لگی تھیں مگر بات جب اِس منزل تک پہنچی کہ حمید اختر اِس معاملے میں لدھیانہ جا کر ساحر کی والدہ سے بات چیت کریں تو ساحر نے شادی سے انکار کر دیا اور اِن دونوں کی کہانی ایک خوبصورت موڑ لے کر ختم ہوگئی۔''(۱۵)

اب دیکھتے ہیں کہ خود رضیہ اور اُنکے گھر کے لوگ اُن کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ رضیہ نے ایک مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان ہے 'انتظار ختم ہوا۔ انتظار باقی ہے' جو ہفت روزہ 'حیات' سجاد ظہیر نمبر

11 نومبر 1973 میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر سید احمد جعفر نے اسے اپنی کتاب 'سجاد ظہیر۔ شخصیت اور فکر' میں شامل کیا ہے۔ اپنے مقالے میں رضیہ لکھتی ہیں کہ کئی باتیں ایسی ہیں جو بادی النظر میں بالکل معمولی لگتی ہیں مگر جن سے سجاد ظہیر کی عظیم شخصیت مرتب ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اچھے کھانے کے شوقین ہونے کے باوجود انھوں نے کبھی بدمزہ کھانے پر نکتہ چینی نہیں کی تھی۔ اور کھانا کم ہوتا تھا تو ضرور پوچھتے تھے کہ سب نے کھالیا کہ نہیں۔ دوسرے کی بات وہ نہایت تحمل سے سُنتے تھے۔ اپنے خیال انھوں نے کبھی رضیہ پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔ زیادہ سے زیادہ کبھی کوئی کتاب پڑھنے کی رائے دے دیتے تھے۔ وہ کہتی ہیں کہ انہیں کسی عورت کے کردار کو بُرا کہتے ہوئے میں نے کبھی نہیں سُنا۔ ان سے مل کر لوگوں میں خود اعتمادی بڑھ جاتی تھی۔ اپنی غلطی تسلیم کرنے میں انہیں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی۔ وہ احسان فراموشوں کو ہمیشہ معاف کر دیتے تھے۔ رضیہ سجاد ظہیر کے مطابق یہ ان کی شخصیت کا ایک رُخ تھا۔ اُن کی شخصیت کے دوسرے رُخ کے بارے میں وہ اپنے مضمون 'انتظار ختم ہوا انتظار باقی ہے' میں لکھتی ہیں:

> ''البتہ یہ سوچنا غلط ہوگا کہ ان کو کبھی غصہ آتا ہی نہیں تھا۔ اگر ہمارے گھر میں کام کرنے والی لڑکی سے کوئی پیالی ٹوٹ جاتی، ہمارے کتے کا پلہ ان کا کرتا پھاڑ دیتا، ان کے لکھتے وقت کوئی فقیر پھاٹک پر کھڑا ہو کر زور زور سے چیخنے لگتا جوان کے لکھنے کی جگہ سے چند ہی گز پر تھا، ان کے آرام کرنے کے وقت کوئی صاحب بغیر اطلاع کے آدھمکتے اور پھر گھنٹوں نہ جاتے، کوئی تھرڈ کلاس طالبِ علم اپنے تھرڈ کلاس کو اپنے مسلمان ہونے کا خمیازہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ان سے سفارش کرنے کو کہتا، کوئی ٹیڑھا میڑھا دوست نشے میں دُھت ان کے بار بار سوسشلٹ ملکوں کے سفر پر طویل طعنے دیتا اور اسی قبیل کی بہت سی باتوں پر ان کو غصہ نہیں آتا۔ لیکن جب کوئی شخص اپنی سیاسی قلابازی کو قوم کے لیے مفید ثابت کرنے کی کوشش کرتا، اپنی ذاتی منفعت کو اصول بنا کر پیش کرتا، نئے سرے سے کام پر جُٹ جانے کی بجائے پرانی لکیریں پیٹ پیٹ کر ترقی پسندی کی صفوں میں انتشار پھیلانے کی کوشش کرتا اور سازش کرتا، شخصی آزادی، مکمل آزادی، آزادی برائے آزادی وغیرہ

قسم کے نام پر سوشلزم کو گالیاں دیتا' کیونکہ اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ' تو ان کو غصہ آتا تھا۔ بڑا گہرا خاموش غصہ۔ اور پھر یہ خاموشی الفاظ بنتی۔ یہ گہری خاموشی جس میں اس شخص کی ریاکاری، بے ایمانی اور حماقت پر افسوس بھی ہوتا۔ اور جب یہ غصہ الفاظ بن جاتا تو اکثر حرفِ آخر بن جاتا۔(۱۶)

جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو حکومتِ برطانیہ نے بہت بڑے پیمانے پر کمیونسٹوں کی گرفتاری کا عمل شروع کیا۔ بہت سارے جانے مانے کمیونسٹ نظر بند کیے گئے جن میں سجاد ظہیر بھی شامل تھے۔ اُنہیں سینٹرل جیل لکھنؤ میں نظر بند کیا گیا جہاں وہ تقریباً دو سال قید رہے۔ اِس دوران اُنہوں نے جیل سے اپنی رفیقہءِ حیات رضیہ سجاد ظہیر کے نام کل ۸۱ خطوط لکھے۔ ان خطوط میں بنّے بھائی نے اپنی اہلیہ کے تئیں بے پناہ محبت کا اظہار بڑے شائستہ طریقے سے کیا۔ اُس کتاب کا دیباچہ ہندوستان کے مشہور شاعر جناب جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے۔ بنّے بھائی کی شخصیت اور اُن کی ذاتی خوبیوں کے بارے میں جوش ملیح آبادی کا نقطہ نگاہ کیا تھا وہ اُس پیش لفظ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"مجھے اس جوڑے سے بہت محبت ہے۔ صورتوں اور سیرتوں کے لحاظ سے یہ دونوں میاں بیوی بلا کے طباع طرار اور بڑی نوک پلک کے ادیب ہیں اور پھر اُن میں محبت وخلوص کی خوشبو ہے جو اب ایک جنس نایاب ہو چکی ہے۔ سجاد ظہیر میں علم وادب اور فطانت کے ساتھ ساتھ ایک ایسی معصومیت پائی جاتی ہے کہ اُن پر بے ساختہ پیار آتا ہے اور بیگم میں خلوص ومحبت کے ساتھ ساتھ بعض اوقات ایک ایسا تیکھا پن پایا جاتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے بے ساختہ غصہ آجاتا ہے اور جب اِن دونوں کو ملا کر دیکھتا ہوں تو دِل کی ایک ایسی شیرینی محسوس ہوتی ہے جو کسی سُریلی بانسری کے زیر و بم سے پیدا ہوتی ہے۔"(۱۷)

رضیہ بیگم کے غصے کی طرف جو اشارہ جوش ملیح آبادی نے کیا ہے وہ بے جا نہیں ہے۔ اُن کی اپنی بیٹی نور ظہیر بھی کچھ ایسی ہی بات اپنی امی کے لیے کہتی ہیں۔ اُن کے مطابق اُن کی امی کو غصہ بہت جلد آجاتا تھا۔ اگر کسی نے اُن کی الماری سے چیز نکال لی یا میز پر سے کاغذ کا لفافہ اُٹھایا، یا پھر باورچی خانے میں کچھ پکانے کی غلطی وارد ہوئی کہ طوفان کھڑا ہو گیا۔ اِن حالات میں امی کہتیں "جب چیزیں سلیقے سے

رکھنا نہیں آتا تو میری الماری چھوتی کیوں ہو" یا پھر "پھوہڑ بی بی، ہاتھ لگاتی ہو کہ پنجے مارتی ہو"۔

سجاد ظہیر اپنی بیوی سے بالکل الگ مزاج رکھتے تھے۔ اُن کو غصہ کبھی نہیں آتا تھا۔ کانفرنس ہو یا سیمینار چاہے کوئی کتنا بھی اُکسائے بنّے بھائی غصّے کو پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتے تھے۔ نہ ہی اُن کے کردار میں نفرت نام کی کوئی چیز تھی بلکہ وہ اپنے دوستوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ اُن کے کام بھی خود ہی کر دیتے۔ قیام ممبئی کے دوران ایک بار حمید اختر کی طبیعت خراب ہو گئی۔ تب وہ اندھیری میں ایک دوست کے یہاں ایک تنگ و تاریک کمرے میں رہتے تھے۔ وہاں وہ سخت بیمار پڑے اور کئی دِن تک بے ہوشی کے عالم میں رہے۔ جب بنّے بھائی کو اِس بات کا علم ہوا تو اُسے ڈھونڈتے ہوئے پہنچ گئے اور اُسے اپنے گھر لے آئے۔ وہاں حمید اختر تقریباً چھ مہینے ان کے گھر رہے۔ اُس زمانے میں سجاد ظہیر کو کمیونسٹ پارٹی سے جیب خرچ کے تقریباً پچاس ساٹھ روپے مہینے کے ملتے تھے اور ساٹھ ستر روپے مضامین لکھنے کے۔ وہ انہی روپیوں سے گزر بسر کرتے تھے۔ اس قلیل رقم سے صرف وہ دال چاول اور چپاتی ہی جُٹا پاتے تھے۔ حمید اختر کہتے ہیں کہ جب تک وہ بیکار رہے بنّے میاں کے گھر پہ ہی رہتے اور کھاتے تھے۔ بعد میں اُنھیں کام حاصل ہوا اور پیسے ملنے لگے تو بھی اُنہوں نے حمید اختر سے کھانے کے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ کبھی کبھی جب حمید اختر پھل یا مٹھائی لے آتے تو بنّے میاں مُسکرا کر کہتے کہ حمید اُن کی عادتیں بگاڑ رہا ہے۔

ایک اور واقعہ جس کا ذکر مسرت آمیز ہے وہ یہ ہے کہ حیدرآباد ترقی پسند مُصنفین کی کانفرنس کے دوران شوکت بیگم کا دل کیفی اعظمی پر آ گیا اور دونوں نے شادی کا فیصلہ کیا۔ شوکت حیدرآباد کے ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اور کیفی کمیونسٹ پارٹی سے صرف چالیس روپے مہینہ پاتے تھے۔ نہ آمدنی کا کوئی دیگر ذریعہ تھا نہ رہنے کا کوئی مُستقل ٹھکانہ۔ لیکن اس کے باوجود بھی شوکت کیفی سے شادی کے لیے بضد تھیں۔ کیفی کی طرف سے بنّے بھائی لڑکی والوں سے بات چیت کر رہے تھے اور اُن کی دلی خواہش تھی کہ یہ شادی ہو جائے۔ چنانچہ بنّے بھائی اِسطرح بھاگ دوڑ میں لگے رہے جیسے شادی کیفی کی نہیں خود اُن کی اپنی ہے۔ آخر یہ شادی ہوئی اور بنّے بھائی کے گھر پر ہی ہوئی۔

تو یہ تھے سید سجاد ظہیر یعنی بنّے بھائی جن کی فطرت میں پیار اور ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ رنگین مزاج تھے لیکن اُنہوں نے ایک لمحے کیلیے بھی تہذیب کا دامن ہاتھ سے جانے

نہیں دیا۔ اُن کی فکر میں زندہ دلی بھی تھی اور سنجیدگی بھی۔ یہ اُن کا ہی حوصلہ تھا کہ اُنہوں نے عیش و آرام کی زندگی کو ترک کر کے اِنسانی فلاح و بہبودی کیلیے غریبی کی زندگی کو پسند کیا۔ وہ تمام عمر تنگ دست رہے لیکن کبھی شکوہ شکایت زباں پر نہیں لائے۔ بنّے بھائی جیسے لوگ پوری صدی میں ایک ہی بار پیدا ہوتے ہیں اور جب دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو وقت کی ریت پر اپنے قدموں کے نہ مٹنے والے نشان چھوڑ جاتے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے سنگِ میل ثابت ہوتے ہیں۔

سن 2005 میں دہلی میں سجاد ظہیر کا صد سالہ جشن زیرِ اہتمام کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین اور قومی کونسل برائے فروغ اردو تین دن تک منایا گیا تھا جس کا افتتاح اُس وقت کے مرکزی وزیر جناب ارجن سنگھ نے کیا اور جس کی صدارت کا ذمہ جناب اے۔ کے ہنگل کو سونپا گیا۔ اس جشن میں بڑے بڑے ادیب، شاعر اور دانشور شامل ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ سجاد ظہیر کی بیٹیوں نے بھی حصہ لیا تھا جن میں نجمہ باقر، نسیم بھاٹیہ، نادرہ ببر شامل تھیں۔ ان تینوں میں ایک نادرہ ببر کو ہی سجاد ظہیر کے بارے اپنے جذبات کا اظہار کرنے کا موقع ملا۔ اُس نے کہا:

> ''آپ سب جانتے ہیں کہ سجاد ظہیر میرے والد تھے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ میں اس گھر میں پیدا ہوئی۔ میں جب پیدا ہوئی تو وہ راولپنڈی سازش کیس میں بند تھے۔ میں آٹھ سال کی تھی جب میں نے انھیں پہلی بار دیکھا۔ میری والدہ نے مجھے پالا۔ وہ بہت پریشانی کے دن تھے۔ ہمارے گھر پر PWA کی میٹنگ ہوتی تھی۔ سب جمع ہوتے تھے۔ میں ان کو دیکھتی۔ ان کو سُنتی۔ جب ذرا بڑی ہوئی تو پتہ چلا کہ بیدی چچا میرے سگے چچا نہیں ہیں، عصمت خالہ میری سگی خالہ نہیں ہیں۔ ان سب سے مل کر ہی اندازہ ہوا کہ اپنے اصولوں پر ٹکے رہنا اور بڑے مقصد کے لیے لڑنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اگر ابا کا نام بڑا ہے تو میری ماں کا نام بھی بڑا ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو ابا اتنے بڑے نہ ہو پاتے۔ میری والدہ کی بڑی قربانیاں ہیں۔ میں کونسل کا اور ارجن سنگھ صاحب کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انہوں نے اتنے بڑے پروگرام کا انعقاد کیا۔ اسی طرح کام ہوتا رہے گا تو نوجوانوں کو ایک بڑے مقصد کے لیے لڑنا آئے گا۔''(۱۸)

نادرہ ببر کی تقریر سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کہا وہ اکثر و بیشتر رضیہ سجاد ظہیر کے متعلق تھا۔ انہوں نے سجاد ظہیر کی شخصیت، فن اور تنظیمی صلاحیتوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اس سے قدرے مایوسی کا احساس ہوا کیونکہ وہ جلسہ سجاد ظہیر کی صد سالہ جشن کے تحت تھا۔ لیکن ازاں بعد قمر رئیس نے جو کلیدی خطبہ پڑھا اس میں انہوں نے سجاد ظہیر کی شخصیت اور خوبیوں پر محرکتہ الآرا بیان دیا۔ اس بیان میں انہوں نے سجاد ظہیر کے کارناموں کو بڑی وضاحت کے ساتھ عالمانہ انداز میں پیش کیا۔ انہوں نے کہا:

> ''سجاد ظہیر کی زندگی مینارۂ نور تھی۔ ان کے کارناموں کو تین دائروں میں رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے۔ محنت کش طبقہ کو بیدار اور منظم کرنا، آزادی اور انصاف کے لیے ان کی جدوجہد اور تحریک کو آگے بڑھانا اور ادیبوں اور شاعروں کو فرسودہ، قدامت پسند سماج کو بدلنے اور نو آبادیاتی فکر کے حصار سے باہر نکلنے پر آمادہ کرنا۔ مشترکہ تہذیب اور متحدہ قومیت کے آدرشوں کو فروغ دینا اور ہندوستانی عوام کا رشتہ ساری دنیا میں بیدار ہوتے ہوئے محنت کش انسانوں کی تحریکوں سے جوڑنا۔ ہر زمانے میں ان کی فکر و عمل کے یہی مشترک مقاصد اور آدرش رہے ہیں۔ سجاد ظہیر کی سرگرمیوں کا دوسرا اہم دائرہ ترقی پسند ادبی تحریک تھی جو نہ صرف اردو اور ہندی بلکہ ملک کی تمام زبانوں میں بیسوی صدی کی سب سے اہم اور باوقار فکری اور ادبی تحریک بن گئی ہے۔ سجاد ظہیر اشتراکی اور مارکسی نظریات کو اپنانے کے باوجود اس ادبی تحریک میں ہر فکر و خیال کے ادیبوں اور دانشوروں کو جمع کرنے کی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔''(۱۹)

مجلس کا اختتام بھی قمر رئیس صاحب کی تقریر سے ہی ہوا۔ اُنہوں نے نوزائدہ ترقی پسند ادیبوں کو یہ پیغام دیا کہ کھل کر کام کریں اور آزاد فضا میں پڑھیں لکھیں۔ اُنہوں نے کہا کہ اردو انجمن کا کوئی مینی فیسٹو نہیں ہے کیونکہ مینی فیسٹو ادیب کا ضمیر ہی ہوتا ہے۔ اس لیے آج ایک نئی فکری تحریک کی ضرورت ہے جو اس سیمینار کی فضا سے بنے گی اور نئی طرح کی ہمہ گیر روشن خیالی کو جنم دے گی۔

☆☆☆☆☆☆

کتابیات

نمبر شمار کتاب کا نام	مصنف	ناشر پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱) وہ وقت، وہ لوگ اور میں	سجاد ظہیر	پرگتی شیل وسودھا۔ بھوپال	2005	232
۲) سجاد ظہیر۔ فکر اور شخصیت	ڈاکٹر سید احمد جعفر	پرگتی شیل وسودھا۔ بھوپال	2005	237
۳) سجاد ظہیر فکر اور شخصیت	ڈاکٹر سید احمد جعفر	پرگتی شیل وسودھا۔ بھوپال	2005	241
۴) وہ وقت، وہ لوگ اور میں	سجاد ظہیر	پرگتی شیل وسودھا۔ بھوپال	2005	238
۵) وہ وقت، وہ لوگ اور میں	سجاد ظہیر	پرگتی شیل وسودھا۔ بھوپال	2005	240
۶) وہ وقت، وہ لوگ اور میں	سجاد ظہیر	پرگتی شیل وسودھا۔ بھوپال	2005	ص229
۷) وہ وقت، وہ لوگ اور میں	سجاد ظہیر	پرگتی شیل وسودھا۔ بھوپال	2005	231
۸) مغنی آتش نفس۔ سجاد ظہیر	سبط حسن	مکتبہ دانیال، کراچی	2005	74
۹) ادب اور روشن خیالی	سبط حسن	مکتبہ دانیال، کراچی	1990	95
۱۰) آشنائیاں کیا کیا	حمید اختر	بک ہوم، لاہور	2008	07
۱۱) خصوصی مقالہ برائے تھیسیس	حمید اختر	غیر مطبوعہ	2009	03
۱۲) ادب اور روشن خیالی	سبط حسن	مکتبہ دانیال، کراچی	1990	98
۱۳) آشنائیاں کیا کیا	حمید اختر	بک ہوم، لاہور	2008	10
۱۴) آشنائیاں کیا کیا	حمید اختر	بک ہوم، لاہور	2008	15
۱۵) بمبئی کی بزم آرائیاں	رفعت سروش	نورنگ کتاب گھر۔ نئی دہلی		
۱۶) سجاد ظہیر۔ شخصیت اور فکر	ڈاکٹر سید جعفر احمد	مکتبہ دانیال، کراچی	2005	141
۱۷) نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	نعمانی پریس، دہلی	1951	08
۱۸) سجاد ظہیر۔ ایک تاریخ ایک تحریک	علی احمد فاطمی	جوش اور فراق لٹریری سوسائٹی	2006	139
۱۹) سجاد ظہیر۔ ایک تاریخ ایک تحریک	علی احمد فاطمی	جوش اور فراق لٹریری سوسائٹی	2006	143

☆☆☆☆

۳۔ سیاسی اور فکری سرگرمیاں

حمید اختر کا ذکر پہلے بھی کئی بار آچکا ہے۔ یہ حضرت سجاد ظہیر کے بے حد قریب تھے اور سجاد ظہیر ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اس لیے سجاد ظہیر کی ذاتی خوبیوں کی پہچان جتنی انہیں تھی کسی اور کو کم ہی تھی۔ ویسے تمام بڑے بڑے دانشوروں اور تخلیق کاروں نے سجاد ظہیر کی ادبی اور تحریری صلاحیتوں کا بڑی خوبی سے ذکر کیا ہے لیکن حمید اختر نے جس سادگی، صداقت اور دیانت داری سے اسے بیان کیا ہے وہ خاص توجہ کے قابل ہے۔ وہ اپنی کتاب 'آشنائیاں کیا کیا' میں لکھتے ہیں:

> ''وہ جس قسم کی زندگی گزار رہے تھے انہیں کے جیسے لوگ اس کا حوصلہ کر سکتے تھے۔ اگر چاہتے تو ان کے لیے دنیاوی آسائشوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ سر وزیر حسن کے بیٹے اور آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے۔ جس قسم کی امیرانہ اور پُرآسائش زندگی انہوں نے گزاری تھی وہ کسی بھی عام آدمی کو زندگی بھر کے لیے ناکارہ بنا سکتی تھی مگر انہوں نے دنیا کو دکھوں سے نجات دلانے، سماجی عدم وتوازن کو ختم کرنے اور ایک بہتر دنیا کو قائم کرنے کا عزم کر رکھا تھا جس پر وہ زندگی کی آخری سانس تک قائم رہے۔ یہ بن باس انہوں نے خود لیا، اپنی رضا سے اور خوشی کے ساتھ۔''(۱)

اسی کتاب میں آگے چل کر حمید اختر نے ملکی مفاد اور ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ پارٹی کی بہتری اور بہبودی کے لیے سجاد ظہیر کی قربانیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں یہ بات اپنے تجربے کی روشنی میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سجاد ظہیر نے اس ملک کی بہتری، ترقی اور خوشحالی کے لیے روز و شب کام کیا۔ ادب کی ترقی پسند تحریک ہو یا کمیونسٹ پارٹی کی سیاست، پالیسیاں مرتب کرتے وقت اس ملک کے عوام کو جاگیردارانہ اور سرمایہ داروں کے چنگل سے آزاد کرانے اور صحیح معنوں میں عوامی قیادت کو سامنے لانے کے مقاصد ان کے سامنے تھے۔ میں نے جب باقاعدگی سے ان کے ساتھ کام کرنا شروع کیا وہ انارکلی سے اُٹھ کر ڈیوس روڈ پر ایک دوست کے یہاں قیام پذیر تھے۔ تین چار سال بعد وہ وہاں سے جیل روڈ چلے گئے۔ میں اپنی سائیکل پر خفیہ پولس سے بچتا بچاتا ہر دوسرے تیسرے روز ان کے یہاں آ جاتا۔ اس زمانے میں پارٹی کے ہفتہ وار 'نیا زمانہ' کا کام بھی میرے ہی ذمہ تھا۔ وہ اس کے مضامین لکھنے کے علاوہ فرضی ناموں سے مضامین بھی لکھتے جو 'امروز' میں شائع ہو جاتے اور اس طرح مہینے میں تیس چالیس روپے جو معاوضہ کے طور پر 'امروز' سے ملتے میں وصول کر کے انہیں پہنچا دیتا۔ یہ پیسے وہ اپنے روزمرہ کے اخراجات کے لیے علیحدہ رکھتے، پارٹی فنڈ سے انہوں نے کبھی اپنی ذات پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔ میرے لیے ان کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ اس لیے بھی سودمند رہا کہ فسادات اور ذاتی پریشانیوں کی وجہ سے میں ان سے ملنے سے پہلے سخت مایوسی کا شکار تھا۔ عملی سیاست میں حصہ لینے اور اپنے ملک کی بہتری کے لیے کچھ کر گزرنے کے جذبے سے یہ جان لیوا مایوسی ختم ہو گئی اور نئے سرے سے جینے کی اُمنگ پیدا ہو گئی۔" (۲)

سجاد ظہیر زندگی میں اقدار کو دیگر خوبیوں پر ترجیح دیتے تھے۔ وہ صحت مندانہ تہذیب اور تمدن کے علمبردار تھے اور بدترین سے بدترین حالات میں بھی مایوس نہیں ہوتے تھے۔ انہیں اپنی روایت کی پاسداری کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ اس لیے مذہب سے منکر ہونے کے باوجود مذہبی روایات پر عمل کرتے تھے۔ عید کو وہ مذہبی تہوار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تہذیبی اجتماع بھی مانتے تھے۔ بنے بھائی کے لیے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے حمید اختر لکھتے ہیں:

"کہاں ملیں گے ایسے لوگ جنہوں نے ذاتی زندگی کی تمام موجودہ آسائشوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے بنی نوع انسانی کی بہتری کے لیے منصوبے بنائے۔ جنہوں نے اس دنیا سے دکھ، افلاس، اور جہالت کے خاتمے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ یہی وہ کام ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے۔ کوئی مذہب بھی ایسا نہیں ہے جس نے انسان کی بہتری اور دنیا کو بہتر جگہ بنانے کے مقاصد پیش نظر نہ رکھے ہوں۔ کام تو وہی ہے جو کسی نہ کسی طریقہ سے اب بھی جاری ہے۔ سید سجاد ظہیر جیسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ انہوں نے برصغیر کے ادیبوں شاعروں کو ادب کی صحت مندانہ روایات کی پاسداری کا شعور دیا۔ وہ خود نقاد، شاعر اور ادیب تھے۔ 'لندن کی ایک رات' 'روشنائی' 'ذکر حافظ' اور 'پگھلا نیلم' ان کی ہمیشہ یاد رہنے والی تصنیفات ہیں۔ اگر وہ سیاسی کام کرنے کی بجائے ادبی کام اور تخلیقی سرگرمیوں پر زیادہ توجہ دیتے تو شاید انہیں اردو کے بہت بڑے ادیب کے طور پر یاد رکھا جاتا۔ لیکن جو کام انہوں نے تنہا انجام دیا وہ ممکن ہے بہت سے ادارے مل کر بھی نہ کر سکتے اور اس کے لیے ان کا نام یقیناً ہمیشہ زندہ رہے گا۔" (۳)

سجاد ظہیر کے بارے میں حمید اختر نے جو کچھ لکھا ہے وہی نظریہ سبط حسن کا بھی تھا۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ سجاد ظہیر کے اندر ادبی تقریبات کی تنظیم اور ترتیب کی بڑی صلاحیتیں تھی مثلاً یہ کہ ڈھاکہ سے پشاور اور دہلی سے مدراس تک کا سفر کرنا اور مختلف زبانوں اور نسلی گروہوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا اور پھر ان کو ایک بڑی تنظیم کی لڑی میں پرو دینا بڑا جان جوکھوں کا مرحلہ تھا لیکن سجاد ظہیر نے یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے اور ہنستے کھیلتے کر دکھایا۔ اس دوران میں نہ انہوں نے کبھی عجلت پسندی دکھائی اور نہ کبھی کسی پر غصہ کیا اور نہ ہی ان کے چہرے پر کبھی بیزاری تھکاوٹ اور ناگواری کے اثرات دیکھنے میں آئے۔ وہ عمر بھر انسانیت کی سربلندی کے لیے بڑے خلوص سے جدوجہد میں محو رہے اور کسی بھی موقع پر تلخی کا شائبہ تک نہیں آنے دیا۔

لندن میں جو طالب علم ہندوستان سے آئے ہوئے تھے وہ تمام امیر گھرانوں کے صاحبزادے تھے جن کا مقصد تعلیم سے زیادہ عیاشی تھا۔ سجاد ظہیر نے ان طلبا کا قریب سے مشاہدہ کیا

اور اپنے اردگرد کے ماحول کو بھی سمجھنے کی بہت محنت اور کشادہ دِلی سے کوشش کی۔ اُس وقت ہندوستان کی عوام سرمایہ داری اور imperialism کے گراں گیر بوجھ کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ اردو کے زیادہ تر شاعر ہمیشہ سے ہی حکمرانوں اور بادشاہوں کے آگے دست گیر رہے ہیں اِسلیے اردو ادب پر شروع سے ہی جاگیرداری اور امیر طبقہ کا تسلط رہا ہے۔ ایسے ماحول میں احتجاج اور انقلاب کی باتیں نہیں کی جاسکتیں۔ پھر بھی چند شاعروں اور ادیبوں نے عوام کو جھنجوڑنے کی کوشش کی۔ اقبال کی آواز کہ 'جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو' آہستہ آہستہ پچھڑے ہوئے لوگوں کے کانوں میں پڑنے لگی تھی۔ اُسی دور میں چکبست نے نعرہ لگایا کہ 'نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے'۔ غالب اور حالی نے بھی لوگوں میں ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ مقدمۂ حالی پر اگرچہ ادیبوں اور نقادوں نے طرح طرح کی چہ میگوئیاں کیں لیکن اِس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ مقدمہ اِس راہ پر پہلا قدم تھا۔

سجاد ظہیر مندرجہ بالا ماحول میں لندن سے ہندوستان لوٹے۔ یہاں آ کر اُنہوں نے محسوس کیا کہ رعایا میں قومی آزادی اور حُب الوطنی کا جذبہ اُجاگر کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک کے ادیبوں کو متحد کیا جائے۔ اُنہوں نے قومی آزادی اور متناسب سماج کی تعمیر کو ہی اپنا نصب العین بنالیا۔ اِس مقصد کے حصول کی کامیابی کے لیے صرف ادیبوں کا اتحاد ہی کافی نہ تھا۔ ہندوستان کی محنت کش عوام کو بھی آزادی کی جدوجہد میں شامل کرنا ضروری تھا۔ اِس بات کی وضاحت اُنہوں نے 'روشنائی' میں مختلف مقام پر کی ہے۔ یہ کام جتنا دلچسپ تھا اُتنا دُشوار گزار بھی تھا۔ لیکن سجاد ظہیر کو اپنے نصب العین سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اِس لیے کوئی مشکل اُن کے لیے سرکرنا ناممکن نہیں تھی۔

بنّے بھائی نے میکسم گورکی، رومین رولینڈ، آندرے مالرو، برٹرینڈ رسیل جیسے ادیبوں کو بڑی دِلچسپی سے پڑھا اور اُن سے اثر لیا۔ اِنہی کی بدولت سجاد ظہیر نے ملک کے شعراء اور ادیبوں کی انجمن کا قیام کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ لیکن ایسا کام اِتنا آسان نہیں ہوتا جتنا دِکھائی دیتا ہے۔ جناب خلیل الرحمٰن اعظمی جنہیں ترقی پسند تحریک کا پہلا مورخ مانا جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ فرانس میں جب سجاد ظہیر لوئی آراگوں سے بحث مباحثہ کر رہے تھے تو اُنہوں نے سجاد ظہیر کو یہ مشورہ دیا تھا کہ "ادیبوں اور مصنفوں کو منظم کرنا دشوار کام ہے۔ اگر اِس کام میں وسیع المشربی کا

اظہار نہ کیا گیا تو کامیابی مشکل ہے۔" یہ مشورہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا کیونکہ کچھ عرصے بعد ترقی پسند ادیبوں میں دو گروپ وجود میں آ گئے۔ ادیبوں میں ایسی تقسیم سیاسی اعتبار سے ہوئی۔ ایک گروپ حکومت سے تعاون کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ حکومت ایک قومی حکومت ہے۔ دوسرا گروپ صرف پارٹی کے منشور کے حق میں ہی تھا۔ دونوں گروپ ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈا کرنے لگے اور وہ لوگ جو اُن کے خیال سے اختلاف رکھتے تھے اُن پر رجعت پسندی کا الزام لگنے لگا۔ مثال کے طور پر فیض احمد فیض کی ایک بہت مشہور نظم ہے جس کا پہلا شعر ذیل میں درج ہے:

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اِس نظم کی علی سردار جعفری نے اپنے ایک مضمون 'ترقی پسندی کے بعض بنیادی مسائل' میں بُری طرح دھجیاں اُڑائی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ فیض ترقی پسند شاعر نہ تھے۔ اُنھوں نے تمام عمر سجاد ظہیر کا ساتھ دیا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے اِنعقاد میں پیش پیش رہے۔ پھر بھی اُن کی اِس نظم کے متعلق سردار جعفری لکھتے ہیں:

"پوری نظم میں اِس کا کہیں پتہ نہیں چلتا کہ سحر سے مراد عوامی آزادی کی سحر ہے اور منزل سے مراد عوامی اِنقلاب کی منزل۔ اِس نظم میں داغ داغ اُجالا ہے' شب گزیدہ سحر ہے' حسینانِ نور کا دامن ہے' فضا کا دشت ہے' تاروں کی آخری منزل ہے' نگارِ صبا ہے' چراغ سرِ راہ ہے' پکارتی ہوئی باہیں اور بلاتے ہوئے بدن ہیں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن نہیں ہے تو عوامی اِنقلاب اور عوامی آزادی' غلامی کا درد اور اِس درد کا مداوا۔ ایسی نظم تو ایک غیر ترقی پسند شاعر ہی کہہ سکتا ہے۔" (۴)

فیض کو یہ عبارت بالکل پسند نہیں آئی۔ اُس زمانے میں فیض اور سجاد ظہیر دونوں راولپنڈی سازش کیس میں جیل میں بند تھے۔ وہاں فیض نے کئی نظمیں اور غزلیں لکھیں جو بعد میں 'دست صبا' کے نام سے شائع ہوئیں۔ اُسی دوران فیض نے سجاد ظہیر کی رفیقۂ حیات رضیہ بیگم کو جیل سے ایک خط لکھا جس میں سردار جعفری کے مندرجہ بالا انتساب کے ردِعمل کی ایک جھلک مِلتی ہے۔ فیض اُس خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کی فرمائش پر بنّے نے میری نئی اور 'فضول' سی نظم غالباً آپ کو بھیج دی ہے۔ میں نے تو منع کیا تھا کہ مت بھیجنا۔ کہیں علی سردار جعفری کی نظر پڑھ گئی تو مجھ پر تنزل پسندی کا فتویٰ لگا دیگا۔ یوں بھی لوگ کہیں گے کہ ہمیں جیل میں بیٹھ کر محض گُل اور بُلبُل کی سوجھ رہی ہے حالانکہ لکھنے کو اور اتنی باتیں رکھی ہیں۔ بہرصورت آپ باتیں بناتے رہیئے۔ ہمارا اگر جیل میں عاشقانہ شعر لکھنے کا دِل چاہے گا تو ضرور لکھیں گے۔"(۵)

جذبی کے مجموعۂ کلام کا دوسرا ایڈیشن آزاد بک ڈپو، جامع مسجد دہلی نے 1951 میں شائع کیا تھا۔ اُس کے دیباچے میں معین الدین جذبی نے ترقی پسند ادیبوں کے متعلق اپنے خیالات کا اِظہار کچھ اِس طرح کیا ہے:

"اِدھر کچھ عرصے سے ترقی پسندوں میں ایک رجحان پیدا ہوگیا ہے جو بڑی حد تک تنگ نظری پر مُبنی ہے۔ حسن وعشق کا ذکر ترقی پسند مذہب میں گناہ ہے جو شاید ہی بخشا جائے۔ ترقی پسندی صرف سیاست کا نام ہے۔ حسن وعشق کے اِنفرادی جذبات ازل سے آج تک دلوں کو گرماتے رہے ہیں اور گرماتے رہیں گے"۔(۶)

اِس میں باقاعدہ طور پر ترقی پسند ادیبوں پر الزام لگائے جارہے تھے جو کچھ حد تک صحیح بھی تھے۔ لیکن زیادہ تر الزام بے بنیاد تھے۔ مثلاً بھمڑی (تھانہ) میں ترقی پسندوں کی ایک کل ہند کانفرنس 1946 میں ہوئی جس میں سجاد ظہیر موجود نہیں تھے۔ اِس کانفرنس میں 1936 کے مینی فیسٹو کو کافی نہیں سمجھا گیا تھا۔ یہ وہی مینی فیسٹو تھا جو 1936 کی کل ہند کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا۔ وہ کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تھی جس کی صدارت مُنشی پریم چند نے کی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ منشور کانفرنس میں پاس ہوجائے۔ اُس کانفرنس میں مولانا حسرت موہانی بھی شریک تھے۔ اُنہوں نے اصرار کیا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ممبر شپ صرف اور صرف اشتراکی ادیبوں تک ہی محدود کردی جائے اور جو لوگ کمیونسٹ پارٹی سے تعلق نہیں رکھتے اُنہیں اِس تحریک سے الگ رکھا جائے۔

باقی لوگوں کا جو بھی نظریہ تھا لیکن بنّے بھائی نے اِس کی سخت مخالفت کی۔ وہ جمہوری نظام کے

حامی تھے اور ترقی پسند تحریک بھی جمہوری تحریک تھی۔ اور اُس کا طریقہ کار بھی جمہوری تھا۔ وہ کہتے تھے حالانکہ کمیونسٹوں کا یہ خیال تھا کہ اُن کی تحریک بہت مہذب تحریک ہے اور ہر ملک اور قوم کے کمیونسٹ اپنے ملک اور قوم کی بہتری اور بہبودی کے لیے ہی سرگرداں ہیں۔ پھر بھی جو غیر کمیونسٹ ترقی پسند تحریک کے رُکن ہیں اُن کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کمیونسٹوں کی رائے سے اتفاق کریں۔ اِسی طرح جو ادیب اِس تحریک کا رُکن بن جاتا ہے چاہے اُس کے لیے لازمی ہے کہ وہ تحریک کے منشور پر پوری طرح عمل کرے تاہم اُس پر یہ پابندی بالکل نہیں کہ وہ اپنے دیگر عقائد سے الگ ہو جائے۔

یہ بات غور طلب ہے کہ جس وقت بنّے میاں ولایت میں تعلیم حاصل کر رہے تھے دنیا میں تاریخی اور سیاسی حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد تمام دنیا میں بڑے پیمانے پر ردوبدل ہوا۔ اِس ہلچل کی زد میں ہمارے ملک کو آنا بھی عین قدرتی بات تھی۔ جنگ کے بعد انگریز حکمرانوں نے نہایت غیر قانونی طریقے سے ملک کو لوٹا۔ جنگ کے بعد ملک کی اِقتصادی حالت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس لیے جنگ کی وجہ سے انگریزوں کو جو خسارہ ہوا اُس کی بھرپائی کے لیے اُنہوں نے ہندوستان کو لوٹنے کا منصوبہ بنایا۔ ہندوستان میں خام مال بنتا تھا یا جو زرعی پیداوار ہوتی تھی اُن کے دام بہت زیادہ گھٹا دیئے گئے جس سے کسانوں اور مزدوروں کی حالت خستہ ہو گئی۔ فیکٹریاں اور کارخانے بند ہو گئے۔ فوج اور پولس میں چھانٹی کی گئی جن کے نتیجے کے طور پر بے روزگاری حد سے زیادہ بڑھ گئی۔

اُدھر روس میں بھی ایک انقلاب رونما ہوا جس نے زارشاہی کا خاتمہ کر دیا۔ اِس اِنقلاب کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ پورے ایشیا میں جو محکوم قومیں تھیں اُن میں غلامی کا طوق اُتار پھینکنے کا جذبہ تیز ہو گیا۔ تُرکی اور ایران بھی اِس جدوجہد میں لگ گئے کہ کسی طرح وہ انگریز سامراجیوں سے اپنے ملک کو نجات دِلائیں۔ چین میں بھی آزادی کی تحریک زور پکڑنے لگی۔

عالمی سطح پر ہونے والی اِن سب تبدیلیوں نے بنّے بھائی کے شعور اور لاشعور دونوں پر گہرا اثر چھوڑا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ ملک کی عوام جو سامراجی، سرمایہ دارانہ اور رجعت پرست طاقتوں کی گرفت میں تڑپ رہی ہے اُسے آزاد کرانا ہر ادیب کا قومی فرض ہے۔ 1935 میں پیرس میں ورلڈ کانگریس آف دی رائٹرز فار دی ڈیفنس آف کلچر منعقد ہوئی جس میں میکسم گورکی، ہنری باربس، رومین

رولینڈ اور آندرے مارلو جیسے قد آور ادیب شامل ہوئے۔ سجاد ظہیر بھی وہاں ایک مشاہد کے طور پر حاضر رہے۔ وہاں یہ عہد لیا گیا کہ ادیب موت کی طاقتوں کے مقابلے میں قلم سے زندگی کی حفاظت کریں گے۔ سجاد ظہیر کی زندگی نے یہیں سے ایک نیا موڑ لیا اور بنّے بھائی نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک خوشحال زندگی پر جو وہ گزار رہے تھے اُس کے مقابلے میں عام آدمی کی زندگی کو ترجیح دینگے۔

لندن میں اپنے دس سالہ قیام کے دوران سجاد ظہیر رفتہ رفتہ بائیں بازوں کے ادیبوں کی طرف جھکنے لگے۔ اُن کے دِل میں اِنقلاب کا جذبہ گھر کرنے لگا۔ لیکن اِس انقلابی جذبے کی اِبتداء اُسی زمانے سے شروع نہیں ہوئی تھی بلکہ بہت پہلے سے لوگوں کے ذہنوں میں اِنقلاب کا بیج داخل ہو چکا تھا۔ 1920 میں کانگریس کا ایک اجلاس کلکتہ میں ہوا جس کی صدارت لالہ لاجپت رائے نے کی۔ ان کی تقریر جس کا ذکر رجنی پام دت نے اپنی کتاب 'انڈیا ٹوڈے' میں کیا ہے، اُنہوں نے کہا ہے:

> ''اِس حقیقت سے آنکھ چرانے سے کچھ فائدہ نہیں کہ ہم ایک اِنتہائی اِنقلابی دور سے گزر رہے ہیں۔ ہم فطرتاً اور روایت کے لحاظ سے اِنقلاب کے خلاف ہیں۔ ہماری روایت یہ ہے کہ ہم بڑی آہستہ خرامی سے چلتے ہیں لیکن جب چلتے ہیں تو بڑی تیز رفتاری کے ساتھ۔ دُنیا کی کوئی زندہ شے اپنی حیات میں اِنقلاب سے بچ کر بھاگ نہیں سکتی۔'' (۷)

پھر جلیان والا باغ کا وحشت ناک حادثہ ہوا جس کی وجہ سے زیادہ تر لوگ حکومت کے خلاف متحد ہو گئے اور جگہ جگہ اِس کے خلاف احتجاج ہونے لگا۔ نتیجہ کے طور پر تقریباً تیس ہزار ہندوستانی برطانوی جیلوں میں بند کر دیئے گئے۔ اِس شرم ناک واقعے کی ٹیس اب تک عوام اپنے دِلوں میں محسوس کر رہی ہے۔ اُسی زمانے میں یعنی 1917 میں روس میں اِنقلاب آیا جس کا اثر ساری دُنیا کے غلام ممالک پر پڑا اور لوگوں میں ایک اُمید پیدا ہوئی کہ وہ بھی اپنے ملک میں عوامی حکومت لا سکتے ہیں، رجنی پام دت نے اپنی کتاب 'انڈیا ٹوڈے' میں لوگوں کے جذبات کی خاطر خواہ عکاسی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ 1921 میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے ایک اعلان نامے میں مندرجہ ذیل مطالبہ کیا تھا:

> ''انقلاب سے ہندوستان کی بنیادیں ہل رہی ہیں اور اگر کانگریس اِس کی رہنمائی کرنا چاہتی ہے تو اسے صرف مظاہروں اور عارضی جوش وخروش پر تکیہ نہیں کرنا

چاہیے۔ اسے چاہیے کہ مزدور سبھاؤں کے مطالبات فوراً اپنے مطالبات بنالے۔ اسے چاہیے کہ کسان سبھاؤں کا جو پروگرام ہے اِسے اپنا پروگرام بنالے اور بہت جلد اِس کا وقت آئے گا کہ کوئی بھی رکاوٹ کانگریس کا راستہ نہیں روک سکے گی۔ اس کے ساتھ اِن عوام کی نا قابل مزاحمت قوت ہوگی جو پوری بیداری کے ساتھ اپنے مفاد کے لیے لڑ رہے ہوں گے۔"(۸)

مندرجہ بالا مطالبہ کمیونسٹ پارٹی نے جو نئی نئی وجود میں آئی تھی کانگریس کے اجلاس میں کیا تھا جو اجلاس احمد آباد میں منعقد ہوا تھا۔ اُسی زمانے میں مولانا حسرت موہانی نے مکمل آزادی یعنی Complete Freedom کا ریزولیوشن بھی رکھا جس کی مہاتما گاندھی کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی۔ اُنہوں نے اِسے غیر ذمہ دارانہ فعل قرار دیا۔ گاندھی جی کے اِس رویے سے اِنقلابی عناصر کو ٹھیس پہنچی اور اُنہوں نے کُھلے عام اپنی ناپسندی کا اِظہار کیا۔ لوگوں میں اِس کے خلاف غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ سبھاش چندر بوس نے بہت سخت الفاظ میں اِس کی مذمت کی۔ اُنہوں نے اپنی کتاب 'ہندوستان کی جدوجہد' میں کہا کہ:

"ایسے وقت میں پسپائی کا حکم دینا جب کہ عوام کا جوش اپنی اِنتہا پر پہنچ رہا تھا اِس سے بڑھ کر ملک کے لیے کوئی حادثہ ہو ہی نہیں سکتا۔ دیش بندھو گپتا' موتی لال نہرو اور لالہ لاجپت رائے وغیرہ جو اُس وقت جیل میں بند تھے سب کو اِتنا غصہ آیا جتنا اُس وقت عام لوگوں کو تھا۔ اُس وقت میں دیش بندھو کے ساتھ تھا اور میں دیکھتا تھا کہ وہ غصہ اور رنج سے کس قدر آپے سے باہر ہو گئے تھے۔"(۹)

لوگوں میں آزادی کا جذبہ دِن بہ دن بڑھنے لگا۔ مہاتما گاندھی کے عدم تشدد اور اہنسا کے درس کا یہ اثر ہوا کہ کافی تعداد میں لوگ بائیں بازوں کی تحریکوں میں شامل ہونے لگے۔ کانگریس میں بھی دو گروپ بن گئے۔ وہ جو اہنسا کے حامی تھے اور وہ جو سخت گیری کے حق میں تھے۔ بائیں بازوں کے گروپ میں بڑی تعداد مزدوروں اور کسانوں کی تھی جو اپنے مُطالبات کے لیے ایک جُٹ ہو کر جدوجہد کر رہے تھے۔ جگہ جگہ ٹریڈ یونین بننے لگیں جن میں عورتوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ بات دِلچسپ بھی ہے اور قابلِ غور بھی کہ جب سائمن کمیشن کے خلاف احتجاج ہوا تو عورتوں نے بھی

مظاہرہ کیا۔ تاہم ہندوستان میں اس وقت کمیونسٹوں کا حلقۂ اِقتدار کافی محدود تھا، لیکن جب 1917 میں جواہر لال نہرو یورپ کے دورے پر گئے تو اُن پر اشتراکیت کا کافی گہرا اثر ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1917 میں کانگریس کا جو اجلاس مدراس میں ہوا اُس میں مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کر دیا گیا۔ اُس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مہاتما گاندھی جنہوں نے مولانا حسرت موہانی کا مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس ہونے نہیں دیا تھا وہ اس اجلاس میں موجود نہیں تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اُس اجلاس میں بائیں بازو کے کانگریسیوں کا بہت غلبہ تھا۔ سبھاش چندر بوس لکھتے ہیں کہ جب مہاتما گاندھی نے مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس ہونے کی خبر سُنی تو سخت ناراض ہوئے اور کہا کہ یہ فیصلہ بنا سوچے سمجھے کیا گیا ہے۔ بائیں بازو کے کانگریسیوں کے سرغنہ پنڈت جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس ہونے کی وجہ سے اِشتراکیت کو بہت بڑھاوا ملا۔ اِس لیے جب کانگریس نے 1928 میں کلکتہ میں اجلاس کیا اور گاندھی جی کے اصرار پر مکمل آزادی کی تحریک کو ملتوی کر دیا تو کانگریس کے اِس فیصلے کے خلاف ہزاروں مزدوروں نے مظاہرہ کیا اور کئی گھنٹے تک اجلاس کا کوئی کام نہیں ہونے دیا۔ عدم تعاون کی جدوجہد اِس حد تک زور پکڑ رہی تھی کہ برطانوی حکومت کو تشویش ہونے لگی۔ رجنی پام دت اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ وائسرائے نے اِس اثنا میں وزیر ہند کے نام ایک تار بھیجا جس میں اپنی تشویش کا اِظہار کچھ ایسے کیا:

''عدم تعان کی تحریک سے شہر کا نچلہ طبقہ بے حد متاثر ہوا ہے۔ بعض حصوں میں کسانوں پر بھی اِس کا خاص اثر پڑا ہے۔ آسام کی وادی' صوبہ متحدہ' اُڑیسہ اور بنگال میں اور پنجاب کی اکالی تحریک دیہات کے کسانوں تک پہنچ چکی ہے۔ ملک کی مسلمان آبادی کا بڑا حصہ سخت ناراض ہے اور اِس میں بڑی تلخی ہے۔ حالات کافی پریشان کُن ہیں۔'' (۱۰)

لیکن لوگ اِس بات پر تلے ہوئے تھے کہ اُنہیں مکمل آزادی ہی چاہیئے۔ اِس لیے کانگریس زیادہ عرصے تک لوگوں کے جذبات کو نظر انداز نہ کر سکی اور 1929 کے لاہور اجلاس میں مکمل آزادی کے ریزولیوشن کو منظوری دے دی گئی۔

اوپر کے حالات واضح کر رہے ہیں کہ سجاد ظہیر کی ترقی پسند تحریک سے بہت پہلے آزادی کی

تحریک کافی زور پکڑ چکی تھی جس سے سجاد ظہیر کے لیے زمین ہموار ہوگئی تھی۔ ہاں یہ فرق ضرور تھا کہ سجاد ظہیر ادب کا سہارا لے کر عوام کو بیدار کرنا چاہتے تھے تا کہ اُنہیں احساس ہو کہ آزادی اُن کا حق ہے لیکن سجاد ظہیر سے پہلے جو بھی جدو جہد کی گئی وہ محض سیاسی نوعیت کی تھی۔ سجاد ظہیر نے شاعروں اور ادیبوں کو یکجا کیا کہ وہ ادب کی معرفت آزادی کی جنگ میں شامل ہوں۔ ان سرگرمیوں کا اردو ادب پر بھی اثر پڑا۔ اگر چہ روایتی شاعری برقرار رہی لیکن اِس سے قدم ملا کر حب الوطنی اور آزادی کے نغمے بھی گونجنے لگے۔ اقبال اور چکبست کے نغمے مقبولیت کی بُلندیوں کو چھونے لگے اور ہندوستانی عوام خاص کر نوجوان طبقہ اِس سے لُطف اندوز ہونے لگا۔ ایک وقت تھا جب غزل کو کسی شاعر کے فن کا پیمانہ مانا جاتا تھا مگر اب وہ اپنا وقار کھونے لگی اور شاعر نئی اور معریٰ نظم سے بغلگیر ہونے لگے۔ حالیؔ اقبال اور آزاد نے نظم پر اپنا اعتماد ظاہر کیا تو بیشتر شاعروں کو یہ بات بہت پسند آئی کہ نظم کے حوالے سے بھی جذبات کا اِظہار بڑی خوبی سے کیا جاسکتا ہے۔ اِس لیے ترقی پسند حلقے نے دانشورانہ سوجھ بوجھ سے کام لے کر نظم کو اپنی تخلیق کا ذریعہ بنانے کا فیصلہ کیا اور اُس کی مختلف ہیئتوں کو اپنی شاعرانہ تخلیقات میں استعمال کیا۔ لہٰذا جب ترقی پسندوں کا دور شروع ہوا تو اُن کے لیے اردو ادب جس میں نظم اور نثر دونوں شامل ہیں اُس کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا تھا۔ ہنے بھائی کی موجودگی سے بہت پہلے محنت کش اور مزدور طبقے کو موضوع بنا کر کئی تحریریں وجود میں آئیں۔ 1908 میں منشی پریم چند کی کہانیوں کا مجموعہ 'سوزِ وطن' کے نام سے شائع ہوا جسے نہ صرف ضبط کرلیا گیا بلکہ حکومت نے اُس کی ساری کاپیاں جلا ڈالیں۔ لیکن اِس سے پریم چند کو اور ہمت ملی اور اُنہوں نے اپنی اردو کہانیوں میں پسماندہ طبقے کے زخموں کو سمونے کا علم بلند کیا۔ شبلی نے بھی بلقان کے ہنگامے کے بارے میں ایک نظم لکھی جسے بھی ضبط کرلیا گیا۔ اِقبال کی ابتدائی نظم 'خضرِ راہ' بھی اِسی موضوع پر تخلیق کی گئی۔ اقبال کے شاعرانہ مجموعے میں ایسی نظموں کی بھرمار ہے۔ 'ساقی نامہ' 'لینن خدا کے حضور میں' 'فرمان خدا کا فرشتوں کے نام' اور 'مسجدِ قرطبہ' چند ایسی مثالیں ہیں جن میں غلامی کے خلاف آواز اُٹھائی گئی ہے اور نوجوان نسل کو یہ درس دیا گیا ہے کہ ملک وقوم کے لیے مر مِٹنا اُن کا اخلاقی فرض ہے۔ عورتوں کی تعلیم اور اُن کی ذاتی آزادی کی طرف بھی روشن خیالی سے دیکھا جارہا تھا۔ سروجنی نائیڈو اور اینی بسنت کانگریسی رہنماؤں کے ساتھ مل کر ایسی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں جس میں ملک کے

دبے ہوئے اِنسانوں کی رہنمائی مقصود تھی۔ کالج کے طالبِ علموں میں تو یہ ایک فیشن بن گیا تھا کہ جو لٹریچر امریکہ کی آزادی، فرانس اور روس کے انقلابوں کے متعلق لکھا گیا ہو اُسے ضرور پڑھتے تھے۔ ابراہم لنکن، روسو، والٹیر، کارل مارکس، لینن وغیرہ اُن کے محبوب اور دِل پسند ہیرو تھے۔

سجاد ظہیر پر بھی ملکی اور غیر ملکی ردو بدل اور علم وادب میں ظہور پذیر ہونے والی تبدیلیوں نے کافی اثر کیا۔ اِسلیے وہ اُن تحریکوں میں زیادہ دِلچسپی لینے لگے جن کا تعلق آزادی سے تھا۔ اُنہوں نے اپنے ایک مضمون 'یادیں' میں لندن میں اپنے قیام کا ذکر کیا ہے جس میں یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح کمیونسٹ پارٹی کے زیر اثر اُنہوں نے لندن میں ہندوستان سے آئے طالب علموں کو اِکٹھا کر کے اُنہیں منظم تحریک میں شامل کیا۔ وہاں اُنہوں نے سامراجی طاقتوں کے خلاف جلوس بھی نکالے اور خود بھی باقاعدہ طور پر برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بنے۔ وہیں پر اُن کی صلاحتیں نشونما پانے لگیں اور اُنہوں نے اپنی عملی اور تنظیمی دونوں قابلیتوں پر عبور حاصل کیا۔

ایک خوشحال گھرانے کا لڑکا اپنی مرضی سے ایسی فقیری کی زندگی بسر کر سکتا ہے یہ سُن کر تعجب ہوتا ہے۔ وزیر حسن خود بھی قوم پرست تھے لیکن ہر معاملے میں احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اِس کے باوجود بھی اُنہوں نے اپنے بچوں کو ولایت میں اعلیٰ تعلیم دِلوائی اور اُن پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں لگائی۔ سنکر تیائن کے مطابق بچپن میں ہی وہ سیاسی سوجھ سمجھ رکھنے لگے تھے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد ہی یعنی 1922 میں ہندوستان میں ہنگامہ خیز مناظر سامنے آئے۔ رولٹ بل کی مخالفت ہوئی۔ جلیان والا باغ کا دہل ناک حادثہ ہوا۔ اُسی زمانے میں گاندھی جی کی ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی جس کی وجہ سے طالبِ علموں نے اپنے اداروں کا بائیکاٹ کر دیا۔ غیر ملکی اشیاء کا بائیکاٹ ہوا اور کانگریس کو غیر قانونی جماعت ٹھہرایا گیا۔ اِن تمام واقعات کا مجموعی اثر نوجوان سجاد ظہیر کے ذہن پر گہری چھاپ چھوڑ گیا جس کے زیر اثر سجاد ظہیر کے دِل میں برطانوی حکومت کے خلاف سخت نفرت پیدا ہوگئی۔ روز بروز آزادی کا جذبہ اُن کے دل میں پھیلتا جا رہا تھا اور وہ اُس زمانے سے ہی اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے کہ ملک اپنی آزادی کی تئیں جو بھی قربانیاں مانگے وہ اُسے دے سکیں۔ لندن پہنچ کر بنے بھائی اِن جذبات کو عملی جامہ پہنانے لگے۔ اِس نقطۂ نظر سے اُنہوں نے ہندوستانی طالبِ علموں کا بہت نزدیک سے مشاہدہ کیا اور اُن میں سے کئی طلبا کے دِل میں حب الوطنی کے خیالات کو

پیدا کیا۔ وقت کے ساتھ یہ گروپ ایک پُر اثر ہتھیار بن گیا۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے سامراجی اور جاگیردارانہ نظام کو دھکا لگانا بہت ضروری تھا، کیونکہ تب تک معاشرہ انہی کے زیرِ سایہ پل رہا تھا۔

جب پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو آزادی کی تحریک کی رہنمائی کانگریس کر رہی تھی۔ کانگریس نے انگریزوں کے جھوٹے وعدوں کا یقین کیا اور جنگ میں اُن کا ساتھ دیا۔ جیسے ہی جنگ ختم ہوئی روس میں اِنقلاب اُٹھا جس نے وہاں کے حکمران زار کا تختہ پلٹ دیا اور روس میں عوامی حکومت قائم ہوگئی۔ ہندوستان اور دوسرے ممالک میں بھی اِس جنگ کے بعد آزادی کی لہر تیز ہوگئی۔ انگریزوں نے وعدہ خلافی کی جس کے نتیجے کے طور پر تمام ہندوستانی عوام یک مُشت ہو کر آزادی کے حق میں کھڑی ہوگئی۔ ایک تحریک شروع ہوگئی جو سامراجی سماج کی دُشمن تھی۔ اس میں ہندو مسلم متحد تھے۔ خلافت کی تحریک نے اور گاندھی جی اور علی برادران نے ہندوستان کو جھنجوڑ کر جگا دیا۔ مجموعی طور پر اِن حالات نے ملک کے ہر خطے اور ہر طبقے کو اثر انداز کیا۔

اردو ادب پر بھی اس کا گہرا اثر پڑا۔ ہمارے ادیبوں اور دانشوروں کا نقطۂ نظر بدلنے لگا۔ حالانکہ شعر و ادب کی ہماری پرانی روایت بھی برقرار تھی تاہم اُس کی تاثیر زائل ہونی شروع ہوگئی تھی۔ ملک اور قوم کے تصور کو فروغ مل رہا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی اخبار 'الہلال' اور ظفر علی خان کے 'زمیندار' کو ہندوستانی نوجوان بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھنے لگے تھے۔ اور پھر ہندوستان کے اُس وقت کے سب سے مشہور شاعر اور فلسفی محمد اقبال بھی اِس تحریک کی رہنمائی کرنے لگے تھے۔ سبطِ حسن جو ترقی پسند تحریک میں سجاد ظہیر سے جُڑے ہوئے تھے اور جنہیں ایک بار اِقبال سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا تھا لکھتے ہیں کہ اِقبال نے فکر پر ایک روشن دریچہ کھول دیا۔ یہ بھی کہ اب تک جو اِنسان گناہ کی پاداش بھگت رہا تھا اِقبال نے اُسے وجہِ تخلیقِ کائنات قرار دیا۔ اگرچہ مغربی ممالک میں ترقی کا تصور اٹھارہویں صدی کے بعد زور پکڑ گیا تھا اور بہت تیزی سے مقبول ہونے لگا تھا لیکن اِقبال سے پہلے ہمارے ملک میں ایسا تصور کہیں نہیں ملتا۔ اِقبال نے ہی جدید تصورات سے ہماری فکر کو روشناس کرایا۔ یہ بات بھی اپنی مثال خود ہی ہے کہ اُنھوں نے اِن جدید خیالات کو اپنی شاعری اور اپنے ادب میں ایسی ہُنرمندی سے ڈھالا جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ سبطِ حسن لکھتے ہیں:

''میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ ترقی پسند شاعری اپنی تمام توانائی، دلکشی، نمو

پذیری اور حقیقت آفرینی کے باوجود ملوکیت' سرمایہ داری' سامراج اور محنت پر جو کچھ اقبال نے لکھ دیا ہے اِس کے پاسنگ برابر ایک نظم بھی اپنے ہاں سے پیش نہیں کرسکتی۔ اقبال نے اصل میں اُس میکنزم کو سمجھ لیا تھا جس کے ذریعے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ سماج میں محنت کش کا اِستحصال ہوتا ہے۔ وہ یہ جان گئے تھے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں قدرِ فاضل کیسے پیدا ہوتی ہے۔ اِس لیے اِن کی نظموں کا content اِنتہائی طاقتور اور حقیقت پسندانہ رہا ہے اور اِس content کے اِظہار کے لیے اُنہوں نے جو پیکر تراشے ہیں وہ بھی اِتنے ہی دلکش ہیں۔ ورنہ اِقبال کی شاعری بھی تاثیر سے عاری رہ جاتی۔ ابھی تک اِقبال کے امکانات اور اثرات کو صحیح طور پر دریافت نہیں کیا گیا اور اُنہیں متنازعہ موشگافیوں میں اُلجھا دیا گیا ہے۔ ہم تو اِقبال کو اِن سارے تضادات کے ساتھ اپنا ہی شاعر سمجھتے ہیں۔ اِن کے ہاں جو خوبیاں ہیں وہ ہمارے لیے قابلِ تقلید ہیں۔"(۱۱)

اِس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال اِنتہائی روشن خیال ادیب تھے۔ سبطِ حسن لکھتے ہیں کہ اِقبال کا جو تصورِ کائنات ہے ایک عام مُلّا کے لیے جو ہر قسم کی فکری آزادی کا دُشمن ہے کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ لیکن اقبال وقت سے بھی آگے سوچنے والے مفکر تھے۔ چنانچہ'بال جبریل' میں اقبال کے زیادہ تر اشعار موجودہ مسائل پر ہی ہیں۔ ایسے بھی کافی اشعار ہیں جو روس کے متعلق اور لینن اور مارکس کے بارے میں ہیں۔ یہ بھی مانا جاتا ہیں کہ اِقبال کے ہاں ارتقاء اور حرکت کا جو تصور ہے وہ اِنتہائی اِنقلابی اور نیا ہے۔ اِنسان کا تصور بھی اُن کی شاعری میں بالکل نیا ہے اور یہ مروجہ تصورات سے الگ تھلگ اور جدید ترین ہے۔

ترقی پسند تحریک کے پس پشت جو مندرجہ بالا تبدیلیاں ظہور میں آئیں اُن کے علاوہ تہذیب کے دوسرے شعبوں میں بھی گراں گیر تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ موسیقی جو بادشاہوں کے ختم ہوجانے کے بعد تقریباً بستر مرگ پر پڑی تھی پھر سے زندہ ہوگئی۔ میوزک کے مختلف ادارے وجود میں آئے اور میوزک کی بڑی بڑی کانفرنسیں ہونے لگیں۔ یعنی ایک بار پھر موسیقی لوگوں کی زندگی کا حصہ

بن گئی۔ اِسی طرح تصویر کشی اور تھیٹر بھی مقبول ہوئے اور یہ تمام تہذیبی مناظر منظرِ عام پر آئے اور اِن کا رُخ قوم اور وطن کی طرف مائل ہوا۔

لہٰذا ہر لحاظ سے عوام تبدیلی کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہو چکی تھی۔ اِس لیے سجاد ظہیر کو اِنقلاب لانے میں کسی خاص مشکل کا سامنا کم سے کم ہندوستانی عوام کی طرف سے نہ کرنا پڑا۔ اُس زمانے کے جتنے بڑے شاعر اور ادیب تھے جیسے فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجاز لکھنوی، جوش ملیح آبادی، منشی پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ سب نے اِس کو اپنا تعاون دل کھول کر دیا۔ اِس کے علاوہ ڈاکٹر محمد اشرف، ڈاکٹر دین محمد تاثیر، فیروز الدین منصور، پروفیسر سنت سنگھ وغیرہ بھی اس میں شامل رہے اور اسی لیے شاعروں اور ادیبوں نے ملک کی دبی ہوئی عوام کو جاگیرداری، سرمایہ داری اور سامراجی نظام سے نجات دلانے کا بیڑا اُٹھایا۔

☆☆☆☆☆☆

﴾کتابیات﴿

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر/پبلیشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱)	آشنائیاں کیا کیا	حمید اختر	بک ہوم، لاہور	2008	09
۲)	آشنائیاں کیا کیا	حمید اختر	بک ہوم، لاہور	2008	18
۳)	آشنائیاں کیا کیا	حمید اختر	بک ہوم، لاہور	2008	32
۴)	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی	2008	112
۵)	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی	2008	113
۶)	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی	2008	114
۷)	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی	2008	27
۸)	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی	2008	28
۹)	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی	2008	29
۱۰)۸)	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی	2008	30
۱۱)	ادب اور روشن خیالی	سبط حسن	مکتبہ دانیال، کراچی	1990	147

☆☆☆☆

۴۔ادبی خدمات۔تحریریں۔رسائل وجرائد

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد 1935 میں لندن میں رکھی گئی تھی۔انگریزی میں اسے Porgressive Writers Association کے نام سے جانا جاتا تھا۔قیام کے بعد انجمن کی نشستیں بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہر ماہ ہونے لگی تھیں۔لندن میں جو ہندوستانی طلبا آئے ہوئے تھے وہ مختلف صوبوں کے رہنے والے تھے اور الگ الگ زبانیں بولتے تھے۔ایسے بہت سے لوگ انجمن میں شریک ہو گئے۔یہ پہلے بھی کہا گیا ہے کہ 1935 میں پیرس میں نئے ادیبوں کی ایک کانفرنس ہوئی تھی جس کا نام World conference of the writers for defence of culture تھا۔اس کانفرنس میں جنہوں نے شرکت کی وہ دنیا کے شعرۂ آفاق ادیب تھے۔اس کانفرنس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ دنیا کے تمام امن پسند ادیبوں اور دانشوروں کو اکٹھا کیا جائے۔سجاد ظہیر اور ملک راج آنند اس کانفرنس میں بطور مشاہد (observer) شریک ہوئے تھے۔ان دونوں کے اوپر اس تنظیم کا بہت گہرا اثر ہوا۔اس کانفرنس کے بارے سجاد ظہیر خود لکھتے ہیں کہ:

''یہ پہلا موقع تھا جب قریب قریب دنیا کی ہر مہذب قوم کے ادیب باہم صلاح مشورے کے لیے ایک مقام پر جمع ہوئے تھے۔انہوں نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ تہذیب وتمدن کو رجعت پسندی اور تنزل کی اُٹھتی ہوئی لہر سے بچانے کے لیے اپنی انفرادیت کو خیر باد کہہ کر اپنی جماعت کو منظم کرنا ضروری

ہے۔صرف یہی ایک موثر طریقہ ہے جس کے ذریعے سے وہ ترقی اور فلاح کی قوتوں کی مدد کر سکتے ہیں۔اپنی تخلیقی صلاحیت کو افزائش اور نشوونما کا پورا پورا موقع دے سکتے ہیں اور اس طرح جماعتی حیثیت سے اپنی ہستی کو ایک انقلاب انگیز عہد میں فنا ہو جانے سے بچا سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اتنی بڑی کانفرنس میں مختلف خیال اور عقیدے کے ادیب جمع تھے۔لیکن ایک چیز کے بارے میں جس پر سب متفق تھے وہ یہ تھی کہ ادیبوں کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ آزادی خیال اور رائے کے حق کے تحفظ کی کوشش کرنی چاہیے۔فاشزم یا سامراجی قوتیں جہاں بھی ادیبوں پر جابرانہ پابندیاں عائد کریں یا ان کے خیالات کی بنا پر ان پر ظلم کریں، اس کے خلاف پُرزور احتجاج کرنا۔دوسری چیز جو اس کانفرنس میں سب محسوس کرتے تھے، یہ تھی کہ ادیب اپنے حقوق کا بہترین تحفظ اسی حالت میں کر سکتے ہیں جب وہ عوامی آزادی کے 'متحدہ محاذ' کا جزو بن کر محنت کش طبقوں کی پشت پناہی حاصل کریں۔"(۱)

مندرجہ بالا کانفرنس میں شمولیت کے بعد سجاد ظہیر نے زندگی کی طرف اپنا نقطۂ نظر قائم کر لیا اور عوام کی فلاح و بہبودی میں جی جان سے لگ گئے۔جب کمیونسٹ پارٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ دائیں بازو کی سیاست کا اثر پھیلنے سے روکا جائے تو سجاد ظہیر نے پنڈت نہرو سے تعاون کیا اور کانگریس میں فارن افیرز اور رابطہ عامہ (mass contact) کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی۔بعد میں 1939 میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی کل وقتی رکنیت اختیار کی۔اس کے فوراً بعد بمبئی شاخ کے سکریٹری بھی مقرر ہوئے۔ پھر 1939 میں دہلی برانچ کے سکریٹری بھی بنے۔اس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد تھی اس لیے انہیں انڈر گراؤنڈ رہ کر سرگرمیوں میں شریک ہونا پڑتا تھا۔تاہم جب 1942 میں یہ پابندی اُٹھالی گئی تو وہ ایک عام سیاسی کارکن کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔

جب وہ لندن میں تھے تو وہاں کے ہندوستانی طلبا نے ایک انگریزی جریدہ 'بھارت' کے نام سے نکالا تھا۔سجاد ظہیر اس کے مدیر تھے۔جب کمیونسٹ پارٹی نے اپنا رسالہ 'قومی جنگ' نکالا جو بیک وقت اردو'انگریزی' بنگالی' مراٹھی اور ہندی زبانوں میں شائع ہوتا تھا تو اُس کے مدیر بھی سجاد ظہیر

ہی مقرر ہوئے۔ ویسے تو اس ادارے کے ایڈیٹوریل بورڈ میں بڑے نامور ادیب تھے جیسے علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، سبطِ حسن، ظ۔ انصاری، محمد مہدی وغیرہ لیکن اُس کے چیف ایڈیٹر سجاد ظہیر ہی تھے۔ چونکہ تمام بڑے ادیب 'قومی جنگ' کے لیے لکھتے تھے اور سجاد ظہیر کے اپنے مقالہ جات وغیرہ بھی اس میں باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے اس لیے بہت کم عرصے میں 'قومی جنگ' کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ اس رسالے میں عالمی حالات پر بڑی قدردانی سے بحث مباحثے ہوتے تھے اور ہر طرح کے ردِعمل پر نئے انداز سے غور کیا جاتا تھا۔ اس وجہ سے بھی 'قومی جنگ' بہت مقبول ہوا۔ جب کمیونسٹ پارٹی سے پابندی ہٹالی گئی تو 'قومی جنگ' پارٹی کے ترجمان کی حیثیت سے اردو کا پہلا ہفتہ وار اُبھر کر آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مقبول عام ہوگیا۔ دوسری عالمگیر جنگ کے اختتام پر اس رسالے کا نام بدل کر 'نیا زمانہ' رکھ دیا گیا۔ اس کے چیف ایڈیٹر بھی سجاد ظہیر ہی ٹھہرائے گئے تھے۔ 'نیا زمانہ' کو بھی وہی شہرت حاصل ہوئی جو 'قومی جنگ' کو ملی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی زبان عام فہم اور سادہ تھی اور اس نے انہی قدروں کو مستحکم کرنے کی کوشش کی جو مولانا ابوالکلام آزاد اور ان جیسے دوسرے نامور صحافیوں نے کی تھیں۔ 'نیا زمانہ' کی صحافتی خوبیوں کا بیان کرتے ہوئے سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

> ''دوسری عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد اس ہفتہ وار 'قومی جنگ' کا نام 'نیا زمانہ' ہوگیا۔ گو کہ ہم کو سخت مالی دشواریوں کا سامنا تھا لیکن بہت جلد ہمارا ہفتہ وار عام طور سے ملک کا سب سے اچھا ہفتہ وار مانا جانے لگا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے تحریر دے کر اس امر کا اعتراف کیا اور کہا کہ سیاسی اختلاف سے قطع نظر صحافت کے اعتبار سے 'نیا زمانہ' اردو کا سب سے اچھا ہفتہ وار ہے۔ ہم نجی طور پر اس پر فخر کرتے تھے۔ ہمارے ادارے میں جو صاحبان وقتاً فوقتاً کام کرتے تھے (40 روپے ماہانہ کی اجرت پر) ان کے نام سے لوگ واقف ہیں۔ ہمارے ہفتہ وار کی اشاعت اپنے عروج کے زمانے میں ایک ہزار سے بھی زائد تھی۔'' (۲)

1935 میں ہی سہانپور کی پارٹی برانچ نے ایک ماہنامہ 'چنگاری' نکالا اور اس کی ادارت بھی سجاد ظہیر کو سونپی گئی۔ یعنی جہاں بھی ادبی اور صحافتی صلاحیتیں درکار ہوتی تھیں وہاں سجاد ظہیر کا نام پیش پیش ہوتا تھا۔ 'نیا ادب' کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ یہ رسالہ آفیشل (Official) طور پر ترقی پسند

مصنفین کی انجمن کا ترجمان تو نہیں تھا لیکن وہ غیر رسمی طور پر اور فی الحقیقت جلد اس تحریک کا ترجمان بن گیا۔ 'نیا ادب' کے معاونوں میں جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ شامل تھے۔ بعد میں جب جوش صاحب کا 'حکیم' بند ہو گیا۔ تو 'حکیم' کا نام بھی 'نیا ادب' سے جوڑ دیا گیا اور جوش صاحب کو اس کا مدیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔ سجاد ظہیر کہتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ 'نیا ادب' کے اصلی چلانے والے صرف تین ادیب یعنی سبطِ حسن، سردار جعفری اور مجاز ہی تھے۔ باوجود سخت گیر مشکلات کے یہ لوگ کافی عرصہ تک 'نیا ادب' نکالنے اور جاری رکھنے میں کامیاب رہے اور یہ رسالہ 1942 کے اواخر تک جاری رہا۔ چونکہ یہ رسالہ لکھنؤ سے نکلتا تھا اس لیے وہاں کے ادیبوں نے ایک ادارہ بھی قائم کیا جو ترقی پسند ادب کی کتابیں چھاپنے لگا۔ اس ادارے کا نام 'حلقۂ ادب' رکھا اور سب سے پہلے مجاز کے کلام کا مجموعہ 'آہنگ' حیات انصاری کے افسانوں کا مجموعہ 'انوکھی مصیبت' سردار جعفری کے افسانوں کا مجموعہ 'منزل' اور سجاد ظہیر کا ناول 'لندن کی ایک رات' کو شائع کیا۔ اسی ادارے نے ایک مجموعہ 'آزادی کی نظمیں' نام سے بھی شائع کیا جس کو سبطِ حسن نے ترتیب دیا تھا۔ اس مجموعہ کے بارے میں سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

> ''اس ادارے نے 'آزادی کی نظمیں' کے نام سے ایک مجموعہ بھی شائع کیا جسے سبطِ حسن نے ترتیب کیا تھا اور جس میں غالب سے لے کر اس وقت تک کی اردو کی سیاسی اور انقلابی نظموں کا انتخاب تھا۔ جب 'آزادی کی نظمیں' شائع ہوئیں، اس وقت دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو چکی تھی۔ میں لکھنؤ جیل میں گرفتار تھا، سبطِ حسن مجھ سے ملنے کے لیے آئے اور پھلوں اور سگریٹوں کے تحفے کے ساتھ مجھے اس کتاب کی ایک کاپی بھی دی۔ اس تشدد اور ابتلاء کے دور میں 'نیا ادب' اور ترقی پسند کتابوں کی اشاعت کو جاری رکھنا دراصل بڑی ہمت کا کام تھا۔ آزادی کی نظمیں پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور دل مضبوط ہوا۔ کوئی شخص اسے پڑھنے کے بعد یہ نہیں کہہ سکتا کہ اردو ادب کے بہترین خلاقوں نے وطن کی آزادی کی جدوجہد میں اس کے ہر موڑ پر اپنی قوم کے بلند ترین جذبات اور خواہشات کی پر جوش ترجمانی نہیں کی ہے۔ اس مجموعے میں

دوسری عالمگیر جنگ کے موضوعات تک نظمیں تھیں، جوش صاحب کی 'ایسٹ انڈیا کمپنی کی فرزندوں سے خطاب' اور سردار جعفری کی تازہ ترین نظم جس کا پر جوش آغاز اس شعر سے ہوا تھا۔

رقص کرائے روح آزادی کہ رقصاں ہے حیات
گھومتی ہے وقت کے محور پر ساری کائنات

اس نظم کے لکھے جانے کے تھوڑے ہی دن بعد سردار جعفری گرفتار کر لیے گئے۔ اب سبطِ حسن اکیلے رہ گئے۔ البتہ اس زمانے میں 'نیا ادب' کے چلانے میں رضا انصاری (فرنگی محل) کی مدد بہت کچھ شامل تھی۔'' (۳)

اکثر ایسا ہوا ہے کہ اردو کا کوئی بھی رسالہ جو ترقی پسند تحریک کی نمائندگی کرنے کے لیے نکالا جاتا تھا یا جس میں ترقی پسند ادیبوں کے کارنامے شائع ہوتے تھے اُس کی ادارت کا کام سجاد ظہیر کو ہی دیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے اردو اخباروں جیسے 'قومی جنگ' اور 'نیا زمانہ' کی ادارت سجاد ظہیر نے ہی کی تھی۔ 1959 کے آخر میں ایک اور ہفتہ وار اخبار 'عوامی دور' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ کمیونسٹ پارٹی کا اخبار تھا اور اس کے مدیر بھی سجاد ظہیر ہی تھے۔ ابتدا سے ہی 'عوامی دور' مالی دشواریوں میں مبتلا ہو گیا تھا اور یہ مشکلیں بڑھتی چلی گئیں۔ سجاد ظہیر نے بے حد کوشش کی کہ یہ ہفتہ وار دم توڑنے نہ پائے لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ 'عوامی دور' جو دسمبر 1959 میں شروع ہوا تھا بالآخر 1963 میں بند ہو گیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد انہوں نے 'حیات' کے نام سے ایک اور پرچہ شائع کیا لیکن یہ پرچہ بھی مالی مشکلات میں اُلجھا رہا اور اس وجہ سے زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔

سجاد ظہیر نے سینکڑوں مضامیں اور اداریے قلمبند کیے جو 'قومی جنگ' 'نیا زمانہ' 'عوامی دور' اور 'حیات' میں بھی شائع ہوئے۔ ان کی کئی تحریریں 'نیا ادب' 'شاہراہ' 'ادب لطیف' 'صبا' اور کئی دیگر پرچوں میں بھی شائع ہوئیں۔ بدقسمتی سے ان کے مضامین، اداریے اور تحریریں مختلف پرچہ جات میں بکھرے پڑے رہ گئے اور کسی نے انہیں یکجا نہیں کیا۔ ڈاکٹر نصیر الدین ازہر نے ان کے مضامین کی ایک فہرست تیار کرنے کی کوشش کی ہے جس میں بانوے (92) مضامین شامل ہیں لیکن یہ فہرست بالکل نامکمل ہے۔ سید مظہر جمیل نے بھی ان کی منتشر تحریروں کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں

نے ایسے مضامین کی ایک فہرست بذاتِ خود تیار کی ہے جس میں سو سے زیادہ مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین سجاد ظہیر نے مختلف ادبی موضوعات اور سیاسی مسائل پر لکھے ہیں اور جو الگ الگ رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں مگر آج تک انہیں کسی کتابی صورت میں اکٹھا نہیں کیا گیا۔ سید مظہر جمیل نے منجملہ 161 مضامین کی لسٹ تیار کی ہے جو اُنکی کتاب 'انگارے سے پگھلا نیلم تک' میں درج ہے۔ لیکن جو مضامین اس میں شامل کیے گئے ہیں اُن کے علاوہ بھی بہت سے مضامین اور تحریریں ہیں جو بکھری ہوئی ہیں اور جن کا کسی کو علم نہیں ہے۔ انہوں نے جو رسائل و جرائد کے اداریے لکھے ہیں انکی تعداد بھی دو ڈھائی سو کے قریب ہوگی۔ علاوہ ازیں سجاد ظہیر نے جو خطوط لکھے ہیں انکی تعداد بھی ہزاروں میں ہے۔ 'نقوش زنداں' میں صرف اکیاسی (81) خطوط شامل کیے گئے ہیں۔ دیگر خطوط آج تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے۔

قدرت نے سجاد ظہیر کو جو ادبی یا صحافتی خوبیاں بخشی تھیں وہ انہیں پوری طرح عمل میں نہیں لا سکے۔ وجہ یہ تھی کہ ان پر کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند ادب کا اتنا بھاری بوجھ تھا کہ وہ اپنی پوری توجہ ادب اور اپنی تخلیقات کی طرف نہ دے سکے۔ ان کی ذاتی تخلیق شدہ ادبیات کی تفصیل بہت مختصر ہے۔ ان کا سب سے پہلا شاہکار 'انگارے' ہے جو افسانوں کا مجموعہ ہے اور جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اس میں سجاد ظہیر کے علاوہ رشید جہاں، محمود الظفر اور احمد علی کی کہانیاں شامل ہیں۔ ان کی دوسری کتاب ایک ناولٹ ہے جو انہوں نے لندن سے ہندوستان واپسی پر لکھا اور اُسے 'لندن کی ایک رات' کا نام دیا۔ اس کے بعد کافی عرصہ انہوں نے سوائے چند مضامین اور تحریروں کے کوئی محرکتہ الآرہ ادبی کارنامہ نہیں کیا۔ 1947 میں ملک کے بٹوارے سے پاکستان کا قیام ہوا تو انہیں پارٹی کی طرف سے پاکستان بھیجا گیا کہ وہاں وہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی تنظیم کریں۔ وہاں وہ راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے اور 1955 تک کا عرصہ قید زنداں میں گزارا۔ اس دوران انہوں نے دو نہایت اہم کتابیں لکھیں ایک کا نام 'روشنائی' رکھا جو ترقی پسند تحریک کی روداد بیان کرتی ہے۔ دوسری کتاب کا نام 'ذکر حافظ' رکھا جو حافظ شیرازی کی شاعری پر نہایت بلند پائے کی تنقید ہے۔ سید سجاد ظہیر کی تصنیفات و تالیفات کی مکمل فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے:

نمبر شمار	کتاب	سنِ اشاعت	ناشر
۱۔	انگارے (افسانوں کا مجموعہ)	1932	نظامی پریس۔لکھنؤ
۲۔	بیمار (ڈرامہ)	1935	نظامی پریس۔لکھنؤ
۳۔	لندن کی ایک رات (ناولٹ)	1938	مکتبہ دانیال۔کراچی
۴۔	اردو، ہندی، ہندوستانی لسانی مسئلے پر ایک نظر	1947	کتب پبلشر۔بمبئی
۵۔	نقوش زنداں (جیل سے رضیہ کے نام خطوط)	1951	مکتبہ شاہراہ۔دہلی
۶۔	ذکر حافظ (تنقید)	1954	انجمن ترقی اردو ہند۔علی گڑھ
۷۔	روشنائی (ترقی پسند تحریک کی روداد)	1956	مکتبہ اردو۔لاہور
۸۔	پگھلا نیلم (شاعری)	1964	نئی روشن پرکاشن۔دہلی

(تراجم)

نمبر شمار	کتاب	مصنف	ناشر
۹۔	اوتھیلو (othelo) ڈرامہ	شیکسپیر	
۱۰۔	کینڈیڈا (candida) ڈرامہ	شیکسپیر	
۱۱۔	گورا (ناول)	رابندر ناتھ ٹیگور	
۱۲۔	پیغمبر	خلیل جبران	
۱۳۔	اپنے لوگ (روسی کہانی)		قومی جنگ 1942
۱۴۔	دوسرا فیصلہ میں کروں گا (روسی کہانی)		قومی جنگ 1942
۱۵۔	نکولا داپتسا روف کی نظم 'اعتماد'		حیات 1970

(صحافت)

۱۶۔ 'بھارت' (لندن) ہندوستانی طلبا کا ترجمان

۱۷۔ 'چنگاری' ماہ نامہ (سہارن پور)

۱۸۔ 'قومی جنگ' ہفتہ وار (بمبئی)

۱۹۔ 'نیا زمانہ' ہفتہ وار (بمبئی)

۲۰۔ ’عوامی دور‘ ہفتہ وار (دہلی)

۲۱۔ ’حیات‘ ہفتہ وار (دہلی)

مصنف کا یہ مقصد بالکل نہیں کہ سجاد ظہیر کی تخلیقات و تالیفات پر ہمہ گیر بحث کی جائے۔ تاہم سجاد ظہیر کی ادبی خدمات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انکی چند اہم کتابوں کا معائنہ کیا جائے۔لہٰذا راقم الحروف اسی کے مدِ نظر انکی ادبی خدمات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہے۔

سجاد ظہیر کا ناول ’لندن کی ایک رات‘ جس زمانے میں شائع ہوا اُس وقت ناول نگاری میں پختگی آچکی تھی۔اس سے پہلے ڈپٹی نظیر احمد، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولانا عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا اور پریم چند ناول نگاری کے فن کو انتہائی بلندیوں تک پہنچا چکے تھے۔ پریم چند کے افسانے ادب کے معیار کا پیمانہ بن چکے تھے۔ان کا افسانہ ’کفن‘ تو آج بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ پریم چند کے ناول ’گئودان‘، اور ’میدان عمل‘، ’چوگان ہستی‘ پریم چند کی ناول نگاری کے بلند معیار کا ثبوت ہیں۔انہی صلاحیتوں کی وجہ سے پریم چند کو اردو زبان کا ٹالسٹائے اور چارلس ڈکنز کہتے ہیں۔ یہاں مقصد پریم چند کی خوبیاں بیان کرنا نہیں بلکہ ’لندن کی ایک رات‘ پر مختصر بحث کرنا ہے۔ یہ ناول نہ صرف موضوع اور مواد کے اعتبار سے بلکہ اسلوب و تکنیک کے لحاظ سے بھی اردو ناول نگاری میں مخصوص حیثیت رکھتا ہے۔اس میں پہلی بار شعور کی رو (Stream of Consciousness) کو تکنیکی زاویے سے استعمال کیا گیا ہے۔ یہی تکنیک ’انگارے‘ میں شامل افسانے ’نیند نہیں آتی‘ میں بھی استعمال کی گئی ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ’انگارے‘ 1932 میں شائع ہوا تھا اور ’لندن کی ایک رات‘ 1938 میں چھپی تھی۔یعنی افسانے اور ناول کے درمیان تقریباً چھ سال کا وقفہ عائد تھا پھر بھی سجاد ظہیر نے دونوں میں ایک ہی تکنیک برتی۔شعور کیا چیز ہے؟ دراصل یہ ایک نفسیاتی اصطلاح ہے جسے پہلی بار ولیم جیمز نے Principles of Psychology میں استعمال کیا تھا۔ یہ اصطلاح اردو ادب میں بھی استعمال میں لائی گئی تھی۔تنقید میں پہلی بار اسے میری سنکلیر نے ڈوروتھی رچڑسن کے ناول پلگریمج (Pilgrimage) پر تبصرہ کرتے وقت استعمال کیا تھا۔ بعد میں ورجینا وولف وغیرہ نے متعدد بار اس سے خاطر خواہ فوائد حاصل کیے۔سید مظہر جمیل کہتے ہیں کہ رفتہ رفتہ اس اصطلاح نے ادب میں باقاعدہ ایک تکنیک کے طور پر اپنی شناخت قائم کرلی۔

انسانی ذہن اس کے جسم کا نہایت اہم عنصر ہے۔ اس کے تین خانے ہوتے ہیں یعنی شعور، تحت الشعور اور لاشعور۔ یہ تینوں خانے انسان کی شخصیت کو انتہائی شدت سے اثر انداز کرتے ہیں۔ سید مظہر جمیل ماہرین نفسیات کے حوالے سے اس اصطلاح کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

''گو کہ یہ تینوں طبقے انسان کی شخصیت کو متاثر کرنے میں نمایاں رول ادا کرتے ہیں تاہم ولیم جیمز کے نظریے کے مطابق انسانی ذہن میں خیالات کا ہجوم مربوط اور مسلسل نہیں ہوتا بلکہ خیالات اور احساسات دریا کی شکل میں بہتے رہتے ہیں۔ ان کا بہاؤ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ البتہ ذہنی کیفیات بدلتی رہتی ہیں۔ 'شعور کی رو' کی تکنیک کو برتنے والا فن کار لاشعور پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔ ان کے نزدیک ہمہ وقت شعور کا عمل بھی لاشعور سے متاثر ہوتا ہے اور یہی نظریہ انسان کو شعور کے اس اظہار کی طرف لے جاتا ہے جو بظاہر منتشر، غیر مربوط، پراگندہ اور بے ترتیب ہے لیکن جس کا اظہار انجانے پن کے ساتھ انسان کی سوچ اور اس کے اعمال میں ہوتا رہتا ہے۔'' (۴)

سجاد ظہیر کے ناول 'لندن کی ایک رات' جس میں شعور کی رو کا استعمال کیا گیا ہے، کا تذکرہ کرتے ہوئے عزیز احمد نے اپنی کتاب 'ترقی پسند ادب' میں لکھا ہے کہ بجائے ناول کے اگر اسے ایک طویل افسانہ کہا جائے تو بجا ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ ناول دو غیر متوازی حصوں میں بٹا ہوا ہے اس لیے اس سے ایک ہندوستانی نوجوان کی محبت کے قصے کی رومانیت سے کوئی اہم نتیجہ نہیں نکلتا۔

عزیز احمد کی اسی رائے پر سید مظہر جمیل نے کافی اعتراض اُٹھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ناول کے واقعاتی پہلوؤں کے بارے یہ رائے نہ صرف غلط ہے بلکہ نامناسب بھی ہے۔ اس زمانے میں جب یہ ناول لکھا گیا عالمی سطح پر جو اسلوبی تحریکیں عمل میں آ رہی تھی عزیز احمد اُن سے ناواقف نہیں تھے بلکہ فرانسیسی رومان پسندی کے اثرات ان پر کافی حد تک غالب تھے۔ اس لیے سید صاحب کی نظر میں عزیز احمد کی مذکورہ رائے ان کی تنگ نظری کا اظہار ہے۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی اس رائے کو کسی استدلال پر استوار نہ کر کے اپنی تنقیدی بصیرت کا ایک غیر متوازن بیان محض بنا دیا ہے جس کو دوسرے ناقدین نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اس کے برعکس ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں کہ سجاد ظہیر

نے پہلی مرتبہ اس ناول میں شعور کی رو کا تکنیک کے طور پر استعمال کیا ہے اور اس لحاظ سے 'لندن کی ایک رات' میں اردو میں جدید ناول نگاری کا آغاز کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> '''لندن کی ایک رات' اس لحاظ سے اہم ناول ہے کہ اس میں اس وقت کی مروجہ ناول نگاری کے اصولوں سے انحراف کی کوشش کی گئی ہے اور پہلی مرتبہ ناول کی مغربی تکنیک شعور کی رو کا استعمال اس میں کیا گیا ہے۔ اس کے مسائل ان ہندوستانی طلبہ کے مسائل ہیں جو لندن جا کر تعلیم تو حاصل کرتے تھے لیکن جن کے سامنے کوئی مستقبل نہ تھا۔ اس طرح 'لندن کی ایک رات' سے اردو میں جدید ناول نگاری کا آغاز ہوتا ہے جس میں مغربی فن اور مشرقی مسائل ایک نئے طرز پر برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سجاد ظہیر صحیح معنوں میں ایک حقیقت نگار تھے جنہیں اپنی تاریخ، ملکی سیاست اور ادب کی رفتار کا مکمل عرفان حاصل تھا۔''(۵)

ڈاکٹر قمر رئیس نے اس ناول کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سجاد ظہیر نے اس ناول میں ایک نئی عصری بصیرت کو سمونے کی طرح ڈالی ہے۔ انہوں نے روایتی ناول نگاری سے ہٹ کر ایک نیا تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ احتشام حسین کی بھی یہی رائے ہے کہ سجاد ظہیر نے اردو ناول نگاری کو ایک نیا اسلوبِ نگارش دیا ہے۔ پروفیسر عتیق احمد نے بھی اس ناول پر تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''سجاد ظہیر نے 'لندن کی ایک رات' میں ان تمام عناصر سے بھرپور فائدہ اُٹھایا ہے۔ بہت سے نقادانِ فن نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی کہ 'لندن کی ایک رات' کا اختصار جسے کبھی ایک طویل افسانہ کہا گیا اور کبھی ناولچہ، شعوری رو کی تکنیک کے ساتھ دوسری devices یعنی تلازمۂ خیال، خاموش خود کلامی، بلند خود کلامی کے استعمال کے سبب اپنے اختصار میں کتنی وسعت اور پنہائیاں رکھتی ہے۔ اس پہلو پر خاص طور سے توجہ دینے کے لیے وقت اور جگہ کے آزادانہ ادغام کو سجاد ظہیر نے کافی برتا ہے۔ یوں بھی جیسا پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ کردار کے ذہن یا شعور کی رو میں اشاروں، کنایوں اور جھلکیوں کے سبب جو اختصار اور پڑھنے والے کے چشم تصور اور ذہن کے ساتھ ساتھ سفر کی بنا پر اس اختصار میں جو پھیلاؤ ہوتا ہے وہ

بیانیے میں ناولوں اور کہانیوں میں منظر کشی، کردار نگاری اور واقعات کی تفصیل وغیرہ کی طوالت کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ اس لیے یہ لازمی نہیں ہے کہ شعور کی رو میں لکھے جانے والے ناول بھی بیانیہ کی طرح طویل اور دبیز ہوں۔

'لندن کی ایک رات' میں لمحۂ موجود کی معاشرتی، تہذیبی، اخلاقی اور سیاسی فضا سے لے کر ماضی کے طویل عرصوں بلکہ مدتوں تک کی ان ہی کیفیات اور حالات کو سامنے لایا گیا ہے۔ لندن ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی تاریخ کے حوالے سے بیک وقت برطانوی سامراج کی چیرہ دستیوں اور ان کی تعلیم و تہذیب کے پھیلاؤ کے اچھے اور برے یعنی مثبت اور منفی اثرات کا اشاریہ بنتا ہے۔ اگر صفحات کی محدود تعداد کے باوجود ہم سب کچھ جان کر اُٹھتے ہیں تو پھر سجاد ظہیر کے اس ناول کی اور خود ان کی اپنی کامیابی میں شک وشبے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔"(۶)

جیسا کہ سید مظہر جمیل صاحب نے فرمایا ہے 'لندن کی ایک رات' واقعاتی لحاظ سے ایک مختصر کینوس کا نام ہے جس میں لندن میں مقیم ہندوستانی طلبا کی زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ ناول ان طلبہ کے جذبات، خواہشات اور حسرتوں کے تضاد کی عکاسی کرتا ہے۔ دیگر نقادان اور تبصرہ نویسوں کے قطع نظر دیکھتے ہیں کہ سجاد ظہیر خود اس ناول کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"اس کتاب کو ناول یا افسانہ کہنا مُشکل ہے۔ یورپ میں ہندوستانی طالب علموں کی زندگی کا ایک رخ اگر دیکھنا ہو تو اسے پڑھیے۔ اس کا بیشتر حصہ لندن، پیرس اور ہندوستان واپس آتے ہوئے جہاز پر لکھا گیا ہے۔ آج اسے دو سال سے زیادہ ہو گئے۔ اب میں اس مسودے کو پڑھتا ہوں تو اسے چھاپتے ہوئے رکاوٹ ہوتی ہے۔ یورپ میں کئی برس طالب علم کی حیثیت سے رہ چکنے کے بعد اور تعلیم ختم کر چکنے کے بعد چلتے وقت پیرس میں بیٹھ کر مخصوص جذباتی کش مکش سے متأثر ہو کر سوڈیڑھ سو صفحے لکھ دینا اور بات ہے۔ اور ہندوستان میں ڈھائی سال مزدوروں، کسانوں کی انقلابی تحریک میں شریک ہو کر کروڑوں انسانوں کے ساتھ سانس لینا اور ان دل کی دھڑکنیں سُننا دوسری چیز ہے۔ میں اس قسم کی

کتاب اب نہیں لکھ سکتا اور نہ اس کا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔" (۷)

اگر چہ سجاد ظہیر اپنی انکساری کی وجہ سے 'لندن کی ایک رات' کو ناول یا افسانہ قرار نہیں دیتے یہ ناول یا ناولٹ ہمارے ملک کے ان اہم ناولوں میں ہے جنہوں نے نوجوان ادیبوں کی رہبری کی ہے اور تہذیبی مناظر کے کئی اہم پہلوؤں پر آزادانہ اور پہلے پہل توجہ دی ہے۔ یہ سجاد ظہیر کی صلاحیتوں کا ہی ثبوت ہے کہ وہ بخوبی اس جذبے کی عکاسی کرتے ہیں جو ان طلبا کے دلوں میں انگڑائیاں لے رہا ہوتا ہے جو غیر ملک میں قیام کرنے کے باوجود اپنی تہذیب کو ایک نئے زاویے سے دیکھتے ہیں اور عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں پر بھی نظر جمائے رہتے ہیں۔

سجاد ظہیر کا سب سے پہلا شاہکار 'انگارے' تھا جو 1932 میں شائع ہوا جب وہ چھ مہینے کی چھٹیوں میں ہندوستان آئے۔ اس میں سجاد ظہیر کے علاوہ رشید جہاں، احمد علی اور محمود الظفر کے افسانے بھی شامل تھے۔ اس میں جو پانچ کہانیاں سجاد ظہیر کی شامل تھیں ان کے نام ہیں:

1۔ نیند نہیں آتی۔

2۔ جنت کی بشارت۔

3۔ گرمیوں کی ایک رات۔

4۔ دلاری۔

5۔ پھر یہ ہنگامہ۔

اِس مجموعے کے شائع ہونے سے پہلے سجاد ظہیر کا صرف ایک افسانہ 'گرمیوں کی ایک رات' دو سال پہلے رسالہ 'جامعہ' دہلی میں چھپا تھا۔ دیگر افسانے پہلی بار 'انگارے' میں شائع ہوئے۔ احمد علی کے صرف دو کہانیاں شامل تھیں جن کے نام یہ ہیں:

1۔ بادل نہیں آتے۔

2۔ مہاوٹوں کی ایک رات۔

محمود الظفر کا صرف ایک ہی افسانہ تھا جس کا نام 'جواں مردی' ہے اور رشید جہاں کی ایک کہانی اور ایک ڈرامہ شامل کیے گئے جن کے نام بالترتیب 'دِلی کی سیر' اور 'پردے کے پیچھے' ہیں۔

'انگارے' کی اشاعت نے ملک میں ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مولوی

عبدالماجد دریا آبادی نے اس مجموعے کی جم کر مخالفت کی۔ دیگر مذہب پرست لوگوں نے بھی اس پر کئی طرح کے الزام لگائے اور یہ بھی لکھا کہ ان کہانیوں میں ننگا پن ہے جس کی مذہب اجازت نہیں دیتا۔ اس پر یہ الزام بھی تھا کہ ان کہانیوں میں دین اور مذہب کی بے حرمتی کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں سجاد ظہیر نے اپنی کتاب 'روشنائی' میں اس الزام کی صفائی دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''انگارے کی بیشتر کہانیوں میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ کم اور سماجی رجعت پرستی اور دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان زیادہ تھا۔ بعض جگہوں پر جنسی معاملات کے ذکر میں لارنس اور جوائس کا اثر نمایاں تھا۔ رجعت پرستوں نے ان ہی خامیوں کو پکڑ کر 'انگارے' اور اُس کے مصنفین کے خلاف سخت پروپیگنڈا کیا۔ حسب دستور مسجدوں میں ریزولیوشن پاس ہوئے۔ مولوی عبدالماجد دریا آبادی خم ٹھونک کر ہمارے خلاف اکھاڑے میں آ گئے، ہمیں قتل کرنے کی دھمکی دی گئی اور بالآخر صوبہ متحدہ کی حکومت سے اس کتاب کو ضبط کروادیا۔'' (۸)

آخر 'انگارے' میں ایسا کیا تھا جس نے مذہبی حلقوں میں پلچل مچادی۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ان میں دین اور مذہب کے خلاف کچھ بھی نہیں تھا۔ 'انگارے' کی تمام کہانیوں میں اُس احساس کے خلاف بغاوت ہے جو پرانی ادبی روایتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ 'انگارے' کے تمام افسانہ نگاروں نے قصے کے پرانے انداز کو ترک کیا اور پلاٹ آور ترتیب کو بہت کم اہمیت دی۔ اب تک تو ادیب اور دانشور پرانے اخلاقی و معاشرتی قاعدے قانون کے پابند تھے مگر اس ماحول میں گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ آخر کار انہوں نے یہ گلا سڑا خول اُٹھا کر پھینک دینا ہی مناسب سمجھا اور ادب میں ایک نئی جہت کا آغاز کیا۔ خلیل الرحمن اعظمی کہتے ہیں:

''جھوٹی مذہبیت، ریاکاری، تہذیب و شائستگی کا سوانگ، وطن پرستی اور قوم پرستی کے ڈھونگ ان سب پر 'انگارے' کے مصنفین اپنے طنز کے تیر برساتے ہیں۔ ان افسانوں میں جوانی کا جوش اور ہر چیز کو تہس نہس کر دینے کا جذبہ ہے اور یہ جذبہ کبھی کبھی اعتدال سے اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ ان مقالموں اور فقروں میں ابتذال اور عامیانہ پن پیدا ہو جاتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں کا ردِ عمل شدید

ہوا جس کے نتیجے میں یہ کتاب ضبط کر لی گئی۔''(۹)

اعظمی صاحب نے اوپر جو کچھ کہا وہ بہت حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ 'انگارے' کے افسانے افسانہ نگاری کے معیار پر پورے نہیں اُترتے پھر بھی وہ اس شور وشر کے حقدار نہیں تھے جو ان کی اشاعت پر اُٹھ کھڑا ہوا۔ احمد علی کی کہانی 'مہاوٹوں کی رات' تقریباً گیارہ مہینے پہلے لاہور کے ادبی رسالے 'ہمایوں' میں جنوری 1932 کے شمارے میں چھپ چکی تھی جس میں ادبی حلقوں نے قطعاً دلچسپی نہیں لی۔ احمد علی کی دوسری کہانی 'بادل نہیں آتے' جلد بازی میں 'انگارے' میں شمولیت کے لیے لکھی گئی تھی۔ رشید جہاں کی کہانی 'دلی کی سیر' اور اُس کا ڈرامہ 'پردے کے پیچھے' دونوں ابتدائی نوعیت کی تخلیقیں تھیں۔ یہی صورت محمد الظفر کی کہانی 'جواں مرد' کی بھی تھی۔ اس کہانی کو اردو شکل سجاد ظہیر نے خود عطا کی تھی۔ اگر چہ اعظمی صاحب نے ان کہانیوں کے مصنفین کے مقاصد کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان کے مقاصد پر کسی نے براہِ راست روشنی نہیں ڈالی۔ یہاں تک کہ 'انگارے' میں بھی کوئی دیباچہ یا پیش لفظ یا حرفِ آغاز وغیرہ کچھ بھی شامل نہیں کیا گیا جو انکے مقاصد کی وضاحت کرتے۔ لیکن 'انگارے' کی اشاعت کے بعد جو ہنگامہ برپا ہوا اُس نے بہت حد تک کتاب کی مقصدیت کو ظاہر کر دیا۔ کچھ لوگوں نے تو اس بات کی داد دی کہ ان افسانوں میں موضوع اور طرزِ اظہار بیحد بے باکانہ ہے۔ لیکن کچھ مذہبی اجارہ داروں اور قدامت پرست طبقوں نے اس کے خلاف جنگ کا محاذ کھول دیا۔ 'انگارے' پر طرح طرح کے الزام لگائے گئے اور اس کے خلاف تشدد قسم کے فتوے جاری کیے گئے۔ ان کہانیوں کو دل آزار، فحش، اخلاق سوز، مذہب دشمن، غیر اسلامی اور مسلمانوں کے مذہبی اور تہذیبی عقائد کو برانگیختہ کرنے والی سازش قرار دیا گیا۔ نئے خیالات کے حامی بزرگوں میں علامہ نیاز فتح پوری، مولوی عبدالحق اور دیا نرائن نگم شامل تھے۔ ان کے خلاف سر فہرست مولانا عبدالماجد دریا آبادی تھے۔ مخالفین کو کم سے کم ایک درجن رسائل و جرائد کی سہولت حاصل تھی جن میں ہفت روزہ 'سچ' لکھنؤ سے 'مدینہ' بجنور سے 'سرفراز' لکھنؤ سے 'ہمدم' لکھنؤ سے 'تنویر' لکھنؤ سے 'ستارُالہ آباد سے وغیرہ کئی رسالے شامل تھے۔ ان رسالوں میں لگاتار کئی ماہ تک 'انگارے' اور اس کے مصنفین کے خلاف دشنام اور گالی گلوچ کا سلسلہ جاری رہا۔

'انگارے' کی اشاعت پر مولانا دریا آبادی نے سجاد ظہیر سے زیادہ ان کے والد بزرگ سر

وزیر حسن کو ذمہ دار ٹھہرایا کہ انہوں نے اپنے ناخلف بیٹے کی تربیت کی طرف توجہ نہیں دی۔ 'انگارے' کے متعلق ایک مضمون 'سرگزشت' کے 24 فروری 1933 کے شمارے میں شائع ہوا جس میں اس کتاب کو خریدنے اور اس کا تذکرہ کرنے تک کو گناہ عظیم قرار دیا گیا۔ اسی طرح علی گڑھ کے ایک رسالہ 'پیام' کے 5 اپریل 1933 کے شمارے میں بھی ایک مضمون شائع ہوا جس میں 'انگارے' پر لعن طعن کی گئی۔ لکھنؤ کی شیعہ کانفرنس کی مرکزی مجلس نے بھی کتاب کی ضبطی کا مطالبہ کیا۔ کچھ مولویوں نے یہاں تک کہا کہ ان افسانوں کے مصنفین پر سنگسار کیا جائے اور انہیں پھانسی پر لٹکایا جائے۔ اس تمام ترہنگامے کا اثر یہ ہوا کہ یو پی حکومت نے کتاب کی ضبطی کے احکام جاری کر دیئے اور تمام کتابوں کو نذر آتش کر دیا۔ پھر بھی اس کتاب کی ایک بڑی تعداد ادبی قارئین کے پاس پہنچ گئی۔ لیکن کتاب کی ضبطی کے خلاف بھی خاصا تیز ردِعمل ہوا۔ دیانرائن نگم جو منشی پریم چند کے خاص دوست اور ہمدرد تھے ایک رسالہ 'زمانہ' کے نام سے نکالتے تھے۔ انہوں نے اپنے رسالے کے ایک شمارے میں لکھا:

> ''چار نوجوان مصنفوں نے جن میں ایک لیڈی ڈاکٹر بھی شامل ہے 'انگارے' نام سے دس قصوں کو کتابی صورت میں شائع کیا۔ ان میں موجودہ زمانے کی ریاکاریوں پر روشنی ڈالنے اور مروجہ رسوم و رواج کی اندرونی خرابیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہمارے نام نہاد اعلیٰ طبقے کی روزمرہ معاشرت کے نقائص کا مضحکہ اڑایا گیا تھا۔ گو اس مجموعے کا طرزِ بیان اکثر مقامات پر کھٹکتا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ نوجوان عالم نے دنیا میں جو علم بغاوت بلند کر رکھا ہے اس کا ایک ادنےٰ کرشمہ اس کتاب کی اشاعت ہے۔ اسلامی بزرگوں اور مولوی صاحبان نے اس کو اپنے تقدس اور احترام پر زبردست حملہ خیال کر کے اس پر لعن طعن میں کوئی کسر باقی نہ رکھی اور اس چھوٹی سی کتاب کے خلاف طوفانِ عظیم برپا کر رکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ روحانیت کے علم بردار اور مذہب کے احترام کے دعوے دار حضرات اپنے اپنے طبقے کی کمزوریوں اور خامیوں سے کب تک آنکھیں بند کیے رہیں گے۔ مسلم پریس میں جس انداز سے اس کتاب پر نکتہ چینی ہوئی ہے اس سے زمانہ حال کی مروجہ تنگ خیالی کا پورا ثبوت

ملتا ہے۔ مولوی صاحبان کچھ ہی کیوں نہ کہیں سوسائٹی کے ہر طبقے میں ریاکاری کے نقائص داخل ہو گئے ہیں۔ اب ان نقائص کو نمایاں کرنے والوں کو مردود و ملعون کرنے یا ان تحریرات و تصانیف کو سرکاری اثرات سے کام لے کر ضبط کرا دینے سے ملک اور مذہب کا کوئی بھلا نہیں کر سکتے۔''(۱۰)

اس کے علاوہ جب 'انگارے' کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی اور اُس کی تمام کاپیوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا تو محمود الظفر نے بھی ایک مراسلہ جاری کیا جو انگریزی اخبار 'دی لیڈر' الہ آباد میں 15 اپریل 1933 کو شائع ہوا تھا۔ اس مراسلے کا عنوان تھا 'انگارے کی دفاع' جس میں اس نے یہ سوال اُٹھایا کہ کیا آزادیِ اظہار کے خلاف برسرِ پیکار ہونے والوں کو ان تشدد پسندانہ ہتھکنڈوں کے خلاف ہتھیار ڈال دینے چاہیے۔ انہوں نے لکھا کہ سجاد ظہیر کی کہانیوں میں مسلمانوں کے موجودہ تصورات اور ان کی زندگی کے طور طریقوں پر طنزِ محض ہے کیونکہ ملک کے اوسط درجے کے مسلمانوں پر اوائل عمری سے ہی ایک مذہبی تسلط چھا جاتا ہے جو ان کی سوچ اور غور و فکر کو مسخ کر دیتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مادی، اخلاقی اور جسمانی افلاس خصوصاً مسلمان عورتوں کے حوالے سے احمد علی نے اپنی تحریر میں جس ذہنی اُپج اور قابلِ ستائش بے باکی سے گفتگو کی ہے اس سے ہمارے رسم و رواج کا پردہ چاک ہوتا ہے اور کھلی حقیقت سامنے آ جاتی ہے۔ رشید جہاں نے جو ڈاکٹر آف میڈیسن ہیں، اپنے عملی تجربات کی روشنی میں پردے کے پیچھے جو عورت کی درگت بنی ہوئی ہے، اس کا نہایت عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔ میری اپنی تحریر میں مرد کی انا کو نشانہ بنایا ہے جو کمزور اور بے آسرا عورت کو اپنی تسکین کی بھینٹ چڑھاتی ہے۔ ان کہانیوں میں پیش کیے گئے مرقعوں کو کوئی بھی نہیں جھٹلا سکتا اور جس میں دم خم ہو وہ خود جائزہ لے سکتا ہے کہ یہ کہانیاں کسی طرح کی ادبی جوہر نمائی کے لیے نہیں لکھی گئی ہیں بلکہ ہمارے ہاں جو افسوس ناک صورت حال ہے، یہ اس کے خلاف داخلی ردِ عمل کا اظہار ہے۔
> اس کتاب کی مصنفین کسی طرح اس کے لیے معذرت خواہ نہیں ہیں۔''(۱۱)

'انگارے' کا جو بھی حشر ہوا اُس سے نئے ادیبوں کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ انجمن ترقی پسند

مصنفین کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ سجاد ظہیر نے دیگر دو ادبی کارنامے بھی ایجاد کیے جو ادبی دنیا میں بہت اہم مقام رکھتے ہیں۔ان میں ایک کتاب کا نام 'روشنائی' ہے اور دوسری کا 'ذکر حافظ'۔ یہ دونوں کتابیں انہوں نے مچھ (بلوچستان) جیل میں دورانِ اسیری تخلیق کیں۔ 'روشنائی' ایک طرح کی ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی ہے۔اس کتاب کا دیباچہ 'عرض حال' کے نام سے سجاد ظہیر کے داماد علی باقر نے لکھا ہے جس میں کہا ہے کہ 'روشنائی' انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام اور تشکیل کی واحد مستند تاریخ ہے جو سجاد ظہیر نے راولپنڈی سازش کیس میں ماخوذ ہونے پر پاکستان کی جیلوں میں لکھی تھی۔

علی باقر نے 'عرض حال' میں جو کچھ لکھا وہ سجاد ظہیر کی شخصیت، ان کی دانش اور ان کی تنظیمی صلاحیتوں پر زیادہ اور 'روشنائی' پر کم روشنی ڈالتا ہے۔ اس نے 'روشنائی' کے بارے کوئی تفصیل نہیں دی۔لیکن اسی کتاب میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا ایک مقالہ 'روشنائی۔ ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی' کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔جس میں روشنائی کی خوبیاں وضاحت سے بیان کی گئی ہیں۔ لکھتے ہیں کہ 'روشنائی' ایک طرح کی ترقی پسند ادبی تحریک کی آپ بیتی ہے اور اس تحریک کے آغاز سے 1947 تک کی کہانی خود میر کارواں نے اپنی زباں سے بیان کی ہے۔ 'روشنائی' میں نہ صرف سجاد ظہیر کا شگفتہ اور محسور کن اسلوب آپ کو شروع سے آخر تک اپنی گرفت میں رکھے گا بلکہ اس تحریک نے جو اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں، جن مشکلات کا سامنا کیا ہے اور جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، جن تنظیمی اور نظریاتی الجھنوں کا شکار ہوئی ہے اور جس حسن وخوبی سے انہیں سلجھانے کی سعی کی ہے ان کا ذکر بھی اس کتاب میں ملتا ہے۔ترقی پسند تحریک کی بنیاد 1936 میں ڈالی گئی تھی اور 1947 میں ہندوستان تقسیم ہو گیا جس کے باعث پاکستان وجود میں آیا۔ان بیس اکیس سالوں میں ادبی تاریخ نے کئی کروٹیں بدلیں جن کو سمیٹ کر سجاد ظہیر نے اس کتاب میں سمو دیا ہے۔

اُنیسویں صدی کے نصف کا دور ہندوتان میں اردو ادب کے (renaissance) یعنی نشاۃ الثانیہ کا دور تھا۔ یہ تبدیلی صرف اردو میں ہی نہیں بلکہ برصغیر کی سبھی زبانوں میں پیدا ہوئی۔ اس دور کی خوبی یہ رہی ہے کہ نئے ادیبوں اور دانشمندوں نے اپنے پرانے قومی ورثے کو نہ چھوڑ کر اُسے نئے ادب سے جوڑے رکھا۔اس دور کی ادبی، تخلیقی اور سماجی اصلاح سے متعلقہ سرگرمیوں کو پنپنے کا موقع ملا جس میں جن رہنماؤں کا ہاتھ تھا ان کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔ یہ ہیں سرسید احمد خان،

محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، مرزا سودا اور عبدالحلیم شرر وغیرہ۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں کہ:

"سترھویں اور اٹھارویں صدی کا ہندوستان رو بہ زوال و انحطاط جاگیردارانہ نظام کے سہارے جی رہا تھا جس کو دھکا دے کر آگے بڑھانے والی قوت محض روایتیں تھیں۔ اگر ان روایتوں کی طاقت گھٹتی جائے اگر ان کا تعلق اصلی مادی حالات سے ختم ہوجائے اگر نئے حالات کے مطابق ان میں اضافہ ہوتو محض روایتیں نہ تو ادب اور زندگی کی قدروں کو زندہ رکھ سکتی ہیں اور نہ انہیں آگے بڑھا سکتی ہیں۔" (۱۴)

ایسی ہی تبدیلیاں نہ صرف برصغیر میں بلکہ تمام دنیا میں ہو رہی تھیں جنہیں بڑھاوا دینے کے لیے ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی گئی جس کی روداد اُس کے بانی اور سربراہ سجاد ظہیر نے 'روشنائی' میں قلم بند کی ہے۔ اول الذکر تبدیلیوں کے مدِنظر یہ بڑے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ محض انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام اور فروغ کی داستان نہیں ہے۔ بلکہ بیسویں صدی کے ہندوستان کا تہذیبی اور ادبی منظر نامہ ہے جسے پوری طرح سمجھے بغیر معاشرتی، تہذیبی، ادبی اور فنونِ لطیفہ کی بدلتی ہوئی قدروں کو پہچاننا اگر ناممکن نہیں تو دشوار گزار ضرور ہے۔ اس کتاب کا جو سب سے اہم پہلو ہے وہ اس کا اندازِ نگارش ہے۔ اس کے متعلق سید مظہر جمیل لکھتے ہیں کہ:

"ان کے شگفتہ اور مسحور کن اسلوب نے تاریخ، تذکرے، فکری مباحث، واقعاتی رپورٹنگ، تہذیبی اور ادبی رویوں کے تجزیوں اور ہندوستان کی کم و بیش سب اہم زبانوں کے معروضی حالات، ہندوستانی رسم و رواج کے بدلتے ہوئے منظر نامے، ادبی مراکز کی فضاؤں کے احوال، قدیم تہذیبی و ادبی روایت اور ورثے کی پاسداری اور بالخصوص ہندوستان کی متعدد ادبی، تہذیبی اور سیاسی شخصیتوں کے چلتے پھرتے مرقعوں کی پیش کش نے 'روشنائی' کو کسی بھی مرحلے پر پڑھنے والوں کے لیے گراں بار نہیں ہونے دیا ہے۔ 'روشنائی' کی مماثل کسی دوسری ادبی کتاب کا تصور ابھرتا ہے تو وہ مولانا محمد حسین آزاد کی معرکہ الآرا کتاب 'آبِ حیات' ہے۔ دونوں کتابوں میں اپنے اپنے عہد کی ادبی و تہذیبی

صورت حال کی نظر کشی کی ہے۔۔۔۔

> 'روشنائی' کے مطالعے کے ساتھ 'آب حیات' کا خیال یوں آیا کہ میں ان دونوں کتابوں میں بعض خصائص مشترک پاتا ہوں اور چند باتیں قطعی مختلف المزاج بھی۔ مثلاً پہلی خوبی تو دونوں کتابوں کا جاذب توجہ ہونا ہے۔ دوسرے 'آب حیات' نے جس طرح ماقبل ادوار کی تہذیبی تبدیلیوں کو بیان کیا تھا، اسی طرح 'روشنائی' بیسویں صدی کے نصف اول کی تہذیبی سرگزشت بیان کرتی ہے جو سید سجاد ظہیر نے ترقی پسند تحریک کے پس منظر کے طور پر رقم کی ہے۔''(۱۳)

'روشنائی' میں سجاد ظہیر کی کردار نگاری کی قابلیت نہایت بلندیوں پر ہے۔ یہ انہیں کی خوبی ہے کہ انہوں نے جو بھی منظر نامہ مرتب کیا اس میں تمام تر منظر اور پس منظر اندھیرے کے دائرے سے نکال کر انہیں روشنی کے دائرے میں پہنچا دیا۔ 'روشنائی' میں سجاد ظہیر نے جس فرد کا ذکر کیا ہے وہ کسی معجزے سے کم نہیں لگتا۔ 'روشنائی' اپنی تمام تر خوبیوں کے علاوہ جیتی جاگتی زندگی کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔

'ذکر حافظ' دوسری کتاب ہے جس کی تخلیق جیل میں ہوئی جب سجاد ظہیر پاکستان کی جیلوں میں قید تھے۔ اس کتاب کا پس منظر یہ ہے کہ بائیں بازو کے کچھ ادیبوں نے غزل اور مثنوی وغیرہ جیسی صنفِ شاعری کو جاگیردارانہ تمدن کی یادگار قرار دیا اور ان پر براۓ راست حملہ کیا۔ ایک جگہ راجندر سنگھ بیدی نے اپنا صدارتی خطبہ پڑھا جس میں اُس نے میرؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ میرؔ کی شاعری قنوطی اور فراری ہے اور اس وجہ سے اس دور کے ادیبوں کے لیے ناموزوں ہے۔ اسی دوران ہنس راج رہبر نے خواجہ الطاف فاروقی کی کتاب 'مثنوی زہرِ عشق کا مطالعہ' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ مثنوی جاگیردارانہ تمدن کی یادگار ہے۔ رہبر کا خیال تھا کہ یہ مثنوی رئیسوں کے عشق کی داستان بیان کرتی ہے اور جنسی لذت پرستی کی تلقین کرتی ہے۔ اس ماحول میں سجاد ظہیر نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا 'غلط رجحان' جس میں انہوں نے اس تنقیدی رویے کو گمراہی سے تعبیر کیا تھا۔ اسی اثناء میں ظ۔ انصاری نے بھی ایک مضمون غزل کو جاگیردارانہ تمدن کی یادگار اور فراری ادیبوں کی پناہ گاہ قرار دیا تھا۔ ان سب مضامین کے جواب میں سجاد ظہیر نے 'ذکر حافظ' عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

سجاد ظہیر کے تنقیدی کارنامے بہت زیادہ نہیں ہیں۔ تنقیدی اعتبار سے ان کے مضامین اور چند مراسلات کو چھوڑ کر ان کی سب سے اہم تصنیف 'ذکر حافظ' ہی ہے۔ اس کتاب کی تکمیل جون 1954 میں مچھ جیل (بلوچستان) میں ہوئی۔ اس میں انہوں فارسی کے بلند پایہ اور نامور شاعر خواجہ حافظ شیرازی کی شاعری پر تنقید کی ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے پڑی کہ اس زمانے میں زیادہ تر ترقی پسند ادیب وغیرہ قدیم ادب پر حملے کر رہے تھے۔ راجندر سنگھ بیدی اور ہنس راج رہبر کی مثال پہلے دی جا چکی ہے۔ ظ۔ انصاری نے بھی ایک مضمون 'غزل باقی رہے گی' کے عنوان سے لکھا تھا جس میں حافظ کی شاعری پر کئی طرح کے الزامات لگائے گئے تھے۔ ان الزامات کا جواب سجاد ظہیر نے 'ذکر حافظ' میں دیا ہے۔ حافظ کی شاعری کا لب ولباب وہ چند لفظوں میں بڑی خوش اسلوبی سے یوں بیان کرتے ہیں:

> '' حافظ کی غزلوں میں وہ لذت پر مبنی بے ثباتی عالم، داخلیت، فراز اور زندگی کی تاریکیوں کو جام عیش میں ڈبو دینے کا جذبہ رچا ہوا ہے جو خود حافظ کی زندگی میں رچ بس گیا تھا اور جو اس وقت تک ملک کے شاعر کے یہاں اتنا حسین و دلکش بن کر نہیں آتا۔'' (۱۴)

حافظ نے اپنے عہد کے علماء پر طنز کیا تھا اور کہا تھا کہ لوگ گمراہ کن ادب کی پیروی کر رہے ہیں اور یہ کہ ان کی عقل وحکمت میں پختگی نہیں ہے۔ لیکن سجاد ظہیر نے حافظ کے کلام کو گہرائی سے سمجھنے کے بعد یہ واضح کر دیا کہ حافظ نے تمام علم یا تمام علماء پر حملہ نہیں کیا'' بلکہ انہوں نے ان لوگوں کو اپنا نشانہ بنایا تھا جو دین وفقہ کا لبادہ اوڑھ کر اور عبادت اور ریاضت کی نقاب چہروں پر اوڑھ کر شکم پروری، خود پرستی اور خود بینی میں غرق تھے اور علم وحکمت، تقدس اور پاکیزگی کا ڈھونگ عوام الناس کو دھوکہ دینے اور لوٹنے کا ایک وسیلہ بنا لیا تھا۔'' سجاد ظہیر کے مطابق یہ علماء عام طور پر جو لکھتے ہیں اور کہتے ہیں وہ لوگوں کو مغالطے میں ڈالنے کے لیے اور سچائی کو چھپانے کے لیے ہوتا ہے۔ آخر میں 'ذکر حافظ' کے بارے میں سجاد ظہیر کی اپنی رائے قلم بند کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے یہ معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ انہوں نے حافظ کی شاعری کو کس زاویے سے دیکھا اور پرکھا اور یہ کتاب لکھنے میں ان کا مقصد کیا تھا۔ یہ وضاحت انہوں نے اپنے خط میں دی ہے جو انہوں نے مچھ جیل بلوچستان سے اپنی اہلیہ رضیہ سجاد ظہیر کے نام لکھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ خامیاں نہ ہوں جو مجھے خود اکثر نقادوں کی تحریروں میں نظر آتی ہیں۔ اول تو یہ کہ تنقید میں ادب کی چاشنی ہو جسے پڑھ کر لوگوں کو حظ آئے۔ وہ محض تشریح نہ ہو بلکہ بجائے خود ایک تحریر لطف بھی ہو۔ دوسرے یہ کہ اس میں زیرِ نظر شاعر کا محض 'سماجی پس منظر' نہ ہو جیسے فلاں شاعر جاگیرداری دور کے انحطاط کی پیداوار تھا۔ (یہ 'پیداوار' بھی کیسا بھونڈا لفظ ہے۔ جب کہ اسے ادبی تخلیق کے سلسلے میں استعمال کیا جائے)۔ تیسری یہ بات دکھائی جائے کہ اس میں اس کے کلام میں خوبیاں تاثیر یا خرابی اور بے کیفی اور سپاٹ پن کیوں ہے۔ اس میں حسن و لطافت کے کونسے پہلو وغیرہ ہیں۔ چوتھے یہ کہ ماضی کے ادب عالیہ کا جائزہ لیتے وقت محض، چند عام فقروں کا لگے بندھے جملوں کا استعمال کر کے بات ختم نہ کی جائے مثلاً یہ کہ اس میں انسان دوستی کے عناصر ہیں۔ بلکہ یہ دکھایا جائے ٹھوس طریقے سے کہ اس کلام کا وہ کون سا حصہ ہے اور کونسی باتیں ہیں جن کے ذریعے شاعر نے انسان کی انسانیت، اس کی تہذیب نفس اور اس کے انبساط میں اضافہ کیا ہے اور جواب بھی قابلِ قدر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔'' (۱۵)

ان کے علاوہ یعنی سجاد ظہیر کی تین کتابیں جن پر اس باب میں بحث کی گئی ہے، دیگر کتابیں کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں ہیں۔ مگر سجاد ظہیر کے خطوط جو انہوں نے سینٹرل جیل لکھنؤ سے رضیہ سجاد ظہیر کے نام لکھے اردو ادب میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ یہ خطوط کتابی شکل میں 'نقوش زنداں' کے نام سے شائع ہوئے ہیں اور دستیاب بھی ہیں۔ لیکن ان خطوط پر بحث آگے چل کر ہوگی جب ہم ان کے دور اسیری کا ذکر کریں گے۔ ویسے بھی راقم الحروف کا مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ سجاد ظہیر کی ادبی خدمات پر محض سرسری نظر ڈالی جائے۔ ویسے بھی سجاد ظہیر نے اپنی ادبی صلاحیتوں کو ترقی پسند تحریک کے ارتقاء پر ترجیح دی اور جس کے وہ جتنے قابل تھے اتنے ادبی کارنامے نہیں دکھا پائے۔ خواجہ احمد عباس کے لفظوں میں سجاد ظہیر نے انقلابی تحریک میں شامل ہو کر نہ صرف دولت، شہرت، آرام، پیسہ، جائداد کو تیاگ دیا بلکہ ان کی سب سے بڑی قربانی یہ تھی کہ انہوں نے عوام کی خاطر اپنی ادبی صلاحیتوں اور اپنے فن کارانہ رجحانات کو پس پشت ڈال دیا۔

سجاد ظہیر کی وفات کے بعد رضیہ سجاد ظہیر نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا 'انتظار ختم ہوا۔ انتظار باقی ہے' جو علاوہ دیگر رسالہ جات کے 'روشنی کا سفر' میں بھی شائع ہوا تھا۔ 'روشنی کا سفر' سجاد ظہیر کے مضامین کا مجموعہ ہے جسے علی باقر نے ترتیب دیا تھا اور جسے سارنش پرکاشن نئی دہلی سے 1950 میں شائع کیا تھا۔ بعد میں یہ مضمون ڈاکٹر سید احمد جعفر نے اپنی مرتب کردہ کتاب 'سجاد ظہیر۔ شخصیت اور فکر' میں بھی شامل کیا ہے۔ اپنے مضمون میں رضیہ لکھتی ہیں کہ سجاد ظہیر کی زندگی میں ایک ہی غم تھا کہ ان کو ادبی تخلیقات کے لیے مناسب مہلت نہیں ملی۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین اور ترقی پسند تحریک میں اس قدر الجھے رہے کہ انہیں ادبی تخالیق کی فرصت ہی نہیں ملی۔ وہ لکھتی ہیں:

''آزادی آنے کے بعد تقسیم 'مسئلہ پاکستان، قید و بند، روپوشی، اس سے آزادی کے بعد ہندوستان واپس آکر پھر وہی گردش اور اب کی دفعہ قومی ہی نہیں بین الاقوامی پیمانے پر بھی اس طرح کے فرائض منصبی نے ہمیشہ تخلیق سے روکے رکھا۔ میری بات کے ثبوت ہیں 'روشنائی' اور 'ذکرِ حافظ'۔ یہ دونوں ہی کتابیں پاکستان کے مختلف قید خانوں میں لکھی گئیں جبکہ زبردستی پابہ زنجیر ہو کر بیٹھنا پڑا۔ میں کبھی کبھی ان سے کہتی تھی کہ میں اندرا بی بی سے کہوں گی کہ تمہیں دو چار سال کے لیے قید کروا دیں تو ادب کے لیے نہایت مفید ہوگا۔ کچھ نہیں تو دو کتابیں تو ہو ہی جائیں گی۔ وہ مسکرا دیتے تھے۔''(۱۶)

سجاد ظہیر کی وفات پر بڑی تعداد میں لوگوں نے مرحوم کی بیوی کو خطوط لکھے جن میں یہ کہا تھا کہ سجاد ظہیر کے انتقال سے اردو ادب کو سخت نقصان پہنچا ہے اور یہ بھی کہ سجاد ظہیر کے ساتھ ہی ادب میں ترقی پسندی کا دور ختم ہو گیا ہے۔ ان جملوں میں ایک ایسی حقیقت پوشیدہ ہے جو اپنی زبان خود آپ ہے۔ اگرچہ سجاد ظہیر نے بہت کم تصنیفات چھوڑی ہیں لیکن جو کچھ وہ لکھ گئے ہیں ان کا اردو ادب میں بہت بلند مقام ہے۔

☆☆☆

کتابیات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر پبلشر	سن اشاعت	صفحہ نمبر
۱)	انگارے سے پگھلا نیلم تک	سید مظہر جمیل	اکادمی بازیافت، کراچی	2005	32
۲)	انگارے سے پگھلا نیلم تک	سید مظہر جمیل	اکادمی بازیافت، کراچی	2005	37
۳)	روشنائی	سجاد ظہیر	پرائم ٹائم پبلیکیشن، لاہور	2006	220
۴)	انگارے سے پگھلا نیلم تک	سید مظہر جمیل	اکادمی بازیافت، کراچی	2005	111
۵)	انگارے سے پگھلا نیلم تک	سید مظہر جمیل	اکادمی بازیافت، کراچی	2005	87
۶)	انگارے سے پگھلا نیلم تک	سید مظہر جمیل	اکادمی بازیافت، کراچی	2005	91
۷)	انگارے سے پگھلا نیلم تک	سید مظہر جمیل	اکادمی بازیافت، کراچی	2005	101
۸)	روشنائی	سجاد ظہیر	پرائم ٹائم پبلیکیشن، لاہور	2006	36
۹)	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو	2008	206
۱۰)	انگارے سے پگھلا نیلم تک	سید مظہر جمیل	اکادمی بازیافت، کراچی	2005	120
۱۱)	انگارے سے پگھلا نیلم تک	سید مظہر جمیل	اکادمی بازیافت، کراچی	2005	121
۱۲)	روشنائی	سید سجاد ظہیر	پرائم ٹائم پبلیکیشن، لاہور	2006	11
۱۳)	انگارے سے پگھلا نیلم تک	سید مظہر جمیل	اکادمی بازیافت	2005	240
۱۴)	سجاد ظہیر۔حیات اور خدمات	زیب النساء	کیشو پرکاشن، الہ آباد	مئی 1999	195
۱۵)	سجاد ظہیر۔شخصیت اور فکر	ڈاکٹر سید احمد جعفر	مکتبہ دانیال	2005	142
۱۶)	سجاد ظہیر۔روشنی کا سفر	علی باقر	سارنش پرکاشن	1995	166

☆☆☆☆

دوسرا باب

ترقی پسند تحریک

۱۔ تحریک کا آغاز اور پس منظر

۲۔ پہلی کل ہند کانفرنس 1936

۳۔ الہ آباد اور لکھنو کی کانفرنسیں

۴۔ دوسری کل ہند کانفرنس اور ترقی پسند ادب کی ترویج

۵۔ انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان اور نئی کمیونسٹ پارٹی

۱۔ تحریک کا آغاز اور پس منظر

اُنیسویں صدی کا درمیانی زمانہ اُردو ادب کے لیے بڑی کشمکش اور جدو جہد کا دور تھا کیونکہ اُس دور میں سرمایہ داری عروج پر تھی جو عقلیت پرستی کی پیدائش ہوتی ہے۔ تب ہندوستان کے متوسط طبقے کی عوام عقلیت پسندی سے بہت متاثر تھی جن میں زیادہ تر انگریزی پڑھے لکھے لوگ تھے۔ لہٰذا سرمایہ داری، جاگیرداری اور سامراجی عناصر کو بہت اِمداد حاصل تھی۔ اِسی زمانے میں کچھ ایسے ادیب سطحِ ادب پر آئے جنھوں نے روایتی ادب اور تہذیب کے ساتھ نئے ادب کی بھی رہنمائی کی۔ یہ دور ادبی، تخلیقی اور سماجی تبدیلیوں کا سنہری دور تھا۔ سرسید احمد خان، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نظیر احمد، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی، مرزا سودا اور عبدالحلیم شرر کچھ ایسے ادیب تھے جن کی سرگرمیوں نے اِس دور کو رونمائی بخشی۔ ویسے تو ہر زمانے میں اُس کی ضرورتوں کے مطابق اور عرفانِ حق کی تحصیل کے لیے نئے نئے فلسفے اور نقطۂ نظر وجود میں آتے رہے ہیں لیکن یورپ میں ادب کے بارے میں ایسے نظریات کی لگاتار ترویج ہوتی رہی ہے۔ ایسی ہی تحریکی تبدیلیوں کے زیرِ اثر ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں کچھ نوجوان ادیب اور شاعر ایک ایسی نئی سوچ میں مبتلا تھے جو مارکس اور اینجلس کی تخلیقوں سے جنم لے رہی تھی۔ اِن لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ کوئی بھی نیا نظریہ تب تک مثبت نہیں ہوسکتا جب تک اُسے ماضی کے ادیبوں کی تخلیقات کی روشنی میں نہ دیکھا جائے۔ لہٰذا اُنھوں نے دانتے، شکسپیر، گوئٹے، زولا وغیرہ کے تمام ادبی کارناموں کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور وہ اِس نتیجے پر پہنچے کہ اُن کی ادبی کاوشیں بھی ترقی پسند رجحانات کی پیداوار ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لینن نے یہ بات واضح کرنے

کی بیحد کوشش کی کہ ہم ماضی کی ادبی تخلیقات سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اِس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ زندگی باقاعدہ طور پر اپنی ترقی اور بلندی کو حاصل کرنے کیلیے ہمیشہ برسرِ پیکار رہتی ہے۔ اِسی بنا پر ترقی پسندی کے موضوعات اور تقاضے وقت بر وقت بدلتے رہے ہیں۔ لیکن اِن تبدیلیوں کے باوجود ادیب ماضی سے بھی اپنا تعلق قائم رکھتا ہے اور حال سے بھی اپنا رشتہ بناتا ہے اور اُس کی ضرورتوں کو خاطر خواہ اہمیت دیتا ہے۔ اِس نئی نسل کے بارے جناب قمر رئیس لکھتے ہیں:

''یہ نئی نسل زیادہ سرکش، بے باک اور خود آگاہ تھی جو مارکسزم یا اشتراکیت نے اِس اِنسانی سماج اور اِس کے مسائل کے ادراک اور شعور کی جو صلاحیت دی تھی اُس کی بنیاد سائنسی اور عقلی طریق کار پر تھی۔ ہر چند کہ یہ بصیرت جواب تک بالکل ابتدائی مراحل میں تھی' نوجوانوں کے جذباتی جوش سے دبی ہوئی تھی تاہم وہ ایک روشن اور واضح شعور کی طرف بڑھ رہے تھے۔''(۱)

اُس دور میں جو Renaissance کا دور تھا پھر بھی ایک ٹھہراؤ اور یک رنگی چھائی ہوئی تھی۔ اِس یک رنگی اور ٹھہراؤ کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے ترقی پسند تحریک عمل میں آئی کیونکہ جہاد ہی ترقی پسندی کی خاص خوبی ہے۔ یہ تحریک اُسی سماج دُشمن جدوجہد کی توسیع تھی۔ اِسے کسی غیر ملک سے برآمد نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ نئے حالات اور نئی سمت کی پیش رو تھی جو مزدور طبقے کی جنگ اور سوشلسٹ نظریے سے پیدا ہوئی تھی، اِس تحریک کو عالمی سطح پر ہونے والی سرمایہ داری اور فاشزم کے خلاف جنگ سے طاقت مل رہی تھی۔ سرمایہ داری نظام گرتے گرتے ایسی پستی تک جا چکا تھا کہ وہ تہذیب کی حفاظت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اِس کے خلاف لندن میں کچھ ہندوستانی ادیبوں نے جن میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند اور دوسرے ادیب شامل تھے اُنھوں نے ایک حلقہ قائم کیا۔ وہ لوگ وقتاً فوقتاً ملتے رہتے تھے اور اِس موضوع پر تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے۔ اُن کی باقاعدگی سے ماہانہ میٹنگ ہوتی تھی۔ ایسی ہی ایک میٹنگ لندن میں چیرنگ روڈ سے متصل نان کنگ ریسٹورنٹ کے زیریں کمرے (Basment) میں ہوئی۔ وہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کا منشور پاس کیا گیا۔ یہ منشور لندن میں پڑھنے والے کچھ ادیبوں نے بنایا تھا جن میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ملک راج آنند، پرمود سین گپتا، ڈاکٹر محمد دین تاثیر وغیرہ شامل تھے۔

اوپر کی تحریر میں جو کچھ بیان کیا گیا اُس میں بہت بعد کے یعنی 1936 کے آس پاس کے ماحول کی عکاسی کی گئی ہے لیکن آزادی کے حصول کی جنگ بہت پہلے سے شروع ہوگئی تھی۔ پہلے سیاسی سرگرمیاں عمل میں آئیں اور بعد میں ادبی محاذ پر بھی اِس کا اثر ہوا۔ پہلی جنگ آزادی تو 1857 میں شروع ہوگئی تھی جسے انگریز ہندوستانیوں کی بغاوت کہتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہندوستانی عوام یہ جنگ ہار گئی۔ اِس میں جیت کے بعد انگریزوں نے جو مظالم ڈھائے اُن کی داستان سُن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ گلی گلی وحشیانہ قتلِ عام ہونے لگا۔ اِس قتل عام کا ذکر مرزا غالب نے اپنی ایک تحریر میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

''ہارے ہوئے دُشمنوں کا پیچھا کرتے ہوئے فتح مند انگریز حکمراں ہر گلی کوچے کو گھیر کر تہس نہس کر رہے تھے۔ بازار میں اُنہیں جو بھی نظر آیا اُسے کاٹ کر پھینک دیا۔ شہر کے سب لوگ امیر غریب، بڑے چھوٹے چاہے اُن کا کوئی بھی رُتبہ تھا سب نے گھروں میں گھُس کر دروازے بند کر لیے تھے تاکہ اپنی عزت کی حفاظت کر سکیں۔ شہر میں غنڈوں کی ایک فوج سی جمع ہوگئی تھی جس کے خوف سے کچھ لوگ بھاگ نکلے تھے۔ تھوڑے سے لوگوں نے غنڈوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ چند لوگ جیتنے والوں سے بھڑ گئے اور اُن کا گندہ خون بہانے لگے۔ دو تین دن کے لیے دہلی کی ہر سڑک کشمیری گیٹ سے چاندنی چوک تک جنگ کا میدان بن گئی۔ تین گیٹ یعنی اجمیری گیٹ، ترکمان گیٹ اور دہلی گیٹ ابھی تک باغیوں کے قبضے میں تھے۔ میرا گھر جو بالکل شہر کے بیچ تھا اُس کا فاصلہ دہلی گیٹ اور کشمیری گیٹ سے برابر تھا۔ جب فتح یافتہ شیطانوں نے دہلی میں قدم رکھا تو انہوں نے لوگوں کو قتل کرنا اور ان کے گھروں کو سپرد آتش کرنا اپنا قانونی حق سمجھا۔ لوگ ظلم و تشدد کو برداشت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ ظلم کے اس ننگے ناچ کے آگے لوگوں کے ہاتھ جو کچھ لگا، اٹھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایسے مظلوموں کا ایک لمبا قافلہ کشمیری گیٹ، ترکمان گیٹ اور دہلی گیٹ سے روانہ ہوگیا۔ اُن کو تلاش تھی ایسے گاؤں یا مزاروں کی جہاں وہ کچھ عرصہ کے لیے

پناہ گزین بن کر رہ سکیں۔ اگر ایسی جگہوں پر بھی وہ اپنے آپ کو محفوظ نہ پاتے تو اور آگے نکل پڑتے اور دن رات محوِ سفر رہنے کے بعد کوئی مناسب ٹھکانہ ڈھونڈ پاتے۔ جہاں تک راقم الحروف کا سوال ہے نہ اس کا دل دہلا اور نہ اس کے قدم لڑکھڑائے۔ میں وہیں رہا جہاں میں تھا اس خیال سے کہ میں نے کوئی قصور نہیں کیا جس کی مجھے سزا ملے گی۔ سُنا تھا کہ انگریز بے قصوروں کا خون نہیں بہاتے اور شہر کی آب و ہوا بھی مجھے نا موافق نہیں۔ اس لیے میں کیوں مارا مارا پھروں۔ مجھے اکیلے بیٹھ کر اپنی آواز کو اپنے قلم سے منسلک کرنا تاکہ میری آنکھوں سے جو آنسو بہہ نکلیں وہ میرے خونچکاں الفاظ میں مل جائیں۔"(۲)

اس حادثے کے کافی عرصے بعد تک آزادی کی جدوجہد پس پردہ رہی بلکہ یہ کہنا کہ لوگوں کی کمر ہی ٹوٹ گئی۔ بہت سالوں کے بعد پھر سے انقلاب کی صدا بلند ہوئی۔ بنگال کو تقسیم کرنے کے پیچھے انگریزوں کا ایک خاص مقصد تھا۔ وہ یہ ہتھیار استعمال کر کے بنگالیوں کی طاقت کو کمزور کرنا چاہتے تھے۔ اس میں لارڈ کرزن اور سر اینڈر یو فریزر کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس سلسلے میں لارڈ کرزن نے ایک خط مسٹر بروڈرک کو لکھا جو اس وقت ہندوستان میں حکومتِ برطانیہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ تھے۔ اس خط میں لکھا کہ بنگالی اپنے آپ کو ایک قوم تسلیم کرتے ہیں اور یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ جب انگریز ملک سے نکال دیئے جائیں گے تو ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آجائے گی۔ اس لیے وہ ایسا کوئی ریزولیشن نہیں مانیں گے جس سے ان کے خواب کی تعبیر میں رکاوٹ پیدا ہو۔ بعد میں لارڈ کرزن کی جگہ لارڈ منٹو نے لی تو ان کا بھی یہی خیال تھا کہ بنگال کی تقسیم ضروری ہے مگر وہ اس طریقے کے حق میں نہیں تھے جو تقسیم کے لیے عمل میں لایا جانا تھا۔ لارڈ منٹو نے اس سلسلے میں اپنے کسی خط میں لکھا بھی تھا کہ:

"میں نے گوکھلے کو یہ نہیں بتایا کہ بنگالیوں کی سیاسی طاقت کا تنزل ہی تقسیمِ بنگال کے حق میں سب سے مضبوط دلیل ہے۔ ان کی بڑھتی ہوئی طاقت اور ان کی ادبی خوبیاں اور ان کا فطرتی استعداد جن کی وجہ سے وہ دوسروں پر حاوی ہو سکتے ہیں، ان کی ناقابلِ تسخیر قوت ہے جسے مٹانا بہت ضروری ہے۔ اس لیے میرے

خیال میں سیاسی نظریے سے بنگال کو تقسیم کرنا نہایت لازمی ہے۔"(۳)

تقسیم کے خلاف جب باقی سب ترکیبیں ناکام ثابت ہونے لگیں تو بنگالیوں نے سودیشی مہم کو اپنا ہتھیار بنایا۔ اس مہم کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ غیر ملکی اشیاء کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اس سے دوہرا فائدہ حاصل کیا جانا درکار تھا۔ ایک تو یہ کہ بائیکاٹ کے اقتصادی نقصان سے ولایتی عوام پر دباؤ پڑے گا خاص کر مانچسٹر سُوت پر جس کی بنگال بہت بڑی منڈی تھا۔ دوسرا یہ کہ اس سے ہندوستانی صنعت پھر سے بحال ہو جائے گی۔ آگے چل کر لوگ اس بنیادی مقصد سے بھی آگے نکل گئے اور ان کے جذبات ہر اس شے سے جُڑ گئے جو ہندوستانی ہے۔ بنگال میں کئی طرح کی سمیتیاں قائم کی گئیں جن کے زیادہ تر ممبران طالبِ علم تھے۔ نوادیپ اور بھٹ پارہ کے پنڈتوں نے اس مہم کی بہت امداد کی۔ نادیہ کے جو گھریلو پروہت تھے انہوں نے گھر گھر جا کر سودیشی پرچار کیا۔ بنگالی اخبار جیسا کہ سندھیا اور بنگلہ واسی لورپول کے نمک اور غیر ملکی شکر کو لیکر یہ پرچار کرنے لگے کہ ان کی صفائی کے لیے گائے اور سور کے خون کا استعمال کیا جاتا ہے۔ سودیشی مہم کے ارتقاء کے لیے دباؤ ڈالا جانے لگا۔ جو لوگ اس سے اختلاف کرتے تھے انھیں برادری سے خارج کیا گیا۔ یہ بات حکومت کے علم میں آگئی اور اسے اس بات کا بھی پتہ چل گیا کہ لوکل پولیس اس مہم کے پس پشت ہے اور لوگوں سے ملی ہوئی ہے۔

وقت کے ساتھ بائیکاٹ مہم اور سودیشی مہم ایک دوسرے سے پوری طرح منسلک ہو کر جنگ آزادی کی صورت میں اُبھر کر سامنے آئیں۔ اب معاملہ صرف برٹش اشیاء کے بائیکاٹ کا نہیں رہا تھا بلکہ یہ معاملہ برٹش حکمرانوں کے بائیکاٹ کا بن گیا تھا۔ آزادی کی جنگ کو کچلنے کے لیے حکومت نے بہت سخت قدم اُٹھائے۔ چونکہ باری سال (Barisal) علاقے نے قومی احتجاج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اس لیے اسے سزا دینے کا بڑے پیانے پر بندوبست کیا گیا۔ جگہ جگہ پولیس تعینات کر دی گئی۔ ساتھ ہی گورکھا رجمنٹ کو بُلایا گیا جنہوں نے باری سال کے باشندوں پر بہت ظلم ڈھائے۔ جس وجہ سے باری سال کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ لیکن انگریزوں کے مظالم صرف باری سال تک ہی محدود نہیں تھے۔ دوسرے شہروں میں بھی مجسٹریٹ یہ دہشت پیدا کر رہے تھے کہ اگر سودیشی کی مہم ترک نہ کی گئی اور برطانوی اشیاء کی خرید شروع نہ کی گئی تو وہ گورکھوں کو دوبارہ بلا کر لوگوں پر نازل کر دیں گے۔ ان تمام سختیوں کے باوجود سودیشی مہم میں کوئی کمی واقعہ نہ ہوئی بلکہ وہ بنگال کے

باہر بھی پھیلنے لگی۔ بمبئی میں بال گنگادھر تلک، اُنکی بیٹی شریمتی کیتکر اور شریمتی اے۔ وی۔ جوشی نے اس کی کمان سنبھالی۔ پنجاب میں کئی مشہور لیڈر اس میں شامل ہوئے جن میں سے پنڈت چندر یکا دت، شری منشی رام جو بعد میں سوامی شردھانند کے نام سے مشہور ہوئے قابلِ ذکر نام ہیں۔ مدراس میں سبرامنیم آئیر اور پی آنند چارلو سامنے آئے۔ غرضیکہ سودیشی مومنٹ ملک گیر قومی تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ قومی سطح پر اس کی پشت پناہی بال گنگادھر تلک اور لالہ لاجپت رائے نے کی۔

اگرچہ کچھ لوگوں نے سودیشی اور بائیکاٹ کی تحریکوں کی مخالفت بھی کی لیکن ان دونوں مہموں سے انقلابی تحریک کو بہت تقویت پہنچی۔ اس سے لوگوں میں حُب الوطنی کا جذبہ دور دور تک پھیل گیا۔ لیکن اس سے دو طبقے قائم ہو گئے۔ ایک طبقہ ان لوگوں کا جو تشدد کے حق میں تھے اور دوسرا ان کا جو عدم تشدد کے ذریعے انگریزی حکومت سے آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس بھی ان ہی لائنوں پر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ان دونوں طبقوں میں مقصد اور حصولِ مقصد دونوں کے بارے میں اختلاف تھا۔ بعد میں ایک طبقے کی کمان سبھاش چندر بوس نے سنبھالی اور دوسرے طبقے کی رہنمائی مہاتما گاندھی نے اپنے ذمے لی۔

جیسا کہ کہا گیا ہے حصولِ آزادی کے لیے کچھ لوگوں نے انقلابی سرگرمیاں شروع کیں جس سے برطانوی حکومت کو تشویش ہونے لگی۔ یہ سرگرمیاں صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ غیر ممالک میں بھی ہونے لگیں۔ لندن میں جن لوگوں نے انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لیا اُن میں ویر ساورکر، ہردیال اور مدن لال ڈھنگیرہ کے نام سرفہرست تھے۔ ان لوگوں نے 18 فروری 1905 کو ''انڈین ہوم رول سوسائٹی'' کا انعقاد کیا۔ اِن کا مقصد مکمل آزادی حاصل کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے عدم تشدد کے راستے کا انتخاب کیا۔ لیکن ضرورت پڑنے پر تشدد کا استعمال بھی واجب سمجھا گیا۔ لہٰذا امریکہ میں سان فرانسسکو کے مقام پر ایک پارٹی بنائی گئی جس کا نام ''غدر پارٹی'' رکھا گیا۔ یہ پارٹی پہلی نومبر 1913 کو قائم ہوئی۔ اس کو بنانے کے لیے جو ریزولیوشن پاس کیا گیا اُس میں پارٹی کا مقصد آزادی ہی کہا گیا۔

ستمبر 1915 کو مسز اینی بسنٹ نے ''ہوم رول لیگ'' کا اعلان کیا اور اس کے قیام کا ریزولیوشن کانگریس کے اجلاس میں منظوری کے لیے پیش کیا لیکن پارٹی پریزیڈنٹ نے اسے مسترد

کردیا۔ لہٰذا مسز بسنٹ نے خود ہی 1916 کو اسے قائم کردیا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس کی برانچیں بمبئی، کانپور، الٰہ آباد، بنارس، متھرا، کالی کٹ، احمد آباد اور مدراس میں کُھل گئیں۔ اینی بسنٹ اور تلک نے اس کے بعد ہندوستان کے کئی علاقوں کا دورہ کیا تا کہ ہوم رول لیگ کے مقاصد لوگوں کو سمجھا سکیں۔ ہر جگہ ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ پولیس نے بھی ان کے دورے کو ''کامیاب دورہ'' ہی کہا تھا۔

جب گاندھی جی افریقہ سے ہندوستان لوٹے تو اُنھوں نے ستیہ گرہ کا ہتھیار استعمال کیا۔ اُن کا کہنا تھا جو لوگ طاقت سے آزادی حاصل نہیں کر سکتے اُن کے لیے آزادی حاصل کرنے کا یہ آسان اور کارگر ذریعہ ہے۔ لہٰذا لوگوں نے بڑے پیمانے پر اس کا استعمال کرنا شروع کیا۔ کئی جگہ پُرامن ہڑتالیں کی گئیں۔ لیکن امرتسر میں ایک نہایت شرمناک اور دل دہلا دینے والا واقعہ ہوا۔ امرتسر میں دو ہڑتالیں ہوئیں ایک 30 مارچ کو اور دوسری 6 اپریل کو جو پورے امن امان سے انجام کو پہنچیں۔ لیکن 9 اپریل 1919 کو مائیکل ڈائیر نے ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر کچلو کو ملک بدر کردیا۔ لہٰذا اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ 13 اپریل کو ساڑھے چار بجے شام کو اس عمل کے خلاف ایک پبلک میٹنگ کی جائے۔ جنرل ڈائیر نے 12 اپریل کو ہی لوگوں کی اسمبلی پر پابندی لگا دی۔ لیکن یہ حکم لوگوں تک غلطی سے یا جان بوجھ کر نہیں پہنچایا گیا۔ اس لیے جیسے ہی پبلک میٹنگ شروع ہوئی جنرل ڈائر نے اپنی فوج کو لے کر ایک ٹیلے پر پوزیشن لے لی۔ اُس وقت کوئی 10,000 لوگ وہاں پہنچ گئے تھے۔ ڈائر نے بنا کسی وارننگ کے اُن پر گولیاں برسانی شروع کردیں۔ لوگ اپنی جانیں بچانے کے لیے ہر طرف بھاگے۔ اِسی دوڑ دھوپ میں کچھ لوگ کنوئیں میں گر گئے اور کئی دوسرے لوگوں کے پیروں تلے دب کر مر گئے۔ ہزاروں کے قریب جانیں تلف ہوگئیں۔ اس حادثے کی چھان بین کے لیے ہنٹر کمیٹی مقرر کی گئی جس نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اس قتل عام کی جنرل ڈائر کے پاس کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ 4 ستمبر 1920 کو کلکتہ میں کانگریس کا اجلاس ہوا جس کی صدارتی تقریر لالہ لاجپت رائے نے کی۔ اُس تقریر میں انھوں نے اِس حادثے کا حال بیان کرتے ہوئے کہا کہ '' یہ ظلم اور درندگی قانون کے نام پر عمل میں لائی گئی۔'' اس لحاظ سے انگریزی حکومت نے پنجاب کے ساتھ دشمن سے بھی برا سلوک کیا۔ اس کا سیدھا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں

میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ انگریزی حکومت کو ملک کی حدوں سے باہر پھینکنے کی جدوجہد میں دل وجان سے جُٹ گئے۔ مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنا ''سر'' کا خطاب لوٹا دیا اور وائسرائے کو نہایت دردناک الفاظ میں خط لکھا جس میں لاکھوں لوگوں کے مغموم جذبات کو واضح کیا۔

ایسا اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب جب نان کوآپریشن کی تحریک میں کمزوری پیدا ہوئی یا یہ دم توڑتی ہوئی نظر آنے لگی تو حکومت نے خود ہی کوئی غیر عقل مندانہ قدم اُٹھا کر اسے پھر سے زندہ جاوید کر دیا۔ 1921 میں پرنس آف ویلز کے دورۂ ہندوستان نے بھی یہی کام کیا اور 1928 میں اس تحریک کو طاقت سائمن کمیشن کی نامزدگی سے ملی۔ جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 میں پاس ہوا تو اُس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ ریفارمز کے عمل میں آنے کے دس سال بعد ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جو اس بات کی تفتیش کرے گا کہ اُن ریفارمز میں کیا تبدیلیاں کی جائیں۔ اس سلسلے 8 نومبر 1927 کو ایسے ہی ایک کمیشن کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ برٹش پارلیمنٹ کی میعاد صرف 1929 تک تھی اور نئے چناؤ میں لیبر پارٹی کے اقتدار میں آنے کے کافی آثار تھے۔ لیبر پارٹی کا رویہ ہندوستانیوں کی طرف بہت ہمدردانہ تھا۔ اس لیے موجودہ حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ فوراً ہی کمیشن بنا دیا جائے تاکہ لیبر پارٹی کو موقع ہی نہ ملے کہ وہ ہندوستانیوں کو کوئی رعایت دے۔ شاید اس سے بھی ہندوستانی عوام کو زیادہ شکایت نہ ہوتی لیکن ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا گیا کہ اس کمیشن میں سات برٹش پارلیمنٹ کے ممبر ہوں گے اور سائمن اُس کمیشن کے چیئرمین ہونگے۔ یعنی اس کمیشن میں ایک بھی ہندوستانی نہیں ہوگا۔ سائمن کمیشن کی خبر سُن کر لوگوں کو بہت مایوسی ہوئی۔ ہر سیاسی لیڈر چاہے وہ کسی بھی پارٹی سے تعلق رکھتا تھا بہت ناراض ہوا اور ایک متفقہ فیصلہ کیا گیا کہ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اس سے پہلے ایسا کوئی موقع نہیں تھا جب کسی موضوع پر تمام سیاسی پارٹیاں متفق ہوں۔ لہٰذا سائمن کمیشن کا تمام پارٹیوں کی طرف سے بائیکاٹ کیا گیا اور جگہ جگہ مظاہرے ہوئے جن میں ''سائمن واپس جاؤ'' کے نعرے بلند ہوئے۔ جب سائمن کمیشن لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو اُس کے خلاف جو لوگ احتجاج میں شامل ہوئے اُن میں لالہ لاجپت رائے بھی تھے جن کے ساتھ بہت ساری عورتیں بھی احتجاج کر رہی تھیں۔ یہ 30 اکتوبر 1928 کی بات ہے۔ پولس نے لالہ

لاجپت رائے پر لاٹھیاں برسائیں جس سے وہ شدید زخمی ہوئے اور فوراً ان کا انتقال ہو گیا۔ اس ظلم سے نوجوان انقلابیوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ بھگت سنگھ نے سانڈرز اسسٹنٹ پولس سپرنٹنڈنٹ جس نے لاٹھی چارج کیا تھا اُس کا قتل کر دیا لیکن خود بچ نکلا۔ بعد ازاں بھگت سنگھ اور اُس کے ساتھی بٹو کیشور دت نے دہلی اسمبلی ہال میں دو بم پھینکے اور کچھ گولیاں بھی چلائیں۔

لالہ لاجپت رائے کا ذکر آیا تو ان کی زندگی سے وابستہ ایک بہت دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ لالہ لاجپت رائے نے جو تقریریں کیں یا تحریریں لکھیں وہ تین حصوں میں تقسیم کی گئیں۔ انہوں نے پہلے حصے کا نام رکھا 'میری زندگی کی کہانی' جسے اردو میں لکھا گیا تھا اور جس میں ان کی زندگی کے ذاتی حالات درج ہیں۔ دوسرے حصے کا نام 'میری جلاوطنی کی کہانی' اور تیسرے حصے کا نام ہے 'امریکہ اور جاپان میں ہندوستانی انقلابی'۔ ان تین حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کر کے وجے چندر جوشی نے انہیں ایک کتاب کی شکل میں 1965 میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا عنوان ہے "Lajapat Rai Autobiographical Writings"۔ اس کتاب میں لالہ لاجپت رائے نے اپنے باپ دادا کی زندگی کے حالات بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ان کی ماں ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئی تھی لیکن شادی کے بعد وہ ہندو رسموں اور رواجوں کو ماننے لگی تھی اور کسی بھی رسم کو نظر انداز نہیں کرتی تھی۔ لیکن ان کے والد مورتی پوجا کے سخت خلاف تھے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی 25 یا تیس سال تک ان کا رجوع اسلام کی طرف تھا اور مذہب اسلام کے سُنّی مسلک کو مانتے تھے۔ لالہ لاجپت رائے نے لکھا ہے کہ ان کے والد لالہ رام کشن ذات کے اگروال بنیا تھے اور پنجاب میں لدھیانہ کے پاس ایک چھوٹے سے گاؤں جگراؤں کے رہنے والے تھے جہاں ان کے آبا واجداد کئی پشتوں سے مقیم تھے۔ وہ لوگ جین مذہب کے شویتامبر طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا مذہب کے پابند تھے اور جین سادھوؤں کی صحبت میں رہنا پسند کرتے تھے۔ لیکن ان کے والد مختلف قسم کے انسان تھے۔ وہ ہندو مذہب سے گریز کرتے تھے اور مولویوں وعلماؤں کے درمیان زیادہ وقت گزارتے تھے۔ وہ باقاعدگی سے نماز پڑھتے تھے اور روزے بھی رکھتے تھے۔ بعد میں جب سر سید احمد خان نے اپنے ''قدرتی مذہب'' کی مہم شروع کی تو وہ ان کے پیروکار بن گئے اور چالیس سال کی عمر تک سر سید احمد خان کے پیروکار بنے رہے۔ اس دوران وہ ہندو دھرم اور برہمو سماج کے سخت خلاف

تھے اور ان کی کڑی نقطہ چینی کرتے تھے۔

لالہ لاجپت رائے نے لکھا ہے کہ جب ان کے والد مذہب اسلام کے سُنّی مسلک کو مانتے تھے تو انہوں نے لالہ لاجپت رائے کو قرآن کی چند آیتیں پڑھنا سکھائیں اور اس کے زیرِ اثر وہ بلند آواز میں نماز پڑھتے تھے اور کبھی کبھی روزہ بھی رکھتے تھے۔ لالہ لاجپت رائے نے لکھا ہے:

''میرے والد ہندو مذہب' ہندو رواجوں اور رسموں کی کڑی مذمت کرتے تھے اور ہندو دیوی دیوتاؤں کے لیے بڑی کرخت زبان کا استعمال کرتے تھے۔ ہندو تہواروں کے دنوں میں نہ تو وہ خود پوجا میں شامل ہوتے تھے اور نہ ہی گھر کے دوسرے لوگوں کو پوجا کرنے کی اجازت ہوتی تھی۔ البتہ میری ماں چوری چھپے تمام رسمیں ادا کرلیتی تھی۔ اکثر جب میرے والد گھر میں نہیں ہوتے تھے تو وہ گھر کے تمام دروازے بند کر کے اپنی مذہبی روایتوں کے مطابق پوجا پاٹھ مکمل کرلیتی جس کا میرے والد کو علم تک نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ اچانک آجاتے اور اسے پوجا کرتے دیکھ لیتے یا ہماری باتوں سے یا کسی دوسرے ذریعہ سے انہیں معلوم ہوجاتا کہ ان کی غیر حاضری میں وہ مورتی کی پوجا کرتی رہی ہیں تو وہ اپنے غصے پر قابو نہ رکھ پاتے اور میری ماں پر بری طرح ناراض ہوتے۔

اسلام کے ساتھ اتنا قریبی تعلق ہونے کے باوجود بھی اگر میرے والد نے باقاعدہ اسلام قبول نہیں کیا تو یہ کسی کرشمے سے کم نہیں اور اس کا سہرا میری ماں کے سر جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں بچّہ تھا تو میری ماں میرے والد کے مذہبی رجحان کی وجہ سے بہت آنسو بہاتی تھیں۔ لیکن اس کے آنسوؤں کا میرے والد پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ البتہ میرے والد یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اسلام قبول کرلیا تو میری ماں اپنے بچّوں کو لے کر اپنے والد کے گھر چلی جائے گی جو وہ بالکل نہیں چاہتے تھے۔''(۴)

ہندوستان میں مندرجہ بالا سرگرمیاں سیاسی سطح پر واقع ہوئی تھیں جن کی وجہ سے حکومت برطانیہ کو تشویش ہونے لگی تھی۔ لیکن ادبی محاذ پر بھی ادباء اور شعرا نے ہندوستانیوں کو یکجا کرنے اور ان

میں آزادی اور قومیت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے بہت اہم قدم اُٹھائے۔ اس کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے کہ پنجاب میں اقبال کا بول بالا تھا اور وہ اپنے وقت کے سب سے قد آور شاعر تھے۔ اُن کی شاعری میں زیادہ تر خودی اور قومیت کا درس نمایاں تھا۔ اکبر الہ آبادی طنزیہ شاعری کے لیے بہت مشہور تھے۔ اکبر اگرچہ حکومت کی نوکری کرتے تھے پھر بھی بہت بلند قومی جذبات رکھتے تھے اور گاندھی کے خاص معترف تھے۔ 1936 کے بعد کا جدید اردو لٹریچر خاص طور پر عوامی حکومت کا حامل تھا۔ ان کی تقریروں، تحریروں اور دیگر تخلیقات میں ترقی پسندی کے عناصر اُبھر کر آرہے تھے۔ اس جدیدیت کے حامیوں میں میراجی، فیض، سردار جعفری، احمد علی، سجاد ظہیر، خواجہ احمد عباس، حفیظ جالندھری وغیرہ سب سے آگے تھے۔ ان کے علاوہ اُپندر ناتھ اشک، جوش ملیح آبادی، وغیرہ نے بھی ترقی پسند تحریک کو تقویت دینے میں بہت اہم کام کیا۔ اُس دور میں کمیونزم نے بہت سارے ادباء کو اثر انداز کیا تھا۔ ایسے لوگوں میں سجاد ظہیر اور سردار جعفری سرفہرست تھے۔ کچھ عرصہ تک کیفی اعظمی اور مخدوم محی الدین بھی ان کے ساتھ رہے لیکن رفتہ رفتہ ان کا نظریہ بدلتا گیا۔ ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری اور کنہیالال کپور بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔

'روشنائی' میں سجاد ظہیر لکھتے ہیں کہ 1938 کے وسط سے اردو ترقی پسند ادیبوں کے تین اہم مرکز قائم ہونے لگے تھے۔ یہ مرکز تھے لاہور، لکھنؤ اور حیدر آباد (دکن)۔ لاہور سے دو اچھے رسالے نکل رہے تھے۔ ایک تو 'ہمایوں' تھا اور دوسرا 'ادبی دنیا'۔ 'ہمایوں' کے ایڈیٹر میاں بشیر احمد اور حامد علی خان تھے اور 'ادبی دنیا' کے مولانا صلاح الدین احمد تھے۔ شروع شروع میں فیض احمد فیض، ڈاکٹر دین محمد تاثیر، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، اور اپندر ناتھ اشک کی تخلیقات انہی رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ بعد میں چودھری برکت علی اور چودھری نذیر نے 'ادب لطیف' رسالہ جاری کیا اور 'مکتبہ اردو' قائم کیا جس میں نئے اردو ادب کی اشاعت کی جانے لگی۔ 'ادب لطیف' نے ترقی پسند ادب کی بہت اہم خدمات انجام دیں۔ 'مکتبہ اردو' نے بھی ایک ناشری ادارے کی حیثیت سے بہت اہم کام کیا۔ اس ادارے نے پنجاب میں اور بعد میں پنجاب کے باہر بھی ترقی پسند ادیبوں کے کارناموں کو شائع کیا۔ 1939 میں ایسے ہی ادیبوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جن میں علی سردار جعفری بھی شامل تھے۔ دراصل سردار جعفری علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے کر رہے تھے لیکن اپنی

سیاسی سرگرمیوں کی بناء پر وہاں سے نکالے گئے۔ پھر انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ ان میں اسرار الحق مجاز بھی تھے جو علی گڑھ سے ایم اے پاس کر کے لکھنؤ آ گئے تھے۔ مجاز کی ادبی اور سیاسی خوبیوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کے مزاج میں ایک لطیف اور دلکش رنگینی تھی۔ خوبصورت، مترنم الفاظ اور ترکیبوں کے ذریعہ وہ کیف اور رومانیت کی خوشنما فضا اپنے شعروں میں پیدا کرتے تھے جس کے ذریعے" وہ اس زمانے کے آزادی خواہ نوجوانوں کی مضطرب روح کو اپنے کلام میں مسخر کر لیتے تھے۔'' انہیں خوبیوں کے سبب مجاز بہت جلد اردو ادب جاننے والے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے محبوب شاعر بن گئے۔ ایک اور ادیب حیات اللہ انصاری تھے جو لکھنؤ کے ترقی پسند ادیبوں میں بہت ممتاز مقام رکھتے تھے۔ وہ لکھنؤ کے نامور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے ایک بزرگ تھے مولانا عبدالباری جن کی ذاتی شرکت سے نان کوآپریشن کو بہت تقویت ملی تھی۔

لکھنؤ سے انہیں دنوں ایک رسالہ 'ہندوستان' کے نام سے شائع ہوا جو ہفتہ وار نوعیت کا تھا۔ اس کا ادبی حصہ ترقی پسند ادیبوں کے لیے ہی وقف تھا۔ اس رسالے کے ابتدائی دور میں کئی نوجوان اردو ادیبوں کی نظمیں شائع ہوئیں۔ ان میں مجاز، سردار جعفری، جاں نثار اختر، علی جواز زیدی اور شمیم کرہانی کی کافی نظمیں چھپیں۔ یہ تمام نوجوان ترقی پسند شاعر تھے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ ترقی پسند تحریک اب اگلے دور میں پہنچ چکی تھی۔

سبط حسن، مجاز اور سردار جعفری نے 1941 میں ایک رسالہ 'نیا ادب' کے نام سے جاری کیا جو تھوڑے ہی عرصے میں ترقی پسند تحریک کا ترجمان بن گیا۔ اس کے علاوہ لاہور سے 'ادب لطیف' شائع ہوا۔ یہ رسالہ 1942 کے آخر تک شائع ہوتا رہا مگر بعد میں بند ہو گیا۔ اس کے مختلف شماروں میں کئی بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوئیں جن میں فراق گھورکھپوری کا مضمون 'نئے ادب میں غزل کی جگہ' فیض احمد فیض کا 'ترقی پسند ادب' احتشام حسین کا 'قدیم ادب اور ترقی پسند نقاد' ڈاکٹر عبدالعلیم کا 'ادبی تنقید کے بنیادی اصول' وغیرہ ایسے مضمون ہیں جو بہت مقبول ہوئے۔ کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی تو ان دنوں اکثر پنجاب کے رسالوں میں ہی لکھتے تھے لیکن 'نیا ادب' کے کئی نمبروں میں عصمت چغتائی، کرشن، منٹو، اختر رائے پوری، احمد علی اور علی سردار جعفری کے افسانے شائع ہوئے۔ لکھنؤ سے ترقی پسند ادیبوں نے 'حلقۂ ادب' کے نام سے ایک دارالاشاعت بھی قائم کیا جس میں مجاز کے

کلام کا مجموعہ 'آہنگ' حیات اللہ انصاری کے افسانوں کا مجموعہ 'انوکھی مصیبت' سردار جعفری کے افسانوں کا مجموعہ 'منزل' اور سجاد ظہیر کا ناول 'لندن کی ایک رات' شائع ہوئے۔ ترقی پسند تحریک پر جو اعتراضات کیے گئے اُن کا بھی مناسب جواب سجاد ظہیر نے دیا جو 'سراج مبین' کے نام سے 'نیا ادب' میں شائع ہوا۔ اسی زمانے میں ہندی کا ایک اور ترقی پسند رسالہ 'ہنس' شائع ہوا جس کے ایڈیٹر شیودان سنگھ چوہان اور منشی پریم چند کے بیٹے شری پت رائے تھے۔ یہ رسالہ تھوڑے عرصے میں ہی ترقی پسند تحریک کا ترجمان بن گیا۔

سجاد ظہیر کی ترقی پسند تحریک کے منشور (Manifesto) کا مسودہ لکھنے اور مکمل کرنے کی ذمہ داری پانچ اشخاص کو سونپی گئی۔ یہ وہ لوگ تھے جو ان نوجوانوں کی صف میں کھڑے تھے جن کے احساس کو اُس زمانے کی سیاست نے جھنجھوڑ رکھا تھا۔ جرمن میں ہٹلر نے اپنے ملک کے اعلیٰ درجے کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو یا تو قید کر لیا تھا یا ملک بدر کر دیا تھا۔ اس واقعہ سے روشن خیال ادیب فاشزم کو نفرت کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ لہٰذا نہ صرف یورپ بلکہ امریکہ کے دانشور بھی متحد ہو کر ان عوامی تحریکوں میں شامل ہو گئے تھے۔ 1935 کی ترقی پسند ادبی تحریک اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اُس مینوفیسٹو میں جن لوگوں نے سب سے پہلے دستخط کیے وہ تھے ڈاکٹر ملک راج آنند، سجاد ظہیر، ڈاکٹر کے۔ ایس۔ بھٹ، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر ایس سنہا، ڈاکٹر دین محمد تاثیر۔

منشی پریم چند نے یہ مینی فیسٹو اپنے رسالہ 'ہنس' کے اکتوبر 1935 کے شمارے میں شائع کیا۔ انہوں نے ان مقاصد کے حق میں ایک اداریہ بھی لکھا اور کہا کہ یہ تحریک ہمارے ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔

ان ادیبوں نے منشور میں اس تحریک کا نام انجمن ترقی پسند مصنفین رکھا اور یہ واضح کیا کہ اس کا مقصد محض ایک ادبی حلقہ بنانا ہی نہیں بلکہ ایک ایسی تحریک کو جنم دینا ہے جس میں ہندوستان کے ایسے ادیب جو ترقی پسند نظریہ رکھتے ہیں، شامل ہو کر ملک کو آزادی دلانے میں پیش پیش ہوں۔ چنانچہ لندن سے ہی اس منشور کی کاپیاں بنا کر ہندوستان میں اپنے دوستوں اور جاننے والوں کو ارسال کیں تاکہ ہندوستان کے ادیبوں کی رائے حاصل کریں۔ جن لوگوں کو منشور کی نقلیں بھیجی گئیں اُن میں ایک تو محمد اشرف تھے جو علی گڑھ یونیورسٹی میں لیکچرار تھے۔ دوسرے امرتسر میں صاحب زادہ

محمود الظفر تھے جو ایم اے او کالج کے وائس پرنسپل تھے۔ اُن کے ساتھ ان کی خوبصورت بیوی ڈاکٹر رشید جہاں تھیں۔کلکتہ میں بیرسٹر ہیرن مکھرجی اور حیدرآباد (دکن) میں ڈاکٹر یوسف حسین خان تھے۔ بمبئی میں بتھی سنگھ جو بعد میں جواہر لال نہرو کے بہنوئی بنے۔ بتھی سنگھ کے وثوق سے ہی سجاد ظہیر کنہیا لال منشی اور اُنکی بیوی لیلاوتی سے ملے لیکن چونکہ کنہیالال منشی کا نقطہ نظر اس تحریک سے بنیادی طور پر الگ تھا اس لیے ان سے ملاقات سودمند ثابت نہیں ہوئی۔الہ آباد میں وہ علی احمد سے ملے جو یونیورسٹی میں انگریزی کے لیکچرار تھے۔ انہی کی معرفت رگھوپتی سہائے فراق اور ڈاکٹر اعجاز حسین سے بھی ملاقات کی۔ یہ دونوں حضرات یونیورسٹی میں لیکچرار تھے۔ کچھ طلباء سے بھی سجاد ظہیر کی ملاقات ہوئی جن میں احتشام حسین بھی شامل تھے۔ اُسی دوران وہ شیودان سنگھ چوہان اور نریندر شرما سے بھی ملے جنہوں نے بعدازاں بہت بڑے ادیب بن کر شہرت حاصل کی۔ پنڈت امرناتھ جھا ان دنوں الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ انہوں نے بھی ترقی پسند تحریک سے ہمدردی ظاہر کی۔ اس طرح الہ آباد میں ترقی پسند ادیبوں کا ایک حلقہ قائم ہو گیا تھا۔

الہ آباد میں سن 1935 میں ہندی اور اردو کے ادیبوں کی کانفرنس ہندوستانی اکیڈمی میں ہوئی۔ یہ اکیڈمی چند وزیروں نے مل کر مونٹیگو چمس فورڈ اصلاحات کے تحت قائم کی تھی۔ ان وزیروں میں ایک روشن خیال وزیر بھی تھے جن کا نام راجیشور بلی تھا۔ اُنہوں نے لکھنؤ میں پہلی مرتبہ موسیقی کی ایک بڑی کانفرنس منعقد کی۔ اور ہندوستانی اکیڈمی کے انعقاد میں بھی نمایاں حصہ لیا تھا۔ اسی کانفرنس میں مولوی عبدالحق، منشی پریم چند اور جوش ملیح آبادی بھی شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ انہوں نے انجمن کا منشور پڑھا اور اس کے مقاصد سے اتفاق کا اظہار کیا۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی منشی دیا نارائن نگم (ایڈیٹر 'نیا زمانہ' کانپور)، ڈاکٹر محی الدین زور (پروفیسر اردو حیدرآباد دکن) وغیرہ بھی اس کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے۔

سجاد ظہیر کا امرتسر کا دورہ نہایت کامیاب رہا۔ وہاں وہ پہلی بار فیض احمد فیض سے ملے جو ایم اے او کالج میں انگریزی کے لیکچرار تھے۔ سجاد ظہیر، فیض، محمود الظفر اور رشید جہاں کی تجویز پر وہ لاہور گئے جہاں ان کے وسیلے سے انہیں وہاں کے ادیبوں سے ملنے کا موقع ملا جن میں اختر شیرانی بھی تھے۔ اختر نے بلا جھجھک منشور پر دستخط کر دیئے۔

سجاد ظہیر کو اختر شیرانی سے ملانے فیض اُنہیں ان کے مکان پر لے گئے لیکن اختر سے مل کر انہیں نہایت دل شکنی ہوئی۔ وہ ایک تنگ اور تاریک مکان میں رہتے تھے جس کے ہر کونے سے معاشی تنگدستی جھلک رہی تھی۔ اختر شیرانی کی خستہ حالی کو سجاد ظہیر نے یوں بیان کیا ہے:

''اختر شیرانی کے یہاں مجھے فیض لے گئے۔ ان کا مکان پرانے لاہور کی ایک گلی میں تھا۔ ویسی ہی تنگ و تاریک گلی، جیسے پرانی دہلی اور پرانے لکھنؤ میں بھی بہت ہیں۔ ہم کوئی صبح کے آٹھ نو بجے کے قریب وہاں گئے تھے۔ اس لیے اگر دھوپ وہاں پہنچتی تو بھی اس وقت تک نہیں پہنچتی تھی۔ اختر صاحب کا کمرہ اوپر کوٹھے پر تھا۔ اندھیرے زینے پر ہم ٹٹولتے ٹٹولتے اوپر پہنچے تو اختر صاحب کے کمرے کو ہم نے کچھ زیادہ روشن نہیں پایا۔ بے ترتیبی سے چاروں طرف چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ کاغذوں، کتابوں اور کرسیوں کے ہتھوں پر مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ میلے کپڑے ادھر اُدھر پڑے تھے۔ جوٹھی چائے کی پیالیاں اور صبح کے ناشتے کے برتن ابھی تک یوں ہی ایک طرف کو رکھے تھے اور اُس پراگندگی اور کثافت کے درمیان ہمارا وہ محبوب رومانی شاعر سلمیٰ کا خالق، حسن کا پرستار، جس کے شعروں نے کتنے ہی نوجوان دلوں میں محبت کی ایک نئی چاشنی پیدا کی ہوگی، ایک پرانی سی لکڑی کی کرسی پر تہمد باندھے سرنگوں بیٹھا تھا۔ اس سارے ماحول سے اگر ایک طرف اختر کے مزاج کی آشفتگی ظاہر ہوتی تھی تو دوسری طرف معاشی تنگی بھی ٹپکی پڑی تھی۔ اختر شیرانی کو ان حالات میں دیکھ کر میرے دل کو بڑا دُکھ ہوا۔ میں نے پریشان ہو کر فیض کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر ہمدردی اور سکون کی ملی جلی کیفیت تھی اور زبان سے کچھ بولے بغیر جیسے انہوں نے مجھ سے کہہ دیا کہ ''ایک اختر شیرانی ہی نہیں، ہمارے زیادہ تر ادیب، شاعر، اہلِ علم و فن انہی روح فرسا حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جب ہی تو ہم اپنی اس تحریک کو شروع کر رہے ہیں۔''(۵)

اختر شیرانی نے تحریک کا منشور بڑی غور سے پڑھا اور اس پر دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد

میاں افتخار الدین کی کوٹھی پر کچھ پندرہ بیس آدمی مدعو کیے گئے جو ترقی پسند تحریک کے مقاصد کے حامی تھے۔ ان میں عبدالمجید سالک، چراغ حسرت، میاں بشیر احمد، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، فیروز الدین منصور وغیرہ تھے۔ اس اجتماع میں سجاد ظہیر نے تحریک کا منشور پڑھ کر سنایا۔ اس منشور کے متعلق کچھ لوگوں نے اپنے شکوک کا اظہار کیا جن کا جواب سجاد ظہیر نے حسب حال دیا۔ اس وقت جتنے لوگ موجود تھے سب نے مینوفیسٹو سے اتفاق ظاہر کیا اور اس پر دستخط کر دیئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی تشکیل کا اعلان لاہور میں ہی ہوا۔ لہٰذا فیض احمد فیض کی تجویز پر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کو عارضی طور پر انجمن کا سکریٹری چنا گیا اور فیض انجمن کی پنجاب برانچ کے لیے منتخب ہوئے۔ انجمن کی تشکیل کے بعد انجمن کے اجلاس باقاعدگی سے صوفی تبسم کے عدالت روڈ والے گھر پر منعقد ہونے لگے۔ کچھ عرصے بعد جب صوفی تبسم لاہور چلے گئے تو اس کے ساتھ انجمن کی پناہ گاہ بھی چلی گئی۔ لیکن پنجاب میں ان دنوں ایک لٹریری لیگ ہوا کرتی تھی جس کے ممبر ایک کشمیری پنڈت تھے جن کا نام شنگلو جی تھا۔ اس لیگ کے ممبروں نے شنگلو جی کے واسطے سے انجمن کی بہت مدد کی اور اب انجمن کے اجلاس وہاں ہونے لگے۔ لیکن اس لیگ کے ختم ہو جانے کے بعد انجمن پھر سے بے گھر ہو گئی۔ تب قسمت نے ایک اور ذریعہ نکالا۔ سانیال نام کے ایک بنگالی ہندو تھے جن کا ایک پینٹنگ اسٹوڈیو تھا۔ انہوں نے برائے کرم انجمن کو وہاں سے کام کرنے کی اجازت دے دی۔ اس طرح انجمن دربدر بھٹکتی رہی۔ فیض کہتے ہیں اس دربدری کے درمیان بھی ہم سب کی ہمت جوان تھی۔

انجمن کی برانچ پنجاب میں قائم کرنے کے لیے سجاد ظہیر جنوری 1936 میں امرتسر (پنجاب) روانہ ہو گئے۔ پنجابی ادیبوں کا تجربہ سجاد ظہیر نے بڑے رنگین انداز میں بیان کیا ہے۔ چونکہ راقم الحروف خود بھی پنجابی ہے اس لیے سجاد ظہیر کے اس تجربے کی یاد کو تازہ کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ سجاد ظہیر کہتے ہیں کہ اس دورے سے پہلے وہ اپنے خاندان کے ساتھ کشمیر جاتے ہوئے پنجاب سے گزرے تھے۔ وہاں رہنے کا موقع اس سے پہلے انہیں کبھی نہیں ملا تھا۔ وہ ان کے لڑکپن کا زمانہ تھا جس کی یادیں ان کے ذہن میں اب تک باقی تھیں۔ وہ کہتے ہیں اسٹیشنوں پر پھل اور کھانے کی چیزیں بہت زیادہ مقدار میں ہوتی تھیں۔ لسی بڑے بڑے گلاسوں میں ملتی تھی اور وہاں کی بریانی بڑی مزیدار ہوتی تھی۔ لوگ بڑے قد آور اور بھاری بھرکم جسم کے ہوتے تھے جو بہت اونچی

آواز میں بات کرتے تھے۔ اکثر لوگ پگڑی باندھتے تھے اور داڑھی بھی رکھتے تھے۔ ان کے پہناوے میں شلوار، تہمدیں اور لمبی لمبی قمیضوں کا استعمال زیادہ ہوتا تھا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے وہاں کے لوگوں کے برعکس ننگے، بھوکے لوگ بالکل دکھائی نہیں دیتے تھے۔ سبزہ یوپی کے مقابلے میں کم تھا مگر گرمی قدرے زیادہ تھی۔ ان کے لفظوں میں فی الجملہ پنجاب کے ساتھ خوشحالی، توانائی اور کسی قدر کی فطری سختی کا تصور ہمیشہ کے لیے ان کے ذہن میں بس گیا تھا۔

سجاد ظہیر کے بہت سے پنجابی انگلستان میں ہی گہرے دوست بن گئے تھے۔ ان میں میاں افتخار الدین، محمد علی قصوری، کرم سنگھ مان، بابا پیارے لال بیدی وغیرہ ایسے دوست تھے جن کے دل میں وطن کی آزادی کا جذبہ بھرا ہوا تھا۔ لیکن ان میں کسی کو بھی اردو زبان یا اردو ادب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہیں وہ ڈاکٹر ملک راج آنند سے بھی ملے جو خالص ادبی قسم کے انسان تھے مگر اردو ادب سے بے بہرہ تھے۔ کیمبرج میں وہ ڈاکٹر دین محمد تاثیر سے بھی ملے تھے جو اردو جاننے والے واحد پنجابی تھے۔

پنجاب کو اس بات کا فخر تھا کہ اسی کے ایک عزیز نے ہندوستان کو عظیم شاعری عطا کی تھی۔ وہ تھے سر محمد اقبال۔ اسی سرزمین سے حالی پانی پتی اور محمد حسین آزاد نے جدید نظم کی بنیاد ڈالی تھی۔ ظفر علی خان جو پنجابی تھے وہ اصناف ادب کی تقویت کے لیے بہت کارہائے نمایاں عمل میں لائے۔ تنقید کے حلقے میں شیخ عبدالقادر کے 'مخزن' نے اردو رسالوں کی رہنمائی کی اور تنقید کا بلند معیار قائم کیا۔ پنجاب کی فضاؤں میں سالک، مہر اور چراغ حسن حسرت کی تخلیقیں اور اختر شیرانی کی رومانی شاعری گونج رہی تھی۔ اور پھر جلیان والا باغ کا وحشیانہ قتل عام اور بھگت سنگھ کی قربانی بھی پنجاب سے ہی جڑی ہوئی تھی۔ پنجاب کا نام اس وجہ سے بھی روشن تھا کہ وہاں مہاجروں نے خلافت کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور غدر پارٹی اور ببر اکالیوں کی جانبازیاں بھی سب کے دلوں میں بسی ہوئی تھیں۔ اسی پنجاب کی ہر زمین پر لاکھوں لوگوں نے مل کر یہ عہد لیا کہ انگریزی سامراج سے مکمل آزادی حاصل کر کے ہی دم لیں گے۔ یہ تھا اس زمانے کا پنجاب جو آج بھی کم و بیش ویسا ہی ہے۔ اپنے پیشے میں دنیا میں سب سے آگے مگر گھر میں اپنی پدری تہذیب سے جڑا ہوا۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ پنجاب میں آج تک مذہبی تفرقات کا نام و نشان تک کہیں نہیں ملتا۔

☆☆☆☆☆☆

کتابیات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر / پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱)	سجاد ظہیر۔ایک تاریخ اور تحریک	علی احمد فاطمی	جوش اور فراق لٹریری سوسائٹی، الہ آباد	2006	37
۲)	Historic Delhi	ایچ۔کے۔کول	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، دہلی	1996	403
۳)	The History and Culture of Indian People	vol XI	بھارتی ودیا بھون، بمبئی	1998	23
۴)	Lajpat Rai- Biographical Writings	ودیا چندر جوشی	یونیورسٹی پبلشرز، دہلی	1965	15
۵)	The History and Culture of Indian People	vol XI	بھارتی ودیا بھون، بمبئی	1998	691
۶)	روشنائی	سجاد ظہیر	پرائم ٹائم پبلیکیشنز، لاہور	2006	54

☆☆☆☆

۲۔ پہلی کل ہند کانفرنس۔ 1936

جب انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور کا مسودہ شائع ہوا اور جگہ جگہ کے مانے ہوئے ادیبوں اور شاعروں نے اس پر دستخط کیے تو ملک کے دیگر دانشوروں میں بھی جوش وخروش بڑھنے لگا۔ ان میں بیشتر افراد نے جو ترقی پسند تحریک کے حامی تھے مطالبہ کیا کہ جلد ہی انجمن کی ایک کل ہند کانفرنس منعقد کرنی چاہیے جس میں تحریک کے کارکن اور دوسرے ادیب ایک دوسرے سے مل کر ملک کی مختلف زبانوں کا جائزہ لیں اور اس طرح تحریک کو منظم کریں۔ یہ کام بہت مشکل تھا کیونکہ اسے کرنے کے لیے بڑے فن اور مہارت کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ مطالبہ سب سے پہلے الہ آباد برانچ نے کیا تھا لیکن اس کے کارکن یعنی فراق گورکھپوری، احمد علی، شیودان سنگھ چوہان کانفرنس کے داؤ پیچ سے بالکل ناواقف تھے۔ ان مشکلوں کے باوجود یہی طے ہوا کہ کانفرنس ہونی چاہیے۔ انھی دنوں یعنی اپریل 1936 میں کانگریس کا سالانہ جلسہ لکھنؤ میں ہونا طے پایا تھا جس کی صدارت کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو نے حامی بھری تھی۔ کل ہند کانفرنس میں شامل ہونے والے ادیبوں کے لیے کانگریس کا جلسہ اور جواہر لال نہرو کی صدارت بڑی کشش کا باعث تھے۔ کانگریس کے اجلاس میں چونکہ مختلف نظریات کے لوگ آنے والے تھے اس سے انجمن کو بھی بہت فائدہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے انجمن کی پہلی کل ہند کانفرنس الہ آباد کی بجائے لکھنؤ میں کرنے کا فیصلہ ہوا۔ منشی پریم چند کو کانفرنس کی صدارت کے لیے چنا گیا۔ منشی جی نے معذرت کا اظہار کیا کیونکہ اس وقت ان کے پاس صدارت کے لیے ایک نہیں دو دو جگہ سے دعوت نامے آئے ہوئے تھے۔ ایک تو لاہور کا ہندی سیمینار تھا اور دوسری حیدر آباد

دکن کی ہندی پرچار سبھا۔ انہوں نے نہایت عاجزی کے ساتھ لکھا کہ چونکہ وہ صدارت کے اہل نہیں ہیں اس لیے کنہیالال منشی سے رابطہ کیا جائے یا پھر ڈاکٹر ذاکر حسین سے۔ سب لوگوں کے اصرار پر آخر منشی جی نے صدر بننا قبول کر ہی لیا۔ کانفرنس کے لیے لکھنؤ کا رفاہِ عام ہال کئی لوگوں کی کوششوں سے دستیاب ہوگیا۔ رفاہِ عام ہال ایک خوبصورت عمارت ہے جو ایک نواب صاحب کی جائداد تھی جسے اس نواب نے قوم کے حوالے کردیا تھا کہ اس میں عوامی جلسے اور کانفرنسیں ہوسکیں۔ اب وہاں ایک کلب کھل گیا تھا جو Billiard اور برج کھیلنے کے کام آتا تھا اور جو بیئر اور وہسکی پینے والوں کا اڈہ بن چکا تھا۔ بہرحال اس ہال کا بروقت مل جانا سب کے لیے سکون کا باعث بنا۔ لہٰذا یہ فیصلہ ہوا کہ ایک استقبالیہ کمیٹی بنائی جائے جس کی صدارت کے لیے چودھری محمد علی صاحب رودلوی کا نام تجویز کیا گیا۔ یہ چودھری صاحب بہت ساری خصوصیات کے مالک تھے جس کی وجہ سے ان کی شخصیت اودھ کی دلچسپ ہستیوں میں شمار ہوتی تھی۔

رفاہِ عام ہال مل جانے سے ایک فکر تو دور ہوگئی لیکن سب کو ایک اور فکر لاحق ہوگئی۔ وہ یہ کہ اگر بہت کم لوگ آئے تو ہال بھرے گا کیسے۔ تا حال صرف تیس چالیس ڈیلیگیٹوں کے آنے کی اطلاع آئی تھی۔ ویسے بھی لکھنؤ کا ماحول الہ آباد سے مختلف تھا۔ الہ آباد یونیورسٹی کے طلباء سے فراق، اعجاز اور احمد علی کی معرفت رابطہ تھا جو وہاں کے جلسوں میں بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ لیکن لکھنؤ میں ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وہاں کے طلباء کو اکٹھا کیا جاسکے۔ اتنے بڑے شہر میں تحریک کے ارکان اپنے آپ کو تنہا اور بے سروسامان پا رہے تھے۔

بہرحال یونیورسٹی کے چند طلباء کے ذریعہ کچھ اشتہار تقسیم کروائے گئے اور جب بڑے پوسٹر چھپ کر موصول ہوئے تو انہیں چسپاں کرنے کے لیے کوئی آدمی نہیں تھا۔ محمود الظفر نے خود یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا اور کانفرنس کے دو دن پہلے تک شہر میں جگہ جگہ انہیں لگاتے رہے۔ رشید جہاں کی البتہ لکھنؤ میں کچھ لوگوں سے جان پہچان تھی۔ انہیں اپنے ساتھ لے کر رشید جہاں نے استقبالیہ کمیٹی کے ٹکٹ بیچنے شروع کیے جن سے کچھ روپیہ اکٹھا ہوگیا۔ چونکہ کانگریس کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا اس سے یہ امید بندھ گئی کہ جو لوگ اس اجلاس میں شامل ہونے کو آئیں گے وہ تحریک کی کانفرنس میں بھی آجائیں گے۔ ان میں آچاریہ نریندر دیو جی بھی تھے جو ہندی، سنسکرت اور پالی کے عالم تھے۔ ان

کے علاوہ جے پرکاش نارائن، کملا دیوی چٹوپادھیائے اور میاں افتخار الدین جو کانگریس کی بائیں بازو کی سیاست سے منسلک تھے وہ بھی تحریک میں شامل ہونے کے لیے تیار تھے۔ سروجنی نائیڈو جوان دنوں لکھنؤ میں تھیں انہوں نے بھی شرکت کا وعدہ کیا تھا۔

تحریک کی کانفرنس کے منتظمین کو اب یہ فکر درپیش ہوئی کہ بیرون شہر سے آنے والے ڈیلی گیٹوں کو ٹھہرانے اور ان کی دیکھ بھال کا کیا انتظام کیا جائے۔ پیسے کی کمی تو تھی ہی۔ لہٰذا کچھ لوگوں کو انہوں نے اپنے ذاتی دوستوں اور رشتہ داروں کے ہاں ٹھہرانے کا بندوبست کیا۔ کچھ لوگ کانگریس کے کیمپ میں رک گئے اور باقی یونیورسٹی کے ہوسٹل میں ٹھہرائے گئے۔ چونکہ باہر سے آنے والے مہمان وقت کی نزاکت کو سمجھتے تھے اس لیے کسی نے اس بات کا گلہ نہیں کیا کہ ان کے رہنے کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا گیا تھا۔

یہ سارا انتظام محض تین چار لوگوں کے ہی سپرد تھا جن میں سجاد ظہیر، محمود الظفر اور رشید جہاں کے کندھوں پر سب سے زیادہ بوجھ تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ ہر ڈیلی گیٹ کو اسٹیشن پر ملا جائے اور اس کا استقبال کیا جائے۔ تاہم سب نے یہ فیصلہ کیا کہ کم سے کم صدر صاحب یعنی منشی پریم چند کو اسٹیشن پر لینے جانا۔ یہ ذمہ داری سجاد ظہیر اور رشید جہاں کو سونپی گئی۔

دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ سجاد ظہیر زیادہ تر رشید جہاں سے مل کر ہی تحریک کی ذمہ داریاں نبھاتے تھے۔ ایک طویل عرصہ دونوں کا ساتھ رہا۔ اس سے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تحریک کے علاوہ دونوں میں کوئی جذباتی تعلق بھی تھا۔ کسی ادیب نے دونوں کی قربت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی البتہ سبط حسن اس موضوع کے بارے میں کچھ اطلاع فراہم کرتے ہیں۔ 1986 میں ہندوستان کے دورے پر جب سبط حسن تشریف لائے تو علی احمد فاطمی اور محترمہ شاہدہ بانو نے ان کا انٹرویو لیا تھا۔ یہ مکمل انٹرویو سبط حسن نے اپنی کتاب 'ادب اور روشن خیالی' کے تیسرے حصے میں شامل کیا ہے۔ اس انٹرویو میں سبط حسن نے رشید جہاں: ان کے شوہر محمود الظفر، سجاد ظہیر ور شیدہ جہاں کے والد اور ان کی بہنوں کا بہت نزدیک سے مشاہدہ کیا ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ چونکہ یہ انٹرویو بہت دلچسپ ہے اس لیے اس کا ایک خاص حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

''شاہدہ بانو: میں نے سنا ہے کہ رشید جہاں کی شخصیت اس قدر پرکشش اور

جاندار تھی کہ جس نے ذرا سا وقت ان کے ساتھ گزارا ہے وہ ان کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ تو پھر آپ نے تو ان کے ساتھ ایک عرصہ گزارا ہے۔ کام کیا ہے۔ تو پھر آپ ہمیں یہ بتائیے کہ آپ نے رشید جہاں کو پہلی بار کہاں اور کب دیکھا اور اس پہلی ملاقات کا کیا تاثر بنا۔۔۔۔؟

میں نے محسن سے کہا کہ بھئی ہمیں ان سے ملادو تو وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ ہمیں اپنے ڈرائنگ روم لے گیا۔ ایک طرف میں بیٹھا تھا اور دوسری طرف محسن تو جب وہ آئیں تو بجائے کرسی پر بیٹھنے کے وہ سیدھے میز پر جا کر یونہی دراز ہوگئیں اگرچہ کرسی تھی۔ میرے لیے یہی عجیب بات تھی۔ صاحب وہ بے حد خوبصورت تھیں۔ میں نے اتنی خوبصورت عورتیں کم دیکھی تھی۔

شاہدہ: رشیدہ آپا پہلے کس سے شادی کرنا چاہتی تھیں آپ بتائیں گے؟

سبط حسن: کیا کیجئے گا پوچھ کے۔ اسے اب جانے ہی دیجئے۔

شاہدہ: نہیں حضور یہ ہمیں ضرور بتایئے۔ ہمارے لیے یہ اہم بات ہے۔

سبط حسن: جن سے کرنا تھیں اب وہ بھی چلے گئے۔ کوئی نہیں رہا۔

شاہدہ: آپ ہمیں نام بتایئے۔ یہ بات ہم نے کہیں نہیں پڑھی نہ کسی سے جانی۔ ہمارے تھیسس کے لیے یہ بات اہم ہوگی۔

سبط حسن: ہماری پارٹی کے سربراہ تھے۔ لیڈر تھے۔

فاطمی: تو پھر نام بھی بتا دیجئے۔ کیا حرج ہے۔

سبط حسن: وہ سجاد ظہیر سے شادی کرنا چاہتی تھیں مگر بات بنی نہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ٹھیک ہی ہوا کیونکہ دونوں کا نباہ شاید نہ ہو پاتا۔ ویسے وہ لوگ یوں ملتے جلتے تھے کام کرتے تھے۔"(۱)

یہ بات کہ رشید جہاں سجاد ظہیر سے شادی کرنا چاہتی تھیں اس کا ذکر کسی کتاب یا کسی تحریر میں کہیں بھی نہیں ملتا۔ یہ بات صرف سبط حسن کے مندرجہ بالا انٹرویو میں ہی سامنے آئی ہے۔ اگر یہ انٹرویو نہ ہو پاتا تو یہ نہایت دلچسپ بات ہمیشہ کے لیے پس پردہ ہی رہتی۔ حالانکہ اس راز کا کوئی عملی

تاثر نہیں ہے مگر یہ دلچسپی سے خالی بھی نہیں۔

رشید جہاں کا ذکر سبط حسن صاحب نے بڑے مختلف انداز میں اپنے انٹرویو میں کیا ہے۔ ان کے خاوند صاحب زادہ محمود الظفر کا خاص تفصیل سے انہوں نے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ لیکن سجاد ظہیر نے ان کا تعارف بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے (محمود الظفر) تب تک ترقی پسند تحریک میں دلچسپی لینی تو شروع کر دی تھی لیکن وہ ایک خاص مشکل سے برسر پیکار تھے۔ وجہ یہ تھی کہ حالانکہ وہ رام پور ریاست کے رہنے والے تھے اور ان کی مادری زبان اردو تھی لیکن لڑکپن سے ہی انہوں نے انگلستان میں رہ کر ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ انگلینڈ سے پڑھ کر جب وہ ہندوستان لوٹے تو اپنی مادری زبان تقریباً بھول چکے تھے۔ اگر چہ بولنا چالنا سیکھنے میں انہیں کچھ دیر نہیں لگی لیکن جب کبھی کوئی اردو یا فارسی شعر پڑھا جاتا یا کسی دقیق ادبی مسئلے پر گفتگو ہوتی تو محمود کے چہرے پر ایک عجیب سی افسردگی چھا جاتی۔ وہ انگریزی زبان میں شعر لکھ لیتے تھے اور کبھی کبھی اسی زبان میں افسانے اور ادبی مضامین بھی لکھ لیتے تھے مگر اردو سے ناواقفیت کا انہیں بہت قلق رہتا تھا۔

سجاد ظہیر کہتے ہیں کہ مندرجہ بالا خامی کے باوجود ان کی زندگی میں باقاعدگی جنون کی حد تک تھی جس نے ان میں ان تھک کام کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ چونکہ نسل کے پٹھان تھے اس لیے مزاج میں چنداں صلابت سی تھی جو غصّے کی حالت میں ان کے چہرے سے نمایاں ہو جاتی تھی۔ لیکن رشید جہاں بالکل اس کے برعکس تھیں۔ ان کو باضابطگی سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنی چیزیں اِدھر اُدھر چھوڑ کر بھول جایا کرتی تھیں اور انہیں گم کر دینا ان کا روز کا معمول تھا۔ محمود کبھی کچھ بھولتے نہیں تھے۔ ان کو نہ صرف اپنے بلکہ اپنے دوستوں کے کام بھی دستور سے کرنے میں خوشی محسوس ہوتی تھی۔ اور وقت بے وقت دوستوں کو ان کا کام یاد دلانا ان کا شیوہ تھا۔ وہ رشید جہاں کی پھیلائی ہوئی گڑبڑ کو ہمیشہ درست کرنے میں لگے رہتے تھے۔ لیکن محبت کی سنہری زنجیر جس سے وہ ایک دوسرے سے بندھے ہوئے تھے اس کی دلکشی اور لطافت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ سجاد ظہیر کہتے ہیں کہ وہ شے جسے فارغ البالی یا خانگی اطمینان کہتے ہیں وہ ان کی قسمت میں نہیں تھی کیونکہ آنے والا وقت محمود کے لیے قید و بند، محنت و مشقت اور قومی کاموں میں مصروف رہنے کا زمانہ تھا اور رشید کے لیے طویل تنہائی، مالی مشکلات اور جسمانی تردد کا۔

اگر چہ بات پہلی کل ہند کانفرنس کی ہو رہی تھی لیکن رشید جہاں کا ذکر آیا تو رخ ان کی جانب چلا گیا۔ اس لیے اب پھر سے کانفرنس کی روداد سے رابطہ قائم کیا جاتا ہے۔

کانگریس کے اجلاس کے لیے جو لوگ آنے والے تھے ان میں کچھ لوگوں نے تحریک میں شامل ہونے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ ان میں خاص نام تھے آچاریہ نریندر دیو جو سنسکرت اور ہندی کے عالم تھے۔ ان کا شمار اردو کے بہترین مقررین میں بھی ہوتا تھا۔ جے پرکاش نارائن کے علاوہ کملا دیوی چٹوپادھیائے بھی ایک سرخ شعلے کی طرح فروزاں ہونے والی تھیں۔ علاوہ ازیں میاں افتخار الدین اور سروجنی نائیڈو نے بھی کانفرنس میں شامل ہونے کا وعدہ کیا تھا۔

جیسا کہ کہا گیا ہے سب نے یہ فیصلہ کیا کہ مالی اور تنظیمی مشکلات کے باوجود منشی پریم چند کا اسٹیشن پر استقبال کرنا اور انہیں اسٹیشن سے لانے کا انتظام کرنا۔ یہ بھی طے ہوا کہ رشید جہاں اور سجاد ظہیر انہیں لینے جائیں گے۔ لہٰذا کہیں سے تھوڑی دیر کے لیے موٹر بھی حاصل کی گئی۔ گاڑی آنے کا وقت صبح کے نو بجے کا تھا اس لیے سجاد ظہیر اور رشید جہاں نے سوچا کہ گھر سے تھوڑی دیر پہلے ہی نکلنا ٹھیک رہے گا۔ لیکن ہوا یوں کہ وہ ابھی نکلے ہی نہیں تھے کہ منشی پریم چند سامنے کھڑے نظر آ گئے۔ دونوں شرمندگی محسوس کر رہے تھے کہ منشی جی کو لینے نہیں جا پائے۔ لیکن ان کی جھینپ مٹانے کے لیے منشی جی نے مسکرا کر کہا'' بھئی تمھارا گھر بڑی مشکل سے ملا ہے۔ بڑی دیر سے اِدھر اُدھر چکر لگا رہے ہیں۔'' اصل میں سجاد ظہیر کو ٹرین آنے کے وقت کی غلط اطلاع تھی کیونکہ ٹرین آنے کا وقت اپریل سے بدل کر ایک گھنٹہ پہلے ہو گیا تھا۔ منشی پریم چند بہت شائستہ قسم کے انسان تھے اس لیے خود ہی معذرت کے ساتھ کہنے لگے'' ہاں مجھے تھا کہ چلنے سے پہلے تار دے دیتا لیکن کیا ضرورت ہے۔ اگر اسٹیشن پر کوئی نہ ملا تو تانگہ کر کے سیدھا تمہارے یہاں چلا آؤں گا۔''

کانفرنس کے منتظمین نے رفاہِ عام ہال کے ایک معمولی سے کمرے کو اپنا دفتر بنا لیا تھا جس کی ذمہ داری محمود الظفر کے سپرد کی گئی۔ کیونکہ انہیں ٹائپ کرنا بھی آتا تھا اس لیے ریزولیشن وغیرہ تیار کرنے کا کام بھی ان کے ہی حوالے ہوا۔ رشید جہاں اور ہاجرہ بیگم کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ ہال کے دروازے پر بیٹھیں اور ٹکٹ بیچیں اور ساتھ آنے والے لوگوں کو ان کی نشستوں پر بٹھائیں۔

کانفرنس شروع ہونے کا وقت دس بجے صبح کا تھا مگر نو بجے سے ہی لوگوں نے آنا شروع

کردیا تھا۔ سب سے پہلے آنے والوں میں منشی پریم چند ہی تھے جو سب کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے پیش آرہے تھے۔ ساڑھے دس بجے تک تقریباً دو تہائی ہال بھر گیا تھا۔ اتنے میں مولانا حسرت موہانی ایک تانگے سے اترے۔ سجاد ظہیر کہتے ہیں کہ مولانا کا قد چھوٹا تھا اور وہ جی بھر کے بدصورت تھے۔ جسم گدبدا تھا جس پر وہ میلی سی شیروانی پہنتے تھے۔

جب کانفرنس کا آغاز ہوا تو استقبالیہ خطبہ چودھری محمد علی نے پڑھا۔ ان کا نداز بالکل لکھنوی تھا اور انہوں نے اس جدید ترقی پسند تحریک کا خیر مقدم کیا۔ چودھری محمد علی کی تقریر کے بعد منشی پریم چند جو متفقہ طور پر کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے، انہوں نے اپنا صدارتی خطبہ پڑھنا شروع کیا۔ ان کا خطبہ بڑا پر اثر تھا۔ حالانکہ ان کا خطبہ بہت لوگوں کی سمجھ سے بالا تھا لیکن سب لوگ بڑی خاموشی اور سکون سے سن رہے تھے۔ ایک ہندی کا ادیب سلیس اردو میں سامعین کو سمجھا رہا تھا کہ تحریک کے مقاصد کیا ہیں۔ انہوں نے حاضرین کو سیدھے سادے اور پُر اثر الفاظ میں سمجھایا اور لوگوں تک اپنی بات پہنچائی کہ اچھے ادب کی بنیاد سچائی، حسن، آزادی اور انسان دوستی پر ہی قائم کی جانی۔ انہوں نے کہا:

> ''جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت اور حرارت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبہ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے، وہ آج ہمارے لیے بے کار ہے۔ اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔'' (۲)

ترقی پسند تحریک کو منشی جی کے خطبے سے بہت فائدہ ہوا اور اسے تقویت ملی۔ انہوں نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا یہ کانفرنس ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ زبان ایک ذریعہ ہے منزل نہیں۔ اس لیے ادیبوں کو اس امر پر غور کرنا کہ جس منشا سے زبان تعمیر کی گئی تھی وہ پورا ہوا کہ نہیں۔ پرانے ادب پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ادب کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ لیکن تب تک ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ ادب محض جنسی تھا جس کا موضوع جنسی جذبات اور ان سے پیدا ہونے والے درد اور یاس تک ہی محدود تھا۔ ایسا ادب انسان کی ذہنی اور جسمانی ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ جنسیت انسانی زندگی کا ایک جزو ہے لیکن جس ادب کا بیشتر حصہ اسی سے متعلق ہو وہ قوم اور موجودہ دور کے لیے فخر کا باعث نہیں بن سکتا

اور نہ ہی اس کے صحیح مذاق کی شہادت دے سکتا ہے۔ انہوں نے نوجوانوں کومخاطب کر کے کہا کہ اس دور کا ادب اسی وقت مفید ہوسکتا ہے جب ادیب کے سامنے ایک نقطہ نظر ہواور وہ اپنے زمانے کے اہم مسائل سے آنکھیں چار کر سکے۔ لیکن وہ کیفیت اسی وقت پیدا ہو سکے گی جب ہماری نگاہ حسن عالمگیر ہو جائے گی۔ جب ساری خلقت اس کے دائرے میں آجائے گی۔ وہ کسی خاص طبقے تک محدود نہ ہوگا۔

منشی پریم چند نے ترقی پسند تحریک کا اصل مقصد بھی بتایا اور کہا کہ تحریک کے مقاصد کے لیے ہمارے ملک کی فضا ساز گار ہے۔ ہمارا مدعا عالم میں ایسی فضا پیدا کرنا ہے جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے اور نشو ونما پا سکے۔ اپنے خطبے کے اختتام پر انہوں نے فرمایا:

> ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔''(۳)

منشی پریم چند کا خطبہ 'نیا ادب' میں چھپا اور ان کے ذاتی شمارے 'ہنس' میں بھی شائع ہوا۔ سجاد ظہیر کہتے ہیں کہ پورے ملک میں ترقی پسند ادبی تحریک کی غرض وغایت کے متعلق کوئی بھی چیز اس سے بہتر ابھی تک لکھی نہیں گئی۔ اُس وقت تک ترقی پسند ادیبوں پر تحریک کا مقصد پوری طور پر واضح نہیں تھا جس کی وجہ سے کبھی تو غصے میں وہ بائیں طرف جھک جاتے تھے اور کبھی احتیاطاً دائیں جانب لڑھک جاتے تھے۔ لیکن جس تحریک کے نقطہ نظر کی پریم چند نے وضاحت کی اس سے اب کوئی الجھن نہیں رہ گئی تھی۔

مولانا حسرت موہانی چاہتے تھے کہ انہیں پہلے ہی دن تقریر کرنے کا موقع دیا جائے۔ لیکن اس سے تو کانفرنس کی رونق ہی ختم ہو جاتی کیونکہ مولانا کی شخصیت ایک بزرگ ترین اور بہترین مقررین کی تھی۔ انہیں پہلے بلوا لیا جاتا تو بعد میں حاضرین کسی دوسرے کو سنتے ہی نہیں۔ اس لیے انہیں تقریر کرنے کا موقع آخری اجلاس میں شام کے وقت ملا۔ اپنی تقریر میں انہوں نے تحریک کے اعلان نامے اور مقاصد سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ادب کو قومی آزادی کی ترجمانی کرنی۔

اسے ظلم کرنے والے امیروں کی مخالفت کرنی۔ اسے مزدوروں، کسانوں اور تمام مظلوم انسانوں کی طرفداری اور حمایت کرنی۔ اس میں عوام کے دکھ سکھ، ان کی بہترین خواہشوں اور تمناؤں کا اظہار اس طرح کرنا جس سے انقلابی قوت میں اضافہ ہو اور جس سے وہ متحد و منظم ہو کر اپنی جدوجہد کو کامیاب بنا سکیں۔

اشتراکیت کی حمایت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ محض ترقی پسندی کافی نہیں بلکہ جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنی۔ اسے انقلابی ہونا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ چونکہ موجودہ دور میں زندگی کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے اس لیے ترقی پسند ادیبوں کو انہی خیالات کی ترویج کرنی۔ مولانا کی تقریر سے تحریک کو بہت افادہ ہوا۔ ایک تو منتظمین کی حوصلہ افزائی ہوئی اور دوسرا یہ کہ جب برانچ کانپور میں قائم ہوئی تو مولانا نے اس شاخ کا صدر بننا قبول کیا۔ سجاد ظہیر کہتے ہیں کہ ''جب کبھی انجمن پر وہ حضرات حملہ کرتے جن کے مکروہ رجعت پسند چہرے مذہب کی نقاب سے ڈھکے ہوئے تھے، تو مولانا حسرت موہانی تحریک کے لیے سینہ سپر ہو جاتے تھے اور انہیں منہ توڑ جواب دیتے تھے۔''

ترقی پسند تحریک کے مقاصد چاہے بہت بلند تھے لیکن انگریزی سرکار کو اس تحریک سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس لیے سرکار نے ہر ممکن طریقے سے اس پر وار کرنے شروع کر دیئے۔ حکومت کی خفیہ ایجنسی نے Statesman اخبار میں دو مضمون چھپوائے جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ترقی پسند تحریک کمیونسٹوں کی ایک غیر ملکی سازش ہے۔ اور یہ کہ اس تحریک کا اصل مدعا ملک میں بدامنی پھیلا کر حکومت کا تختہ اُلٹنا ہے۔ اس لیے لوگوں کو تنبیہ کی گئی کہ وہ تحریک سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ حکومت کی ملازمت میں تھے یا وہ جو کسی نہ کسی واسطے سے سرکار سے جڑے ہوئے تھے کھلے عام تحریک سے اپنی ہمدردی جتانے سے گریز کرنے لگے۔ ان میں سے ایک پنڈت امرناتھ جھا تھے جو الہ آباد یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ وہ ہندی کے ادیب تھے لیکن اردو کے بھی دلدادہ تھے۔ اگرچہ انہیں اردو لکھنا نہیں آتا تھا لیکن اردو شاعری کے شوقین تھے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ ان کے پاس ایک لائبریری تھی جس میں بڑے مقبول ادبی صحیفے موجود تھے۔ وہ ترقی پسند ادیبوں کو اس لائبریری سے فیضیاب ہونے کی دعوت دیتے رہتے تھے۔ لیکن مندرجہ بالا مضامین شائع ہونے کے بعد جھا صاحب نے مجبوری کا اظہار کیا کہ اب آگے سے وہ تحریک کا ساتھ نہ دے پائیں گے۔ ویسے بھی حالات کے پیش نظر تحریک کے کارکنوں میں دو طرح

کے رجحانات پیدا ہو گئے تھے۔ ایک وہ لوگ تھے جو کسی بھی خطرے سے خوف زدہ ہونے والے نہیں تھے۔ جو آنے والی ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لیے سینہ سپر تھے۔ ان کے خیالات تھے کہ تحریک پر حکومت کی طرف سے جو بھی وار کیا جائے اس کا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسرے طبقے میں وہ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ چونکہ تحریک ایک ادبی ادارہ ہے جس کا کام صرف ادب کی تخلیق کرنا ہے اس لیے اسے سیاست سے دور رہنا چاہیے۔

اس موضوع پر انجمن کے دانشوروں میں بڑی گہرائی سے بحث ہوئی اور انجمن نے ان دونوں رجحانات کو ترک کر کے ایک نئی روش اختیار کی۔ یہ طے پایا گیا کہ انجمن کے خلاف جو مضامین شائع ہوئے تھے ان کا توڑ پیدا کیا جائے۔ پہلی بات جو ان مضامین میں واضح طور پر نمایاں تھی وہ یہ تھی کہ حکومت عوام کو یہ کہہ کر گمراہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ترقی پسند ادب کی تحریک غیر ملکی پیداوار ہے اور اس کی جڑیں اس ملک میں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ایک سازش ہے جس کے ذریعے ملک کو سرکار برطانیہ سے آزادی دلوا کر روس کا غلام بنانا ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ مضامین یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ یہ تحریک ہماری مشرقی تہذیب و تمدن اور اخلاق کے خلاف ہے۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا اس بے بنیاد پروپیگنڈے کا سنجیدگی سے جواب دیا جائے۔ لہٰذا انجمن کے کارکنوں نے کئی رسالوں اور اخباروں میں جوابی مضامین لکھے۔ انجمن کے جلسوں میں بھی انجمن کی صحیح پوزیشن کی وضاحت کی گئی اور ان مضامین کے بیان کو غلط ثابت کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔ یہ بات صاف طور پر بتائی گئی کہ انجمن ترقی پسند مصنفین ایک جمہوری جماعت ہے۔ اس کے کام کرنے کا طریقہ بھی جمہوری ہے۔ اس کے مسودے پر ایک لمبے عرصے تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا اور اس کے بعد ہی ملک کے نامور دانشوروں نے اس پر دستخط کیے۔ یہ مسودہ انجمن کی کل ہند کانفرنس میں کھلی نشست میں منظور ہوا تھا۔ اعلان نامے کا مقصد آزادی اور جمہوریت پسندی تھا۔ تمام بحث و مباحث کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ تحریک نہ کمیونسٹوں کے پروپیگنڈے کا آلہ ہے اور نہ وہ کوئی خفیہ سازش ہے۔ انجمن کے حق میں جو معزز ادیب شروع سے سامنے آئے وہ تھے منشی پریم چند، مولانا حسرت موہانی، مولوی عبدالحق، سروجنی نائیڈو، قاضی عبدالغفار، سمترا نندن پنت، جوش ملیح آبادی، عبدالمجید سالک، آچاریہ نریندر دیو وغیرہ جن کی حب الوطنی اور تہذیب دوستی پر کوئی شک بھی نہیں کر سکتا تھا۔

انجمن کے کارکن یہ ثابت کرنے میں تو کامیاب ہوگئے کہ حکومت کی طرف سے اس پر لگائے ہوئے الزامات بے بنیاد اور غلط ہیں لیکن وہ اس ناقابل تلافی نقصان سے نہ بچ سکے جو انہیں منشی پریم چند کی موت سے پہنچا۔ منشی جی تحریک کی پہلی کانفرنس کے کچھ مہینے بعد ہی وفات پاگئے۔

وفات سے پہلے منشی جی صحیح معنوں میں تحریک کے رہنما بن گئے تھے۔ کانفرنس کے بعد جب تک وہ زندہ رہے انہوں ہر کام میں صرف تحریک کا نقطہ نظر ہی پیش کیا۔ ان کا رسالہ 'ہنس' تو پوری طرح ترقی پسند تحریک کا ترجمان بن گیا تھا۔ اس رسالے میں انہوں نے انجمن کے اعلان نامہ اور مقاصد اور پہلی کل ہند کانفرنس کی روداد کو بہ تفصیل شائع کیا۔ انہی دنوں انہوں نے اپنا ایک افسانہ 'کفن' لکھا جو منشی جی کے فن کے عروج اور کمال کا آئینہ دار ثابت ہوا۔ ان کا مقالہ 'مہاجنی تمدن' اسی دوران رسالہ 'حکیم' میں شائع ہوا جو جوش ملیح آبادی کی ادارت میں دہلی سے شائع ہوتا تھا۔

منشی پریم چند کے آخری دنوں کا حال سجاد ظہیر بڑے جذباتی بن کر دردناک لہجے میں بیان کرتے ہیں۔ جب وہ ان کی مزاج پرسی کے لیے بنارس پہنچے تو بڑی مشکل سے وہ مقام ڈھونڈ پائے جہاں منشی جی رہ رہے تھے۔ وہ اُجاڑ سا پرانی قسم کا ایک باغ تھا جس میں چاروں طرف جنگلی گھاس اُگی ہوئی تھی اور جہاں ہُو کا عالم تھا۔ باغ کے دوسرے سرے پر ایک پرانی عمارت تھی۔ سجاد ظہیر نے جب اس خستہ حال عمارت کے ایک کمرے میں جھانکا تو پریم چند کی بیوی شیورانی نظر آئیں جس نے بتایا کہ منشی جی کافی دنوں سے علیل ہیں۔ پریم چند جس کمرے میں تھے اس پر ایک پرانی سی چلمن پڑی ہوئی تھی۔ وہاں کا نظارہ سجاد ظہیر نے مندرجہ ذیل الفاظ میں قلمبند کیا ہے:

> ''یہ ایک بالکل چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے بیچ میں ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ اس پر پریم چند جی لیٹے ہوئے تھے۔ وہ ویسے بھی بہت دبلے پتلے آدمی تھے۔ اب میں نے جو ان کے جسم اور چہرے پر نظر ڈالی تو معلوم ہوتا تھا کہ بالکل ہی سوکھ کر کانٹا ہوگئے ہیں۔ ان کے گال کی اوپر کی ہڈیاں ویسے بھی ابھری ہوئی تھیں۔ اب وہ اور بھی نمایاں ہوگئیں۔ ان کے چہرے کا رنگ زردی مائل گورا تھا۔ اب اس پر بے جان سی سفیدی آگئی تھی جس پر دھندلکا سا چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔
>
> میں نے انہیں سلام کیا تو جواب دیتے ہوئے ان چہرے پر وہی دلکش

مسکراہٹ پھیل گئی جوان سے ملنے پر ہمیشہ مجھے مہکتے ہوئے موتیے کے پھولوں کے تحفے کی طرح ملا کرتی تھی۔ نحیف آواز میں مجھ سے انجمن کے بارے میں پوچھتے رہے۔ میں کلکتے سے واپس آرہا تھا۔ میں نے ان کو بتایا کہ بنگال میں کئی جگہ ہماری انجمن کی شاخیں قائم ہوگئی ہیں۔ وہ اس بات پر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اپنی بیماری کے سبب سے اس وقت تک وہ خود اپنے پروگرام کے مطابق پٹنہ اور بنارس میں شاخیں قائم نہیں کر سکے۔ لیکن جیسے ہی اچھے ہوں گے وہ ضرور ایسا کریں گے۔ میں نے محسوس کیا کہ بات چیت سے انہیں تھکاوٹ ہو رہی ہے۔ اس لیے یہی کوشش کرتا رہا کہ وہ زیادہ نہ بولیں، اور میں ہی ان سے بات کرتا رہوں۔

شیورانی جی سرہانے بیٹھی انہیں پنکھا جھیل رہی تھیں۔ علاج معالجے کی کافی دیر تک ان سے گفتگو ہوتی رہی۔ میں چاہتا تھا کہ زیادہ دیر تک وہاں بیٹھوں لیکن ایک دو گھنٹے بعد ہی یہ سمجھ کر کہ اس کی وجہ سے انہیں تھکاوٹ ہوگی، رخصت کی اجازت لے کر چلا آیا۔

جب میں واپس آیا تو پریم چند جی کی صحت کے بارے میں میری تشویش بڑھ گئی۔ علاج کے متعلق مجھے جو کچھ بھی معلوم ہوا تھا اس سے بھی مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ ان کی بیماری سخت تھی لیکن مرض ایسا کوئی زیادہ خطرناک یا مہلک نہیں تھا، جس کا مناسب علاج، دیکھ بھال، اچھے آرام دہ ماحول کے ذریعے انسداد نہ کیا جا سکے۔ اس مکان میں جہاں پریم چند تھے، وہاں صاف ہوا تھی اور ان کی چاہنے والی بیوی سے بہتر اور کون ان کی تیمارداری کر سکتا تھا۔ لیکن مفلوک الحالی اور بے سروسامانی کی فضا جیسے وہاں چھائی ہوئی تھی، اور دل میں بار بار یہ اندوہناک خیال اٹھتا تھا کہ پریم چند جی کی ساری بیماریوں کی بنیاد ان کی تنگدستی ہے۔ وہ ایک اتفاقی سانحہ نہیں بلکہ عمر بھر کی مالی اور جسمانی مصیبتوں، افکار و آلام کا ایک لازمی اور منطقی نتیجہ معلوم ہوتی تھی۔ پھر بھی اس وقت ان سے

ملنے کے بعد یہ وہم وگمان بھی نہیں تھا کہ میں ان کا آخری دیدار کر کے جارہا ہوں۔''(۴)

اس واقعہ کے دو ہفتے بعد ہی منشی پریم چند جی وفات پا گئے۔ یہ بڑی افسوس ناک بات تھی کیونکہ وہ ابھی مرنے والے نہیں تھے لیکن اس بے رحم اور ناقدر شناس سماج نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا بلکہ بے رخی اور لاپرواہی برتی۔ یہ جان کر دکھ ہوتا ہے کہ ہندی اور اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار نہایت مفلسی اور بے سروسامانی کا شکار ہوگیا۔ ابھی وہ بوڑھے نہیں ہوئے تھے۔ ان کا آرٹ اور دبی ہوئی صلاحیت اب پختہ ہو چکے تھے۔ ان کے سینے میں اپنے ملک کے محنت کش اور مزدور انسانوں کے لیے ٹیس بڑھ رہی تھی کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے انہیں چھین لیا۔ لیکن اپنے پیچھے وہ ورثے میں اپنا لازوال نام چھوڑ گئے ہیں جو ادب کے آسمان پر ہمیشہ روشن رہے گا۔

منشی جی جیسے رہنما ہونے کے باوجود انجمن کی چند شاخیں تھوڑے عرصے بعد ہی دم توڑتی نظر آنے لگیں۔ دہلی کی برانچ میں بڑے بڑے نامور ادیب اور شاعر شامل تھے۔ وہاں ڈاکٹر دین محمد تاثیر تھے، فیض احمد فیض تھے۔ کانتی چرن اور ان کی بیوی سورن رکھشا تھے۔ ان کے علاوہ کئی نوجوان ادیب بھی تھے لیکن ان سب لوگوں کے باوجود شاخ نیم مردہ حالت میں تھی۔ لیکن 1942 کے بعد حالات نے کروٹ بدلی اور انجمن میں پھر سے حرکت شروع ہوئی۔ یہ شیودان سنگھ اور شمشیر سنگھ نرولا کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

ایک بار امرتسر کے جلیان والا باغ میں کسان سبھا کی کانفرنس ہونی تھی۔ سجاد ظہیر کو اس کے لیے مدعو کیا گیا تھا لیکن اس کانفرنس کا فائدہ لیتے ہوئے وہاں انجمن کی کانفرنس بھی منعقد کی گئی۔ پنجاب کے دورے میں ان کی ملاقات ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال سے بھی ہوئی۔ یہ ملاقات میاں افتخار الدین کی معرفت ہوئی جن کی کوٹھی پر سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف مہمان تھے۔ جب وہ اقبال کی کوٹھی پر پہنچے تو وہ باہر ہی بان کی چارپائی پر نیم دراز تھے اور حقہ پی رہے تھے۔ اقبال سے ملاقات کا تجربہ سجاد ظہیر کے لیے ایک غیر معمولی تجربہ تھا۔ اقبال بڑی شفقت اور التفات سے ان سے گفتگو کر رہے تھے جس کا آغاز سوشلزم سے ہوا تھا۔ اقبال نے بڑے غور اور دلچسپی سے ان کی باتیں سنیں۔ شروع دور میں اقبال تحریک سے کچھ حد تک اختلاف رکھتے تھے لیکن اس بار انہوں نے کہا

''تاثیر نے مجھ سے ترقی پسند تحریک کے بارے دوایک بار باتیں کی تھیں اور مجھے اس سے بڑی دلچسپی ہوئی ہے۔ ممکن ہے سوشلزم کے سمجھنے میں مجھ سے غلطی ہوئی ہو۔ بات یہ ہے کہ میں نے اس کے متعلق کافی پڑھا بھی نہیں ہے۔۔۔ میرا نقطہ نظر آپ جانتے ہیں۔ ظاہر کہ مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی تحریک کے ساتھ ہمدردی ہے۔ آپ لوگ مجھ سے ملتے رہیئے۔'' ظاہر ہے کہ اقبال کے ساتھ یہ ملاقات ادھوری رہی۔ ایک تو یہ مختصر تھی اور دوسرے اشرف نے وہ صاحب جو اقبال کے پاس پہلے سے ہی بیٹھے ہوئے تھے ان کو بری طرح بے حال کردیا تھا کیونکہ وہ حکومت کے حق میں باتیں کرنے لگے تھے۔ اگلی بار جب سجاد ظہیر کو پنجاب جانے کا موقع ملا تو باوجود اقبال سے ملنے کی خواہش کے وہ ان سے نہ مل سکے کیونکہ تب تک اقبال کا انتقال ہو چکا تھا۔

پہلی کل ہند کانفرنس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اردو اور ہندی کے وہ ادیب جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے ان میں ہم خیالی پیدا ہوئی۔ تحریک میں تیزی آگئی۔ سب کے ایک ساتھ ملنے اور اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کرنے سے مقاصد اور تنظیم میں پختگی پیدا ہوئی۔ ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث و مباحثہ کرنے سے سب کے ذہن صاف ہوگئے۔ ارکان کی یکجہتی سے تحریک میں طاقت پیدا ہوئی۔ تحریک سے ہر طرح کے لوگ جڑنے لگے۔ ان میں صرف نوجوان ادیب ہی نہ تھے بلکہ اس وقت کی کئی نامی گرامی ہستیاں بھی تھیں۔ ایسے مختلف ادبا و شعرا نے پچھلے اور جدید ادب میں ایک ہم آہنگی قائم کردی جس نے تحریک کو استحکام اور قوت عطا کی۔ یہ تحریک صرف ادیبوں کے لیے ہی وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ سب کی کوشش تھی کہ اس میں طلبا اور وہ لوگ جو قومی ادب سے منسلک تھے یا سیاسی کارکن، کسانوں اور مزدوروں کی تحریک سے وابستہ لوگ بھی اس تحریک میں شامل ہوجائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ ان کی دلچسپی کا سامان بھی مہیا کیا جائے۔ لہٰذا آگے ہونے والی کانفرنسوں میں مشاعروں اور کوی سمیلنوں کا بھی اہتمام کیا گیا۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ آگے سے کانفرنس کی صدارت کے لیے ایک سے زیادہ لوگوں کا انتخاب ہونا چاہیئے۔ وجہ یہ تھی کہ اردو ادب جو کئی اصناف سخن کا شگوفہ ہے اس کی ہر صنف کے ادیبوں کی شمولیت سے تحریک کو افادہ ہوگا۔ اور پھر ہندی اور دیگر زبانوں کے دانشوروں کو تحریک کی صدارت سے عزت افزائی ہوگی اور ادب کا حلقہ بھی وسیع ہوگا۔ اسی کے پیشِ نظر آئندہ ہونے والی الہ آباد کانفرنس جو 1937 میں ہوئی اس کے

مولوی عبدالحق کے علاوہ آچاریہ نریندر دیو اور پنڈت رام نریش ترپاٹھی بھی صدر چنے گئے۔ادب کے کئی مختلف شعبے ہیں جیسے تنقید، ناول، افسانہ نگاری، شاعری وغیرہ۔اس لیے یہ ضروری تھا کہ وہ لوگ کانفرنس کی صدارت کریں جو ان میں سے کسی نہ کسی شعبے کی نمائندگی کر سکیں۔لہٰذا تحریک کے اجلاس میں جہاں کسی خاص صنف ادب پر بحث ہونے کی گنجائش ہو اسی صنف کے ماہر کو ہی کانفرنس کا صدر چنا جانے لگا۔اسی طرح تحریک کی دوسری کانفرنس کے صدر جو الہ آباد میں ہی 1938 میں ہوئی جوش ملیح آبادی، پنڈت آنند نرائن ملا اور سمترا نندن پنت منتخب ہوئے۔اس کے بعد وقتاً فوقتاً تحریک کی کئی کانفرنسیں ہونے لگیں جس میں بھاری تعداد میں لوگ شامل ہونے لگے۔تحریک کی دوسری کل ہند کانفرنس الہ آباد میں 1938 میں ہوئی، تیسری کل ہند کانفرنس 1942 میں دہلی میں ہوئی۔ایک محرکہ خیز کانفرنس 1945 میں حیدرآباد میں ہوئی۔اس کے علاوہ تحریک کی چوتھی کل ہند کانفرنس 1943 میں بمبئی میں ہوئی اور پانچویں کانفرنس 1949 میں بھیمڑی (مہاراشٹر) میں ہوئی اور چھٹی کانفرنس مارچ 1952 میں دہلی میں منعقد کی گئی۔

لکھنؤ کی کل ہند کانفرنس نے تحریک میں روح پھونک دی تھی۔کئی جگہوں پر جیسے بنارس، پٹنہ، ناگپور وغیرہ جہاں کے ادیبوں سے ان کا رابطہ تھا وہاں کے ہندی اور اردو کے ادیبوں کو تحریک کی طرف مائل کیا۔اس کے علاوہ وہ جس جلسے میں جاتے چاہے وہ کانگریس کا جلسہ ہو یا ہندی ساہتیہ پریشد کا، وہاں تحریک کے مقاصد سے حاضرین کو آگاہ کرتے۔دہلی میں تحریک کی ایک شاخ اختر حسین رائے پوری نے قائم کی۔وہاں وہ رسالہ 'حکیم' جن کے مدیر جوش ملیح آبادی تھے ان کے ساتھ رسالے کی اشاعت میں معاون کی حیثیت سے شامل ہو گئے تھے۔'ساقی' رسالہ بھی وہیں سے نکلتا تھا جس کے مدیر شاہد احمد دہلوی تھے۔اس رسالے نے بھی تحریک کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔شاہد احمد نے اس کے علاوہ ایک ماہنامہ 'شاہجہاں' بھی جاری کیا جس میں تحریک کے مقاصد کا چرچا ہوتا تھا۔ان سب نے مل کر ترقی پسند ادبی تحریک کو بہت بڑھاوا دیا۔

سن 2000ء میں ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی کے زیر اہتمام دو روزہ سیمینار ۱۷ اور ۱۸ دسمبر کو ہوا تھا جس کے پہلے اجلاس کی صدارت کملیشور نے کی تھی۔اپنا صدارتی خطبہ پڑھتے وقت انہوں نے یہ شعر کہا تھا:

اے بت تراش عشق کو حیرت میں ڈال دے
پتھر کی آنکھ سے ذرا آنسو نکال دے

یہ شعر سجاد ظہیر کے تعلق سے بہت معنی خیز ہے۔ ترقی پسند تحریک ایجاد کر کے انہوں نے پتھر کی آنکھ میں آنسو لا کر دکھا دیا۔ ایسی تحریک جو سخت دل انسانوں کی آنکھوں کو نم کر دے بہت مشکل سے عمل میں آتی ہے۔ سجاد ظہیر کی تحریک ایسی ہی ایک تحریک تھی۔ وہ تحریک اُس وقت کی پیداوار تھی جب انسان اس دور میں درد سے کراہ رہا تھا جو کبھی بدلنے والا نہیں تھا۔ جس کے آنکھ کے آنسو کب کے سوکھ چکے تھے۔ سجاد ظہیر نے ان آنکھوں کو پھر سے تر کیا جو غیر معمولی امر تھا۔ آخر سجاد ظہیر اور ترقی پسند تحریک ایک دوسرے کا اٹوٹ انگ بن گئے۔ جہاں ایک کا ذکر آتا ہے وہاں دوسرے کا ذکر خود بخود کھڑا ہو جاتا ہے۔ بنّے بھائی نے نہ صرف تحریک کی بنیاد ہی ڈالی بلکہ وہ ایک تاریخی روایت بھی چھوڑ گئے۔ تحریک سے ان کا رشتہ اگر ایک ہی شعر میں واضح ہو سکتا ہے تو وہ شعر یہ ہے:

یوں مجھ میں تیرے لمس کا احساس رچا ہے
اپنے ہی بدن سے تیری آجاتی ہے خوشبو

☆☆☆☆

﴿کتابیات﴾

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر / پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱)	ادب اور روشن خیالی	سبطِ حسن	مکتبہ دانیال۔ کراچی	1990	162
۲)	روشنائی	سجاد ظہیر	پرائم ٹائم پبلیکیشن۔ لاہور	2006	99
۳)	روشنائی	سجاد ظہیر	پرائم ٹائم پبلیکیشن۔ لاہور	2006	102
۴)	روشنائی	سجاد ظہیر	پرائم ٹائم پبلیکیشن۔ لاہور	2006	133

☆☆☆☆

۳۔ الہ آباد اور لکھنؤ کی کانفرنسیں

سن 1937 ، 1938 اور 1939 میں ترقی پسند ادیبوں کی تین کانفرنسیں ہوئیں جن میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ادیبوں نے شرکت کی۔ پہلی دو کانفرنسیں تو الہ آباد میں ہوئیں اور تیسری لکھنؤ میں ہوئی۔ الہ آباد کی پہلی کانفرنس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے کارکنوں میں ایک شریمتی شیام کماری نہرو بھی تھیں جو الہ آباد ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتی تھیں۔ وہ خاتون جب کسی کام کا ارادہ کر لیتی تھیں تو اسے منزلِ مقصود تک پہنچائے بغیر دم نہ لیتی تھیں۔ چونکہ وہ نہرو خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اس لیے شہر میں ان کا کافی اثر و رسوخ تھا۔ شیام کماری ایک ایسی انجمن کی سکریٹری تھیں جو ہر سال ایک سودیشی نمائش کرتی تھی جس سے کافی سرمایہ اکٹھا ہوتا تھا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ جو پنڈال سودیشی نمائش کے لیے لگے گا اسی میں انجمن کی کانفرنس بھی کر لینی۔ نیز کم خرچ بالا نشین والا معاملہ تھا۔ اس کے علاوہ ان کے ذاتی اثر و رسوخ سے بھی کافی چندہ اکٹھا ہو گیا جس سے کانفرنس بخوبی ہو جانے کی امید بندھ گئی۔

کانفرنس کے کارکن سر تیج بہادر سپرو جو الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کرتے تھے۔ ان کے پاس چندہ مانگنے گئے۔ وہ حضرت ترقی پسند تحریک کے حق میں نہیں تھے۔ چونکہ وہ سروزیر حسن کے دوست تھے اس لیے انہوں نے چندہ تو دے دیا لیکن اردو ادب سے حمایت کے باوجود وہ سمجھتے تھے کہ کمیونزم سے سوائے ملک کی بربادی کے کچھ حاصل نہیں ہونے والا۔ سر تیج بہادر سپرو کی شخصیت کے بارے میں سجاد ظہیر لکھتے ہیں کہ ان کی باتیں دلچسپ ہوتی تھیں اور باتوں باتوں میں وہ ایسے ایسے

لطیفے چٹکلے سناتے تھے اور اردو اور فارسی کے ایسے خوبصورت شعر پڑھتے تھے کہ ان سے بحث کرنے سے زیادہ ان کی باتیں سننے میں مزہ آتا تھا۔ ہندی کی مخالفت اور اردو کی حمایت میں غلو سے کام لیتے تھے اور اس کی حد سے زیادہ تعریف کرتے تھے۔ وہ گاندھی اور جناح سے اس وجہ سے بھی ناراض رہتے تھے کہ انہیں اردو نہیں آتی تھی۔

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے اب انجمن نے اپنی کانفرنسوں کے لیے ایک سے زیادہ صدر منتخب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ الہ آباد کی پہلی کانفرنس میں جو 1937 میں ہوئی اس میں صدارت کے لیے مولوی عبدالحق، آچاریہ نریندر دیو اور پنڈت رام نریش ترپاٹھی کا انتخاب ہوا۔ مولوی عبدالحق اچانک علالت کی وجہ سے صدارت کی ذمہ داری سرانجام نہ دے سکے۔ صرف ان کا بھیجا ہوا خطبہء صدارت ہی پڑھا گیا۔

اس کانفرنس میں مولوی عبدالحق کے علاوہ جے پرکاش نارائن، شیو دان سنگھ چوہان، نریندر شرما، رمیش چندر سنہا وغیرہ نے بھی حصہ لیا۔ آچاریہ نریندر دیو اور پنڈت رام نریش ترپاٹھی جو کانفرنس کی صدارت کے لیے چنے گئے تھے انہوں نے تقریریں کیں جو تحریک کے حق میں تھیں۔

مولوی صاحب کے خطبے نے کانفرنس میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ ہر ایک ادیب پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ انہوں نے نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ وہ خالص تخریبی روایت سے بچ کر رہیں اور روایتی عناصر کو اپنانے کی کوشش کریں۔ انہوں نے یہ بھی کہا اچھا ادب خلوص اور ایثار سے ہی پیدا کیا جاسکتا ہے اور یہ کہ ادب کی پہلی ضرورت ادبیت ہے جس کا پورا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔

آچاریہ نریندر دیو سنسکرت اور پالی کے عالم فاضل تھے۔ وہ کاشی ودیا پیٹھ کے پرنسپل اور کانگریس کی بائیں بازو کی تحریک کے محرک بھی تھے۔ انہوں نے بہت زوردار تقریر کی جس سے نوجوان ادیبوں میں کافی جوش پیدا ہوا۔

ہندی ادب میں پنڈت نریش کمار ترپاٹھی ایک خاص قسم کا مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے 'کویتا کمودی' کی کئی جلدیں ہندی میں شائع کیں۔ لیکن ادیب ہونے کے باوجود وہ بیوپاری قسم کے انسان تھے اس لیے رفتہ رفتہ وہ ترقی پسند تحریک سے دور ہوتے گئے۔

ترقی پسند مصنفین کی دوسری کانفرنس الہ آباد میں 1938 میں ہوئی۔ یہ ہندی اور اردو

ادیبوں کی ملی جلی کانفرنس تھی۔ یہ کانفرنس بھی پہلی کانفرنس کی طرح سودیشی نمائش کے موقع پر اسی کے پنڈال میں ہوئی۔ اس میں بھی شیام کماری نہرو کا بہت مفید تعاون رہا۔ اس کانفرنس میں یو پی، پنجاب اور بہار کے ادیب کافی تعداد میں شامل ہوئے اور اس میں ادبی مسائل پر بہت سنجیدہ گفتگو ہوئی۔ جیسا کہ پچھلی کانفرنس میں ہوا ویسا اس میں بھی ہوا۔ کانفرنس کی صدارت کی ذمہ داری جوش ملیح آبادی، پنڈت آنند نارائن ملا اور سمترا نندن پنت کو سونپی گئی۔ اس کانفرنس کی خوبی یہ تھی کہ اس میں پنڈت جواہر لال نہرو اور کاکا کلیلکر نے صرف شمولیت ہی نہیں کی بلکہ اپنی تقریریں بھی کیں۔ میتھلی شرن گپت جو اس زمانے میں ہندی کے بہت بڑے کوی تھے وہ بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئے اور اپنی کویتائیں سنائیں۔ اس کانفرنس میں رابندر ناتھ ٹیگور بہ نفس نفیس تو شامل نہیں ہو پائے مگر انہوں نے اپنا پیغام لکھ کر بھیجا تھا جو کانفرنس میں پڑھا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر اور رابندر ناتھ ٹیگور کا پیغام 'نیا ادب' کے جنوری فروری 1941 کے شمارے میں شائع ہوئے تھے۔ پنڈت جی نے بڑے زوردار انداز میں اس بات کی تردید کی کہ سوشلزم کے قیام سے کسی کی انفرادیت کو زعم پہنچے گا یا وہ دب جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ لکھنے والے کے دماغ میں ایک خیالی دنیا ہوتی ہے جس کے بارے میں وہ سمجھتا ہے کہ دنیا اس تک پہنچ سکتی ہے۔ اپنی خیالی دنیا اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک پل باندھ جائے۔ ہر زمانے کے شاہکار اسی قسم کے پل ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ابھی تک ایسے ادیب بہت کم پیدا ہوئے ہیں جو ملک کو آگے لے جاسکیں۔ اس لیے انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام اس بہت بڑی ضرورت کو پورا کرے گا۔

اپنے زمانے میں گورودیو رابندر ناتھ ٹیگور کا ادب کی دنیا میں اپنا ایک مخصوص مقام تھا۔ وہ تعصب کے سخت خلاف تھے اور ہندی اردو کے جھگڑے سے بے حد بد دل تھے۔ سجاد ظہیر نے 1930 میں ٹیگور کو آکسفورڈ میں دیکھا ضرور تھا لیکن ان سے ملاقات کا موقع حاصل نہیں ہوا تھا۔ شروع شروع میں سجاد ظہیر ٹیگور کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے کیونکہ انہوں نے کبھی ہندوستان کی آزادی کی تحریک کی کھل کر حمایت نہیں کی تھی بلکہ ایسا کرنے سے گریز کرتے تھے۔ دوسرا یہ کہ وہ اپنے آپ کو بڑے ڈرامائی انداز میں نہایت امیرانہ طور سے پیش کرتے تھے جو طرز سجاد ظہیر کو پسند نہیں تھی۔ لیکن جب وہ ٹیگور سے 1938 میں ملے تو انہیں محسوس ہوا کہ ان کے تحقیقی کارناموں کے متعلق

ان کا نقطہ نظر بدل چکا تھا۔ تب ٹیگور اپنی قوم کے مہین اور حسین ترین جذبات کو اپنی تخلیقات میں نہایت موثر اور دلکش طریقے سے ظاہر کرتے تھے اور اسی وجہ سے وہ قوم کے مغنی اور مصور بن گئے تھے۔ اس ملاقات میں وہ ٹیگور کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے۔ اگرچہ ابتدائی دور میں ٹیگور قوم کے جدید ترین عوامی اور انقلابی تقاضوں سے پوری طرح باخبر نہ تھے لیکن آخری عمر میں وہ اس کمی کو سمجھنے لگے تھے۔ ان کے بارے میں سجاد ظہیر کہتے ہیں:

''رابندر ناتھ ٹیگور کی آواز مہین تھی۔ وہ بیماری اور بڑھاپے کی وجہ سے اور بھی دھیمی ہوگئی تھی۔ لیکن یکبارگی مجھے محسوس ہوا کہ انہیں غصہ آ گیا ہے اور ان کی آنکھیں چمکنے لگیں اور کوشش کر کے وہ اونچی آواز میں مجھ سے کہنے لگے'' میری سمجھ میں تعصب اور تنگ نظری بالکل نہیں آتی۔ ورکنگ کمیٹی نے 'بندے ماترم' کے ترانے سے اس ٹکڑے کو حذف کر کے بالکل ٹھیک کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نہرو نے اس بارے میں میری رائے پوچھی تھی اور میں نے خود ان کو یہ رائے دی تھی۔ ہمارا قومی ترانہ ایسا ہونا جسے ملک کا ہر ایک رہنے والا خوشدلی اور عقیدت سے گا سکے۔ مسلمان جو بت پرستی کے خلاف ہیں، کس طرح ایسے ترانے گا سکتے ہیں جس میں کالی کو خطاب کیا گیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ خود میرے عقائد بھی نہیں ہیں اور میں اسے پسند نہیں کرتا۔ لیکن بعض لوگ اتنے تنگ نظر اور جاہل ہوتے ہیں کہ دوسروں کے جذبات اور عقیدوں کا بالکل خیال نہیں کرتے۔''(۱)

سجاد ظہیر کلکتہ میں ٹیگور کو الہ آباد کی دوسری کانفرنس کے لیے مدعو کرنے گئے تھے۔ ٹیگور نے علالت کی وجہ سے معذرت کا اظہار کیا لیکن پیغام لکھ دیا جسے کانفرنس میں پڑھا گیا۔ اس پیغام کی جدید ادب میں بہت اہمیت ہے۔ ایک تو یہ کہ ترقی پسند تحریک کو ایسے عظیم شاعر کی تائید حاصل ہوئی جو بین الاقوامی سطح پر شہرت یافتہ تھے۔ دوسرا یہ کہ اس پیغام سے بخوبی جان پڑتا تھا کہ ان کے ادبی اور فنی نظریات میں کتنی گراں قدر تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ اپنے پیغام میں انہوں نے کہا:

''ادیبوں کو انسانوں سے مل جل کر انہیں پہچاننا ہے۔ میری طرح گوشہ نشین رہ کر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ زمانہ دراز تک الگ رہ کر اپنی ریاضت میں میں نے

جو بہت بڑی غلطی کی ہے اب اسے میں سمجھ گیا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ یہ نصیحت کر رہا ہوں۔ میرے شعور کا تقاضہ ہے کہ انسانیت اور سماج سے محبت کرنی۔ اگر انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ ناکام اور نامراد رہے گا۔ یہ حقیقت میرے دل میں چراغِ حق کی طرح روشن ہے اور کوئی استدلال اسے بجھا نہیں سکتا۔'' (۲)

یہ پیغام بہت محرکتہ الآرا پیغام تھا۔ یہ ٹیگور کی بلند شخصیت کی شہادت دیتا ہے کہ وہی ایک ایسا انسان ہے جو اپنی خامیوں کو بلا جھجک قبول کر سکتا ہے۔ اس پیغام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پچھلے پچاس سال سے جس فکر سے جڑے ہوئے تھے اب وہ انہیں بہت کم، بہت ناکافی نظر آنے لگی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ آخری عمر میں ان کا ذہن قدرے زیادہ روشن ہو گیا تھا اور وہ اپنے عہد کی ضرورتوں کو بخوبی سمجھنے لگے تھے۔ وہ ادیبوں کو یہ تاکید کرنے لگے تھے کہ وہ ایسا آرٹ اور فن تعمیر کریں جو عوام کی زندگی کے قریب ہو۔ چونکہ ایسا ادب پیدا کرنا کوئی آسان کام نہ تھا اس لیے انہوں نے نئے ادیبوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس کام کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ٹیگور کی عظمت کی اس سے بڑی نشانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے بتائے ہوئے معیار پر سب سے پہلے انہوں نے خود اپنے آپ کو جانچا اور بلا خوف اعتراف کیا کہ دراز عرصہ تک سماج سے الگ رہ کر انہوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔

الہ آباد کی دوسری کانفرنس کی اہمیت پہلی کانفرنس سے اس لیے زیادہ تھی کہ اس میں یوپی، بہار اور پنجاب کے نمائندے شامل ہوئے تھے۔ پنجاب سے فیض احمد فیض نے شرکت کی۔ ان دنوں لکھنؤ ترقی پسند ادیبوں کا گڑھ بن گیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم اور حیات اللہ انصاری وہاں سے ہفتہ وار 'ہندوستان' نکالنے لگے تھے جس میں ترقی پسند مضامین شائع ہوتے تھے۔ مجاز لکھنوی بھی دہلی ریڈیو چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے تھے۔ علی سردار جعفری نے بھی لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم۔اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ جوش ملیح آبادی نے بھی لکھنؤ میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے 1939 میں جو لکھنؤ میں کانفرنس ہوئی اس میں یہ تمام دانشور شامل ہوئے۔ ان کے علاوہ پنڈت آنند نارائن ملا بھی موجود تھے۔ علی گڑھ سے شاہد لطیف اور علی اشرف شامل ہونے کے لیے آئے تھے۔ یہ دونوں نوجوان ادیب تحریک سے نئے نئے وابستہ ہوئے تھے حالانکہ بعد میں ان دونوں نے اپنے اپنے مقاصد میں بہت شہرت حاصل کی۔

بنارس سے امرت رائے (پریم چند کے صاحب زادے)، سریندر بالو پوری اور دیگر کئی ہندی کے ادیب بھی شرکت کے لیے پہنچے تھے۔ اردو ادیبوں میں سید اعجاز احمد، فراق گھورکھپوری، سید احتشام حسین اور وقار عظیم وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس کانفرنس میں عبدالعلیم نے ایک بہت اچھا مقالہ پڑھا جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ہندی اردو کو قریب لانے کے لیے دونوں کے رسم الخط ترک کر کے رومن رسم الخط کو اپنانا ضروری ہے۔ چنانچہ تجربے کے طور پر دعوت نامے اور اشتہارات رومن رسم الخط میں ہی چھپائے گئے۔ لیکن یہ تجربہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ اس کی مخالفت بڑے سخت لفظوں میں کی گئی۔ کاکا کالیکر جو مہاتما گاندھی کے چیلے تھے انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ اگرچہ ترقی پسند تحریک کے ہمدرد ہیں لیکن اگر انجمن نے رومن ہی کی تجویز کو باقاعدہ اپنا نصب العین بنالیا تو پھر وہ پوری طرح اور کھل کر انجمن کی مخالفت کریں گے۔

الہ آباد کی دو کانفرنسیں اور لکھنؤ کی ایک کانفرنس کا یہ فائدہ ہوا کہ ترقی پسند ادیبوں میں ہم آہنگی پیدا ہونے لگی۔ اس سے لوگوں کے خیالات صاف ہونے لگے اور ان کی سوچ میں پختگی پیدا ہونے لگی۔ ان کانفرنسوں سے سجاد ظہیر کا نام ترقی پسند تحریک سے یوں جڑ گیا جیسے ایک کے بغیر دوسرے کی کوئی ہستی ہی نہیں۔ اس تحریک میں ادباء اور شعراء کے علاوہ طلبا سیاسی کارکن اور کسان، مزدور، غرض ہر نظریہ کے لوگ شامل ہونے لگے۔ اس سے تحریک کی جڑیں اور مضبوط ہوگئیں وہ پھیلنے پھولنے لگی۔

ان تین سالوں میں ترقی پسند تحریک نے کافی نام پیدا کر لیا تھا اور اس کی پہنچان مسلّم ہوگئی تھی۔ لیکن تحریک کی تقویت اور ترویج میں بیشتر کارکردگی سجاد ظہیر کی ہی تھی۔ ان کی تنظیمی صلاحیت اور ان کی بے پایاں محنت کی چھاپ تحریک کے ہر پہلو پر جذب تھی۔ سجاد ظہیر اجتماعیت پسند تھے اور وہ مذہب، نسل، عقیدے وغیرہ سے بہت بالاتر تھے۔ سجاد ظہیر انسان کو صرف اس کے حقوق اور انفرادی آزادی کی سطح پر ہی دیکھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ اس فعال تحریک کے کارکن اور محرک ہونے کی بہت شہرت حاصل کر چکے تھے۔ تحریک کے متعلق بھی ان کا یہ نظریہ تھا کہ وہ ایک جمہوری اور عوامی تنظیم ہے جس میں ہر نظریہ کے لوگ بلا جھجک اپنے خیالات ظاہر کر سکتے ہیں۔ پابندی صرف یہی تھی کہ وہ ترقی پسند رجحان رکھتے ہوں اور پچھڑے ہوئے طبقے کو سامراجیت سے آزاد کرانے کے ضامن ہوں۔ یہ سب

ہونے کے باوجود تحریک پر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ اس میں فرد کی ذاتی آزادی کی گنجائش نہیں اور یہ کہ
وہ فنکار کے تخیل کی آزادی کو چند خانوں میں مقید کر کے اس کی تخلیقی صلاحیت کو نکھرنے اور پھلنے او
پھولنے نہیں دیتی۔ تحریک کے مخالفین یہ بھی شکایت کرتے تھے کہ فنکار کو اپنی کیفیت کو واضح کرنے کی
مکمل آزادی ہونی جو یہ تحریک مہیا نہیں کر سکتی۔ ایسے الزامات سراسر جھوٹے اور بے بنیاد تھے۔ ان کا
منشا صرف یہی تھا کہ ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں کو گمراہ کر کے ان کے ذہنوں میں انتشار اور
ژولیگی کا زہر بھر دیں تا کہ وہ لوگ جلا اور تابندگی پھیلانے کی بجائے دھند لکے اور تیرگی پیدا کریں۔
ترقی پسند تحریک فنکار کی آزادی کی منکر نہیں تھی۔ وہ لوگ فنکار کی تخلیقی آزادی چاہتے تھے تا کہ فنکار کی
بہترین تخلیقوں کے لیے ایک پاکیزہ اور صحت مند فضا پیدا کرنے کے لیے ماحول پیدا کر سکیں۔

ایسے اور دیگر کئی الزامات کے مقابل تحریک کے ابتدائی چند سالوں کی سرگرمیاں اس بات کی
گواہ ہیں کہ ترقی پسند تحریک کے ارکان نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ بلکہ رجعت پرست عناصر نے مکروہ
سازشیں کر کے فنکاروں کی تخلیقی آزادی کی راہ میں کوہِ گراں کی طرح مشکلیں اور رکاوٹیں حائل کیں۔ اس
کے برعکس تحریک کا مقصد یہ تعین کیا گیا تھا کہ ادبی تخلیق کا ضروری فرض صرف ملک کی معاشی، ادبی اور
سیاسی کیفیت کو بہ لفظ حقیقت بیان کرنا ہونا۔ فنکار کی آزادی پر کوئی پابندی دور دراز تک ان کے مقاصد
میں نہ تھی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

> '' اس کی ادبی کاوش کا کبھی یہ مقصد نہیں تھا کہ شاعروں کو میٹھے گیت گانے اور
> حسن و عشق کی حکایتوں اور واردات کے بیان کرنے سے روکا جائے۔ یا وہ نغمے
> جن سے دلوں میں سوز اور دردمندی پیدا ہو، جان میں گھلاوٹ اور آنکھوں میں
> نمی، نہ چھیڑے جائیں۔ ہمارا مقصد ادیب کی نظر کو محدود کرنا نہیں بلکہ اس کو اور
> وسیع کرنا تھا۔ باریک بینی کے ساتھ اس میں گہرائی پیدا کرنا تھا۔ اس میں وہ
> کسک اور ٹیس پیدا کرنا تھا جو خود پرستی کے تنگ گھروندے سے باہر نکل کر ساری
> نوع انسانی کے دکھ درد، رنج و راحت کا شریک ہونے اور اسے ہمدردی اور
> بصیرت کے ساتھ سمجھنے سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ انجمن کی طرف سے متعدد
> کانفرنسیں منعقد کر کے انجمن کی مختلف شاخوں اور خود ادبی حلقوں میں نئی طرح

کے افسانے، نظمیں، تنقیدی مضامین پڑھ کر اور ان پر بحث اور مباحثہ کر کے، متعدد رسالوں کا اجرا کر کے یا پہلے سے جاری شدہ رسالوں کو نیا رنگ دے کر، ان میں ادب کے نئے مقاصد پر بحث چھیڑ کر، اپنے مخالفوں اور نکتہ چینیوں کو سنجیدگی سے جواب دے کر اس پر اصرار کر کے، کہ نئے لکھنے والے عوام کی زندگی نیز ان کی ترقی پسند تحریکوں کو زیادہ سے زیادہ بچی اور گہری واقفیت حاصل کریں۔ ہم نے وہ ذہنی اور عملی بنیاد رکھی جو ادب کے رجعت پسند رجحانات کو پسپا کرنے اور شکست دینے اور نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق کے لیے ضروری تھی۔ اس نظریاتی اتحاد کی کوشش کے ساتھ ساتھ دوسرا سب سے اہم کام جو اس زمانے میں انجام دیا گیا، وہ نئے ترقی پسند لکھنے والوں اور ترقی پسند ادب میں دلچسپی رکھنے والوں کی سارے ملک میں اور اس کی اکثر بڑی بڑی زبانوں میں ایک ابتدائی قسم کی تنظیم تھی، اور ان کے ایک مرکز کا قائم ہونا تھا۔ ہمارا وطن لسانی اعتبار سے کئی بڑی بڑی زبانوں کے علاقوں میں بٹا ہوا ہے۔ ان مختلف زبانوں میں سے ہر ایک کو کروڑوں یا لاکھوں انسان بولتے ہیں۔ اردو، ہندی، بنگالی، آسامی، اڑیہ، تامل، تیلگو، ملیالم، کنڑ، گجراتی، سندھی، پنجابی، پشتو، کشمیری تو ایسی زبانیں ہیں جو کافی ترقی یافتہ ہیں اور ان میں صدیوں پرانا ادب بھی موجود ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی زبانیں ہیں جو ابھی تک ترقی نہیں کر سکیں۔ مثلاً بلوچی یا شمالی اور شمال مشرقی پہاڑی قبیلوں کی زبانیں۔ غالباً ہماری تحریک سے پہلے ملک میں ایسا ادبی ادارہ یا تنظیم نہیں تھی جس میں یہاں کی مختلف زبانوں کے ادیب واحد نصب العین کے تحت منظم کیے گئے ہوں۔ 1936 میں مسٹر کنہیالال منشی نے گاندھی جی کی سرپرستی حاصل کر کے اس قسم کے ایک کل ہند ادارے بھارتیہ ساہتیہ پریشد کو قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئی۔ اس کا ابتدائی جلسہ 1936 میں ناگپور میں ہوا تھا۔ اس کے بعد اس انجمن کا نام ہی نہیں سنا گیا۔"(۳)

اب تک تحریک نے بہت زور پکڑ لیا تھا اور انجمن کی شاخیں جگہ جگہ قائم ہونے لگی تھیں۔ بنگال میں جوش وخروش بہت زیادہ تھا۔ کلکتہ میں شاخ تھی ہی لیکن ایک ایک شاخ سہلٹ اور گوہاٹی میں بھی بن گئی تھی۔ بنگال کی شاخ نے اپنا ایک دفتر بھی منظم کرلیا تھا اور تحریک میں بہت سے آرٹسٹوں کو بھی شامل کرلیا تھا۔ بعد میں اس شاخ کا نام بدل کر 'بنگال کے ترقی پسند ادیب اور آرٹسٹوں کی انجمن' رکھا گیا۔ وہیں سے بنگال کا ماہنامہ 'پریچے' بھی شائع ہونے لگا تھا۔

احمد آباد میں بھی انجمن کی شاخ قائم کی گئی تھی۔ دکن اور مغرب کے حلقوں میں بھی انجمنیں بن گئیں۔ حتہ کہ اب ایک مرکزی دفتر کی گراں ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ ان دنوں چونکہ ملک راج آنند ہندوستان آگئے تھے انہوں نے انجمن کا کافی کام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ وہ لکھنؤ میں رہائش پذیر تھے۔ احمد علی بھی الہ آباد یونیورسٹی کو چھوڑ کر لکھنؤ منتقل ہو گئے تھے۔ عبدالعلیم بھی لکھنؤ میں ہی عربی کے لیکچرار عائد ہو گئے تھے۔ اس لیے انجمن کا مرکزی کام لکھنؤ میں ہی ہونے لگا تھا۔ اس کام کے لیے ڈاکٹر علیم کا گھر ہی مرکز کا دفتر بن گیا تھا۔ ان تین لوگوں نے یعنی ملک راج آنند، احمد علی اور ڈاکٹر عبدالعلیم نے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ تحریک کا ایک انگریزی رسالہ 'نیو انڈین لٹریچر' کے نام سے 1939 میں شائع کیا۔ سجاد ظہیر کہتے ہیں کہ اس رسالے کا پہلا نمبر بہت خوبصورت تھا۔ اس کا پہلا شمارہ انگریزی داں حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ رسالے میں چند خامیاں بھی تھیں جن کا شروع میں کسی کو احساس نہیں ہوا تھا۔ ان خامیوں کے باوجود رسالے کا دوسرا نمبر پہلے سے بہتر تھا لیکن اس کی فروخت اور وصولی امید سے کم رہی۔ دوسرا یہ ہوا کہ جو تین آدمی ایڈیٹوریل بورڈ میں تھے ان میں نفاق پیدا ہو گیا۔ ملک راج آنند چیف ایڈیٹر کی پوزیشن اختیار کرنے لگے تھے جس کی وجہ سے احمد علی ناراض ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی ناراضگی اتنی شدید ہوگئی کہ احمد علی رسالے سے الگ ہو گئے۔ دیگر دونوں شخص یعنی آنند اور علیم مل کر رسالے کو چلاتے رہے۔ لیکن کسی خاص مجبوری کی وجہ سے ملک راج آنند کو انگلینڈ جانا پڑا۔ ویسے تو وہ دو تین مہینے میں واپس آجاتے لیکن بدقسمتی سے ستمبر 1939 میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوگئی اور ملک راج آنند واپس ملک نہ آسکے۔ کاغذ کا ملنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ چھپائی بھی مہنگی ہوگئی۔ 1940 میں ترقی پسند ادیبوں کی بڑے پیمانے پر گرفتاریاں بھی ہونے لگیں تھیں۔ ایسے حالات میں تحریک کا وہ رسالہ جو بڑے جوش اور امیدوں سے شروع کیا تھا، ہمیشہ کے

لیے ابدی نیند سو گیا۔

سبطِ حسن نے ایک اشاعت کو ترتیب دی تھی جس کا نام 'آزادی کی نظمیں' رکھا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس کی اشاعت حلقہء ادب لکھنؤ نے 1940 میں کی۔ اس مجموعے میں غالب سے لے کر 1940 کے دور کی وہ نظمیں شامل تھیں جن میں حُب الوطنی کا جذبہ تھا یا قومی بیداری کو مقامِ اولیں بخشا گیا تھا۔ رفیع احمد قدوائی نے اس کتاب کا دیباچہ لکھا تھا جس کا اقتباس خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ یہ اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

> ''آزادی کی نظموں کا زیرِ نظر مجموعہ صرف نظموں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ احساسِ غلامی کی تاریخ ہے اور مجھے خوشی ہے کہ مرتب نے انتخاب کی بنیاد قومی زندگی کی حقیقتوں پر رکھی ہے۔ اس انتخاب سے اس دعویٰ کی بھی تائید ہوتی ہے کہ ادب اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر ان نظموں کو غور سے پڑھا گیا تو نہ صرف آزادی کے تصور کا تدریجی ارتقاء واضح ہو جائے گا بلکہ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ آج ہم کس منزل پر ہیں، ہمارے رجحانات کیا ہیں اور ہماری آئندہ منزل کیا ہوگی۔'' (۴)

اس کتاب کا ذکر سجاد ظہیر نے بھی خود ایک خط میں کیا ہے جو انہوں نے 14 اپریل 1940 کو اپنی رفیقہ حیات کو سینٹرل جیل لکھنؤ سے لکھا جس میں ذیل کا مضمون تھا:

> ''پرسوں 'آزادی کی نظمیں' ملی۔ اس میں فیض احمد فیض کی ایک نظم پڑھی تو بالکل حسبِ حال معلوم ہوئی۔ اس لیے بہت پسند آئی۔ تم اسے ضرور پڑھنا۔ خاص کر یہ شعر۔
>
> اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بارِ ستم
> آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
>
> میرا ارادہ اس کتاب پر تنقید کرنے کا ہے۔ کتاب بری نہیں حالانکہ بعض نظمیں چھوٹ گئی ہیں۔'' (۵)

بہر حال ان ڈھائی تین سالوں میں تحریک نے اس قدر ترقی کر لی تھی کہ اس کی مقبولیت کا پرچم پورے ہندوستان میں لہرانے لگا تھا۔ لوگ اس تحریک کے ساتھ اپنا رشتہ مرتب کر کے فخر محسوس

کرتے تھے۔ ہر زبان کے ادیب و شاعر تحریک کی ادبی سرگرمیوں سے متاثر تھے اور اس کی میٹنگوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اس لحاظ سے انجمن ترقی پسند مصنفین کا مستقبل اب بے حد روشن نظر آنے لگا تھا۔

☆☆☆☆

کتابیات

نمبر شمار کتاب کا نام	مصنف	ناشر / پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱) ادب اور روشن خیالی	سبط حسن	مکتبہ دانیال۔ کراچی	1990	165
۲) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو۔ دہلی	2008	65
۳) روشنائی	سجاد ظہیر	پرائم ٹائم پبلیکیشن۔ لاہور	2006	73
۵) نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔ دہلی	1991	28

☆☆☆☆

۴۔ دوسری کُل ہند کانفرنس اور ترقی پسند ادب کی ترویج

انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس کلکتہ میں دسمبر 1938 کو منعقد ہوئی۔ یہ کانفرنس پہلی کانفرنس سے تقریباً دو سال بعد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کے افتتاح کرنے کی ذمہ داری رابندر ناتھ ٹیگور نے ادا کرنا قبول کرلیا تھا۔ لیکن عین وقت پر انہوں نے اپنی ضعیفی کے مدِ نظر شانتی نکیتن سے کلکتہ آنا مناسب نہ سمجھا اس لیے اپنا افتتاحی خطبہ بھجوا دیا جو کانفرنس میں پڑھا گیا اور سراہا بھی گیا۔ اس کی صدارت ملک راج آنند نے کی۔ کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر سدنید ھرناتھ دت تھے۔ دت بنگالی ادیبوں اور نقادوں میں بہت ممتاز رتبہ رکھتے تھے اور مشہور بنگالی ماہنامہ 'پریچے' کے مدیر بھی تھے۔ کئی اور بنگالی ادیب بھی اس کانفرنس میں شامل ہوئے جن میں چند ادیبوں کے نام تھے بدھ دیو بوس، مانک بنرجی اور تاراشنکر بنرجی۔ کانفرنس میں شرکت کے لیے پرماتما چودھری بھی پہنچے جو تقریباً 75 سال کے تھے اور ضعیفی کی وجہ سے چند قدم ہی چل سکتے تھے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی جو اردو اخبار 'روز نامہ' کے مدیر تھے پہلی بار اس کانفرنس میں شریک ہونے آئے تھے۔ ہندی دانوں میں بلراج ساہنی اور ان کی بیوی دمینتی حاضر ہوئے جنہوں نے ابھی تک فلمی اداکاری کا کام شروع نہیں کیا تھا اور شانتی نکیتن میں ہندی ادب پڑھاتے تھے۔

پنجاب کی انجمن کے نمائندے کرشن چندر تھے جو کانفرنس شروع ہونے کے بعد پہنچے تھے۔ سجاد ظہیر کہتے ہیں وہ صورت شکل کے لحاظ سے بالکل ایف۔ اے کے طالب علم معلوم ہوتے تھے۔ پنجاب سے دوسرے نمائندے خود ملک راج آنند ہی تھے جو اس کانفرنس کے صدر ہی نہیں بلکہ اس

کے روحِ رواں بھی تھے۔

لکھنؤ سے جو لوگ آئے تھے ان میں ڈاکٹر عبدالعلیم، مجاز لکھنوی، احمد علی، علی سردار جعفری، رضیہ سجاد ظہیر اور خود سجاد ظہیر تھے۔ اسی ہفتے سجاد ظہیر کی شادی بھی ہوئی تھی۔ تب تک رضیہ سجاد ظہیر انجمن کی ممبر نہیں تھی لیکن غالباً اُس نے ترقی پسند تحریک میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنی شادی کے فوراً بعد اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ کانفرنس میں شرکت کا حال سجاد ظہیر کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''ہماری شادی پُرانی وضع سے بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ اس لیے شاید اس بدعت کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ہم دونوں نے شادی کی بہت سی رسموں اور تقریبوں کو ادھورا چھوڑ کر، اور اپنے بزرگوں کو کافی حیران اور ناراض کر کے ایک ہی ہفتہ بعد کلکتہ بھاگ جانے کا فیصلہ کیا۔ رضیہ کو ان کے میکے لے جانے کے لیے ان کے بھائی اجمیر سے چل کر جب لکھنؤ اسٹیشن پر پہنچے تو انہوں نے یکا یک دیکھا کہ ان کی بہن سُرخ کپڑوں میں لپٹی ہوئی کلکتہ جانے والی گاڑی کے ایک ڈیوڑے ڈبے میں دوڑ کر سوار ہو رہی ہے اور گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم سے سرک رہی ہے۔''(۱)

اسی کانفرنس میں انجمن کی کمیٹی کے عہدیداروں کا انتخاب کیا گیا۔ اب سجاد ظہیر کے بجائے ڈاکٹر علیم اس کے نئے سیکریٹری چنے گئے۔ جن ادیبوں نے اپنے مقالے اور کلام پڑھے ان میں ڈاکٹر علیم سب سے آگے تھے۔ انہوں نے 'اردو، ہندی، ہندوستانی' پر ایک مقالہ لکھ کر پڑھا۔ ایک مقالہ سدنید ھردت نے بھی پڑھا لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے ان دونوں مقالوں پر تسلی بخش بحث نہ ہو سکی۔ ایک کمی یہ بھی محسوس کی گئی کہ مضامین اور مقالوں میں خود تنقیدی اور فنِ تنقیدی نہیں پایا جاتا تھا۔ حالانکہ اردو کے ادبا میں یہ کمی ندارد تھی جس کی مثال حیدر آباد (دکن) اور لکھنؤ کی کانفرنسوں میں ملتی تھی۔ وہاں اچھے مقالوں کی کمی بھی نہیں تھی اور تمام مقالے ادب کی مختلف اصناف اور ان کے مسائل پر مبنی تھے اور بڑی مشقت سے لکھے گئے تھے۔ لیکن دوسری زبانوں میں ایسا نہیں تھا۔

ترقی پسند تحریک کی ابتدا سے لے کر اب تک ان ڈھائی پونے تین سالوں میں اسے جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ ترقی پسند ادب صرف اردو میں ہی نہیں بلکہ ملک کی تمام

زبانوں میں سرایت کر گیا تھا۔ جن دانشوروں نے تحریک کے منشور سے اتحاد ظاہر کیا وہ معمولی ادیب نہیں تھے بلکہ ملک کے نامور تخلیق کار تھے۔ ان ادیبوں اور سیاسی رہنماؤں نے کھلے دل سے تحریک کی حوصلہ افزائی کی۔ ملک کے مختلف شہروں اور زبانوں میں نوجوان ترقی پسند ادیب اپنے فن سے لوگوں کو متاثر کر رہے تھے اور اپنی تحریروں میں نئے ادب اور نئے شعور کو واضح طور پر نمایاں کر رہے تھے۔ نئے نئے رسالہ جات شائع ہونے لگے تھے۔ بنگال سے 'پریچے' کا ذکر تو پہلے ہی آ چکا ہے۔ لاہور سے بھی دو بہت اچھے رسالے 'ہمایوں' اور 'ادبی دنیا' نکلنے شروع ہو چکے تھے۔

حیات اللہ انصاری جن کا تذکرہ سجاد ظہیر نے بڑی طوالت سے کیا ہے، انہوں نے بھی ایک ہفتہ وار اخبار لکھنؤ سے جاری کیا تھا۔ اگرچہ اخبار کانگریس کی جانب سے تھا لیکن اس میں ترقی پسند تحریک کی روداد، تقریریں اور نئے ادیبوں کی تخلیقات بھی شامل ہوتی تھیں۔ سبط حسن جو حیدر آباد میں قیام رکھتے تھے اب لکھنؤ آ گئے تھے اور انہوں نے ہفتہ وار 'پرچم' نکالا تھا۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد انہوں ترقی پسند ادیبوں کا اپنا رسالہ 'نیا ادب' بھی لکھنؤ سے شائع کیا۔ اس کی ادارت میں سبط حسن کے علاوہ علی سردار جعفری اور مجاز بھی شامل تھے۔ اس کا پہلا شمارہ 1939 میں شائع ہوا جس میں ملک راج آنند کا مضمون 'ایرانی تھیٹر' ل۔ احمد اکبر آبادی کا مضمون 'ہمارا ادب اور زمانے کا تقاضہ' اور علی سردار جعفری کا مضمون 'ترقی پسند تحریک' شامل تھے۔ ان کے علاوہ مخدوم محی الدین کی کہانی 'آدم کی اولاد' احتشام حسین کی کہانی 'کھنڈر' اور مجاز، جذبی، جاں نثار اختر اور ڈاکٹر دین محمد تاثیر کی نظمیں بھی چھاپی گئیں۔ اسی شمارے میں پریم چند کے خطبۂ صدارت کا حصہ اور عابد گلریز کا ڈرامہ 'ڈاکٹر' بھی شامل کیا گیا تھا۔ لیکن اس شمارے کے اداریے میں خاص طور پر ترقی پسند تحریک کے اہم پہلوؤں کو وضاحت سے بیان کیا گیا تھا۔ ایسا کرنا ضروری بھی تھا کیونکہ تحریک کی کانفرنسوں سے بہت حد تک ترقی پسند تحریک کے مقاصد اور طرزِ عمل واضح نہیں ہوتے تھے۔ اسی لیے اس شمارے کے پہلے اداریے میں ان سب باتوں کی بڑی خوبصورتی سے وضاحت کی گئی تھی۔

کلکتہ کی کانفرنس ایک اسکول کے ہال میں ہوئی تھی جو نیا نیا بنا تھا۔ اس کانفرنس کی روداد کو سجاد ظہیر نے بہت تفصیل سے اپنی کتاب 'روشنائی' میں بیان کیا ہے۔ اس کانفرنس میں بنگال کے چوٹی کے ادیب شامل ہوئے جن پر ماتما چودھری کا نام قابلِ ذکر ہے۔ پرماتما چودھری کے بارے میں سجاد ظہیر

نے لکھا ہے کہ وہ نہایت ضعیف اور لاغر تھے اور انہیں دکھائی بھی بہت کم دیتا تھا۔ پھر بھی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے ادیبوں کو آشیرباد دینے کے لیے اپنی ضعیفی کو نظر انداز کر کے کانفرنس میں پہنچ گئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''مجھے یاد ہے کہ پہلے دن صبح کو جب کانفرنس کا اجلاس شروع ہو گیا تھا اور سارا ہال تقریباً ایک ہزار آدمیوں سے بھرا ہوا تھا، میں نے دیکھا کہ سامنے کے دروازے سے ایک دبلے پتلے بزرگ، جن کے سر کے بال اور مونچھیں سفید تھیں، اور جو اس قدر ضعیف تھے کہ انہیں دو آدمی بازوؤں سے سہارا دیئے ہوئے تھے اور جن کی آنکھوں سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اچھی طرح سوجھتا نہیں ہے، آہستہ آہستہ ڈائس کی طرف آرہے ہیں، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ لائے جارہے ہیں۔ ان کو ڈائس کی طرف آتا دیکھ کر جو تقریر ہو رہی تھی وہ بند کر دی گئی۔ ہیرن مکھرجی اور کانفرنس کے دوسرے رکن تیزی سے ڈائس سے اتر کر ان بزرگ کے استقبال کے لیے لپکے۔ جب کئی آدمیوں کی مدد سے انہیں زینے پر چڑھا کر ڈائس پر پہنچا دیا گیا تو سارے مجمع نے انہیں دیکھا اور کھڑے ہو کر تالیاں بجا کر ان کا استقبال کیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ بزرگ جن کی عمر اس وقت ۷۵ برس کے قریب رہی ہوگی، بنگال کے مشہور ناول نگار پرماتما چودھری ہیں۔''(۲)

سجاد ظہیر لکھتے ہیں کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کانفرنس نے تنظیم کو اور مضبوط کیا اور ان میں اور بھی زیادہ خود اعتمادی اور ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کیا۔ اس کانفرنس نے لوگوں کو بنگال کے ادیبوں سے ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع بھی فراہم کیا۔ اجلاس میں ڈیلی گیٹوں نے اپنی رپورٹیں پڑھیں اور مختلف زبانوں میں جذبات کی عکاسی کی گئی۔

'نیا ادب' کے پہلے شمارے کی اشاعت کا تذکرہ بڑی طوالت سے کیا جا چکا ہے۔ اس کا پہلا اداریہ بہت مقبول ہوا تھا اور اس کی قابل قدر حوصلہ افزائی بھی ہوئی تھی۔ اس میں ترقی پسند ادیبوں کے مضامین اور شعری کارنامے شائع ہوئے تھے۔ کہیں کہیں جہاں جگہ خالی بچ گئی تھی وہاں اردو کے

مانے ہوئے شعرا کے چنندہ چنندہ اشعار لکھ دیئے گئے تھے۔

ادباء اور شعرا کے کلام اس میں درج نہیں کیے جاتے تھے۔ لیکن مئی 1939 میں اسی پرچے کا جب دوسرا شمارہ شائع ہوا تو اس میں عصمت چغتائی کا افسانہ 'گیندا' بھی شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس میں ایک ترجمہ بھی شائع ہوا جو سوامی اودتیانند کے مضمون 'جدید چینی ادب' کا تھا۔ اداریے کا مضمون تھا 'نئی شاعری میں حسن و عشق' جس میں بڑی وضاحت سے اظہارِ خیال کیا گیا تھا۔ ایک انگریزی سائنسداں پروفیسر ہالڈین کے مضمون 'سائنس اور زندگی' کا سعید احمد نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ وہ ترجمہ بھی اس شمارے میں داخل تھا۔ علاوہ ازیں مجاز کا گورکی کی کہانی 'وہ لڑکا' کا ترجمہ بھی اس شمارے میں شائع ہوا تھا۔ شفیق نقوی کا مضمون 'انسانیت کی قیمت' کو بھی اس شمارے میں شامل کیا گیا تھا۔

اگلے مہینے یعنی جون 1939 میں 'نیا ادب' کا تیسرا شمارہ شائع ہوا۔ اداریے میں ادب اور سیاست پر اظہارِ خیال کیا گیا تھا۔ سبطِ حسن نے ترکی کے ایک شاعر ناظم حکمت پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں شاعر کے انقلابی نظریے پر تبصرہ کیا گیا تھا۔ رشید جہاں نے سین ڈور گرگ کی کہانی 'ایک واقعہ' کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جسے اس شمارے میں جگہ دی گئی تھی۔ رشید جہاں کے خاوند محمود الظفر کا ڈرامہ 'امیر کا محل' بھی شائع ہوا۔ اس کے عالاوہ علی عباس حسینی کی کہانی 'آم کا پھل' بھی اس شمارے میں شریک کی گئی تھی۔

اس کے بعد 'نیا ادب' کے کئی شمارے شائع ہوئے اور یہ رسالہ ترقی پسند ادب کے ابتدائی رسالوں کی حیثیت کا حامل ہو گیا۔ لیکن 'نیا ادب' نے جو سب سے اہم رسالہ نکالا وہ ایک مجموعے کی صورت میں تھا جس میں اس دور کے ترقی پسند ادیبوں کے مضامین، افسانے، نظمیں وغیرہ یکجا کر دی گئی تھیں۔ شروع شروع میں ترقی پسند مصنفین کے حالات زندگی بھی شائع کیے گئے تھے۔ تقریباً تمام ترقی پسند ادیبوں کے کارنامے اس میں شامل کیے گئے تھے۔ لیکن چند ایک ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقیں شامل نہ ہو سکیں جن میں رشید جہاں، اختر انصاری وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چونکہ ان سب ادیبوں کے مجموعے ابھی حال ہی میں شائع ہوئے تھے اس لیے انہیں وہ رتبہ نہ مل سکا جو دوسرے ادیبوں کو ملا تھا۔ اس شمارے میں جو خاص مضامین شائع کیے گئے ان میں اختر حسین رائے

پوری کا 'ادب اور زندگی' فیض احمد فیض کا 'انیسویں صدی میں اردو ادب کا سماجی پس منظر' سبط حسن کا 'فلسفہ شاہین' ڈاکٹر عبدالعلیم کا 'ہماری قومی زبان' سجاد ظہیر کا 'اردو کی انقلابی شاعری' وغیرہ تھے۔ ان کے علاوہ سید مطلبی فرید آبادی کا مضمون 'شمالی ہند کے دیہاتی شعرا میں انقلابی رجحانات' اور سردار جعفری کا مقالہ 'ترقی پسند مصنفین کی تحریک' وغیرہ بھی شامل کیے گئے۔ یہ تمام مضامین نثر والے حصے میں رکھے گئے تھے۔ جو حصہ نظموں کے لیے مخصوص تھا اس میں جوش ملیح آبادی کی نظم 'وفاداران ازلی کا پیام شہنشاہ ہندوستان کے نام' مجاز کی نظم 'عشرت فردا' سید مطلبی فرید آبادی کا گیت 'ہیا ہیا' جمیل مظہری کی نظم 'ماں' فیض احمد فیض کی نظم 'سوچ' تاثیر کی 'غیرتوں کی صدا' جذبی کی 'فطرت ایک مفلس کی نظر میں' جاں نثار اختر کی 'خانہ بدوش' شائع کی گئیں۔ ایک حصہ کہانیوں کے لیے بھی صرف کیا گیا تھا۔ اس میں پریم چند کا افسانہ 'کفن' نیاز فتح پوری کا افسانہ 'جنت کی حقیقت' احمد علی کا 'ہماری گلی' خواجہ احمد عباس کا 'ابابیل' سعادت حسن منٹو کا 'نیا قانون' کرشن چندر کا 'دو فرلانگ لمبی سڑک' شامل کیے گئے تھے۔

ان دنوں جوش ملیح آبادی دہلی سے ایک رسالہ 'کلیم' کے نام سے نکالتے تھے۔ یہ رسالہ زیادہ تر ترقی پسند ادب کا ہی راہنما رسالہ تھا۔ بعد میں جوش صاحب یہ رسالہ بند کر کے لکھنؤ آ گئے تو جوش نے اپنے رسالے کا نام 'نیا ادب اور کلیم' رکھ دیا۔ اس کا پہلا شمارہ 1939 میں شائع ہوا۔ چونکہ جوش صاحب اس رسالے کی ادارت کر رہے تھے اس لیے پہلا اداریہ انہوں نے خود لکھا اور اسے 'عہد نو کا آغاز' کا عنوان دیا۔

اب تک 'نیا ادب' کافی مقبول ہو چکا تھا اور اس میں زیادہ تر ترقی پسند ادیبوں کی چیزیں ہی شائع ہوتی تھیں۔ اس رسالے کے بارے میں خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں:

> ''نیا ادب اپنے عروج پر تھا اور سارے ترقی پسند خیالات رکھنے والے ادیب اس میں لکھنے لگے تھے۔ شاعروں کی محفل میں علی جواز زیدی، مسعود اختر جمال، سلام مچھلی شہری اور شہاب ملیح آبادی وغیرہ بالکل نئے اور نوجوان شاعر داخل ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں بعض مضامین یادگار حیثیت رکھتے تھے۔ ارنسٹ ٹولر پر سبط حسن کا مضمون، ہیرالال گودی والا کا 'گجراتی ادب میں ترقی پسند رجحانات' پروفیسر برنال کے مضمون 'سائنس اور تہذیب' کا ترجمہ انصار الحق نے

قلم سے فراق کا مقالہ 'نئے ادب میں غزل کی جگہ' اختر انصاری کا مقالہ 'افادی ادب' چودھری محمد علی کی کہانی 'تیسری جنس' اور 'گناہ کا خوف' کملا کانت ورما کی ہندی کہانی 'پگڈنڈی' کا ترجمہ اور تمنائی کے قلم سے جدید چینی افسانوں کے ترجمے اس دور کی خاص چیزیں تھی۔

اردو میں 'نیا ادب' کے ذریعے ترقی پسند مصنفین کے مقاصد کی اشاعت ہو رہی تھی۔ ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس کلکتہ میں ایک انگریزی ماہنامہ 'انڈین لیٹریچر' کی اسکیم بھی منظور کی گئی۔ اس رسالے کی ادارت میں ملک راج آنند، ڈاکٹر عبدالعلیم اور احمد علی تھے۔ اس کے پہلے شمارے میں ڈاکٹر عبدالعلیم کا مضمون 'ہندوستانی' پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکرجی کا 'ہندوستانی مصوری پر' سنید ھر دت کا 'بنگالی ادب' پر اور نارومنی کا 'ترقی پسند فلم' پر شائع ہوئے۔ پریم چند کی کہانی 'کفن' کا انگریزی میں احمد علی نے ترجمہ کیا تھا اور ترقی پسند تحریک پر ملک راج آنند کی کلکتہ کانفرنس کی صدارتی تقریر تھی۔

اسی زمانے میں بنگالی زبان کے رسالے 'پرچھائیاں' اور 'پرگتی' مہاراشٹر کا 'چترا' اور ہندی کے 'روپاب' اور 'ولپو' بھی نکلنا شروع ہوئے اور ہندوستان کی ساری زبانوں میں ترقی پسند ادبی تحریروں کو مقبولیت اور فروغ حاصل ہونے لگا۔'' (۳)

'نیا ادب' کی جو تعریف خلیل الرحمن اعظمی نے کی ہے اس سے سجاد ظہیر اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ 'نیا ادب' باقاعدہ طریقے سے ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا ترجمان نہیں تھا البتہ غیر رسمی طور پر بہت جلد اس تحریک کا ترجمان بن گیا تھا اور ہر وہ شخص جو ترقی پسند تحریک میں دلچسپی رکھتا تھا اسے پڑھنا ضروری سمجھتا تھا۔ کئی دوسرے رسالے بھی تھے جو ترقی پسند ادبی رجحان کے تھے اور الگ الگ شہروں سے نکل رہے تھے جیسے لاہور سے 'ادب لطیف' اور پٹنہ سے 'شمیم'۔ لیکن 'نیا ادب' ایک ایسا رسالہ تھا جس میں ہر علاقے کے بہترین لکھنے والوں کی چیزیں شائع ہوتی تھیں اور جو ترقی پسند ادبی مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر ہی جاری کیا گیا تھا۔ اگرچہ بعد میں جوش صاحب نے اپنے رسالے

کلیم' کا نام اس میں جوڑ کر اس کی ادارت سنبھال لی لیکن در حقیقیت یہ رسالہ صرف سبط حسن، سردار جعفری اور مجاز کی ہمت اور محنت سے ہی چل رہا تھا۔ ان تینوں حضرات نے اپنے جیب سے ہی رقم نکال کر اس میں لگائی اور اپنے وسیلے سے کچھ اشتہار حاصل کر کے کچھ عرصہ تک اسے نکالتے رہے۔ کسی نیک دل رئیس نے حضرت گنج میں رسالے کے لیے دفتر کی جگہ بھی دے دی تھی لیکن آخر کار اس کا دفتر وہیں اس کمرے میں پہنچ گیا جس میں سردار جعفری اور مجاز رہتے تھے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود یہ دونوں حضرات اس رسالے کو کافی عرصے تک نکالتے رہے۔ اس رسالے کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس میں معیاری تخلیقات شائع ہوتی تھیں جنھیں ترقی پسند ادب کے نام سے جانا جاتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا کہ 'نیا ادب' میں جو چیزیں شائع ہوتی تھیں وہ سب اعلیٰ درجے کی ہوتی تھیں یا وہ مکمل ترقی پسند نظریے کی ہی حامل تھیں۔ ان میں کئی طرح کی خامیاں اور کمزوریاں تھیں۔ لیکن کم وبیش وہ رسالہ ترقی پسند ادبی تحریک کی نمائندگی کرنے میں سرگرداں رہتا تھا۔ 'نیا ادب' میں ادیبوں کے جو کارنامے شائع ہوئے ان کے متعلق سجاد ظہیر کا نظریہ یہ تھا:

> 'نیا ادب' کے ان شماروں میں جوش کی چند معرکتہ الآرا نظمیں ہیں۔ (باغی روحوں کا کورس، جہاں میں تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب)۔ فراق کی بعض وہ غزلیں ہیں جن کے شعر کی آہنگ نے ہماری ادبی دنیا میں ایک نئی روح پیدا کر دی۔
>
> سیاروں میں کب پہلے یہ گردش و تابش تھی
> ہیں موڑ پہ صدیوں کے' دن ایک مہینے کے
> نادیدہ فضاؤں میں تارے چھٹک آئے ہیں
> یا چہرۂ فردا پر' قطرے ہیں پسینے کے
>
> فراق کا مضمون 'نئے ادب میں غزل کی جگہ'، مجنوں گورکھپوری کا 'ترقی پسند ادب' فیض احمد فیض کا 'ترقی پسند ادب' احتشام حسین کا 'قدیم ادب اور ترقی پسند نقاد' ڈاکٹر عبدالعلیم کا 'ادبی تنقید کے بنیادی اصول' وغیرہ ایسے مضامین ہیں جنھوں نے اردو ادب میں تنقید کے نئے نظریے کی بنیاد رکھی ہے۔ نئے شاعروں میں ہم

کومجاز، مخدوم محی الدین، سید مطلبی، سردار جعفری، علی جواد زیدی، مسعود اختر جمال وغیرہ کی نظمیں ملتی ہیں جن میں ہماری شاعری کے آغاز کی پر امید رومانیت، انقلاب پرستی اور حبِ وطن کے فروزاں شعلے بھڑک رہے ہیں۔ اس کے افسانوں کا حصہ نسبتاً کمزور ہے۔ اس لیے کہ کرشن چندر، بیدی وغیرہ اس وقت تک اکثر پنجاب کے رسالوں میں ہی لکھتے تھے۔ پھر عصمت چغتائی، کرشن، منٹو، اختر رائے پوری، احمد علی، حیات اللہ انصاری، سردار جعفری کے افسانے کے مختلف نمبروں میں موجود ہیں۔ یہ باتیں میں اپنی یادداشت سے لکھ رہا ہوں۔ سرِ دست 'نیا ادب' کے تین چار نمبروں کے علاوہ دوسری کا پیاں میرے پاس موجود نہیں ہیں۔ بیرونی ترقی پسند ادب کی نمائندگی میکسم گورکی اور چینی افسانوں کے ترجموں سے کی گئی ہے۔ جدید چینی افسانوں کے بہت اچھے ترجمے پٹنہ کے تمنائی نے کیے تھے، جو بعد کو کتابی شکل میں 'زندہ چین' کے نام سے شائع ہوئے۔'' (۴)

جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو ترقی پسند تحریک پر بھی اس کا نمایاں اثر پڑا۔ ترقی پسند ادیبوں کی گرفتاری بڑے پیمانے پر عمل میں لائی گئی۔ خاص کر ان ادیبوں کی جن کا واسطہ کمیونزم سے تھا۔ لیکن ان گرفتاریوں سے جہاں یہ ہوا کہ لوگ جلسے جلوس نکالنے سے خوف کھانے لگے کیونکہ انہیں اپنی گرفتاری کا خطرہ تھا وہاں اسی زمانے میں مکتبہ اردو نے ترقی پسند ادیبوں کی کئی بہترین تخلیقات بھی شائع کیں۔ ان میں فیض احمد فیض کی 'نقش فریادی' کرشن چندر کی 'طلسم خیال' راجندر سنگھ بیدی کی 'دانہ ودام' کے نام بہت مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ اشک اور ندیم کے افسانوں کے مجموعے بھی 'مکتبہ اردو' نے شائع کیے جس سے تحریک میں پھر جان آگئی۔ ایک خاص بات یہ بھی ہوئی کہ نئے ادیب جو یا تو طالب علم تھے یا ابھی جانے مانے ادیبوں میں نہیں گنے جاتے تھے وہ بھی تحریک میں حصہ لینے لگے۔ ان میں احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، ظہیر کاشمیری، عبداللہ ملک، کیفی اعظمی، عبادت بریلوی، وامق جونپوری، ابراہیم جلیس، سلیمان ادیب، ہنس راج راہبر، پرویز شاہدی وغیرہ شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ رجعت پرستوں کا یہ دعویٰ غلط تھا کہ انہوں نے تحریک کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ اس کے برعکس بہت سارے نئے ادیب آنے لگے تھے اور پرانے ادیب بھی بے دھڑک لکھنے لگے تھے جن میں شعور کی پختگی کی خاص

جھلک نظر آتی تھی۔ 'نیا ادب' اور 'ادبِ لطیف' رسالوں میں انہی دنوں ترقی پسند ادب کی شاعری، تنقید اور افسانے ایک بلند معیار کے ساتھ شائع ہونے لگے تھے۔ 'نیا ادب' 'ادبِ لطیف' اور 'ادبی دنیا' یہ تین رسالے تھے جن میں ان دنوں باقاعدگی سے ترقی پسند ادیبوں کے کارنامے چھپتے تھے۔ 'نیا ادب' کی ہستی کو برقرار رکھنے کے لیے سجاد ظہیر بھی باقاعدگی سے مضامین لکھ کر اس میں اشاعت کے لیے بھیجتے رہتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے خلاف جو اعتراضات چھپے تھے ان میں مرزا جعفر علی خان اثر کا مضمون پیش پیش تھا۔ اس مضمون کا عنوان تھا 'نیا ادب کدھر جا رہا ہے' جو نیا ادب کے جنوری 1940 کے شمارے میں چھپا تھا۔ اثر صاحب نے اپنے اعتراضات میں لکھا تھا:

> ''صحیح ادب تعمیر ہوتا ہے نہ کہ تخریب کا در پے۔ مگر اس کے خلاف نئے ادب میں ایسی نظموں کی افراط ہے جو نفرت خیز و اشتعال انگیز ہیں اور مزدوروں کی زندگی یا افلاس کا صرف تاریک رُخ دکھاتی ہیں حالانکہ درکار ایسی نظمیں ہیں جو اس کی زندگی کے ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالیں جو مصیبت، عسرت، اور زبوں حالی میں تابناک اور دلکش ہیں اور جن کی مصوری شاعر کے موقلم کی منتظر اور محتاج ہے۔ اس طرح اس کی طرف دل کھنچیں گے۔ اس کا سکہ دلوں پر بیٹھے گا۔ اختلاف اور خصومت کی خلیج وسیع ہونے کی بجائے تنگ ہونا شروع ہوگی اور اس کو غریبی کے دلدل سے باہر نکالنے میں ہر شخص ہاتھ بٹائے گا۔ ضرورت اصلاح کی ہے نہ کہ ایسے انقلاب کی جو موجودہ نظام کو بدل کر امیر کو غریب یا نیست و نابود کر کے غریب کو امیر بنا دے۔ یاد رکھئے کہ ان خیالات کے تابع یہ غریب امیر بن کر ایسے کھُل کھیلیں گے کہ موجودہ خوش حال طبقے کے بھی کان کاٹیں گے۔'' (۵)

اس مضمون میں دو باتیں تھیں جن کا جواب دینا نہایت ضروری تھا۔ ایک تو اثر صاحب کا یہ اعتراض تھا کہ ترقی پسند ادب کو اصلاح کی ضرورت ہے نہ کہ انقلاب کی۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ نئے ادب کے کارنامے اشتعال انگیز ہیں اور نفرت پھیلاتے ہیں۔ ان کا جواب سجاد ظہیر نے بخوبی دیا جو 'نیا ادب' کے اکتوبر 1940 کے شمارے میں سراج مبین کے نام سے شائع ہوا۔ چونکہ سجاد ظہیر ان دنوں پابند سلاسل تھے اس لیے اپنے اصلی نام سے کچھ بھی نہیں لکھ سکتے تھے۔ لہٰذا قید کے دوران

انھوں نے جو کچھ بھی لکھا سراج مبین کے نام سے ہی لکھا۔ اس مضمون میں سجاد ظہیر نے اثر صاحب کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے کہا:

''ظاہر ہے کہ شاعری کا تعلق انسان کے جذبات سے ہے۔ شاعری کا مقصد جذبات کے ذریعے اثر ڈال کر دماغ کو ایک خاص سمت رجوع کرنا ہے۔ اس مقصد میں کامیابی اس کے لیے اور اس کے کلام کے سامعین اور ناظرین دونوں کے لیے باعث مسرت بھی ہوتی ہے اور وہ خیالات جس کے ماتحت اس نے شاعری کی ہمارے دل و دماغ میں پیوست بھی ہوتے ہیں۔۔۔۔

ترقی پسند شعرا اگر ایک نظام کے خلاف غصہ اور نفرت کا اظہار کرتے ہیں تو ان پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ وہ شاعری کے باہر قدم رکھتے ہیں۔ غصہ، نفرت، محبت یہی تو جذباتی مادہ ہے جس سے شاعر اپنے خیال کا مجسمہ الفاظی توازن کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اگر سرمایہ داری کو مٹانے کے لیے وہ مزدوروں اور کسانوں کے خفتہ جذبات جگانے میں کامیابی حاصل کرتا ہے تو یہ اس کی شاعری کی کامیابی ہے۔ جس مقصد کے لیے اس نے جانفشانی کی وہ حاصل ہو گیا۔ رزمیہ شاعری کیا ہے؟ دنیا کی بہترین نظمیں اس صنف شاعری میں نہیں ملتیں؟ شاہنامہ، مہابھارت، ہومر، انیس کے مراثی کو یاد فرمائیے، اچھائی اور برائی کی طاقتوں کی شدید باہمی جنگ، برائی کے علمبرداروں سے شدید نفرت، ان کے خلاف غصہ، ان کی شکست فاش، اچھائی کی طاقتوں کو نبرد آزمائی پر آمادگی و ترغیب، سخت کلمات لعنت و نفرین سب کچھ بلند ترین شاعری میں موجود ہے۔''(۶)

مرزا حضرت اثر نے کئی اور مضامین بھی لکھے جن میں نئے ادب پر کچھ اور اعتراض بھی اُٹھائے۔ ان مضامین کا عنوان تھا 'ترقی پسند ادب کی نفسیاتی تحلیل'۔ یہ مضامین بھی 'ادب لطیف' میں شامل کیے گئے تھے۔ ان مضامین میں اثر صاحب نے اس بات پر زور دیا تھا کہ ادب کا تعلق جمالیات سے ہے نہ کہ سماجی اصلاح یا درستی سے۔ انھوں نے کہا کہ ادب کا عقائد کی تبلیغ اور اشاعت سے کوئی

واسطہ نہیں۔ ان اعتراضات کا جواب فیض احمد فیض نے دیا جو اسی رسالے میں چھپا تھا۔ اثر صاحب کے علاوہ پروفیسر رشید احمد صدیقی اس تحریک کے سب سے بڑے معترض تھے۔ انہوں نے بھی نئے ادب کے خلاف ایک طویل مضمون لکھا جو 'آفتاب' علی گڑھ کے خاص نمبر میں شائع ہوا تھا۔ صدیقی صاحب نے بھی نئے ادب کے دو پہلو اعتراض کے زاویے سے منتخب کیے۔ ایک پہلو کا تعلق انقلابی شاعری میں نعرے بازی تھا اور دوسرے کا عریانی اور فحاشی سے تھا۔ رشید احمد صاحب لکھتے ہیں:

''انقلاب دوستی یا ترقی پسندی کے معنی یہ کب ہوئے اور کیونکر ہوئے کہ فسق و فواحش اور غارت گری ہی زندگی کا حاصل ہے۔ یہ کیسا آرٹ ہے اور کونسا ادب ہے؟ اور کس قماش کی زندگی ہے جس کا مرکزی اور بنیادی تصور فساد و فحاشی ہو۔ لکھنے کا کام میں نے بھی کیا ہے اور اس وادی کے بہت سے اونچ نیچ اور پیچ و خم سے گزرا ہوں اور اب بھی گزر سکتا ہوں۔ میرے جیسے اور مجھ سے بہتر لوگ بھی موجود ہیں۔ میں نے انشا پردازی کی پیغمبری اور پتے بازی دونوں دیکھی ہیں اور دونوں کو سمجھتا ہوں۔ فحاشی اور عریاں طرازی نہ کوئی ادب ہے نہ کوئی آرٹ اور نہ کوئی زندگی۔ سب کو علاحدہ علاحدہ اور بحیثیت مجموعی بھی صرف سلیقہ، شرافت اور سرفروشی سمجھتا ہوں، حسن بن صباحیت نہیں قرار دیتا (حسن بن صباحیت کی ترکیب پر نہ جائیے حسن بن صباح سے ڈریئے) کہ آپ نوجوانوں کو سستا اور تیز نشہ پلا کر مصنوعی جنت کی سیر کرائیں۔

میرا عقیدہ ہے کہ فحش ہی نہیں ہر بات اس طور پر کہی جا سکتی ہے کہ مذاقِ سلیم پر بار نہ ہو اور کسی کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر اور غیر شاعر، ادیب اور غیر ادیب، ایک دوسرے سے علاحدہ اور ممتاز ہو جاتے ہیں۔

محض بر بنائے مثال قاضی عبدالغفار کی مشہور تصنیف 'لیلیٰ کے خطوط' اور سعادت حسن منٹو کے فسانے لیجئے۔ میں دونوں کو ترقی پسند ادیبوں کے زمرے میں رکھتا ہوں۔ سوسائٹی میں جنسی اشتہار کی تسکین کا جو وسیلہ عورت کو دیا گیا ہے اس کو دونوں بیان کرتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار عورت کی روح کا کرب

اوراس کی بغاوت بن کر سامنے آتے ہیں۔اور جو چیز پیش کرتے ہیں اس میں
آرٹسٹ کا 'لہو ترنگ' جھلکتا ہے۔منٹو عورت کو بیان کرنے میں لذت محسوس
کرتے ہیں۔وہ عورت کی زبونی اور درماندگی سے انشاپردازی کی دکان سجاتے
ہیں۔شاعری میں فیض احمد فیض کا موازنہ بھی بے محل نہ ہوگا۔

شاعرانِ انقلاب کا بھی یہی حال ہے۔یہ انقلاب کو اس طرح پیش
کرتے ہیں جیسے آغا حشر خان کے ڈراموں یا ان کے زمانے کے تھیٹروں میں
ایکٹر غل غپاڑے کرتے نظر آتے ہیں۔''(۷)

رشید احمد صدیقی کے اس مضمون کا جواب سید احتشام حسین نے دیا تھا جو دہلی کے رسالے' آج کل' میں شائع ہوا تھا۔احتشام حسین نے اعتراف کیا کہ رشید احمد صدیقی کا مقالہ خلوص سے خالی نہیں اور ترقی پسند ادبی تحریک کے حق میں یہ سب سے پہلا اور سنجیدہ مقالہ ہے۔لیکن انہوں نے یہ بھی کہا کہ رشید احمد کے مقالے میں ترقی پسند ادب سے ایسی کئی کمزوریاں یا خرابیاں منسوب کر دی گئی ہیں جن کا تعلق ترقی پسند ادب سے بالکل نہیں ہے اور اگر اس مقالہ کی سُرخی 'ترقی پسند ادب' کی جگہ 'نیا ادب' یا' جدید ادب' وغیرہ ہوتی تو یہ عرض کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

سجاد ظہیر کہتے ہیں کہ جن حلقوں سے ترقی پسند ادب پر حملے کیے گئے ان میں دو طرح کے لوگ شامل تھے۔ایک تو وہ جن کی سوچ پرانی طرح کی تھی۔وہ پرانی رویات کے حامی تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ نئے ادیب زبان کو خراب کر رہے ہیں، انہیں یہ شکایت تھی کہ ترقی پسند ادب حسن سے عاری ہے اور وہ لوگ محض انقلاب پھیلاتے ہیں اور جنسی بے راہ روی کی ترغیب دیتے ہیں۔ایسے معترضین میں چند ایسے لوگ بھی تھے جو ایماندار اور قابل احترام تھے جیسے جگر مرادآبادی، مرزا جعفر علی خان اثر، پروفیسر رشید احمد صدیقی وغیرہ۔دوسری قسم کے وہ لوگ تھے جنہیں سجاد ظہیر' بے ادب جہلا' کہتے تھے۔ ایسے لوگ تو تحریک پر حملہ اسلام کے نام سے کرتے تھے لیکن خود بہترین اسلامی ادب و اخلاق سے بے بہرہ تھے۔ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی نئے ادب پر اعتراض کرتے تھے جن کہنا تھا کہ ادیب کا اصل مقصد ادبی یا تخلیقی فن سے جمالیاتی حِس کی تسکین ہے نہ کہ ادب کو اس کے اصلی مقصد سے گمراہ کرنا ہے۔ان کے مطابق کسی بھی نظریے یا مقصد کی پابندی تخلیق کار کی فنی قوت کو فنا کر دیتی ہے۔وہ

کہتے ہیں کہ الفاظ میں ایک نامعلوم قوت ہوتی ہے اور فنکار کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس قوت کو عمل میں لائے۔ ان کی نظر میں ایک فنکار کا تعلق محض فن سے ہی ہونا۔ وہ سماج یا عوام کے سامنے اپنے کارنامے کے لیے جواب دہ نہیں ہوتا۔ بہر حال ترقی پسند ادب کانفرنسوں اور نئے نئے ادیبوں کی تخلیقات سے مشہور ہونے لگا تھا۔ جلسے اور جلوسوں میں مزدور اور کسان بھی اپنی اپنی زبان میں نظمیں وغیرہ سنانے لگے تھے۔ اس وجہ سے عام مشاعرے بہت مقبول ہونے لگے تھے اور عوام کافی تعداد میں ان مشاعروں اور جلسوں میں شریک ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ ترقی پسند ادب عوام کی زندگی میں داخل ہو رہا تھا۔ اس طرح تہذیبی محاذ پر ادبی جدوجہد پورے شباب پر تھی اور نئی تحریک، فنون لطیفہ، تجربات، مشاہدات اور علمی حقائق اور معاشرت کے رشتوں اور ان کے عمل اور ردِ عمل سے انسانوں کے ذہن میں جو جذباتی اور نفسیاتی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، ان کے ہر پہلو کا اظہار کرنے لگی تھی۔

☆☆☆☆

کتابیات

نمبر شمار کتاب کا نام	مصنف	ناشر / پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱) روشنائی	سجاد ظہیر	پرائم ٹائم پبلیکیشن۔ لاہور	2006	194
۲) روشنائی	سجاد ظہیر	پرائم ٹائم پبلیکیشن۔ لاہور	2006	189
۳) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو۔ دہلی	2008	72
۴) روشنائی	سجاد ظہیر	پرائم ٹائم پبلیکیشن۔ لاہور	2006	220
۵) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو۔ دہلی	2008	82
۶) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو۔ دہلی	2008	82
۷) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو۔ دہلی	2008	84

☆☆☆☆

۵۔انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان اور نئی کمیونسٹ پارٹی

ترقی پسند تحریک کی جو کانفرنس 1948 میں کلکتہ میں منعقد ہوئی اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس تحریک کو دو حصوں میں منقسم کر دیا جائے۔ جو پہلے سے چلتی آرہی تھی وہ ہندوستان میں اپنا کام کرے اور ایک نئی انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان میں قائم کی جائے۔اسی طرح کمیونسٹ پارٹی نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ ایک کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان بنائی جائے جو پاکستان میں اپنے طے شدہ کام کو عمل میں لائے۔ یہ بھی طے ہوا کہ سجاد ظہیر کو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا جنرل سیکریٹری چنا جائے۔لہٰذا وہ اپنی پارٹی کی ہدایت پر مارچ 1948 میں پاکستان کے لیے روانہ ہو گئے۔ان کے ذمہ یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کی نئے سرے سے تنظیم کریں۔

پاکستان میں پارٹی کے صوبائی دفاتر لاہور، کراچی اور پشاور میں موجود تو تھے لیکن صرف پنجاب کی صوبائی پارٹی ہی بہت زوروں پر تھی۔ پارٹی کے کارکن و رہنما ہندو اور سکھ تھے۔ان میں سردار سوہن سنگھ جوش، سردار تیجا سنگھ سوتنتر، سردار کرم سنگھ مان وغیرہ کچھ ایسے رکن تھے جو غدر پارٹی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے کئی سال جیل میں گزار چکے تھے۔لیکن ملک کی تقسیم کے بعد ایسے تمام لوگ ہندوستان ہجرت کر گئے اور کمیونسٹ پارٹی کا شیرازہ بکھر گیا۔ پارٹی کی تنظیمِ نو کا کام سجاد ظہیر کے سپرد کیا گیا اور انہوں نے اس سلسلے میں لاجواب کام کیا۔صرف تین سال کے مختصر عرصے میں پارٹی کے نئے کارکنوں کو یکجا کر کے انہیں سیاسی تربیت عطا کی اور پارٹی کو پھر سے ایک منظم جماعت بنا دیا۔

سجاد ظہیر کے پاکستان پہنچنے سے پہلے ہی ان کی گرفتاری کا حکم صادر ہو چکا تھا۔اس لیے

انہیں پاکستان میں روپوش رہنا پڑا۔ اس روپوشی کی وجہ سے وہ نہ تو کسی سے کھلے عام مل سکتے تھے اور نہ ہی کسی سے رابطہ قائم کر سکتے تھے۔ ایسے حالات میں پارٹی کی ازِ سرِ نو تنظیم کرنا نہایت دشوار عمل تھا۔ لیکن سجاد ظہیر کی شخصیت میں کچھ ایسی کشش تھی کہ پارٹی کا ہر ورکر ان سے ذاتی طور پر اپنا پن محسوس کرتا تھا۔ ہر شخص جوان سے جڑتا ان پر اور ان کے طریقہ کار پر پختہ دلی سے بھروسا کرتا تھا۔

حمید اختر سجاد ظہیر کے خاص دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ اگر چہ وہ عمر میں سجاد ظہیر سے بہت چھوٹے تھے مگر وہ ان سے ایک مخلص دوست کی طرح محبت کرتے تھے۔ وہ بمبئی میں بھی سجاد ظہیر کے ساتھ پارٹی میں کام کر چکے تھے اس لیے پاکستان میں بھی وہ اس معاملے میں سجاد ظہیر کے معتمد تھے۔ ان کے مضامین کی اشاعت سے جو اجرت حاصل ہوتی تھی وہ بھی حمید اختر ہی سجاد ظہیر تک پہنچاتے تھے۔ پاکستان میں سجاد ظہیر کی سرگرمیوں کا ابتدائی دور بڑی کشمکش اور دشواریوں کا دور تھا۔ ایک تو معاشرتی تنگدستی تھی اور اوپر سے پاکستانی حکومت چونکہ اشتراکیت کے سخت خلاف تھی اس لیے ان کی جان کے در پے تھی۔

ملک کی تقسیم کے وقت پنجاب میں قتل و غارت کا ایک سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ دہلی تو نہایت خطرناک فرقہ وارانہ فساد کی لپیٹ میں تھی ہی لیکن پنجاب بھی جل رہا تھا۔ حمید اختر ان دنوں لدھیانہ کے پاس اپنے آبائی گاؤں گئے ہوئے تھے۔ لوگ مارے جا رہے تھے اور گاڑیاں کی گاڑیاں سرحد کے دونوں طرف بڑی بے رحمی سے کاٹی جا رہی تھیں۔ کسی خاص معجزے کے تحت وہ بچ کر نکودر کیمپ پہنچے جہاں تقریباً تین مہینے رہنے کے بعد وہ نومبر 1947 کے آخر میں زندہ بچ کر لاہور پہنچ گئے۔ لازمی ہے کہ ایسے سنگین حالات سے گزرنے کے بعد کسی کی بھی ذہنی اور جسمانی قوت توازن میں نہیں رہ سکے گی۔ حمید اختر کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ بہر حال کافی عرصہ اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد وہ اپنی بہن کے گھر منٹگمری (موجودہ ساہیوال) پہنچے جہاں ایک دن ایک شخص ان کے نام سجاد ظہیر کا پیغام لے کر آیا کہ وہ فوراً انہیں لاہور آکر ملیں۔ حمید اختر لاہور پہنچے اور انارکلی کے عقب میں ایک معمولی سے مکان پر دستک دی۔ جواب میں خود سجاد ظہیر برآمد ہوئے۔ اس وقت ان کا حلیہ پہلے سے بالکل مختلف تھا۔ وہ صرف دھوتی اور بنیان میں ملبوس تھے اور بڑی بڑی رعب دار مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ حلیہ انہوں نے اس لیے اختیار کیا تھا کیونکہ پاکستان کی سی۔ آئی۔ ڈی ان کی تلاش میں سرگرداں

تھی۔ انھوں نے حمید اختر سے کہا کہ میں پنجاب میں کسی کو جانتا نہیں ہوں۔ پارٹی کی تنظیم کے لیے زیرِ زمین رہ کر کام کرنا ہے اور اس لیے تمھیں میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ سن 1948 سے 1951 تک ان کا اور حمید اختر کا ساتھ رہا۔ 1948 کا پورا سال تو وہ ذاتی طور پر براہِ راست ان سے ملتے تھے۔ بعد میں یہ رابطہ بالواسطہ بن گیا۔ لیکن وہ بڑی باقاعدگی سے سجاد ظہیر سے ملتے رہے اور پارٹی کا کام کرتے رہے۔ اس سلسلے میں حمید اختر خود لکھتے ہیں:

''وہ انارکلی سے اُٹھ کر ڈیوس روڈ پر ایک دوست کے یہاں قیام پذیر تھے۔ تین چار مہینے بعد وہ وہاں سے جیل روڈ چلے گئے۔ میں اپنی سائیکل پر خفیہ پولس سے بچتا بچاتا ہر دوسرے تیسرے روز ان کے ہاں جاتا۔ اس زمانے میں پارٹی کے ہفتہ وار اخبار 'نیا زمانہ' کا کام بھی میرے ذمہ تھا اور اس کے لیے وہ مضامین لکھنے کے علاوہ فرضی ناموں سے سیاسی مضامین بھی لکھتے جو 'امروز' میں شائع ہوجاتے اور اس طرح مہینے میں تیس چالیس روپے جو معاوضہ کے طور پر ملتے انھیں پہنچا دیتا۔ یہ پیسے وہ اپنے روزمرہ کے اخراجات کے لیے علیحدہ رکھتے، پارٹی فنڈ سے انھوں نے کبھی اپنی ذات پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔''(۱)

سجاد ظہیر کی مالی حالت کا علم ایک اور ذریعہ سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ دسمبر 1959 میں پارٹی نے اپنا ایک ہفتہ وار اخبار 'عوامی دور' جاری کیا تھا جسے شروع ہوتے ہی مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لوگوں کو غلط فہمی تھی کہ چونکہ پارٹی کا اخبار تھا تو اس کا خرچ پارٹی ہی اُٹھاتی ہوگی اور ادارتی عملے کو اچھی تنخواہیں ملتی ہونگی مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ سجاد ظہیر خود اپنے احباب اور واقف کاروں سے جگہ جگہ اخبار کی اشاعت کے لیے رقم اکٹھی کرتے تھے۔ دفتر میں کوئی بھی سہولت نہیں تھی اور سجاد ظہیر ایک ہی کمرے میں زندگی بسر کرتے تھے۔ مالی مشکلات کی وجہ سے ادارتی عملہ بھی صرف چند اشخاص پر ہی مشتمل تھا۔ ان میں ایک عارف نقوی بھی تھے جنھوں نے اپنے ایک مقالے میں جس کا نام 'نقوش' ہے۔ لکھا ہے:

''یہ وہ انسان تھا جو اپنے بیوی بچّوں سے دور پاکستان میں برسوں آہنی سلاخوں کے پیچھے موت اور زندگی کی کشمکش جھیل چکا تھا اور اب دلّی میں آصف علی روڈ پر

کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں تیسری منزل پر ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا اور کامن کینٹن میں کرایہ کے ایک باورچی بلے کے ہاتھوں کھانا کھاتا تھا جس میں مرچیں زیادہ اور بوٹیاں کم ہوتی تھیں اور کبھی کبھی تو صرف سانبھر اور ڈوسا ہی ہوتا تھا۔ ان دنوں 'عوامی دور' کے فنڈ سے بنے بھائی کو تین سو روپے ملتے تھے۔ مجھے ڈیڑھ سو۔ تین سو ہمارے ایک بزرگ ساتھی اصرار الحق مجاز کو، تین سو رضا صاحب کو کتابت کے لیے۔" (۲)

حمید اختر بھی سجاد ظہیر کی مالی حالت کا ذکر اسی انداز میں کرتے ہیں۔ حمید اختر بمبئی میں ایک کمپنی میں ملازمت کرتے تھے جس کے لیے کمپنی نے انہیں رہنے کے لیے ایک کمرہ دے رکھا تھا۔ کسی وجہ سے کمپنی کے مالک سے ان کی تکرار ہوگئی جس کے نتیجہ کے طور پر انہیں نوکری چھوڑنی پڑی اور رہنے کا کمرہ بھی چھوٹ گیا۔ اس بے سروسامانی کی حالت میں سجاد ظہیر زبردستی انہیں اپنے گھر لے آئے جہاں وہ تقریباً ایک سال مقیم رہے۔ اسی دوران حمید اختر کو سجاد ظہیر کے ساتھ رہنے اور ان کے ساتھ پارٹی میں کام کرنے کا موقع بھی ملا۔ وہ کہتے ہیں کہ سجاد ظہیر میں کسی قسم کی ذاتی کمزوری بالکل نہیں تھی۔ وہ چیز جسے کرشن چندر انسان کی فطری کمینگی تصور کرتا ہے سجاد ظہیر میں اس کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"بہت سے لوگوں کے بارے میں میرا ذاتی تجربہ ہے کہ وہ نیکی، شرافت اور بے غرضی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں مگر موقع ملتے ہی انسانی کمزوریوں کا شکار ہو جاتے ہیں مگر سجاد ظہیر کمیونسٹ پارٹی سے ملنے والے پچاس ساٹھ روپے کے جیب خرچ اور دو چار مضامین کا معاوضہ جو ساٹھ ستر روپے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا اس میں ہی گزارہ کرتے تھے اور اسی پر قانع تھے۔ ان کے ہاں سال بھر میں مَیں نے چاول، دال اور چپاتی ہی کھائی۔ گوشت کبھی کبھار ہی پکتا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس مدت میں مَیں نے رضیہ آپا کے مُنہ سے بھی کوئی حرفِ شکایت نہیں سنا۔ میں دو ماہ تک بیکار رہا مگر وہ اسی بجٹ میں مجھے کھلاتے رہے۔ دو ماہ بعد مجھے بہت سے پیسے ملنے لگے اور اس وقت بھی انہوں نے مجھ

سے پیسے لینے سے انکار کیا۔ میں کبھی کبھار پھل مٹھائی یا کھانے کی کوئی چیز لے جاتا تو وہ بڑی معذرت خواہانہ لہجے میں مسکراتے ہوئے کہتے" حمید اختر تم ہماری عادتیں بگاڑ رہے ہو۔"(۳)

سبط حسن بھی سجاد ظہیر کی تہی مائیگی کا ذکر کچھ اسی طرح ہی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب برطانوی حکومت نے 1942 میں تمام کمیونسٹ قیدیوں کو رہا کر دیا تو سجاد ظہیر بھی رہا ہوئے اور بمبئی چلے گئے۔ وہاں کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ روزہ اخبار 'قومی جنگ' کی ادارت اور اشاعت کا کام ان کی سپردگی میں دیا گیا۔ اس وقت سبط حسن نیشنل ہیرالڈ میں ملازمت کرتے تھے۔ انہیں بمبئی سے سجاد ظہیر کا ایک خط موصول ہوا جس میں یہ ہدایت تھی کہ وہ اپنی ملازمت چھوڑ کر ان کے ساتھ کام کرنے بمبئی آ جائیں۔ سبط حسن لکھتے ہیں کہ:

"ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ مجھے تمہاری تن آسانیوں کا علم ہے لہٰذا اطلاعاً تحریر ہے کہ تمہیں 30 روپے ماہوار بحیثیت ایک کل وقتی کارکن کے ملیں گے۔ اس میں سے 17 روپے کھانے کے کٹ جائیں گے۔ کھانا پارٹی ہیڈ کوارٹر میں سب کے ساتھ چٹائی پر بیٹھ کر کھانا ہوگا۔ جھوٹے برتن خود دھونے ہوں گے۔ کھانے کا مینو یہ ہوگا۔ دال گجراتی وضع کی جس پر کھوپرے کی ہوائی تیرتی ہوگی۔ باجرے کی روٹیاں اور ایک گلاس پانی۔ ہفتے میں ایک وقت شام کو گجراتی وضع کی کڑی (گوشت سالن) صبح کے وقت اور پھر تین بجے ایک گلاس چائے اور ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا۔ رہنے کے لیے پارٹی کا اقامت خانہ جس میں سونے کے لیے چٹائی، پانچ روپے مہینہ پارٹی کی اجرت سے کرایہ کٹ جائے گا۔ گویا تمھیں کٹ کٹا کر کل آٹھ روپے بچیں گے۔ اس میں کپڑا دھلواؤ یا خود دھوؤ، سگریٹ پیو یا نہ پیو، ٹرام یا بس میں چلو یا پیدل، تمھاری مرضی ہے۔ امید ہے کہ تم ان خوشگوار شرطوں کو قبول کرو گے اور آنے کی تاریخ سے مجھے اطلاع دو گے۔"(۴)

اپنی ذاتی تنگدستی اور 'عوامی دور' کی بے حالی کے بارے میں سجاد ظہیر خود ایک خط میں لکھتے ہیں جو انہوں نے عارف نقوی کو لکھا اور جو 'مکتوب' جنوری 1962 میں شائع ہوا۔ لکھا ہے کہ جب وہ

ماسکو سے ہندوستان پہنچے تو دیکھا کہ 'عوامی دور' میں بہت گڑ بڑ تھی۔ غلام علی اپنی علالت کی وجہ سے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ سجاد ظہیر کے پاس کوئی دو ہزار روپے تھے جو ان کی ذاتی پونجی تھی۔ یہ رقم انہوں نے رضیہ سے پوچھے بغیر 'عوامی دور' میں ڈال دی۔ اس کے بعد دوستوں سے مدد مانگنے بمبئی گئے۔ وہاں انہیں ڈھائی ہزار نقد ملے اور چار ہزار کا وعدہ ہوا جس سے کچھ عرصے کے لیے کام چل گیا۔ ایسے ہی ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

> '' 'عوامی دور' کی مالی حالت اب بھی سقیم ہے۔ کوشش جاری ہے کہ فنڈ جمع ہو تا کہ اُسے بہتر بنایا جا سکے۔ 28 اور 29 اکتوبر کو احمد آباد میں ایک مشاعرہ اور شب افسانہ ہے۔ امید ہے کہ وہاں سے پانچ ہزار مل جائیں گے۔''(۵)

پہلے ہی کہا گیا ہے کہ تقسیم وطن سے پہلے ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ پارٹی کی سب سے فعال صوبائی برانچ پنجاب ہی تھی لیکن بٹوارے کے بعد حالات بالکل بدل گئے اور پارٹی پنپ نہ سکی بلکہ اس کا شیرازہ ہی بکھر گیا۔ مسلم لیگ کے اثرات اور جاگیردارانہ تسلط کی وجہ سے تنظیم مضبوط نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس صوبہ سرحد اور کراچی میں تحریک زور پکڑنے لگی تھی۔ صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خان بہت مشہور تھے اور فارغ بخاری سے مل کر جو تحریک کے جنرل سیکریٹری تھے خاطر خواہ کام کر رہے تھے۔ سجاد ظہیر کئی مہینے روپوشی کے دور میں فارغ بخاری کے گھر میں چھپ کر رہتے رہے۔ فارغ بخاری ان دنوں ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کے جنرل سیکریٹری تھے اور ایک ادبی رسالے کے مالک بھی تھے جس کا نام 'سنگِ میل' تھا۔ انہوں نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں سجاد ظہیر کی روپوشی کا ذکر ہے اور پاکستان میں ابتدائی دور کا ترقی پسند تحریک کے متعلق تذکرہ بھی ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''صوبہ سرحد میں تمام چھوٹے بڑے ادیب شاعر پیشاور سے کوہاٹ، ڈیرہ اسمٰعیل خان، ضلع ہزارہ اور ضلع مردان تک ترقی پسند تحریک میں شامل ہو گئے۔ ہر جگہ ہفت روزہ تنقیدی اجلاس نہایت باقاعدگی سے ہونے لگے۔''(۶)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ان کی بچیاں چھوٹی تھیں اور رضیہ کو سجاد ظہیر کی سخت ضرورت تھی تو انہوں نے پاکستان جانا کیوں قبول کیا۔ پاکستان میں پہلے سے ہی حمید اختر، سبط حسن،

عبداللہ ملک جیسے پارٹی کے رکن موجود تھے تو پارٹی نے ان سے ہی کسی کو جنرل سیکریٹری کیوں نہیں مقرر کیا۔ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جو تنظیمی صلاحیتیں سجاد ظہیر میں تھیں وہ پارٹی کے کسی دوسرے ورکر میں نہیں تھیں۔تاہم اس وقت پاکستان عمل میں آچکا تھا اور اس ملک کا ایک علیحدہ وجود تھا۔پھر بھی ہندوستان سے سجاد ظہیر کو اس دوسرے ملک میں بھیجا گیا جبکہ ان کے بیوی بچے ہندستان میں مقیم تھے۔ یہ دلیل زیادہ تسلّی بخش معلوم نہیں ہوتی کہ وہ زیادہ قابل تھے۔پھر بھی حمید اختر کا کہنا ہے کہ پاکستان میں ان کی گرفتاری کے وقت تک کا زمانہ کمیونسٹ پارٹی اور اس کے زیرِ اثر کام کرنے والی تمام تنظیموں کا انتہائی فعال زمانہ تھا اور یہ سجاد ظہیر کی صلاحیتوں کا ہی اعجاز تھا کہ تمام تر ریاستی جبر اور مشکلات کے باوجود پاکستان کے محنت کش خیبر سے کراچی تک کمیونسٹ پارٹی کے پرچم تلے جمع ہو گئے تھے۔وہ کہتے ہیں یہ سب کچھ سجاد ظہیر کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے ہی عمل میں آیا۔لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بذاتِ خود وہ پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے پاکستان نہیں جانا چاہتے تھے۔اس موضوع پر راقم الحروف کی گفتگو سجاد ظہیر کی بیٹی نادرہ ببر سے انہی دنوں ہوئی ہے۔وہ کہتی ہیں کہ پارٹی نے پہلے زین العابدین احمد یعنی زیڈ۔اے۔احمد کا نام تجویز کیا تھا۔وجہ یہ تھی یہ حضرت خود پنجابی تھے اس لیے ان کے لیے وہاں کے لوگوں میں شامل ہونا قدرے آسان تھا۔دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ وہ وہاں کے سیاست دانوں اور حکمرانوں سے بخوبی واقف تھے جس کی وجہ سے وہ اپنا کام بڑی آسانی سے سرانجام دے سکتے تھے۔لیکن ان دنوں کمیونسٹ پارٹی کی طرف پاکستانی حکومت کا رویہ سخت گیر تھا اور کارندوں کو ہر وقت گرفتاری کا خطرہ درپیش رہتا تھا۔نادرہ کہتی ہیں کہ زیڈ۔اے۔احمد ان وجوہات کی بناء پر خوفزدہ ہو گئے اور پارٹی کا جنرل سیکریٹری بننے سے کترا گئے۔جب کوئی اور یہ ذمہ داری سنبھالنے پر راضی نہیں ہوا تو پارٹی نے یہ ذمہ داری سجاد ظہیر کو سونپ دی اور سجاد ظہیر پارٹی کے تئیں وفاداری کی بنا پر انکار نہ کر سکے۔یہی وجہ تھی کہ پاکستان میں طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کرنے کے باوجود بھی انہوں نے کبھی کوئی شکوہ یا شکایت نہیں کی۔

جناب سبط حسن بھی ایک غیر شعوری اشارہ اسی طرف کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ملک کی تقسیم کے بعد جب ہندو اور سکھ کمیونسٹ ہندوستان چلے گئے تو پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔اس خلا کو پُر کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔اس کام کے لیے کسی نہایت تجربہ کار اور مستحق

انقلابی رہنما کی ضرورت تھی جو کم از کم مغربی پاکستان کے معاشی اور سماجی حالات سے واقف ہو اور جس کی جڑیں وہاں کی زمین میں پیوست ہوں۔لیکن یہ تمام اوصاف بنے بھائی کی شخصیت میں موجود نہیں تھے۔سجاد ظہیر کی تربیت کسی دوسرے ماحول میں ہوئی تھی۔انہوں نے نہ تو کبھی جسمانی محنت کی تھی اور نہ ہی وہ انقلابیوں اور عوام میں گھل مل کر رہنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ظاہر کے سجاد ظہیر جیسا انسان پاکستان کے کشیدہ حالات میں کام کرنے کے لائق نہیں تھا۔ پھر بھی انہیں پاکستان کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سیکریٹری بنا کر پاکستان بھیجا گیا۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نادرہ ببر کا بیان صحیح ہے کہ زیڈ۔اے۔احمد کے انکار کی وجہ سے ہی سجاد ظہیر نے یہ پوزیشن قبول کی تھی۔

اس موضوع پر کہ صرف بنے بھائی کو ہی پاکستان کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سیکریٹری بنا کر پاکستان جانے کے لیے کیوں چنا گیا، سید مظہر جمیل کی دلیل ذیل میں درج کی جاتی ہے:

> ''خیال ہے سجاد ظہیر کے حق میں قرعہِ فال اس لیے بھی پڑا ہوگا کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو قیام پاکستان کے حق میں ہموار کرنے میں سجاد ظہیر نے اہم کردار ادا کیا تھا اور اس سے قبل وہ کانگریس کے پلیٹ فارم سے بھی مسلم ماس میڈیا کنٹیک کی مہم چلا چکے تھے اور کمیونسٹ پارٹی ہندوستان کی عملی تقسیم کو ٹالنے کی ہر ممکن کوشش کر چکی تھی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان متحدہ ہندوستان میں رہ کر آزادی حاصل کرنے کے سب خواب پاش پاش ہو چکنے کے بعد اب مجبوراً کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو بھی مسلم لیگ کی ہمنوائی کرنی پڑ گئی تھی اور پاکستان کے حق میں ریزولیوشن پاس کرنا پڑا تھا۔کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ میں یہ ایک اہم فیصلہ تھا جس کی بیشتر ذمہ داری سجاد ظہیر پر جاتی تھی۔مزید برآں یہ بھی کہ سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکریٹری اور ترقی پسند ادیب اور شاعر کی حیثیت سے پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان میں خوب اچھی طرح جانے پہنچانے تھے۔''(۷)

سبط حسن لکھتے ہیں کہ اس میں کلام نہیں کہ تنظیمی ناتجربہ کاریوں اور روپوشی کی صعوبتوں کے باوجود بھی بنے بھائی نے جنرل سیکریٹری کے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

”سکھ اور ہندو کامریڈ ہندوستان جا چکے تھے۔ اس کی وجہ سے نظم و ضبط کے سب تانے بانے ٹوٹ گئے تھے۔ بنّے بھائی نے یہاں کے بچے کھچے ساتھیوں کی مدد سے یہ تار پھر سے جوڑے، نئے کارکنوں کی تربیت کی اور تین سال کے مختصر عرصے میں کمیونسٹ پارٹی کو ایک فعال اور با اثر جماعت بنا دیا۔ اب پارٹی کے دفتر لاہور، گجرنوالہ، لائل پور، راولپنڈی، پشاور، کراچی، سکھر، حیدرآباد، ملتان اور رحیم یار خان میں باقاعدگی سے کام کر رہے تھے۔ پارٹی کارکن مزدوروں کی یونینوں، کسان کمیٹیوں، طالب علموں اور ادیبوں کی تنظیموں میں بڑھ چڑھ کر کام کر رہے تھے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ پوری پارٹی میں فکر و عمل کی وحدت پائی جاتی تھی۔ نہ گروہ بندیاں رہیں تھیں نہ رقابتیں۔

پارٹی ممبروں کو پارٹی کی قیادت پر پورا بھروسا تھا اور پارٹی کے رہنما اپنے رفیقوں کو اپنا ساتھی سمجھتے تھے، خیمہ برادر یا رعایا نہیں سمجھتے تھے۔ سب سے حیرت انگیز حقیقت جس کا علم ہمیں گرفتاری کے بعد ہوا یہ تھی کہ اس پارٹی میں خفیہ پولس کا ایک گماشتہ بھی گھس نا سکا۔ چنانچہ پولس کو ہماری انہیں سرگرمیوں کی خبر تھی جو اخباروں میں چھپتی رہتی تھیں۔ پارٹی کی اندرونی تنظیم سے پولس والے بالکل بے خبر تھے۔ کسی ناتجربہ کار اور نوزائیدہ پارٹی کا یہی کارنامہ کیا کم تھا۔ ہماری کج رویوں کے باوجود کمیونسٹ پارٹی کی مقبولیت ملک میں بڑھتی جا رہی تھی۔ مزدوروں کی نمائندہ تنظیم پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے بیشتر سرگرم کارکن کمیونسٹ تھے اور اپنی پُرخلوص محنت اور خدمت کی بدولت مزدوروں میں ان کا بڑا اثر تھا۔ اسی طرح جگہ جگہ کسان کمیٹیاں بنی ہوئی تھیں۔ سندھ میں حیدر بخش جتوئی مرحوم کی ہاری کمیٹی مصروفِ عمل تھی۔ سرحد میں کسان جرگہ کی رہنمائی میں ہشت نگر کے کسانوں کی تحریک جاری تھی۔ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے طالب علم رہنما اپنے جمہوری حقوق کے لیے پیش پیش تھے۔ قریب قریب ہر بڑے شہر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخیں قائم تھیں اور

ان کے جلسے بڑی باقاعدگی سے ہوتے تھے۔"(۸)

اس سلسلے میں عبدالرؤف ملک کا ذکر بھی بہت ضروری ہے۔ یہ حضرت عبداللہ ملک کے چھوٹے بھائی ہیں اور 1936 سے ہی کمیونسٹ موومنٹ سے وابستہ ہوگئے تھے۔ عبداللہ ملک کا ذکر سجاد ظہیر نے کئی جگہ کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں لاہور میں صوفی تبسم جو ایک زمانے میں تحریک کے روح رواں تھے انہوں نے اب سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے کنارہ کشی کرلی تھی۔ اس لیے وہاں پر ایک محنتی انسان کی ضرورت تھی جو کم سے کم انجمن کے جلسے تو باقاعدہ کرسکے۔ ان سب باتوں کے مدِنظر عبداللہ ملک کو لاہور انجمن کا آرگنائزر مقرر کیا گیا تھا۔ اس طرح عبداللہ ملک کا سجاد ظہیر سے تعلق بھی برقرار تھا اور وہ تحریک کے کاموں میں گہری دلچسپی بھی لیتے تھے۔

سجاد ظہیر جب بھی پاکستان جاتے تو پنجاب کی صوبائی پارٹی کی جنرل باڈی میٹنگ میں ضرور شامل ہوتے اور تحریک کے مختلف پہلوؤں پر تبادلہ خیال کرتے۔ وہ 'قومی جنگ' جس کا نام تب 'نیا زمانہ' ہوگیا تھا اس کے ایڈیٹر بھی تھے۔ اس لحاظ سے وہاں کے ادیبوں اور دانشوروں سے ان کی اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکریٹری کے ناطے سے بھی ان کا ملنا ادبا، دانشوروں اور شعرا وغیرہ سے اکثر ہوتا تھا۔ اسی سلسلے میں 1943 سے 1947 تک سجاد ظہیر تین بار لاہور گئے جہاں ان کی ملاقات عبدالرؤف ملک سے ہوتی رہتی تھی۔ اپنی روپوشی کے زمانے میں بھی انہوں نے منٹگمری سے حمید اختر کو لاہور لانے کی ذمہ داری رؤف ملک کو ہی سونپی تھی۔ لہٰذا تقریباً پچاس سال تک رؤف ملک کی سجاد ظہیر سے رفاقت قائم رہی۔ رؤف ملک کے بڑے بھائی عبداللہ ملک ایک عرصے سے آزادی کی تحریکوں سے وابسطہ تھے۔ رؤف اپنے بھائی سے تقریباً چھ سال عمر میں چھوٹے تھے اور یہ دونوں بھائی کانگریس کے توسط سے ہی کمیونسٹ پارٹی میں داخل ہوئے تھے۔ اس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی پر بلا کی پابندیاں عائد تھیں جس کی وجہ سے پارٹی کے زیادہ تر کارکنوں کو روپوشی میں ہی رہنا پڑتا تھا۔ چونکہ عبداللہ ملک کا کئی سینئر کمیونسٹوں سے رابطہ تھا اس لیے ان تک پیغامات پہنچانے کے لیے رؤف ملک کی مدد لی جاتی تھی۔ رؤف نے ان لوگوں کے لیے رہنے کا ٹھکانہ ڈھونڈنے اور ان کے آرام و آسائش کی ذمہ داریاں اپنے سپرد کی ہوئی تھی۔

رؤف ملک نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے 'سجاد ظہیر۔ مارکسی دانشور اور کمیونسٹ

راہنما'۔ اس میں وہ قیام پاکستان کے بعد سجاد ظہیر کے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے جنرل سیکریٹری بن کر وہاں جانے کے بارے میں ذکر کرتے ہیں۔ اس میں پاکستان پہنچنے کا تذکرہ خود سجاد ظہیر نے کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

''کلکتہ کانفرنس میں فیصلہ ہوا کہ ہم پاکستان جائیں اور پارٹی کی تنظیم کریں۔ چنانچہ اپریل 1948 کو ہم بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہنچے۔ احتیاطاً ٹکٹ 'مبین احمد' کے فرضی نام سے لیا تھا۔ کراچی ایئر پورٹ پر عمر اینڈ سنز کے عمر جو علی گڑھ کے رہنے والے تھے ہمیں دیکھتے ہی گھبرا کر ہماری طرف بڑھے اور پریشانی سے کہا'' آپ کے خلاف تو یہاں وارنٹ ہے اور آپ بے فکری سے یہاں کھڑے ہیں۔'' پھر انہوں نے غیر معمولی پھرتی کے ساتھ ایک ٹیکسی ڈھونڈی اور جہاں ہمارا قیام کا انتظام کیا تھا ہم وہاں پہنچ گئے۔''(۹)

ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل پاکستان کانفرنس کا ذکر عبدلرؤف ملک نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ وہ کانفرنس 11 نومبر سے 13 نومبر تک جناح باغ کے اوپن ایئر تھیٹر میں ہوئی تھی۔ کانفرنس میں پنجاب، بنگال، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کے تقریباً ڈیڑھ سو نمائندے شریک ہوئے تھے۔ پنڈال میں بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ سٹالن اور گورکی کی بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں۔ اس کانفرنس کی روداد 'شاہراہ' دہلی میں شائع ہوئی تھی جس کو عبدالرؤف ملک نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ باوجود اس کے کہ اتنے سارے نمائندے اس کانفرنس میں شامل تھے پھر بھی اس کانفرنس کا ماحول خوشگوار نہیں تھا۔ کانفرنس کی روداد جو مندرجہ بالا ادبی رسالہ 'شاہراہ' میں چھپی تھی اس کے مطابق:

''ابھی کانفرنس کے انعقاد کا اعلان ہی ہوا تھا کہ مخالف حلقوں میں ہلچل مچ گئی۔ سابقہ ترقی پسندوں کا ایک گروہ جو اپنی موقع پسندی سے مجبور ہو کر اور ادب کی انقلابی تحریک سے گھبرا کر اب مخالف کیمپ میں چلا گیا ہے اپنا تاریخی رول ادا کرنے لگا۔ چند روزنامہ اور ہفتہ وار اخبارات ترقی پسندوں کو بے دین، غیر ممالک کا ایجنٹ اور پاکستان مخالف کے جھوٹے الزام دے کر عوام کو بھڑکانے لگے۔ یہاں تک کہ ترقی پسندوں کو قتل تک کر دینے کے لیے رائے عامہ کو اُکسایا

جانے لگا۔ لیکن کانفرنس کامیاب ہو کے رہی۔

اس کانفرنس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس ادبی اجتماع میں پہلی بار ملک کے کسانوں اور مزدوروں کے نمائندوں کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔ وہ اپنے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات میں اپنی ابھرتی ہوئی زندگی کے جذبات اور انقلابی رجحانات کی عکاسی دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر خلوص کے نعرے تھے اور دل میں جذبہ مسرت اور ان کے علاوہ مزدوروں اور کسان شاعروں نے بھی اپنے فن پاروں سے کانفرنس میں ایک آتشیں روح پھونک دی۔

کانفرنس میں امریکہ، برطانیہ اور ہندوستان کے ترقی پسند مصنفوں اور دانشوروں کے پیغام پڑھ کر سنائے گئے جن میں امن اور جمہوریت کے لیے ترقی پسند ادیبوں کی ان تھک جدوجہد کو سراہا گیا تھا اور عوامی طاقتوں کی قطعی اور آخری لڑائی کی کامیابی پر اظہار یقین تھا۔ جب کانفرنس میں پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری سید سجاد ظہیر کا پیغام سنایا گیا جن کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ ہے تو بڑی گرمجوشی کا اظہار ہوا اور پنڈال دیر تک تالیوں کی آواز سے گونجتا رہا۔ کانفرنس میں ترقی پسند مصنفین کا ایک اعلان نامہ منظور ہوا۔ پاکستان میں کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا اور پنجاب کے مشہور ادیب اور شاعر احمد ندیم قاسمی جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔" (۱۰)

ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل پاکستان کانفرنس ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ پاکستان میں بائیں بازو کے ادیبوں اور دانشوروں کی گرفتاری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ احمد ندیم قاسمی جو اسی کانفرنس میں انجمن کے جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے تھے سب سے پہلے انہیں گرفتار کیا گیا۔ عبداللہ ملک انجمن کے آرگنائزر سیکریٹری چنے گئے تھے۔ وہ قاسمی کے بعد گرفتار ہوئے۔ راولپنڈی سے حسن طاہر، عارف جلالی دکنی اور کئی دوسرے شاعر و ادیب مختلف تعزیزاتی مقدمات میں دھر لیے گئے۔ کراچی سے ابراہیم جلیس سیفٹی ایکٹ میں پکڑے گئے۔ یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں تھا کہ سجاد ظہیر کو ان حالات میں بائیں بازوں سے متعلقہ تنظیموں کی شیرازہ بندی کرنے میں کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ جب یہ سب کچھ

ہو رہا تھا تو سجاد ظہیر روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ آج ہم سوچتے ہیں تو محسوس ہوتا کہ اس وقت روپوشی کی زندگی گزارنا کتنی کٹھنائی کا کام ہوتا ہوگا۔

فارغ بخاری جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے انہوں نے سجاد ظہیر سے ملاقات کے سلسلے میں ایک مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون کی کچھ تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

''سجاد ظہیر جب انڈر گراؤنڈ تھے تو ایک دن میرے پاس پشاور آپہنچے۔ عجیب ہیئت کذائی تھی۔ داڑھی چھوڑ رکھی تھی، سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا۔ قصہ خوانی میں میری کتابوں کی دکان پر آئے۔ ان کے ساتھ ہمارا دوست محمد حسین عطا بھی تھا۔ یہ دونوں راولپنڈی سازش کیس میں ملوث تھے اور دونوں کے پیچھے پورے ملک کی پولس سرگرداں تھی۔ وہ مجھے بڑے تپاک سے گلے ملے لیکن میں انہیں پہنچان نہ سکا۔ پھر خود ہی تعارف کرایا اور بتایا کہ وہ چند دن میرے پاس مہمان ٹھہرنے آئے ہیں۔ خیر میں انہیں گھر تو لے آیا لیکن بہت پریشان تھا کہ کیا کروں کیونکہ ان دنوں آئے دن میرے گھر پر چھاپے پڑ رہے تھے اور خانہ تلاشی ہو رہی تھی اور یہ سب کچھ انہیں حضرت کے سلسلے میں تھا۔ لیکن میں انہیں اس موقع پر بتانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ میں ڈر گیا ہوں۔ مجھے پریشانی تھی اگر وہ کہیں میرے گھر سے گرفتار ہوگئے تو میں اپنے ساتھیوں کو کیا مُنہ دکھاؤں گا۔ بہرحال وہ تقریباً ایک مہینہ میرے گھر پر رہے لیکن وہ کچھ ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کرتے تھے کہ مجھے ڈر لگتا تھا کہ انہیں کوئی پہنچان نہ لے۔ وہ پہلے ہی دن ہمارے حجرے میں آکر بیٹھ گئے۔ یہ اتنا اچانک ہوا کہ میں بوکھلا گیا۔ ان کی ہیئت کذائی بھی کچھ اتنی غیر معمولی تھی کہ تمام دوست انہیں بڑے غور اور تعجب سے دیکھنے لگے۔ شک و شبے کی فضا اس لیے بھی پیدا ہوئی کہ وہ دیکھنے میں بالکل غیر ملکی ہی لگتے تھے۔ میں اس حیثیت سے ان کا تعارف ہی کرانے لگا تھا کہ وہ اردو میں باتیں کرنے لگے اور انڈیا سے آئے ہوئے ادیبوں سے اپنا تعارف کرایا۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال میرے لیے بڑی

پریشان کن تھی لیکن میں انہیں جانے کے لیے کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔
بہرحال یہ دن خاصے کڑے گزرے اور جب وہ بعد از خرابی بسیار چلے گئے تو
کہیں جان میں جان آئی۔"(۱۱)

اپنی روپوشی کے دنوں میں سجاد ظہیر جن لوگوں کی معرفت اپنے تنظیمی اداروں سے رابطہ قائم رکھتے تھے ان میں حسن عابدی بھی تھے جو اب حیات نہیں ہیں۔ وہ حضرت ایک طرح سے سجاد ظہیر کے کوریئر تھے۔ حسن عابدی نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا نام ہے 'جنوں میں جتنی بھی گزری'۔ اس میں انہوں نے سجاد ظہیر کے ساتھ ایک سفر کا بھی بڑی دلچسپی سے ذکر کیا ہے۔ اس میں سجاد ظہیر کی ذاتی ہئیت اور شخصیت کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ اپریل ۱۹۵۰ کی بات ہے، میں کراچی میں ٹرین پر سوار ہوا اور تیسرے درجے کی کھڑکھڑاتی سیٹ پر رات بھر جاگتا اور دن بھر ریگ زار سندھ کی مٹی پھانکتا ۲۵ گھنٹے بعد لاہور پہنچا تھا۔ یہاں مجھے مرحوم حمید ہاشمی کے یہاں قیام کرنا تھا جو مجھے لینے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے۔ اب یاد نہیں انہوں نے مجھے کیسے پہنچانا، وہ میکلوڈ روڈ پر اپنے والدین کے ساتھ رہتے تھے۔ چنانچہ چند گلیوں کے فاصلے پر ۱۱۴ میکلوڈ روڈ نامی عمارت تھی جس میں پاکستان کمیونسٹ پارٹی اور پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے دفتر تھے۔ میرے لیے اس جگہ بلکہ اس کے آس پاس کے گلی کوچوں سے بھی گزرنا ممنوع تھا۔ لاہور میرے لیے نیا اور میں یہاں کے ہر فرد کے لیے اجنبی تھا۔ میرے ذمے بنّے بھائی سے رابطہ رکھنا اور ان کے ضروری پیغامات متعلقہ کی افراد تک ترسیل تھی جن کی تعداد دو تین سے زیادہ نہ تھی اور جو بنّے بھائی ہی کی طرح روپوش (انڈر گراؤنڈ) تھے۔"(۱۲)

انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کے متعلق فیض احمد فیض نے بھی اپنے خیالات کا اظہار اپنی کئی تحریروں میں اور اپنے رفقا کے ساتھ گفتگو میں بھی کیا ہے۔ یہ پوچھنے پر کہ ترقی پسندی کیا ہے تو جواب دیا کہ "مختلف اذہان اس کے مختلف معنی اخذ کرتے ہیں۔ ترقی پسندی کا ایک واضح تصور یہ ہے کہ گردوپیش کے حقائق اور تقاضوں کا کچھ شعوری ادراک ہونا۔ اگر ادیب یا شاعر ماحول کو جانے بغیر

خوابی کیفیت بیان کر کے کہ سحر ہونے والی ہے اور سب ٹھیک ہو جائے گا تو یہ زندگی کے حقائق سے صریحاً فرار ہے۔ مشکل مسائل سے نبرد آزما ہونا ہی ترقی پسندی کی دلیل ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ادیب گھمبیر مشکلات سے گھبرا کر بھاگ جائے‘ مفرور ہو جائے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا یہ فرار کی دلیل ہے۔ ایسا زندگی میں بار ہا ہوا ہے۔

پاکستان میں انجمن کے اندر کافی شگاف پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ کئی لوگ یا تو خود ہی انجمن سے علیحدہ ہو گئے تھے یا وہاں سے نکال دیئے گئے تھے۔ اس کے بارے میں فیض صاحب کے خیالات یہ ہیں:

> ”پہلے تو تھوڑا فرق کرنا کسی تحریک اور تنظیم میں۔ تحریک چھوٹے چھوٹے گروہوں سے تو نہیں بنتی۔ تنظیم یعنی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن میں جب تک اس کے پاس خاص موقع اور مرحلے پر ایک مخصوص مقام متعین تھا اس وقت اس میں اتحاد ہی تھا۔ اب اس میں دو طرح کی باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ تحریک اور تنظیم ایسے وقت میں پیدا ہوئی جب برصغیر میں قومی اور ملکی آزادی کی تحریک چل رہی تھی یعنی قومی اور ملکی آزادی کی جس سے سب لوگ متفق تھے۔ دوسرے یہ تھا کہ ایک وہ طبقہ تھا جو آسائشوں سے محروم رہا، جس کو طرح طرح کی مجبوریاں درپیش تھیں اور اسے مختلف مظالم اور مصائب کا سامنا رہا۔ اس میں شہر کے چھوٹے سفید پوش طبقہ کے لوگ اور مزدور ہیں جن کا نام اور جن کی زندگی کا عکس ہمارے ادب میں اس سے پہلے نہیں آیا تھا۔ اس پر بھی متفق تھے۔ اور اس پر بھی ایک حد تک اتفاق تھا کہ آزادی کے بعد جو بھی ہمارا معاشرہ ہوگا اس میں اِس وقت کی معاشی ناانصافیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔
>
> تیسری بات یہ بھی تھی کہ بجائے اس کے کہ شعر و ادب میں محض خیالی باتیں کی جائیں اس میں حقیقت پسندی سے زندگی کے حقائق اور گرد و پیش کے ماحول کی صورت گیری کی جائے۔ ان تینوں باتوں پر اتفاقِ رائے تھا۔ اسی وجہ سے یہ تحریک بن گئی۔ تحریک میں اتحاد تھا اور تنظیم بھی۔
>
> جب ملک آزاد ہو گیا تو پہلی منزل تو سر ہو گئی۔ پھر دیکھا کہ اس کے بعد تو ابھی بہت سی منزلیں باقی ہیں۔ ان تک پہنچنے کے بارے میں اختلاف پیدا

ہو گیا۔ کوئی کسی طریقے سے پہنچنا چاہتا تھا کوئی کسی سے۔ اس اگلی منزل کو جمہوریت یا سماجی نا انصافی کہہ لیجئے۔ اس تک پہنچنے کے لیے لوگوں نے اپنے اپنے راستے اختیار کر لیے۔ اس کی وجہ سے کم از کم تنظیم میں رُخنے پیدا ہو گئے۔ جہاں تک تیسری بات تھی کہ زندگی کے عکس اور حقیقت پسندی سے زندگی کی عکاسی کرنی تو اس کے بارے میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا۔ جب معاشرے میں ذہنی پراگندگی، ذہنی پریشانی اور پریشان خیالی پیدا ہوتی ہے تو ہمیشہ دو طرح کے دھارے چلتے ہیں، ایک اندر کی طرف جانے کا اور دوسرا باہر کی طرف دیکھنے کا۔ کچھ لوگ صورت حال سے اس قدر برگشتہ ہو گئے کہ انہوں نے کہا کہ سب پر مٹی ڈالو اور صرف اندر دیکھو کہ تمہارے لاشعور میں کیا ہو رہا ہے۔ اس سے خالص داخلی اور اندرون بینی کی تحریکیں پیدا ہوئیں جس کی انتہا یہ تھی کہ کوئی چیز اچھی ہے نہ بری۔ اس سے ایک خاص قسم کا انارکزم (Anarchism) اور نراجیت پیدا ہوتی ہے۔ اب اس کی ذمہ داری تو تحریک پر ہے نہ تنظیم پر۔ وہ تو حالات اس طرح کے ہوئے کہ اس میں یہ صورتیں پیدا ہوئیں۔" (۱۳)

جب سجاد ظہیر پاکستان میں روپوش تھے یعنی سن 1948 میں تو فیض احمد فیض اس وقت 'پاکستان ٹائمز' اور 'امروز' کے مدیر تھے۔ انہی دنوں یوم مئی منانے کے لیے انجمن ترقی پسند مصنفین کا ایک بہت بڑا جلسہ لاہور میں منعقد کیا گیا۔ اردو اخبار 'احسان' نے ترقی پسندوں کی مخالفت میں لکھا کہ انجمن میں ہر طرح کی برائیاں ہیں۔ وہ لوگ اسلام کی توہین کرتے ہیں، لینن کو قائد اعظم سے بڑا تصور کرتے ہیں اور بیرونی اور غیر ملکی طاقتوں کی طرف داری کرتے ہیں۔ اس جلسے میں بھاری تعداد میں لوگ شامل ہوئے جس سے عوام دشمن لوگ بوکھلا گئے اور انجمن پر گھٹیا قسم کے حملے کرنے لگے۔ دوسری طرف ترقی پسندوں کی صفوں میں بھی تفرقہ پیدا ہونے لگا۔

خواجہ وزیر خان لاہور میں خطیب مسجد تھے اور انگریزوں کے پرانے نمک خوار تھے۔ انہوں نے تو پہلے فیض کے خلاف فتویٰ دیا اور پھر مولانا محمد علی جوہر کے خلاف بھی۔ بعد ازاں لاہور کی چالیس مسجدوں میں مولویوں نے ترقی پسندوں کے خلاف خطبے پڑھے اور لوگوں کو تشدد پر اکسایا۔ اس

کا اثر یہ ہوا کہ 1949 میں ڈاکٹر دین محمد تاثیر جو انجمن کے ابتدائی دور میں بھی سجاد ظہیر کے ساتھ تھے اب ترقی پسند ادیبوں کے خلاف ہو گئے۔ فیض کہتے ہیں کہ پاکستان میں ترقی پسندوں میں اس انتہا پسندی کی بازگشت صاف سنائی دینے لگی تھی۔ اور پھر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آگے چل کر فیض کہتے ہیں کہ انجمن کے عہدیداروں نے حکم صادر کیا کہ اقبال کا بت توڑ دیا جائے اور عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اور ن۔ م۔ راشد کو انجمن سے علیحدہ کیا جائے کیونکہ یہ لوگ ترقی پسندی کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ منٹو پر یہ الزام لگایا کہ اس کی تخلیق فحش اور غلیظ ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر خود فیض ترقی پسند انجمن کے عہدیداران کے خلاف جنگ میں اتر آئے۔ انجمن سے علیحدگی اختیار کرنے کے بارے میں خود فیض فرماتے ہیں:

> ”پھر یار لوگوں نے ایک روز مظہر علی خان کے گیراج میں میٹنگ کی۔ صفدر میر صدر تھے۔ قاسمی (احمد ندیم قاسمی) صاحب سیکریٹری نے علامہ اقبال کے خلاف ایک مقالہ پڑھا۔ بھئی ہمیں بہت رنج ہوا۔ ہم نے اعتراض کیا کہ یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے۔ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ یہ تو ثقہ بند قسم کی بے معنی انتہا پسندی ہے۔ ہماری نہ مانی گئی۔ ہم بہت دل برداشتہ ہوئے۔ اس کے بعد انجمن کی محفلوں میں نہیں گئے۔“ (۱۴)

فیض صاحب کو انجمن سے الگ ہونے کا بہت دکھ ہوا کیونکہ جب 1936 میں انجمن کی بنیاد رکھی گئی تھی تو فیض صاحب سب سے آگے تھے۔ سجاد ظہیر، محمود الظفر، رشید جہاں کے ساتھ مل کر ہی تو فیض نے تنظیم کا منشور طے کیا تھا۔ جس تحریک کے وہ بانیوں میں تھے اسے چھوڑ دینا بڑا دردناک حادثہ تھا۔ تحریک پر فحاشی اور عریانی پھیلانے کے بھی الزامات لگائے گئے جو سراسر بے بنیاد تھے اور جن سے فیض کو سخت صدمہ پہنچا۔ وہ کہتے ہیں:

> ”مخالفین کی جانب سے ترقی پسندوں پر فحاشی اور عریانی کی مہر لگا کر الزام تراشی کی گئی تو ردِ عمل بھی ہوا۔ ترقی پسندوں کے انتہا پسندوں نے عصمت اور منٹو سے لاتعلقی کی روش اختیار کی کہ ان کا ترقی پسندی سے واسطہ نہیں ہے۔ یہ بات بھی صحیح نہیں تھی۔
>
> بھئی اس زمانے میں اوّل علامہ اقبال کے متعلق کچھ غلط تفسیریں کی

گئیں۔ منٹو اور عصمت کے علاوہ قرۃ العین حیدر اور ن۔م۔راشد کے متعلق بھی ہماری رائے میں بہت غلط رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ ہم نے جب بھی ان سے اختلاف کیا تھا ہمیں اب بھی اختلاف ہے۔ اختلاف کا پیدا ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس قسم کے اختلافات تنظیموں میں ہمیشہ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن بہ حیثیت ایک تحریک کے اس کی حقیقت پسندی، راست بازی اور گرد و پیش کی جو بھی حقیقت ہے اس کو سمجھنے اور اس کی صحیح طریقے سے تفسیر کرنے کی جو کوشش ہے اس بارے میں تو اختلاف نہیں تھا، نہ اب ہے۔ بھئی کچھ لوگ کسی وقت مصلحت یا حالات سے متاثر ہو کر بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو وہ ادب کا ایک فطری اور عضویاتی حصہ ہے۔ کچھ عرصے بعد زیادہ اچھا لکھنے والے ان الجھنوں سے نکل جاتے ہیں۔ اور جو ان میں گرفتار رہتے وہ گرفتار رہتے ہیں۔ ان کا کوئی علاج نہیں ہے۔" (۱۵)

ظاہر ہے کہ ترقی پسند ادبی تحریک پاکستان میں تفرقات کی زد میں آ گئی تھی اور ادیب لوگ طرح طرح کے ہتھکنڈوں کے سہارے ایک دوسرے پر ذاتی طور پر حملے کرنے لگے تھے جس کی وجہ سے تحریک کمزور پڑتی چلی گئی اور رفتہ رفتہ اپنا رتبہ کھو بیٹھی۔ آج بھی ظفر اللہ پوشنی اور میجر محمد اسحٰق جیسے لوگ حیات ہیں جنھوں نے کئی سال سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کے ساتھ راولپنڈی کیس میں جیل میں گزارے تھے لیکن ترقی پسند ادبی تحریک سے اب ان کا کوئی سروکار دکھائی نہیں دیتا۔

خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں کہ نئے ادب کی جو تحریک 1935 میں شروع ہوئی تھی وہ آگے چل کے دو حصوں میں بٹ گئی۔ اس زمانے کے کچھ نئے لکھنے والے جو ابتدا میں ترقی پسند سمجھے جاتے تھے اصلاً فرائڈ (Freud) کے نظریات سے متاثر تھے۔ فرانس اا ور انگلستان کی جدید ادبی تحریک سے انہوں نے گہرا اثر قبول کیا تھا اور انہیں بہت شوق تھا کہ اس جدید تکنیک اور نفسیات کو نئے سانچے میں ڈھالا جائے۔ جن ادیبوں کا ایسا نظریہ تھا ان میں کچھ ادیب تو بہت ذہین اور باصلاحیت بھی تھے۔ اس لیے اپنے نظریے اور تجربے کی تکمیل عمل میں لانے کے لیے انہوں نے خود اپنی ایک ادبی تنظیم قائم کر لی اور اس کا نام 'حلقۂ ارباب ذوق' رکھا۔ اس حلقے کی بدقسمتی یہ رہی کہ وہ بھی انتہا پسندی کا شکار ہو گیا۔ ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق کے ادیبوں کے نظریے میں یہ فرق تھا کہ اگر ترقی

پسند ادیب اپنی جماعت کو ہی سب کچھ سمجھتے تھے اور شخص کی انفرادیت کو مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے تو حلقے کے ادیب فرد کو جماعت پر ترجیح دیتے تھے۔ ترقی پسند ادیب مواد (Material) پر زور دیتے تھے مگر حلقے والے لوگ ہئیت (Form) کو مواد پر فوقیت دینے کو اپنا مسلک مانتے تھے۔ اگر ترقی پسند ادیب سیاست کو ہی ادب کا موضوع مانتے تھے تو حلقے والے سیاست سے قطعی پرہیز کرتے تھے۔ لیکن آج کا ادیب کیا سوچتا ہے اور کیا چاہتا ہے اس سلسلے میں خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''ایسا نہیں ہے کہ 'ترقی پسند تحریک' اور 'حلقۂ ارباب ذوق' میں سچی ایسے تھے اور سچے اور متوازن تخلیقی فن کاروں کا قحط تھا مگر حقیقت حال یہ ہے کہ دونوں تحریکوں کا غالب رجحان ادب میں نقطہ اعتدال کھودینے اور اس طور پر مصنوعی ادب پیدا کرنے کی کوشش کا غماز ہے۔ اس لیے اب جدید ذہن ان دونوں تحریکوں سے رہائی حاصل کرنا چاہتا ہے اور تحریکی ادب کو ہی مشتبہ نظروں سے دیکھتا ہے جماعتی وفاداری اور جماعتی وابستگی کی بجائے زندگی کے حقائق کو اپنے طور پر دیکھنے اور زندگی کے تجربوں کو اپنی طور پر جھیلنے کی روش عام ہورہی ہے۔ نیا ادب مواد اور ہئیت ،فرد اور جماعت سیاسی اور غیر سیاسی مسائل کی دوئی کی بجائے ان کی وحدت پر زور دینا چاہتا ہے اور زندگی کی رنگا رنگی اور پیچیدگی کو سادہ مفروضوں اور بنے بنائے فارمولوں کی مدد سے میکانکی طور پر حل کرنے کی بجائے آزادانہ تخلیق کے ذریعے سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ نظریے اور عقیدے کے ڈاگما (dogma) سے دست بردار ہوکر سائنسی دور مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انفرادی خلوص اور صحت نظر کو ضروری سمجھتا ہے۔ وہ نہ صرف 'موادی ادب' پیدا کرنا چاہتا ہے اور نہ صرف 'ہیئتی ادب'۔ وہ ایسی تحریر لکھنا چاہتا ہے جو کلی حیثیت سے ادب اور ادبی تخلیق کہی جاسکے۔ ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے ادبی سرمایے کی جو دیر پا قابل قدر ادبی نمونے ہیں وہ ہماری ادبی تاریخ کا مستقل جزو بن چکے ہیں۔ ان سے جدید ذہن بھی استفادہ حاصل کرے گا اور وہ ادیب اب بھی قدر و منزلت کے مستحق سمجھے جائیں گے جنھوں نے

جماعت یا گروہ سے وابستگی کو ادبی معیار کا بدل نہیں قرار دیا بلکہ ایسی تحریریں یادگار چھوڑیں جو جماعت یا گروہ سے بالاتر ہیں اور انسانیت کے لیے قیمتی ورثہ۔"(۱۶)

ترقی پسند ادبی تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق پر اس سے بہتر تنقید راقم الحروف نے کہیں نہیں پڑھی اور نہ کسی سے سنی ہے۔ اعظمی صاحب اس لحاظ سے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کھلے ذہن سے ان پر نکتہ چینی کی ہے جس کی سچائی اور ایمانداری سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

ادبی تحریک نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان میں بھی ماند پڑ گئی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی ادیب کی سوچ کا انحصار اس کے ماحول پر ہوتا ہے۔ غریبی اور بے سروسامانی کے دور میں ادیب رجعت پرستی اور سامراجیت کے خلاف اپنے ادب کی تخلیق کرتا ہے اور جب اس لعنت سے چھٹکارہ حاصل کر لیتا ہے تو اس کے ادبی کارناموں میں بھی اس کی خوش حالی جھلکنے لگتی ہے۔ ساحر لدھیانوی جب غربت سے برسرپیکار تھے تو انہوں نے لکھا تھا:

ہم نے ہر دور میں تذلیل سہی ہے لیکن
ہم نے ہر دور کے چہرے کو ضیا بخشی ہے
ہم نے ہر دور میں محنت کے ستم جھیلے ہیں
ہم نے ہر دور کے ہاتھوں کو حنا بخشی ہے

اس کے بعد انہیں فلموں میں کام مل گیا اور وہ گیت لکھنے لگے تو انہیں معاشی تنگدستی سے نجات مل گئی اور حالات سازگار ہو گئے۔ تب سے انہوں نے دوستوں سے ملنا ملانا بہت کم کر دیا تھا۔ ساحر نے ایس۔ ڈی۔ برمن کے ساتھ مل کر بہت گانے لکھے اور بے حد دولت بھی کمائی۔ حمید اختر نے ساحر لدھیانوی پر ایک گوشہ لکھا ہے کہ ساحر آہستہ آہستہ شہرت، دولت اور عزت میں اضافے کے ساتھ ساتھ ماضی کو بھولنے لگا اور سخت چڑچڑا ہو گیا تھا۔ ہر قسم کے لوگ اس کی محفل میں آتے تھے مگر وہ ہر محفل میں تنہا ہوتا تھا۔ وہ دوستوں کو گالیاں دینے لگا حتیٰ کہ لوگ اس سے ملنے سے کترانے لگے اور وہ بالکل تنہا رہ گیا۔ یہی حال دوسرے ادبا اور شعرا کا بھی ہوا۔ ادیبوں کے اس رویے کا اثر تو تحریکوں پر پڑنا ہی تھا۔ لہٰذا نئی ادبی تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق ایسے لوگوں کی وجہ سے ہی دم توڑ گئے۔

☆☆☆☆☆☆

کتابیات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر/پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱)	آشنائیں کیا کیا	حمید اختر	بک ہوم۔لاہور	2008	12
۲)	نقوش	عارف نقوی	پرگتی شیل وسودھا	اکتوبر 2005	111
۳)	آشنائیں کیا کیا	حمید اختر	بک ہوم۔لاہور	2008	10
۴)	مغنی آتش نفس	ڈاکٹر سید احمد جعفر	مکتبہ دانیال۔کراچی	2005	30
۵)	سجاد ظہیر حیات اور ادبی خدمات	قمر رئیس	ساہتیہ اکادمی۔دہلی	2005	40
۶)	ترقی پسند ادب۔پچاس سالہ سفر	قمر رئیس	ساہتیہ اکادمی۔دہلی	2005	216
۷)	انگارے سے پگھلا نیلم تک	سید مظہر جمیل	اکادمی بازیافت۔کراچی	2005	43
۸)	مغنی آتش نفس	ڈاکٹر سید احمد جعفر	مکتبہ دانیال۔کراچی	2005	44
۹)	سجاد ظہیر۔ مارکسی دانشور اور کمیونسٹ راہنما	عبدالرؤف ملک	پیپلز پبلشنگ ہاؤس۔لاہور	2009	49
۱۰)	سجاد ظہیر۔ مارکسی دانشور اور کمیونسٹ راہنما	عبدالرؤف ملک	پیپلز پبلشنگ ہاؤس۔لاہور	2009	151
۱۱)	انگارے سے پگھلا نیلم تک	سید مظہر جمیل	اکادمی بازیافت۔کراچی	2005	45
۱۲)	انگارے سے پگھلا نیلم تک	سید مظہر جمیل	اکادمی بازیافت۔کراچی	2005	47
۱۳)	فیض نامہ	ڈاکٹر ایوب مرزا	کلاسیک۔لاہور	2003	91
۱۴)	فیض نامہ	ڈاکٹر ایوب مرزا	کلاسیک۔لاہور	2003	98
۱۵)	فیض نامہ	ڈاکٹر ایوب مرزا	کلاسیک۔لاہور	2003	99
۱۶)	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو۔دہلی	2008	391

☆☆☆☆

تیسرا باب

پہلا دورِ اسیری۔ سینٹرل جیل لکھنؤ

۱۔ پس منظر

۲۔ روداد بند و سلاسل۔ نقوشِ زنداں

۳۔ جیل میں ادب، فن اور شاعری کا مشغلہ

۴۔ جذبات کی رَو

ا۔ پس منظر

اگرچہ دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو غیر قانونی قرار دیا گیا تھا لیکن اس سے بہت پہلے ہی حکومت برطانیہ کی طرف سے کمیونسٹوں پر ظلم کی بوچھار شروع ہوگئی تھی۔ 1928 میں کمیونسٹوں کی طرف سے ایک سازش ہوئی تھی جسے میرٹھ کانسپی ریسی کانڈ کا نام دیا گیا تھا۔ اس کیس نے کمیونسٹ پارٹی پر دو طرح سے اثر کیا۔ ایک تو یہ کہ کمیونسٹوں پر 1929 سے 1933 کے لمبے عرصے تک مقدمہ چلتا رہا جس سے ہندوستانی عوام کو ان سے ہمدردی پیدا ہونے لگی۔ خود جواہر لال نہرو اور ایم۔ اے۔ انصاری نے اس کمیٹی میں شمولیت اختیار کی جو قیدی کمیونسٹوں کے حفظان کے لیے قائم کی گئی تھی۔ گاندھی جی بھی کمیونسٹوں کو ملنے جیل گئے اور انہیں تسلی دی۔ دوسری طرف کمیونسٹوں کے تمام بڑے لیڈر قید ہو جانے سے پارٹی کو زبردست دھکا لگا اور پارٹی کافی کمزور پڑ گئی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ کمیونسٹوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے لیے کانگریس کی ہمدردی محض مگرمچھ کے آنسوؤں کے مترادف ہے۔ لہٰذا انہوں نے کانگریس کے خلاف کھلے عام اعلان جنگ کر دیا۔ 1940 میں کانگریس کا ایک اجلاس رام گڑھ میں منعقد ہوا تھا جس میں کمیونسٹوں نے اپنی پالیسی واضح کر دی تھی۔ اس نئی پالیسی کو انہوں نے 'Proletarian Path' یعنی عوامی راہ کا نام دیا۔ اس پالیسی میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کو عالمی جنگ میں انقلابی طریقہ اختیار کر کے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنی۔ اس جانب پہلا قدم یہ ہونا کہ ملک کی تمام بڑی صنعتوں میں بڑے پیمانے پر ہڑتال کی جائے۔ اس میں یہ بھی شامل ہونا کہ نہ ہم کرایہ دیں گے نہ ہی ٹیکس دیں گے۔

اس مہم کے دیگر اہم پہلو یہ تھے کہ تمام ملٹری اور پولس اسٹیشنوں پر ہتھیاروں سے حملہ کیا جائے، حکومت کے ہر عملے کو تباہ کر دیا جائے اور حکومت کے خلاف بہت بڑے پیمانے پر ہتھیار بند بغاوت کی جائے۔ اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے CPI نے سب سے پہلے بمبئی کی تمام ٹیکسٹائل ملوں میں ہڑتال کروائی جس کے زیرِ اثر 1,50,000 مزدور بیکار بیٹھ گئے۔ حکومت نے اس کے خلاف سخت قدم اٹھائے اور ان تمام لوگوں کی گرفتار کرلیا جو چاہے خود کمیونسٹ تھے یا کمیونسٹوں کے ہمدرد تھے۔ اس سے پارٹی کا شیرازہ کافی حد تک بکھر گیا۔

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ 1939 میں روس اور جرمنی نے ایک عہد نامے پر دستخط کیے تھے جس کے تحت دونوں مل کر متحدہ طاقتوں کے برخلاف لڑیں گے۔ روس کی طرف سے اسٹالن اور جرمنی کی طرف سے ہٹلر نے اس معاہدے پر دستخط کیے۔ اس عہد نامے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ 1936 کے اختتام تک دو مشہور ڈکٹیٹر اٹلی اور جرمنی کی رہنمائی کر رہے تھے۔ اٹلی میں مسولینی اور جرمنی میں ہٹلر۔ انہیں یہ شکایت تھی کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد جن شرائط کو رضامندی دی گئی تھی وہ ان کے حق میں مناسب نہیں تھیں۔ نتیجے کے طور پر جرمنی اور اٹلی میں اتحاد ہو گیا جس میں جاپان نے بھی حصہ لیا۔ ہٹلر نے 1938 میں آسٹریا پر قبضہ کرلیا اور اگلے سال چیکوسلواکیہ بھی اس کے اقتدار میں آگیا۔ پہلی ستمبر 1939 کو پولینڈ کو بھی اس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ برطانیہ اور فرانس جو پولینڈ کے طرف دار تھے انہوں نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ وہ علاقے جو برطانیہ کی زیرِ حکومت تھے اس جنگ سے باہر نہ رہ سکے۔ اسی وجہ سے ہندوستان بھی جنگ کے دائرے میں آگیا۔ 1940 میں جرمنی نے ناروے اور ڈنمارک پر حملہ کیا۔ ڈنمارک نے تو فوراً ہار مان لی مگر ناروے نے کچھ دیر مخالفت کی لیکن باوجود متحدہ محاذ کی مدد کے مقابلہ نہ کر سکا اور ہتھیار ڈال دیئے۔ 1940 کے آخر تک جرمنی نے رومانیہ اور ہنگری کو بھی فتح کرلیا۔ تھوڑی دیر مقابلہ کرنے کے بعد بلگاریہ بھی جرمنی کے ماتحت ہو گیا۔ بعد میں ہٹلر نے گریس کو بھی پچھاڑ دیا اور اس کی فوجوں نے کریٹ کے جزیرے پر بھی پنا اقتدار بنالیا۔

ہٹلر کی لگاتار کامیابی سے روس کو تشویش ہونے لگی اور دونوں ملکوں کے اتحاد کی جڑیں بھی کمزور پڑنے لگیں۔ کامیابی کے غرور میں ہٹلر نے یہ فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے کہ روس چوکنا ہو جائے

اس پر حملہ کرنا اور اسے ہی پہل کرنی۔ چنانچہ 22 جون 1941 کو جنگ کا اعلان کیے بغیر جرمنی نے روس پر حملہ کردیا۔ اس وقت برطانیہ نے روس سے معاہدہ کرلیا تھا جس کے تحت اسے تکنیکی اور دیگر امداد مہیا کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ بہرحال ابتدائی کامیابی کے بعد ہٹلر کو ہار کا منہ دیکھنا پڑا اور دسمبر 1941 تک ہٹلر کو احساس ہوگیا کہ وہ روس کو تہ و بالا کرنے میں ناکامیاب رہے گا۔

ان حالات میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ دوسری جنگ عظیم کا ہندوستان میں کیا ردِعمل ہوا۔ شروع میں کانگریس جو ہندوستان کی سب سے بڑی نمائندہ پارٹی تھی اس کی پالیسی یہ رہی تھی کہ جب تک خود آزاد نہیں ہوجاتے وہ کسی دوسرے ملک کی آزادی کی جنگ میں مدد نہیں کریں گے۔ سرمایہ داری کی جنگ سرمایہ داری کی ہی جنگ کہلائی گی چاہے اس کے حق میں جو بھی دلیل دی جائے۔ چنانچہ کانگریس نے یہ فیصلہ کیا کہ اس جنگ میں حکومتِ برطانیہ کا ساتھ نہ دیا جائے۔ اس نے واضح کردیا کہ جنگ کی تیاریوں میں برطانیہ کو کسی طرح کی مدد فراہم نہ کی جائے گی۔ لیکن 3 ستمبر 1939 کو برطانیہ اور جرمنی کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور اس وجہ سے ہندوستان خود بخود اس میں ملوث ہوگیا۔ پنجاب، بنگال اور سندھ نے مکمل امداد کا عہد کیا اور کئی پارٹیاں جیسے نیشنل فرنٹ، ہندو مہاسبھا وغیرہ نے بنا کسی شرط کے حکومت کا ساتھ دینے کا اعلان کردیا۔ کانگریس نہ صرف اکیلی پڑ گئی بلکہ اس میں پھوٹ کے بھی آثار پیدا ہوگئے۔ گاندھی نے 5 ستمبر 1939 کو وائسرائے سے ایک ملاقات میں کہا کہ اس کی ہمدردی حکومت کے ساتھ ہے۔ یہ انٹرویو 'ہریجن' میں شائع ہوا تھا۔ اس میں گاندھی جی نے کہا کہ

> ''میں صرف ہندوستان کی آزادی کی بارے میں نہیں سوچ رہا۔ وہ تو آئے گی ہی لیکن اس آزادی کا کیا فائدہ اگر انگلینڈ اور فرانس تباہ ہوگئے۔'' نہرو اس سے بھی ایک قدم آگے نکل گئے اور کہا کہ اس کی رائے میں ہمیں بنا کسی شرط کے برطانیہ کا ہر مرحلے پر ساتھ دینا۔ سبھاش چندر بوس واحد لیڈر تھے جو کانگریس کی نان کواپریشن پالیسی پر کاربند رہے۔ یہ شاید سبھاش چندر بوس کا اثر تھا یا کوئی اور وجہ کہ کانگریس نے پھر سے پینترا بدلا اور 15 ستمبر 1939 کو اپنی ورکنگ کمیٹی کی ایک میٹنگ میں ریزولیشن پاس کیا جو پنڈت نہرو کا تیار کیا ہوا تھا اور جس میں یہ کہا گیا تھا کہ جنگ یا امن کا فیصلہ ہندوستان خود اپنی مرضی سے کرے گا اور

کسی بھی سامراجی طاقت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ سامراجی مطالب کے لیے ہمارے ملک کے ذرائع کو غلط طریقے سے استعمال کرے۔ بعدازاں کانگریس کا جو اجلاس 19 مارچ 1940 کو رام گڑھ میں ہوا اس اجلاس میں ورکنگ کمیٹی کے مندرجہ بالا فیصلے کی زوردار حمایت کی گئی اور یہ کہا گیا کہ ہندوستان کی عوام کی مرضی کے خلاف ہندوستان کو جنگ کی آگ میں نہیں دھکیلا جا سکتا۔ اس میٹنگ میں دوبارہ یہ فیصلہ ہوا کہ ہندوستان مکمل آزادی سے کم کوئی بھی رعایت ماننے کو تیار نہیں۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ اگر ہندوستانی عوام کی مانگیں پوری نہیں ہوتیں تو ترک موالات کی مہم زور وشور سے شروع کی جائے گی۔ لیکن اس مہم کو جب شروع کیا گیا تو لوگوں نے اس میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ لہٰذا اس سلسلے میں نہرو نے ایک بیان میں کہا کہ ''اس مہم کا اس وقت شروع کرنا مناسب نہیں ہوگا جبکہ برطانیہ زندگی اور موت کی جدوجہد میں مبتلا ہے۔''

رفتہ رفتہ جنگ کے بادل گہرے ہوتے گئے اور عالمی جنگ میں جاپان بھی میدان میں اتر آیا جس سے حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ جاپان نے ایک کے بعد ایک کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا اور اس کی طاقت خوفناک حد تک ابھر کر سامنے آئی۔ اب جاپان نے برما اور منی پور کے راستے ہندوستان پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ انہیں برطانیہ پر سخت غصہ تھا کیونکہ برطانیہ نے انہیں ان کی مرضی کے خلاف جنگ میں دھکیل دیا تھا۔ بہرحال ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم گرنے کے بعد جاپان بالکل ٹوٹ گیا اور ہندوستان پر قبضہ کرنے کی اس کی خواہش مٹی میں مل گئی۔

فروری 1942 تک جنگ کے حالات کچھ ایسے تھے جس کے زیرِ اثر بہت بڑے پیمانے پر کانگریسی اور کمیونسٹ لیڈروں کی گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں۔ ایک طرف تو گاندھی جیسے امن پسند لیڈر اپنے طریقے سے جدوجہد کر رہے تھے اور دوسری طرف انقلابی لوگ تشدد میں مصروف تھے۔ لیکن تشدد کی ابتدا اس زمانے سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ دراصل انقلابی سرگرمیاں 1905 میں بنگال کی تقسیم سے ہی شروع ہو گئی تھیں۔ بنگال ہمیشہ سے ہی ادبی اور سیاسی لحاظ سے ملک کے دیگر صوبوں سے آگے ہی رہا ہے۔ ایسے لوگوں کو دو حصوں میں تقسیم کرنے سے طوفان برپا تو ہونا ہی تھا اور وہی

ہوا۔ حکومت برطانیہ نے بنگال کو ایسٹ بنگال اور ویسٹ بنگال میں بانٹ دیا اور اُسے عملی جامہ پہنانے کے لیے 20 جولائی 1905 کو وائسرائے نے ایک ریزولیوشن پر دستخط بھی کیے جس کے مطابق 16 اکتوبر 1905 سے بنگال دو حصوں میں بٹ جائے گا۔

بنگال میں تقسیم کے خلاف جو احتجاج ہوا اس کا پہلا ردِ عمل یہ تھا کہ سودیشی مہم پھر سے شروع ہو گئی۔ اس مہم کے تحت بیرونی ممالک خاص طور سے برطانیہ کی بنائی ہوئی کوئی بھی چیز کوئی ہندوستانی استعمال نہیں کرے گا۔ نتیجہ کے طور پر جگہ جگہ غیر ملکی اشیاء کو سپردِ آتش کیا گیا۔ جلپائی گری میں کچھ طالب علموں نے سگریٹ، کرکٹ کے بیٹ اور غیر ملکی کپڑوں کو بھی آگ کے حوالے کر دیا اور لارڈ کرزن کا پتلا بھی جلایا۔ ایسا کرنے سے لوکل تاجروں اور تشدد پر بضد نوجوانوں میں کئی جگہ تصادم بھی ہوئے۔ کچھ لوگوں کو برادری سے خارج کیا گیا۔ حکومت نے اس چیلنج کو نہایت سرد مہری سے کچلنے کا ارادہ کیا اور عوام اور حکومت کے درمیان ایک غیر اعلانیہ جنگ شروع ہو گئی۔ بنگال میں ایک انقلابی جماعت قائم ہوئی جس کا نام 'انوشیلن سمیتی' رکھا گیا۔ اس جماعت کا خاص مقصد بنگال میں دہشت پھیلانا تھا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے کئی لوگوں کا قتل کیا اور کئی جگہ ڈاکے بھی ڈالے۔ 1907 سے 1917 کے دس سالہ عرصے میں انہوں نے کم سے کم 64 لوگوں کو قتل کیا جن میں پولیس کے بڑے افسر، پولیس کو اطلاع بہم پہنچانے والے لوگ اور سرکاری گواہ وغیرہ شامل تھے۔

بنگال کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بھی دہشت گردی نے سر اٹھایا۔ ملک کے باہر بھی انقلابیوں نے کئی جماعتیں قائم کیں۔ ہندوستانی لوگ جو امریکہ میں پہلی عالمی جنگ کے بعد بس گئے تھے انہوں نے سانفرانسسکو میں ایک پارٹی کا قیام کیا جس کا نام غدر پارٹی رکھا۔ غدر پارٹی کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ ہندوستان سے انگریزی راج کو اکھاڑ کر باہر پھینکا جائے۔ بعد میں غدر پارٹی غیر قانونی قرار دے دی گئی لیکن اس کے نمائندے روپوش ہو کر اپنا کام کرتے رہے۔ انقلابیوں کی ایک کانفرنس اکتوبر 1924 میں کانپور میں منعقد ہوئی تھی جس میں کافی تعداد میں انقلابی لیڈروں نے حصہ لیا اور ایک نئی تنظیم قائم کی جس کا نام ہندوستان رپبلیکن اسوسی ایشن رکھا۔ اس تنظیم کا مقصد بھی وہی تھا یعنی ہندوستان کو آزادی دلانا۔ اس تنظیم کی کارکردگی اور فروغ کا ذمہ رام پرساد بسمل کے سپرد کیا گیا۔ بعد میں رام پرساد بسمل اور اس کے دوسرے ساتھی کاکوری سازش کیس میں

گرفتار ہوئے اور انہیں پھانسی کی سزا ہوئی۔ 10 دسمبر 1925 کو رام پرساد بسمل کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس وقت ان کی زبان پر آخری الفاظ یہ تھے ''میں برطانوی حکومت کو زمین دوز کرنا چاہتا ہوں اور یہ ہو کر رہے گا۔'' ان کے ایک ساتھی روشن لال بھی تھے جنہیں بسمل کے ساتھ پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ وہ شخص اپنے ہاتھ میں گیتا کی کتاب لیکر بندے ماترم کہتا ہوا پھانسی کے تختے پر لٹک گیا۔ ان کے ایک اور ساتھی اشفاق اللہ خان قرآن کی کاپی لے کر بے خوف وخطر پھانسی پر چڑھ گئے۔ ان کے آخری لفظ تھے ''میں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کی بہت کوشش کی ہے اور میری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔''

جب کاکوری کیس ختم ہوا تو صرف چندر شیکھر آزاد کے علاوہ باقی تمام انقلابی یا تو پھانسی چڑھ گئے تھے یا کالے پانی بھیج دیئے گئے تھے۔ آزاد نے ایک نئی تنظیم قائم کی جس کا نام ہندوستان سوشیلسٹ ریپبلیکن اسوسی ایشن رکھا۔ اس تنظیم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مسٹر سانڈرس کو قتل کر دیا کیونکہ اس نے لالہ لاجپت رائے پر لاٹھیوں کی بوچھار کر کے انہیں مار ڈالا تھا۔ یہ واقعہ 30 اکتوبر 1928 کو ہوا تھا جب لالہ لاجپت رائے لاہور اسٹیشن پر سائمن کمیشن کی خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ اسوسی ایشن نے اگلا قدم یہ اٹھایا کہ بھگت سنگھ اور بٹو کیشور دت کو اس کام کے لیے تیار کیا کہ وہ دہلی اسمبلی میں دو بم گرائیں تا کہ انقلابی تحریک کو تقویت ملے۔ چنانچہ 8 اپریل 1929 کو بھگت سنگھ اور اس کا ساتھی دت چپکے سے اسمبلی میں گھس گئے۔ بھگت سنگھ نے اسمبلی کے فرش پر پہلا بم گرایا اور پانچ منٹ کے وقفے کے بعد دت نے دوسرا بم گرایا۔ اس حادثے میں نہ کسی کی موت ہوئی اور نہ ہی کوئی زخمی ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں بم نقلی تھے اور محض دہشت پھیلانے کی غرض سے پھینکے گئے تھے۔ بھگت سنگھ اور بہت سارے دوسرے ساتھیوں کو لاہور کانسپی ریسی کیس میں موت کی سزا ہوئی جس سے اس تنظیم کی ساری ذمہ داری چندر شیکھر آزاد کے کندھوں پر آ پڑی۔ آزاد نے بھی بہت جگہوں پر بم گرائے، کئی ٹرینوں کو برباد کیا بلکہ ایک بار تو وائسرائے کو بھی زخمی کیا۔ آخر کار کچھ ساتھیوں نے ڈر کے مارے سارا راز فاش کر دیا اور سب لیڈر پکڑ لیے گئے۔ صرف آزاد بچ نکلے مگر 27 فروری 1931 کو الہ آباد میں وہ پولیس کی گولیوں کا شکار ہو گئے اور دم توڑ دیا۔

بھگت سنگھ، دت اور جتن داس کی موت سے عوام میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا اور ان کا

آزادی کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ 30 جنوری 1929 کو بھگت سنگھ اور بٹوکیشور دت کی یاد میں ایک احتجاجی مظاہرہ کیا گیا۔ جگہ جگہ اس قتل اور ظلم کے خلاف میٹنگ ہوئیں جن کو تتر بتر کرنے کے لیے دفعہ 144 لگایا گیا اور لاٹھی چارج بھی ہوا۔ اس سے نوجوان طبقہ اور جوش میں آ گیا اور انقلابی تحریک نرم پڑھنے کی بجائے اور بھی تیز ہوگئی۔ اس طبقے پر بھگت سنگھ اور دت کے متحدہ بیان سے بہت گہرا اثر پڑا۔ بھگت سنگھ اور دت نے یہ اکٹھا بیان اس وقت دیا جب ان پر اسمبلی میں بم پھینکنے کا مقدمہ چل رہا تھا۔ انہوں نے کہا:

> ''جبر جب بے رحمی سے استعمال کیا جاتا ہے تو وہ بے جا ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ کسی قانونی حقوق کے حصول کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے تو وہ جائز ہے۔ ہندوستان میں ایسے جبر کا مکمل خاتمہ ناممکن ہے۔ اور یہ نئی حکومت جس کے ہم حامی ہیں اُسے ان بزرگوں کی رہنمائی حاصل ہے جیسے گورو گوبند سنگھ، شیواجی، کمال پاشا اور رضا خان، واشنگٹن اور گری بالڈی، لفایت اور لینن۔ چند معمولی انسانوں اور تنظیموں کو ختم کرنے سے قوم ختم نہیں ہو جاتی۔ ہمیں صرف یہ واضح کرنا تھا کہ برطانوی حکومت کے آرڈیننس اور سیفٹی ایکٹ آزادی کی مہم کو کبھی ختم نہیں کر سکتے۔''(۱)

دوسری جنگ عظیم 7 مئی 1945 کو ختم ہوئی جب نازیوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور جاپانی فوجیں ہر محاذ سے لوٹنے لگیں۔ اب حکومت برطانیہ نے محسوس کیا کہ وہ وقت آ گیا ہے جب ایک بار پھر ہندوستانی لیڈروں کا بھروسا جیتا جائے۔ سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ تمام کانگریسی لیڈروں کو رہا کر دیا۔ لارڈ ویول نے جو تبھی وائسرائے منتخب ہوئے تھے اکیس (21) ہندوستانی لیڈروں کو خود سے ملاقات کی دعوت بھی دی۔ اس ملاقات میں وائسرائے نے حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ ایک ایگزیکٹیو کونسل قائم کی جائے جس میں صرف ہندوستانی نمائندے ہی شامل ہوں اور بیرونی ممالک سے واسطے کا محکمہ بھی ہندوستانیوں کے ہی سپرد رہے۔ یہ میٹنگ شملہ میں جون 1945 میں ہوئی لیکن ناکامیاب رہی کیونکہ محمد علی جناح بضد رہے کہ ایگزیکٹیو کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی صرف مسلم لیگ ہی کرے گی۔ ایسی مانگ کسی کو بھی منظور نہیں تھی اس لیے بات آگے نہ بڑھ سکی۔ لیکن

اس وقت سے ایک بات صاف ہوگئی کہ مسلمانوں کو ان کا حق دیئے بغیر ہندوستان کو آزادی کا سورج دیکھنا کبھی نصیب نہ ہوگا۔ لہٰذا کئی لوگوں کو یقین ہوگیا کہ مسلم لیگ کی ہندوستان سے علیحدہ ہونے کی مانگ کو ماننا ہی پڑے گا۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ پنجاب اور بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور مسلم اکثریت والے علاقے پاکستان کے حوالے کر دیئے جائیں۔ بعد میں اسی ترتیب سے ملک کا بٹوارہ بھی ہوا۔

مندرجہ بالا حالات کا ذکر کرنے سے صرف یہی مراد تھی کہ سجاد ظہیر کے ہندوستان آنے سے بہت پہلے ہی سیاسی ماحول بدل چکا تھا اور آزادی کی جدوجہد بالغ ہو چکی تھی جس وجہ سے سجاد ظہیر کے لیے زمین کافی ہموار ہوگئی تھی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ عالمی سطح پر جو تبدیلیاں پہلی عالمی جنگ کے بعد رونما ہوئیں انہوں نے سجاد ظہیر کو بے حد متاثر کیا۔ سامراجی تسلط اور فاسشٹ حکمرانی کے خلاف ان میں زبردست رجحان پیدا ہوا جو بڑھتے بڑھتے شعلہ بن گیا اور وہ کمیونسٹ ہوگئے۔ انہیں سیاسی سرگرمیوں کا ذکر سبط حسن نے بھی کیا ہے۔ وہ بیسویں صدی میں ہونے والی سیاسی اور ادبی تبدیلیوں کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> ''یوں بھی بیسویں صدی متحرک اور تغیر کی صدی رہی ہے۔ اس زمانے میں تبدیلی اتنی برق رفتار رہی کہ انسانی تہذیب کے کسی دور میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ 1905 کا روسی انقلاب آتا ہے اور پھر روس اور جاپان کی پہلی جنگ ہے جس کی بڑی اہمیت ہے۔ سیاسی اعتبار سے یہ پہلا موقع تھا جب مشرق نے ایک مغربی طاقت کو شکست کھاتے دیکھا تھا۔ اس طرح یہ جنگ مشرق کی فکری تبدیلی کے لیے ایک موڑ بن جاتی ہے اور اس بارے میں اقبال نے بھی اپنے مقالات میں بہت کچھ لکھا ہے۔ پھر ادھر خود ہندوستان کی فضا میں بنیادی تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ انگریزوں کی حکمت عملی اور برطانوی استعماریت کو مستحکم کرنے کی شاطرانہ چالیں۔ تقسیم بنگال ہو کہ بندوبست دوامی کا نظام ان سب کے خلاف زبردست سیاسی ردِعمل پیدا ہونا شروع ہو چکا تھا۔ قومی بیداری کی تحریکیں، انگریزی سامراجیت کے خلاف دہشت گردی کی تحریکیں، سول

نافرمانی کی تحریکیں، بنگال کا خوفناک قحط، کسانوں کی جدوجہد، مزدور تنظیم کا قیام۔ یہ سب واقعات ایک تسلسل کے تحت رونما ہو رہے تھے اور نتیجہ میں ہندوستان کی فضا میں ایک زبردست ہلچل پیدا ہو چکی تھی۔ ادھر ہندوستان سے باہر پیدا ہونے والا ہیجان بھی براہِ راست بالواسطہ طور پر یہاں کے حالات پر اثر انداز ہو رہا تھا جیسے جنگ بلقان، جنگ طرابلس جن پر اقبال کی خوبصورت نظمیں سامنے آتی ہیں:

فاطمہ تو آبروئے امتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

یہ دور ایسا ہے کہ اگر آپ اس کا انیسویں صدی سے مقابلہ کریں تو آپ انیسویں صدی کو عرضداشتوں کا عہد کہیں گے جن میں لوگ رعایتیں طلب کرتے تھے یا زیادہ سے زیادہ آپ اسے اصلاحی دور کہیں گے۔ لیکن بیسویں صدی کے ساتھ مطالبے کا دور بھی شروع ہوتا ہے جس میں سامراجی نظام کی برائیوں کو محسوس کرلیا جاتا ہے اور اس کے خلاف زبردست ردِ عمل پیدا ہوتا ہے۔'' (۲)

سجاد ظہیر کمیونسٹ کیوں بنے اس کی وضاحت انہوں نے خود ہی اپنے ایک مضمون میں کی ہے جو رسالہ 'حیات' کے 11 نومبر 1973 کے شمارے میں چھپا تھا اور جس سے محترمہ زیب النسا نے اقتباس لیا ہے۔ انہوں نے اس مضمون میں لکھا ہے:

''یہ ظاہر کہ میری زندگی پر یعنی اس رُخ اور اس سمت کو متعین کرنے میں ہمارے وطن کی قومی آزادی کی جدوجہد اور کمیونسٹ تحریک اور مارکسی نظریہ حیات نے سب سے زیادہ اور فیصلہ کن اثر ڈالا۔ اوپر کی سطروں میں نے اپنے بچپن اور لڑکپن کے چند حالات اور واقعات کا ذکر اس غرض سے کیا ہے کہ اس سمت کے متعین ہونے کے باوجود اس کے دائرے کے اندر بھی انفرادیت اور شخصیت کا ارتقاء ہوتا ہے۔'' (۳)

لہٰذا جب وہ اشتراکیت کا جذبہ لے کر ہندوستان کی سرزمین پر آئے تو ان کے دل میں

انگریزی سامراجیت کے خلاف سخت نفرت اور غصہ بھرا ہوا تھا۔ ہندوستان آتے ہی انہوں نے انگریزی حکومت کے خلاف اشتعال انگیز تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہو کر جیل پہنچ گئے۔ دسمبر 1938 میں ان کی شادی ہوئی مگر اس سے پہلے ہی وہ ایک دو بار جیل جا چکے تھے۔ تیسری بار وہ 12 مارچ 1940 کو گرفتار ہوئے اور انہیں سینٹرل جیل لکھنؤ میں رکھا گیا۔ سبط حسن کہتے ہیں کہ سجاد ظہیر پر جو ردِ عمل ہوا اس کو جاننے کے لیے اس وقت کے جو بین الاقوامی حالات تھے ان پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ اپنے ایک انٹرویو میں جو انہوں نے اپنے انتقال سے صرف چار روز پیشتر ہی علی احمد فاطمی کو دیا تھا اس میں انہوں نے کہا:

''سن ۳۲ میں ہٹلر جرمنی میں برسر اقتدار آتا ہے اور اس کے بعد فاسشزم کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بھی یہ ہنگامہ خیزی شروع ہو چکی تھی تو ہم اگر اس دور کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا۔ مثلاً امریکہ میں بڑے پیمانے پر احتجاجی ادب لکھا جانے لگا تھا۔ اسٹائن بیک، اپٹن سنیکلر، تھیوڈر ڈرائیز، اونیل وغیرہ سب کے سب احتجاجی ادب لکھ رہے تھے۔ اسی طرح انگلستان میں ایشروڈ، سیکلر لوئی ہیں۔ فرانس میں روما رولا، اینڈی باربوز، جرمنی میں اِسٹیفن وانگ ہے۔ اُس کی بیوی ہے۔ غرض کہ ایک بہت بڑا دشمن فاسسٹ دشمن۔ جمہوریت نواز اور عوام دوستوں کا ایک بہت بڑا محاذ 1932 اور 1936 کے درمیان تیار ہو چکا تھا۔ یہی زمانہ ہمارے یہاں بھی سول نافرمانی کا زمانہ تھا۔ نشاۃ الثانیہ کا زمانہ تھا اور صرف ادب کی نشاۃ الثانیہ کا زمانہ نہیں بلکہ زندگی کا ہر گوشہ کروٹ لیتا نظر آتا تھا۔ آپ موسیقی کو دیکھ لیں۔ اسی الہ آباد میں جب ہم لوگ پڑھتے تھے تو انہی دنوں بہت سی آل انڈیا موسیقی کانفرنسیں ہوئی تھیں۔ موسیقی ایک باعزت اور معتبر شے سمجھی جانے لگی تھی۔ وہ صرف درباری شے نہیں رہ گئی تھی۔ نئے انداز کی فلمیں بن رہی تھیں۔ کھدر کا رواج شروع ہو چکا تھا۔ کاٹیج انڈسٹریز فیشن میں داخل ہو چکی تھی۔ لوگ اپنے گھروں میں اپنی قوم کی بنی ہوئی چیزوں کو استعمال کرنے لگے تھے۔ تو اسی طرح پورا ماحول تہذیبی فضا میں ہماری تحریک

کے لیے سازگار تھا۔ ہماری شاعری دیکھ لیجیے۔ انجمن کے قیام کے قبل اردو میں جوش تو ہندی میں سمترا انندن پنت آ چکے تھے۔ پریم چند کی کہانیاں مقبول ہو چکی تھیں۔ گئودان شائع ہو چکا تھا۔ پھر اسی دوران غالباً 1935 میں اختر حسین رائے پوری کا محرکتہ الآرہ مضمون ادب اور زندگی شائع ہو چکا تھا۔ مجاز کی نظم 'رات اور ریل' ادبی فضا میں گونج چکی تھی۔ جو بھی کہانیاں لکھی جا رہی تھیں ان کی ساری توجہ اس طرف تھی۔''(۴)

چنانچہ سجاد ظہیر بھی عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں سے الگ نہ رہ سکے اور ہندوستان آنے کے تھوڑے عرصے میں ہی یعنی 1939 میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے رکن بن گئے۔ سن 1939 سے 1942 تک ایک عام سیاسی کارکن کی حیثیت سے پارٹی کی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ اس زمانے میں پارٹی غیر قانونی قرار دی گئی تھی۔ پھر 1942 میں جب پارٹی سے قانونی پابندی ہٹالی گئی تو کمیونسٹ پارٹی کو بھی دوسری سیاسی پارٹیوں کی طرح ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے کام کرنے میں آسانی ہوگئی۔

پابندی ہٹنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کا ہیڈ کوارٹر بمبئی میں قائم ہوا جہاں سجاد ظہیر نے بھی اپنی رہائش والکیشور روڈ پر 'سیکری بھون' میں اختیار کر لی۔ وہاں سے وہ ایک اخبار 'قومی جنگ' کے نام سے نکالتے تھے جس کی کاپیاں سب کامریڈ مل کر سڑک پر بیچتے تھے۔ اس ماحول کا ذکر علی سردار جعفری نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے جو 'حیات' کے سجاد ظہیر نمبر میں شائع ہوا تھا اور جس کا ذکر سید مظہر جمیل نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہم پارٹی کمیون میں رہتے تھے اور وہیں کھاتے تھے۔ معلوم نہیں اس کمیون کا نام راج بھون کیوں پڑا تھا۔ ماہانہ اجرت چالیس روپے تھی، ہم مضامین لکھتے تھے، کاپیاں جُڑواتے، انہیں پریس لے جاتے اور جب اخبار چھپ چکا ہوتا تو پوری ٹیم اخبار فروش بن جاتی اور سڑکوں پر چیخ چیخ کے اخبار بیچتی۔ اس سے عوام پر گہرا اثر پڑتا اور دیکھتے دیکھتے اخبار بک جاتے تھے۔''(۵)

کانگریس پارٹی کا ایک سیشن رام گڑھ میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں سامراجیت کے خلاف

دوبارہ ستیہ گرہ کا ریزولیشن پاس ہوا تھا جس سے حکومت کو بہت تشویش ہوئی تھی۔ چونکہ سجاد ظہیر کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تھے جو غیر قانونی قرار دی گئی تھی، انہیں گرفتار کرلیا گیا تھا۔ کانگریس کے بھی سیاسی ورکز بہت بڑی تعداد میں گرفتار ہوئے تھے۔ اس سے پہلے بھی بنّے بھائی تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے جیل جاچکے تھے۔ زیادہ تر قیدیوں کو دیوی کیمپ میں نظر بند کیا گیا تھا۔ یہ جگہ راجستھان کے ایک ریگستان میں واقع تھی جس کی نگرانی فوج کے سپرد تھی۔ ایسے قیدیوں میں ڈاکٹر زیڈ۔اے۔احمد، ڈاکٹر اشرف، محمود الظفر وغیرہ شامل تھے جنہیں دیوی کیمپ میں ہی رکھا گیا تھا مگر بنّے بھائی کو سینٹرل جیل لکھنؤ میں بند کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں جناب سبط حسن ایک نہایت دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں:

''میں ان دنوں انگریزی روزنامے 'نیشنل ہیرالڈ' جس کی صدارت جواہر لال نہرو کرتے تھے میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا۔ ایک روز گھر پر بیٹھا ہوا تھا کہ بارہ تیرہ برس کا ایک لڑکا مجھ سے ملنے آیا۔ اس نے اپنا نام بتایا اور کہنے لگا کہ میں لکھنؤ سینٹرل جیل کے ڈپٹی سپر یڈنٹ کا بیٹا ہوں اور مجھے سجاد ظہیر صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ میرے گھر کی دو تین بار تلاشی ہوچکی تھی اس لیے میں نے بڑی احتیاط سے گفتگو شروع کی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اگر بنّے بھائی نے تمھیں بھیجا ہے تو کوئی پرچہ رقعہ بھی دیا ہوگا۔ لڑکا مسکرایا اور اپنے جوتے کے اندر سے ایک چھوٹا سا کاغذ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ بس خیر و عافیت کے چند فقرے اور لکھا تھا کہ بوبو ہر ہفتہ مجھ سے ملنے آتی ہیں۔ ان سے کہنا تو تمہارے لیے بھی اجازت حاصل کرلیں گی۔ پھر لکھا تھا کہ یہاں تمہارے اسکول کے ایک ساتھی سے ملاقات ہوئی وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ اس کے لیے اگر تم کچھ کتابیں اور ضرورت کی کچھ چیزیں بھجوا سکو تو بہتر ہے۔ میں نے حافظے پر زور ڈالا مگر بالکل یاد نہیں آیا۔ میں نے اس لڑکے سے پوچھا میاں اس خط میں ایک سیاسی قیدی کا ذکر ہے مگر نام نہیں لکھا۔ تم جانتے ہو کہ یہ شخص کون ہے۔ لڑکے نے جواب دیا کہ جی ہاں ان کا نام جے بہادر سنگھ ہے۔ مجھے بڑا

اچنبھا ہوا کہ جس جئے بہادر سنگھ کو میں جانتا تھا وہ تو بڑا مُخنی سا کھلنڈر لڑکا تھا۔ پھر مجھے یہ خیال آیا کہ کہیں یہ وہی جئے سنگھ تو نہیں جو دہشت پسند ہو گیا تھا اور پپرڈی کے مقام پر ریل گاڑی پر چھاپا مارنے کے جرم میں سزا کاٹ رہا تھا۔ میں نے اس لڑکے سے پوچھا تو اس نے کہا جی ہاں یہ وہی جئے بہادر سنگھ ہے مگر اب وہ Terrorist نہیں رہا بلکہ جیل ہی میں کتابیں پڑھ پڑھ کر کمیونسٹ ہو گیا ہے۔ میں نے کچھ کتابیں اور ضرورت کی کچھ چیزیں جو عُجلت میں فراہم ہو سکتی تھیں اکٹھا کیں اور اسے لڑکے کے حوالے کر دیں۔ میں نے کئی بار اس سے ملنے کی بھی کوشش کی مگر اجازت نہیں ملی۔ ملک جب آزاد ہوا تو دوسرے دہشت پسندوں کی طرح جئے بہادر سنگھ بھی دس بارہ سال قید کاٹنے کے بعد رہا ہو گیا اور اس کا شمار اعظم گڑھ کے سب سے مقبول اور مخنتی لیڈروں میں ہونے لگا۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر صوبائی کارکن بھی منتخب ہوا تھا مگر افسوس ہے کہ میں اس کی رہائی کے بعد بھی جئے بہادر سنگھ سے مل کبھی نہ سکا اس لیے کہ میں ملک سے باہر تھا۔ سُنتا ہوں کہ جئے بہادر سنگھ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔''(۶)

سجاد ظہیر 12 مارچ 1940 کو گرفتار ہوئے۔ ان کی گرفتاری کے وقت گھر میں ان کی والدہ کے علاوہ اور کوئی موجود نہ تھا۔ ان کی شادی کو سال بھر ہی ہوا تھا مگر اس وقت ان کی بیوی رضیہ الہ آباد میں تھیں۔ اپنی گرفتاری کے سلسلے میں سجاد ظہیر نے اپنے تاثرات اپنے ایک مضمون 'سرگزشت' میں بیان کیے ہیں۔ سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

'' بہر حال انگریزی سرکار نے سب سے پہلا حملہ ہم کمیونسٹوں پر کیا۔ مارچ 1940 میں جب میں لکھنؤ میں تھا اور اسی رات کو رانچی میں کانگریس کے سالانہ بڑے اجلاس میں شرکت کے لیے روانہ ہونے والا تھا، ایک کالی اسٹیشن ویگن اور مصلح سپاہیوں سے بھری جیپ علی الصبح ہمارے گھر 'وزیر منزل' میں اندر آ کر رکی اور اس میں سے ایک انگریز پولس افسر نے اندر آ کر مجھے بلایا اور میری گرفتاری کا وارنٹ مجھے دکھایا۔ میری بیوی رضیہ اس وقت الہ آباد میں

تھیں۔ اس وقت گھر میں صرف میری والدہ تھیں۔ وہ کافی پریشان ہوئیں اور انگریز افسر کو بُرا بھلا کہنے لگیں اور اس سے پوچھنے لگیں کہ میری طرح کے نیک اور اچھے آدمی کو کیوں گرفتار کیا جارہا ہے۔ انگریز افسر کافی مہذب تھا۔ اس نے میری والدہ کی تردید نہیں کی اور اپنی مجبوریوں کا اظہار کیا۔ اوپر کا حکم تھا اور اسے اس کے مطابق عمل کرنا تھا۔ میں اس بحث میں شریک نہیں ہوا اور جلدی جلدی اپنا بستر اور ضروری سامان پیک کرنے لگا۔ اور تھوڑی دیر میں جیل جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ چلتے وقت میری ماں نے مجھے میرے ہاتھ میں ایک سُرخ گلاب کا پھول دے دیا۔ جب میں ان کو آداب کر کے اور گلے مل کر رخصت ہونے لگا تو مجھے اس کی خوشی ہوئی کہ میری والدہ رو دھو نہیں رہی تھیں۔ وہ خاموش تھی اور ان کی صورت سے غصہ ٹپک رہا تھا۔ اس وقت لکھنؤ میں دو جیل تھے۔ ایک سینٹرل اور ایک ڈسٹرکٹ۔ دونوں ملحق تھے۔ مجھے سینٹرل جیل رکھا گیا۔ میں اس واردات سے دو بار پہلے بھی تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے جیل کی ہوا کھا چکا تھا۔'' (۷)

اپنے مضمون 'سرگزشت' میں جو گنگ وجمن کے سجاد ظہیر نمبر میں 1973 میں شائع ہوا اس میں سجاد ظہیر نے اپنی اس گرفتاری کا بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہ ان کی تیسری جیل یاترا تھی لیکن پہلی دو گرفتاریوں کی نسبت اس بار انہیں ایک پریشانی اور گھبراہٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ شادی کے ایک سال کے عرصے میں ہی انہیں اپنی رفیقہء حیات سے جدا ہونا پڑا جبکہ ابھی تک وہ ایک دوسرے کو پوری طرح پہنچان بھی نہیں پائے تھے۔ اس طرح کے احساسات کے باوجود سجاد ظہیر میں پریشانی کو برداشت کرنے کی جرأت بھی تھی اور حوصلہ بھی۔ اس مضمون میں آگے چل کر اپنے اس جذبے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''جیل کے پھاٹک میں قدم رکھنے کے بعد سب سے پہلا خیال جو دل و دماغ میں گردش کرتا تھا وہ یہی تھا کہ دشمن کے حملے کا کیسے مقابلہ کیا جائے۔ کیسے خود کو ایسی جسمانی حالت میں رکھا جائے کہ اگر ایک طرف جسمانی صحت تمام اذیتوں

اور محرومیوں کے باوجود برقرار رہے تو دوسری طرف نصب العین پر یقین اور اعتماد اور دل میں سامراجی اور رجعتی قوتوں سے تادم حیات لڑنے اور ان کو شکست دینے کا حوصلہ اور ولولہ باقی رہے۔ اگر میں اپنی اس سعی میں کامیاب ہوا تو دراصل اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود اور اس کے باوجود کے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ہیں۔ اور مجھے اپنے وطن کے سرسبز کھیتوں اور اس کے نرم اور روپہلے دریاؤں، اسکے گھنے جنگلوں، اس کی گنجان بستیوں اور ان سے بلند ہونے والی مردوں عورتوں اور بچوں کی صداؤں سے محروم کردیا گیا ہے۔ اور میں آزادنہ اپنے دیہاتوں، قصبوں اور شہروں میں گھوم پھر نہیں سکتا۔ پھر بھی یہ سب قید کی تنہائی میرے دل کے پردے پر چلتی پھرتی اور بولتی تصویروں کی طرح جو ہر گھڑی اور ہر دم موجود تھیں۔ اور مجھے زندہ اور صحیح سلامت رکھنے میں میری سب سے بڑی مددگار تھیں۔ اور ایسا ہونا یہ ثابت کردے گا کہ حق کے لیے لڑنے والوں کی پابندی ان کی نہیں بلکہ ان جابروں کی شکست ہے جنہوں نے مجھے اور میری طرح کے ہزاروں لاکھوں دوسرے آزادی خواہوں کو اپنے ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا ہے۔"(۸)

اپنی گرفتاری کا منظر جو سجاد ظہیر۔نے خود بہ نفس نفیس دیکھا اور محسوس کیا اس کا ذکر انہوں نے اپنی محرکۃ الآرا تخلیق 'روشنائی' میں بھی بڑی خوبی سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب جون 1940 میں ہٹلر نے سوویت روس پر حملہ کیا تو اس کے نتیجے کے طور پر بین الاقوامی سیاست میں بہت تبدیلیاں آئیں جن کا ہمارے ملک پر بھی اثر پڑا۔ ہمارے ملک کی آزادی کی مہم انگریزوں کی سامراجیت کے ہی خلاف تھی اس لیے لڑائی جب تک جرمنی اور برطانیہ کے خلاف تھی عوام یہی چاہتی تھی کہ سامراجی برطانیہ کو اپنے ملک کے وسائل اس جنگ میں استعمال کرنے نہ دیا جائے تاکہ برطانیہ کی مصیبتوں کا فائدہ اٹھا کر اپنی آزادی کی جدوجہد کو تقویت مہیا کی جائے۔ داہنے بازو کے لیڈر کبھی بھی انقلابی جدوجہد نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو صرف حکومت پر دباؤ ڈالنے کے حق میں تھے تاکہ اس طرح سامراجی حکومت ان سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو جائے۔ چنانچہ جب وہ لوگ سمجھوتہ کرنے میں ناکام رہے تو

کانگریس نے پھر سے انفرادی سول نافرمانی کا اعلان کر دیا اور کانگریسی ورکرز جیلوں میں بھر دیئے گئے۔ کمیونسٹ تو پہلے سے ہی سمجھوتے کے خلاف تھے اور اسی وجہ سے جیلوں میں کافی تعداد میں جا چکے تھے۔ سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

"جب سوویت یونین پر حملہ ہوا تو ہر ایسے آزادی خواہ کے سامنے، جو بین الاقوامی حالات کو تھوڑا بھی سمجھتا تھا، یہ سوال اُٹھ کھڑا ہوا کہ اگر ہٹلری فاشسزم کی اس جنگ میں کامیابی ہوگئی تو اس کے معنی یہی ہوسکتے ہیں فاشسٹ سامراج ساری دنیا پر حاوی ہو جائے، دنیا کے سارے محکوم ممالک اور بھی زیادہ سختی سے کچلے جائیں، غلام بنائے جائیں اور بین الاقوامی سوشلزم کی عوامی تحریک کافی مدت کے لیے دبا دی جائے۔ اس کے برخلاف اگر سوویت یونین کی فتح ہوئی تو اس کے سبب انقلابی مزدور تحریک اور تمام دنیا کے محکوم ممالک کی آزادی کی تحریکیں مضبوط ہوں گی اور امریکی اور برطانوی اور فرانسیسی سامراج باقی رہیں گے۔ پھر بھی مجموعی حیثیت سے دنیا کی عوامی قوتوں میں بہت اضافہ ہوگا اور خود ہمارے اپنے ملک کی آزادی کی کامیابی کے امکانات بڑھ جائیں گے۔

ایسی صورت میں یہ ضروری تھا کہ ہماری وطنی آزادی کی جدوجہد نئے حالات میں نئے طریقے سے چلائی جائے۔ وہ نیا طریقہ ایسا ہونا جس کے ذریعہ سے ہمارے وطن کی عوام کا اتحاد، تنظیم اور قوت بڑھے۔ وہ برطانوی سامراج کو مجبور کرسکیں کہ وہ ہمیں آزاد کرے اور ساتھ ہی ساتھ اس عظیم ملک کی قوت بین الاقوامی فاشزم کے خلاف جنگ کو کامیاب کرنے میں لگائی جاسکے۔ برطانوی حکمراں ایسا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے تسلط کو برقرار رکھتے ہوئے اور آزادی خواہوں اور عوام پر مختلف طریقوں سے ظلم کرتے ہوئے صرف اپنے مذموم سامراجی طریقوں سے اس ملک کے وسائل کو جنگ کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔" (۹)

یہی وہ حالات تھے جن کے زیر اثر سجاد ظہیر قید ہوئے اور آزاد بھی ہوئے۔ لیکن اس پہلی

اسیری کے دوران انہیں احساس ہوا کہ اوپری اور درمیانہ طبقے کے لوگ جو شہروں میں رہتے ہیں اپنے دیرینہ ادب سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یونیورسٹی میں پڑھے لوگ مشکل سے مہذب اور تعلیم یافتہ کہے جانے کے لائق ہوتے ہیں۔ ہم اپنی پرانی روایتوں کو اس لیے بھول جاتے ہیں کیوں کہ علم کی جستجو اور تحقیق میں ہمیں مغربی علمی روایتیں زیادہ صحت مند نظر آنے لگتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس صورت حال کی ذمہ داری سامراجی نظام تعلیم اور ہماری معاشرت کی بوسیدہ حالت پر ہے جو غلامی کی وجہ سے گزشتہ دو سو سال سے ہمارے ملک میں پیدا ہوگئی ہے۔ اس لیے وہ اپنے ملک کے ادیبوں، فنکاروں، شعرا و ادبا کو یہ درس دیتے ہیں کہ جس حد تک ممکن ہو اجتماعی طور پر اپنی تعلیم اور تربیت حاصل کر کے صحیح معنوں میں ایمان دار ادیب و فنکار بنیں۔ اور اگر ہمارے وطن میں عظیم اور اچھے فن کی تخلیق ہوئی اور علم کا چراغ روشن ہوا تو انہی ادیبوں، فنکاروں اور گروہوں کے ہاتھوں ہوگا۔

☆☆☆☆☆☆

کتابیات

نمبرشمار کتاب کا نام	مصنف	ناشر/پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱) The History & Culture of Indian People Vol.XI		بھارتی ودیا بھون+	1989	555
۲) ادب اور روشن خیالی	سبط حسن	مکتبہ دانیال۔کراچی	1990	141
۳) سجاد ظہیر۔ حیات اور خدمات	زیب النسا	بن ٹولہ اللہ آباد	1999	56
۴) ادب اور روشن خیالی	سبط حسن	مکتبہ دانیال۔کراچی	1990	160
۵) انگارے سے پگھلا نیلم تک	سید مظہر جمیل	اکادمی بازیافت۔کراچی	2005	36
۶) مُغنی آتشِ نفس سجاد ظہیر	سبط حسن	مکتبہ دانیال۔کراچی	2005	28
۷) سجاد ظہیر۔شخصیت اور فکر	سید جعفر احمد	مکتبہ دانیال۔کراچی	2005	230
۸) سجاد ظہیر۔شخصیت اور فکر	سید جعفر احمد	مکتبہ دانیال۔کراچی	2005	232
۹) روشنائی	سجاد ظہیر	پرائم ٹائم پبلیکیشنز۔لاہور	2006	232

☆☆☆☆

۲۔ رودادِ بند و سلاسل۔ نقوشِ زنداں

1939 میں جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو کانگریس کی طرف سے جواہر لال نہرو اور کمیونسٹوں کی طرف سے سجاد ظہیر سب سے آگے تھے۔ ملک میں آزادی کے لیے ایک خاص طرح کا جوش و خروش تھا۔ لیڈر لوگ جگہ جگہ تقریریں کر کے عوام میں بیداری کا جذبہ پیدا کر رہے تھے۔ سجاد ظہیر بھی حکومت برطانیہ کے خلاف بڑی اشتعال انگیز تقریریں کرنے لگے تھے۔ اگرچہ کانگریس پر بطور پارٹی کوئی پابندی عائد نہیں تھی لیکن کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی پارٹی قرار دیا گیا تھا۔ بہت سارے لیڈر گرفتار کیے جا رہے تھے۔ سجاد ظہیر بھی ایک بار 1937 میں اور دوسری بار 1938 تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے جیل جا چکے تھے۔ تیسری بار جب انہیں جیل جانا پڑا تو وہ ایک لمبے عرصے کی سزا تھی۔ ان کے ساتھ ہی اور بھی بہت سے لیڈروں اور ورکروں کی گرفتاری عمل میں آئی۔ اس بار قید کی میعاد طویل دو سال کی تھی۔ ان کی شادی کو صرف پندرہ مہینے ہی ہوئے تھے اور ان کی شریک حیات رضیہ پیٹ سے تھیں۔ ایسے حالات میں ان کی ذہنی کیفیت کیا رہی ہوگی یہ وہی جان سکتے ہیں جنھیں ایسے حالات سے گزرنا پڑا ہو۔

ان دو سال کے بند و سلاسل کے درمیان سجاد ظہیر نے لکھنؤ جیل میں بہت سارے خطوط لوگوں کو لکھے جن میں زیادہ تعداد ان خطوط کی ہے جو انہوں نے اپنی بیوی کو لکھے۔ یہ تمام خطوط رضیہ نے سنبھال کر رکھے جنھیں جون 1951 میں 'نقوشِ زنداں' کے عنوان سے مرتب کر کے شائع کیا۔

عاشقی کا جو پہلو سجاد ظہیر کے خطوں میں شروع سے آخر تک برقرار ہے کہیں بھی ان کے

جذبۂ محبت میں کسی کمی کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ ان خطوں میں جگہ جگہ رضیہ سے اس بات کا گلہ شکوہ ہے کہ وہ باقاعدگی سے وقت پر خط نہیں لکھتیں۔ انہیں رضیہ کے خطوں کا بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جیل میں آنے جانے والے خط سینسر ہو کر جاتے ہیں اس لیے ان کا وقت پر نا ملنا کوئی حیران کن بات نہیں۔ پھر بھی اس تاخیر کے لیے وہ رضیہ سے چھیڑ چھاڑ اور گلہ شکوہ کرتے ہی رہتے تھے۔

'نقوشِ زنداں' کے مجموعے میں کُل اکیاسی (۸۱) خط شامل کیے گئے ہیں جن میں ستر (۷۰) خط تو سینٹرل جیل سے لکھے ہوئے ہیں اور باقی گیارہ (۱۱) خط سجاد ظہیر نے اپنی علالت کے دوران کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ سے لکھے تھے۔ اس انتخاب میں رضیہ نے وہ خطوط شامل نہیں کیے جو خود رضیہ نے سجاد ظہیر کو لکھے تھے۔ وجہ ہم سمجھ سکتے ہیں۔ کئی جذبات پردہ پوشی میں ہی رہیں تو خوبصورت لگتے ہیں۔ پردے کے باہر ان کی وہ خوبصورتی نہیں رہتی۔

جیل میں انسان اپنی تنہائی سے معذور ہو جاتا ہے۔ اُسے اپنی بیوی، بچے اور دیگر رشتے دار بہت یاد آتے ہیں۔ وہ ماحول اُس کے لیے اجنبی ہوتا ہے جس میں وہ خود کو ڈھالنے میں دقت محسوس کرتا ہے۔ اس کو ہر وقت یہ امید لگی رہتی ہے کہ کوئی ملاقاتی آئے تاکہ وہ اس کے ساتھ چند لمحے خوشگوار بات چیت میں گزار سکے۔ گھر کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس کی نظر رہتی ہے جو شاید اُسے گھر میں رہ کر دکھائی بھی نہ دیتیں۔ جیل میں روزمرہ کا ایک ہی پروگرام ہوتا ہے جو بہت جلد بوریت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تب انسان اس ماحول سے فرار کی تدبیریں سوچنے لگتا ہے۔ دل آزادی کی کھلی فضا میں سانس لینے کو ترستا ہے لیکن وہ اسے میسّر نہیں ہوتی۔ قدرت کے مناظر جو باہر ہر روز دیکھنے کو ملتے تھے اب جیل میں شاذونادر ہی ان کا دیدار ہوتا ہے۔ اگر کبھی بُلبُلوں کا ایک جوڑا جیل کے احاطے میں آکر چہکنے لگتا ہے تو کئی طرح کے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں۔ کوئی پھول کھلتا ہے تو پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

سجاد ظہیر نے رضیہ کو پہلا خط 16 مارچ 1940 کو سینٹرل جیل سے لکھا۔ اس پہلے خط کے مطالعے سے ہی مندرجہ بالا احساسات کی ترجمانی ہو جاتی ہیں۔ وہ تمام مایوسیاں اور امیدیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اس خط میں جگہ جگہ بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ اس خط کی ابتدا ہی مایوسی کے احساس سے ہوتی ہے۔ رضیہ ایک دن پہلے اُن سے ملاقات کے لیے آئی تھی اور ان کا خیال تھا کہ دوسرے دن بھی

آ ئے گی مگر وہ نہ آئی اور اس لیے ان کی دل شکنی ہوئی۔ محبت کرنے والوں کا سب سے قیمتی ورثہ یا تو خطوط ہوتے ہیں یا ملاقاتیں۔ جب وہ ان دونوں سے محروم ہو جاتے ہیں تو انہیں سخت مایوسی کا احساس ہوتا ہے۔ سجاد ظہیر کو بھی یہی دشواری درپیش تھی۔ انہیں رضیہ سے جدائی کا احساس پریشان کر رہا تھا جو عین قدرتی امر ہے۔ لکھتے ہیں اب جبکہ تنہائی ہے بس تمہارا ہی خیال ہر دم آتا ہے۔ جیل میں بھی وہ جیل کے ماحول سے سمجھوتہ نہیں کر پاتے۔ جس کوٹھری میں وہ بند ہیں وہ انہیں بالکل خیالی معلوم ہوتی ہے اور انہیں یقین نہیں ہوتا کہ وہ اس کوٹھری میں بند ہیں اور اس وجہ سے رضیہ تک نہیں پہنچ پاتے۔

موسم کے حال کی ابتدا بھی اسی خط سے کرتے ہیں اور قید کے تقریباً دو سال کے دوران یہ ذکر ہر خط میں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس وقت بڑی خوشگوار ہوا چل رہی ہے اور جب گردن کھڑکی کی طرف موڑتا ہوں تو آسمان پر وہ ستارہ چمکتا ہوا نظر آتا ہے جو میں نے ایک دفعہ تمہیں الہ آباد جمنا کنارے دکھایا تھا۔ آگے کہتے ہیں کہ ابھی تھوڑی ہی دیر میں چاندنی بھی یہاں سے دکھائی دینے لگے گی مگر چاند دکھائی نہ دے گا۔ اور کہتے ہیں چاند دکھائی نہ دینا اچھا ہی ہے کیونکہ اس سے اور کوفت ہوتی ہے اور اکیلے پن کا احساس اور تیز ہو جاتا ہے۔ محبوب سے جدائی دل و دماغ پر کیا کیا پرچھائیاں ڈالتی ہے ان کا ذکر بھی سجاد ظہیر نے اس خط میں کیا ہے۔ کہتے ہیں:

> ''تمہاری یاد تمہاری صورت، تمہاری ہنسی کی آواز، تمہاری سب باتیں، ایک ایک چیز، ہمارے کمرے، وہ صبحیں، وہ شام اور راتیں، یہ سب اتنی صاف دل و دماغ پر اپنی پرچھائیاں ڈال رہی ہیں کہ میں دنیا کا نہیں بلکہ عام خیال کا باشندہ بن گیا ہوں۔ ان سب کے ساتھ ایک ایسا شدید روحانی درد ہے جیسے کوئی دل کے نازک ترین احساسات کو بے دردی سے مسل دے، اس درد کا کوئی علاج سمجھ میں نہ آئے اور درد بڑھتا ہی چلا جائے۔''(۱)

اسیری میں انسان میں جو ذہنی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ انسان کے مشاہدے اور احساس کی قوت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ بہت قریب سے قید کوٹھری کے اندر اور باہر کے ماحول کا بھرپور مشاہدہ کرتا ہے۔ رات کے وقت قید خانے کے اندر کا اندھیرا، چند ابابیلوں کا بے مقصد اِدھر اُدھر اُڑنا، آس پاس سے دیہات سے آنے والے لوگوں کے گانوں کی آواز اور ان

کے ڈھول کا شور، ساتھی قیدیوں کی بے معنی چھوٹی باتیں، کسی کی مسکراہٹ یا کسی کی بے چینی، یہ سب کچھ اہم لگنے لگتا ہے۔ یہ تمام مایوس کن باتیں ہیں جو وہ رضیہ کو لکھ کر بتا تو رہے ہیں لیکن یہ بھی محسوس کر رہے ہیں کہ ان باتوں سے رضیہ کو ضرور پریشانی ہوگی۔ اس لیے اُسے مشورہ دیتے ہیں کہ وہ یہ پڑھ کر خواہ مخواہ پریشان نہ ہو کیونکہ ان کی یہ ذہنی کیفیت تو گرفتاری کی وجہ سے ہے جو وقت گزرنے پر ختم ہو جائے گی۔

جب انہوں نے پہلا خط لکھا تو انہیں قید ہوئے پانچ دن ہو گئے تھے۔ ان پانچ دنوں میں روزانہ ان کا کیا پروگرام ہوتا تھا اس کا اس خط میں بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ صبح کے ساڑھے پانچ بجے اُٹھ کر تھوڑی دیر ورزش کرتے اور پھر وہاں کے باغیچے میں گھومتے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے نہا دھو کر تیار ہو جاتے تھے۔ ناشتہ کرنے کے بعد کوئی کتاب یا اخبار پڑھتے یا کوئی ملنے والا آ گیا تو چند منٹ اس سے ملاقات کی۔ کھانا ساڑھے بارہ ایک بجے دوپہر کو پروسا جاتا تھا۔ کھانے کے بعد تھوڑا آرام یا اگر نیند غالب ہو جائے تو ذرا سا سو لینا۔ چار بجے کے قریب بیڈمنٹن کھیلتے تھے جس کے ایک گھنٹے بعد شام کی چائے ہوتی تھی۔ اس کے بعد جلد ہی یعنی ساڑھے پانچ بجے جیل پر وحشت چھا جاتی تھی۔ سب قیدیوں کو اپنی اپنی کوٹھریوں یا بیرک میں بند کر دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد کا وقت بڑی مشکل سے کٹتا تھا کیونکہ اس وقت نہ روشنی ہوتی تھی نہ مکمل اندھیرا، مچھروں کی بھرمار اور اگر چند منٹ چہل قدمی کرنے کو دل کرے تو جگہ ندارد۔ لکھتے ہیں کہ سات بجے تک اندھیرا اچھی طرح ہو جاتا تھا اور پھر وہ پڑھائی کرنے لگتے تھے یا خط لکھتے تھے۔ آٹھ بجے رات کا کھانا لگ جاتا تھا اور ساڑھے دس بجے بستر پر دراز ہو جاتے تھے۔ جیل میں انہیں ہفتے میں صرف ایک خط لکھنے کی اجازت تھی اور ظاہر ہے کہ اسیری کے ابتدائی دور میں وہ یہ ایک خط صرف رضیہ کو ہی لکھتے تھے۔

جب سجاد ظہیر قید ہوئے تو رضیہ ایم۔ اے کی تیاری کر رہی تھی اور پیٹ سے بھی تھی۔ انہیں رضیہ کی پریشانیوں کا پورا احساس تھا۔ اس کا امتحان سر پر تھا اور وہ بالکل اکیلی تھیں جس سے وہ کافی پریشان تھے۔ اُس کی ہمت افزائی کے لیے اُسے لکھتے ہیں کہ انہیں امید ہے کہ ان تمام پریشانیوں کے باوجود وہ اپنے امتحان میں کامیابی حاصل کریں گی۔

قید میں بھی سجاد ظہیر کے ذہن میں گھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں نمایاں رہتی تھیں۔ خط میں رضیہ کو

تاکید کرتے ہیں کہ وہ ان کی کتابوں کی الماریوں کی اچھی طرح صفائی کروادے اور بازار سے Naphthelene (نیپتھلین) منگواکران میں ڈلوادے تاکہ کتابوں کو کیڑا نہ کھاجائے۔اور یہ بھی کہ ان کے گرم کپڑوں میں بھی یہی دوائی ڈال دے۔

سجاد ظہیر کا 16 مارچ 1940 کا لکھا ہوا پہلا خط جس میں انہوں نے ہر پہلو پر ایک قیدی کی حیثیت سے غور کیا ہے اس سے ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو ان کے وسیع مشاہدے، کی وضاحت کرتا ہے۔

''جان سے زیادہ عزیز رضیہ۔میرا خیال تھا کہ تم دوسرے دن صبح کو بھی آؤ گی اور یہاں اطلاع بھی ملی کہ آنے والی ہو۔لیکن جب بارہ بج گئے تو بالکل مایوسی ہوگئی کیونکہ میں سمجھ گیا کہ اب تم الہ آباد کے لیے روانہ ہوگئی ہوگی، خیر۔

خط لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔کیونکہ اب جبکہ تنہائی ہے بس تمہارا ہی خیال ہر دم آتا ہے۔یہ چھوٹی سی کوٹھری جس میں اس وقت بند ہوں، (شام کے سات بجے ہیں اور ہم لوگ پانچ بجے سے مقفل ہوجاتے ہیں) بالکل خیالی معلوم ہوتی ہے۔یقین نہیں ہوتا کہ اس میں بند ہوں اور اس وجہ سے تم تک نہیں پہنچ سکتا،بس ایک احساس ہے،ایک اصلیت ہے اور ایک حقیقت۔اور وہ یہ کہ ایک دوسرے سے جدا ہیں،دُور ہیں،مجبور ہیں اور پاس نہیں ہوسکتے۔اس وقت بڑی خوشگوار ہوا چل رہی ہے اور جب گردن کھڑکی کی طرف موڑتا ہوں تو آسمان پر وہ ستارہ چمکتا ہوا نظر آتا ہے جو میں نے ایک دفعہ تمہیں الہ آباد جمنا کنارے دکھایا تھا۔یاد ہے؟ غالباً زہرہ۔۔خوب چمکتا ہوا،(یا خوب چمکتی ہوئی)۔ بھی تھوڑی ہی دیر میں چاندنی بھی یہاں سے دکھائی دینے لگے گی مگر چاند دکھائی نہ دے گا۔اور کہتے ہیں چاند دکھائی نہ دینا اچھا ہی ہے کیونکہ اس سے اور کوفت ہوتی ہے اور اکیلے پن کا احساس اور تیز ہوجاتا ہے۔''(۲)

اس خط سے اقتباس لینے کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ جن جذبات کا اظہار سجاد ظہیر نے کیا ہے اور زندگی کے جن پہلوؤں پر انہوں نے غور کیا ہے وہ ایک طرح سے آئندہ خطوں کی تمہید ہیں۔ یہی جذبات بار بار دیگر خطوں میں بھی اُبھر کر سامنے آتے ہیں اور یہی سجاد ظہیر کی اسیری میں ایک وفادار دوست کی طرح ان کا آخر تک ساتھ نبھاتے ہیں۔ اگر بیچ کے خطوں کو نظر انداز کر کے ان کے آخر سے پہلے کے ایک خط پر غور کیا جائے تو وہی جذبات اور وہی احساسات جگہ جگہ بکھرے ہوئے ملیں گے۔ رضیہ سے بے پناہ محبت کی جھلک تو ہر خط میں دکھائی دیتی ہے۔ خط کا القاب ہی اس محبت کی طرف بے اختیار اشارہ کرتا ہے۔ ہر خط کا القاب رضیہ سے ان کی لافانی محبت کا آئینہ ہے۔ یہ تمام القاب جیسے 'میری زندگی کی بہار' یا 'میرے دل و جان کی مالک' یا 'میری جان' یا صرف 'جان' وغیرہ ہر خط میں موجود ہیں۔ کہیں کہیں 'میری پیاری' یا 'میری جان سے بھی پیاری' یا 'میری پیاری بیگم' اور 'میری بہت پیاری بیوی' جیسے القاب کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ یہ سب اس کے باوجود کہ ان کے خط سنسر ہو کر جاتے تھے اور کچھ انجانے لوگ انہیں پڑھتے تھے۔ اگر انہیں سنسر کا خوف نہ ہوتا تو کئی گنا زیادہ محبت بھرے القاب استعمال کیے ہوتے۔ محبت کا یہ تیز ترین اظہار 'نقوشِ زنداں' میں شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔

سجاد ظہیر کی طرح فیض احمد فیض کو بھی دورِ اسیری سے دوچار ہونا پڑا تھا جب وہ راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے تھے اور تقریباً چار سال مختلف جیلوں میں نظر بند رہے۔ انہوں نے بھی اپنے جذبات کا اظہار ان خطوں میں کیا ہے جو انہوں نے اپنی بیوی ایلس کو قید کے دوران لکھے تھے۔ انہوں نے ایک خط مورخہ 9 نومبر 1951 کو حیدرآباد سینٹرل جیل سے اپنی رفیقۂ حیات کو لکھا تھا جس میں ذیل کے تاثرات عیاں کیے ہیں:

> ''بہت سے لوگوں کی دوستی اور محبت، تمام بہاریں، سب برساتیں، صبحیں اور شامیں، غروب آفتاب اور طلوع ماہتاب، الفاظ، اموات، رنگ و بو کا حسن، لطف و انبساط کی بے انت وارداتیں، ان سب سے جیل کی بے رونقی میں دل پر ایسی حسرت طاری ہوتی ہے جس سے پہلے ہم آشنا نہیں تھے۔ اگر دو چار دوستوں نے دعا کی یا زندگی میں درد و کراہت کے چند لمحے پیش آئے تو ان

نعمتوں کی میزان کے سامنے ان کی کیا وقعت ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ یہ احساس پوری طرح جیل خانے میں میسر آسکتا ہے اس لیے کہ جیل خانے کی دنیا باقی دنیا سے الگ تھلگ ایک دنیا ہے بلکہ یوں کہنا کہ ایک طرح کی 'اگلی دنیا' ہے جو روزمرہ دنیا سے اتنی دور دراز اور ایسی بلند و بالا معلوم ہوتی ہے کہ اس کی نارسا بلندیوں پر سے انسان نیچے کی انسانی دنیا کو بہت بسیط اور جامع نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ اگر کوئی دیکھنا چاہے تو۔ ہم تو بیشتر اوقات ادھر دیکھتے ہی نہیں۔ دامن دل کھینچنے کے لیے ہر گوشۂ تنہائی کی اپنی دلچسپیاں بھی بہت ہوتی ہیں۔''(۳)

فیض کے اس خط کو دیکھیں تو فیض میں اور سجاد ظہیر کے جذبات میں کتنی ہم آہنگی جان پڑتی ہے۔ جیل کے بارے میں سجاد ظہیر نے بھی بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

جیل میں سجاد ظہیر کی زندگی کا دوسرا شدید المیہ ان کے احساس تنہائی سے وابستہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کرتے تھے جس کی کمی کو وہ رضیہ کے خطوں سے پوری کرتے تھے۔ تنہائی کی تکلیف وہ المیہ کا یہ عالم تھا کہ رضیہ کو لکھتے ہیں تمہارے جانے کے کچھ دن بعد تک بہت بُرا لگتا ہے اور طبیعت بہت مضمحل رہتی ہے۔ اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ آج تمہیں یہاں سے گئے ہوئے چار دن ہوئے۔ اب کہیں جا کر جیل کی نارمل زندگی شروع ہوئی ہے۔ رضیہ کے خط دیر سے آنے سے پریشان ہو جاتے تھے۔ اپنے 23 مارچ 1940 کے خط میں اس کی شکایت کی ہے۔ لکھا ہے آج تمہارا دوسرا خط ملا جو شاید تم نے 18 مارچ کو لکھا ہو کیونکہ تم نے تاریخ نہیں لکھی ہے۔ لکھنؤ کی مہر 19 مارچ کی تھی اور آج مجھے وہ خط دیا گیا۔ اس سے پہلے تمہارا ایک خط 17 کو مجھے ملا تھا اور اسی دن صبح میں ایک خط تمہیں بھیج چکا تھا۔ تعجب ہے کہ تمہارا دوسرا خط لکھنے کے وقت تک نہ ملا۔ 19 اپریل کے خط میں لکھتے ہیں ''ایک ہفتہ سے زیادہ ہوا تمہارا کوئی خط نہیں آیا۔ کیوں؟ میرا خط یہاں سے 2 اپریل کو گیا تھا بتاؤ وہ ملا کہ نہیں۔ بہت پریشانی ہے کہ آخر تمہارا خط کیوں نہیں آیا۔'' رضیہ کا خط ملنے سے انہیں بہت تسکین ہوتی تھی جیسے وہ روبرو کھڑی ہے اور ان سے گفتگو کر رہی ہے۔ اگر خط میں حالات کی تفصیل نہیں ہوتی تھی یا کم ہوتی تھی تو گلہ کرتے تھے۔ ایک خط میں ایسا ہی شکوہ کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ تم نے اپنے متعلق اتنا کم لکھا ہے کہ بالکل تسکین نہیں ہوئی۔ ان کے خطوں میں زیادہ تر رضیہ کی کوتاہیوں کا ہی ذکر

ہوتا تھا۔ بیوی کو چھیڑنے کے لیے لکھتے ہیں کہ اگر میں اپنی صفائی پیش کروں تو فضول، اور اگر کچھ نہ لکھوتو تم نہ معلوم کیا سمجھو۔ اس وقت تو ایسا معلوم ہوگا کہ میں کچھ بھی کروں لیکن تمہیں اس میں میری ہی غلطی نظر آئے گی۔ اس لیے اپنی غلطیوں کا مکمل اعتراف کرتا ہوں۔

جیل میں سنسر کی کڑی پابندی تھی۔ کوئی بھی خط بنا سنسر کے آ جا نہیں سکتا تھا۔ اس لیے خط ملنے میں بہت دیر ہو جاتی تھی۔ سجاد ظہیر سنسر کی کوتاہیوں سے بہت پریشان تھے۔ اس پریشانی کا ذکر انہوں نے 25 جون 1940 کے خط میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میری جان! آج پانچ بجے شام تمہارا تیسرا خط 23 کا لکھا ملا۔ کل بھی ایک خط ملا تھا۔ میں بھی اس بیچ تم کو دو خط لکھ چکا ہوں۔ ایک 17 جون کو اور اب تیسرا خط لکھ رہا ہوں۔ سخت تعجب ہے کہ تم کو ابھی تک یعنی 23 جون تک میرا پہلا خط بھی نہیں ملا۔ جیل کے لوگ تو کہتے ہیں کہ انہوں نے خط بھیج دیا تھا۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پوسٹ آفس میں پولس سنسر خواہ مخواہ کی دیر لگا دیتے ہیں۔ یہ آپ کے اجمیر کے عقل مند پولیس والوں کی حرکت معلوم ہوتی ہے جن میں اتنی بھی انسانیت معلوم نہیں ہوتی کہ ایک مقید شوہر کا خط اس کی بیوی کے پاس آسانی سے پہنچا دیں۔ بہرحال تم خط نہ آنے کی وجہ سے گھبرایا نہ کرو۔ کوئی خاص بات ہوگی تو میں گھر سے تمہیں فوراً اطلاع بھجوادوں گا۔ ہاں اس کا رنج ضرور ہوتا ہے کہ تمہیں بے کار فکر اور پریشانی خط کے نہ ملنے سے ہوتی ہے۔ میں تم کو دو دن ناغہ دے کر یعنی ہفتہ میں دو تین مرتبہ برابر خط بھیجتا رہوں گا۔ کل میں جیل کے لوگوں سے پھر کہدوں گا کہ میرے خط کم از کم فوراً یہاں بھیج دیا کریں۔ یہاں کے عہدے دار تو حتی المقدور کوئی بات ایسی نہیں کرتے جو باعثِ شکایت ہو۔'' (۴)

سنسر کی ستم ظریفی کا ذکر ایک اور خط میں بھی کیا ہے۔ یکم جولائی کے خط میں لکھتے ہیں کہ ''مجھے اب تک صحیح علم نہیں ہے کہ ہفتہ میں کتنی بار تم کو خط لکھ سکتا ہوں اور میرے خطوں کی کہاں کہاں سنسر شپ ہوتی ہے۔ آٹھ آٹھ دس دس دن اجمیر خط پہنچنے کے تو یہ معنی ہیں کہ کم از کم تین بار سنسر ہوتے ہیں۔ دو بار اس کنارے اور ایک دفعہ وہاں۔ بہرحال اب اس کا کیا رونا۔ جیسا میں نے تمہیں لکھا ہے

ہر خط میں رسید مطلع کر دیا کرو۔ تمہارے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک صرف ایک ہی خط تمہیں ملا۔ اس درمیان شاید دو اور مل گئے ہوں گے۔ خیر یہ قصہ چھوڑتا ہوں۔''

معلوم ہوتا ہے کہ سجاد ظہیر رضیہ کے ساتھ خط و کتابت کی باقاعدہ گنتی رکھتے تھے۔ کتنے خط کب کب لکھے انہیں سب یاد رہتا تھا۔ اس لیے اگر کسی خط کا جواب نہیں آتا تھا یا رضیہ اس کی رسید سے مطلع نہیں کرتی تھی تو وہ اس کا ذکر ضرور کرتے تھے۔ اب انہیں ہفتے میں دو خط لکھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ لہٰذا 4 جولائی کے خط میں رضیہ کو لکھتے ہیں کہ میری محبوبہ تمہارے خط کم نہ ہونے۔ ایک پرسوں ملا جو 20 جون کا لکھا تھا۔ لکھتے ہیں کہ اب یہ بات طے سی ہوگئی ہے کہ میں ہفتہ میں دو خط یہاں سے لکھ سکتا ہوں لیکن خط آنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی۔ جتنے خط تم چاہوں بھیجو۔ مجھے اور بھی زیادہ خوشی ہوگی۔

خطوں کے متعلق حکومت نے جیل میں نظر بندوں کے لیے کچھ قواعد مقرر کیے تھے جو جیل تک آتو گئے تھے مگر قیدیوں کے لیے انہیں خفیہ رکھا گیا تھا۔ اس بات کا تذکرہ سجاد ظہیر اپنے ایک خط میں کرتے ہیں۔ یہ خط 8 جولائی 1940 کو لکھا گیا تھا جس کی تحریر ذیل میں درج کی جاتی ہے:

''میری پیاری بیگم، کیسی ہو۔ تمہارا 21 جولائی (غالباً جون؟) کا خط مجھے 5 کو ملا۔ چونکہ میں گذشتہ ہفتے تمہیں دو خط بھیج چکا تھا۔ اس لیے اس ہفتہ لکھ رہا ہوں۔ گورنمنٹ نے ہم ڈیٹینوز (detenus) کے واسطے جو قواعد بنائے ہیں وہ تیار ہوکر آ گئے ہیں۔ جیل کے عہدے دار کہتے ہیں کہ وہ ''خفیہ'' ہیں۔ لہٰذا ہم لوگوں کو دکھائے نہیں گئے۔ خوش عقیدہ لوگوں کا خیال تھا کہ ڈیٹینوز کی جیل کی زندگی میں ان قواعد کی رو سے کچھ نئی سہولتیں پیدا ہوں گی، اور ہم لوگوں کے ساتھ ویسا برتاؤ کیا جائے گا جیسا پہلے نظر بندوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ لیکن فی الحال ان قواعد کا اثر یہ ہے کہ جو سہولتیں اب تک تھیں ان میں سے بھی اکثر میں کمی ہوگئی ہے۔ مثلاً اب خطوں میں پہلے سے زیادہ دیر لگا کرے گی۔ کیونکہ بجائے جیل کی سنسر شپ کے براہِ راست پولیس کی سنسر شپ ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ میرا (National Herald) اب بند کر دیا گیا ہے حالانکہ میں خود دام دے کر

اسے منگواتا تھا۔ معلوم نہیں یہ گورنمنٹ کی منشا سے ہوا کہ جیل کے عقل مند عہدہ داروں کی ''خیر خواہی'' کا نتیجہ ہے۔ بہر حال ان کا خیال تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی قیدیوں پر جتنی زیادہ پابندی عائد کریں گے ان کی اتنی ہی بھلائی ہوگی۔ کیا حرج ہے اگر کسی کی ''ترقی'' ان باتوں کی وجہ سے ہو جائے۔ نیشنل ہیرالڈ بند ہونے سے میری حب الوطنی کا چراغ بجھ نہ جائے گا۔'' (۵)

اگلا خط انہوں نے پندرہ جولائی رات کے وقت لکھا جس میں رضیہ کے دو خطوں کی رسید گی کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ان خطوں کا جواب وہ پہلے ہی لکھ دیتے لیکن ہفتہ گزر جانے کا انتظار تھا کیونکہ انہیں ہفتے میں صرف دو خط ہی لکھنے کی اجازت تھی۔ اس خط میں انہوں نے جوابی خطوں کے لیے دو دن منتخب کر لیے یعنی منگل اور جمعہ۔ یہ اس لیے کہ غالباً دن مقرر کرنے سے رضیہ کو بھی وقت پر خط مل سکیں گے۔ انہوں نے سنسر کو بھی تاکید کی کہ ان کے خط جس دن بھیجے جائیں اسی دن سنسر کے لیے روانہ کر دیئے جائیں۔ اگلے خط میں بھی وہی گلہ یعنی خطوں میں تاخیر۔ لکھتے ہیں ''میری جان تمہارے دو خط جو اجمیر سے نو اور گیارہ جولائی کو چلے تھے 14 کو ملے اور میں ان کی رسید تم کو اپنے 15 جولائی کے خط میں بھیج چکا ہوں۔ تعجب ہے کہ پانچ دن سے تمہارا کوئی خط کیوں نہیں آیا۔''

جیل میں رہ کر ان لوگوں کو چھیڑنے کا بہت دل کرتا ہے جن سے وہ محبت کرتے ہیں۔ چھوٹی سالیاں اسی زمرے میں آتی ہیں۔ رضیہ کی چھوٹی بہن کا نام ڈکی تھا جو بہت چھوٹی تھی۔ اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی غرض سے کہتے ہیں'' اور تمہاری چھوٹی بہن ڈکی آخر وہ مجھے خط کیوں نہیں لکھتی۔ کہنا کہ ابھی وہ بہت چھوٹی ہے اور اگر خط لکھے گی تو کسی کو گمان نہ ہوگا کہ نامۂ محبت ہے۔''

سجاد ظہیر جب نظر بند ہوئے اس وقت ان کی بیٹی نجمہ اپنی ماں کے پیٹ میں تھی۔ اس لیے 31 جولائی سے اور بچی کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد تک رضیہ خط نہ لکھ پائی ہوں گی جس سے سجاد ظہیر بخوبی واقف تھے۔ اس لیے کوئی شکایت بھی نہیں کی۔ رضیہ کے 31 جولائی کے خط کے جواب میں انہوں نے جو خط 2 اگست کو لکھا اس میں اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ وہ خط رضیہ نے فرطِ محبت کے جذبے کے تحت وقت سے پہلے ہی لکھ دیا تھا۔ اسی خط میں اپنے ہونے والے بچے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ''میرا مریخ کیسا ہے؟ بہ دستور تمہیں لاتیں لگاتا ہے یا آج کل سکون ہے۔'' اس سے

ظاہر ہے کہ تب تک بیٹی کی ولادت نہیں ہوئی تھی۔

نجمہ کی پیدائش کی خبر سجاد ظہیر کو ان کے سسر جنہیں وہ ادب سے ڈیڈی کہتے تھے اپنے تار کے ذریعے بھیجی تھی جس کا ذکر انہوں نے 12 اگست کے خط میں کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بچی 12 اگست سے ایک آدھ دن پہلے پیدا ہوئی ہوگی یا شاید اسی دن بھی پیدا ہوئی ہو کیونکہ ڈیڈی کا تار انہیں 12 اگست کو شام ساڑھے چھ بجے موصول ہوا تھا۔ زچہ کم سے کم ہفتہ دس دن تو خط لکھنے کی حالت میں نہیں رہی ہوگی۔ اسی لیے 18 اگست کے خط میں رضیہ سے مخاطب ہیں کہ اگر لکھ سکتی ہو تو خود ذرا اپنی بچی کے بارے میں لکھو کہ اس کی عادات کیا ہیں، روتی زیادہ ہے یا سوتی زیادہ ہے، فسادی ہے یا نیک اور شکل وصورت ورنگ کیسا ہے اور کیا ہوتا جا رہا ہے۔

سجاد ظہیر کے لیے جیل میں رضیہ کے خطوں سے پیدا شدہ تشویش لگا تار جاری رہی۔ نجمہ کی پیدائش سے کچھ روز بعد تک انہوں نے خط نہ ملنے کا کوئی خاص گلہ نہیں کیا۔ لیکن جلد ہی ایسی شکایتیں پھر سے نمودار ہونے لگیں۔ اپنے 6 ستمبر کے خط میں وہ یوں لکھتے ہیں:

> ''میری جان! دس دن سے تمہارا کوئی خط جو جیل کے پتے پر ہو نہیں ملا۔ اس درمیان صرف نجمہ کی تین تصویریں ملیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس کئی خط آئے ہیں لیکن یہاں تو مزید بندشیں عائد ہوتی رہیں۔ وہ خط ابھی تک سنسر کے پاس ہیں، مجھے بہت تشویش ہے۔ دس دن سے مسلسل کوئی خط نہ ملنا اور خیریت معلوم نہ ہونا بہت تکلیف دہ ہے۔ تم سے کیا کہوں کہ برابر لکھتی رہو کیونکہ تم تو لکھتی ہی ہوں گی۔۔۔۔ ممکن ہے کہ اس خط کے پہنچنے تک تم الہ آباد کے لیے روانہ ہو چکی ہو کیونکہ ایک خبر یہ بھی ہے کہ تم 15 اگست کو الہ آباد پہنچو گی۔''(٦)

اگلے خط میں بھی وہی رونا ہے۔ رضیہ کو لکھتے ہیں چھ روز ہو گئے مگر تمہارا خط ابھی تک نہیں دیا گیا۔ غالباً یہاں دفتر میں آیا ہوگا اور نئی پابندی کے مطابق یہاں سے سپریڈنٹ پولس کے دفتر میں جائے گا۔ اس کے بعد کہیں مجھے ملے گا تو گویا اب اگر ہمارے خطوط ایک ہفتہ کے بعد مل جائیں تو سمجھو کہ ٹھیک ملے۔ یہ اتنی ہی مدت ہے جتنی دیر ہوائی ڈاک یہاں سے لندن پہنچا کرتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ میں نے اس تاخیر کی جیل کے عہدہ داروں سے شکایت کی ہے لیکن انہوں نے اپنی لاچاری کا

اظہار کیا ہے۔اب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو لکھوں گا کہ وہ ''مہربانی فرما کر'' اس طرف توجہ کریں اور خطوں کے حوالے کیے جانے میں زیادہ دیر نہ لگائیں۔لیکن نتیجہ جو نکلے گا وہ ظاہر ہی ہے۔

آئندہ خطوں میں بھی وہی گلہ وہی شکایت ہے۔ 13 ستمبر کو لکھتے ہیں معلوم نہیں تم کو میرے خط ملتے بھی ہیں یا نہیں کیونکہ تمہارے خط اس درمیان بہت کم آئے ہیں اور وقفہ بھی زیادہ تھا۔ غالباً یہ سنسر کی زیادتی کی وجہ سے ہے۔ 24 ستمبر کے خط میں بھی یہی شکایت کرتے ہیں کہ اب تو ایک ایک ہفتہ گزر جاتا ہے اور تمہارا خط نہیں ملتا جس سے طبیعت پریشان ہو جاتی ہے۔ یکم اکتوبر کے خط میں رضیہ کو تنبیہ کرتے ہیں کہ آئندہ سے وہ اپنے خط میں ان کے خط کی رسید مطلع کر دیا کرے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ خط کی رسیدگی کے معاملے میں رضیہ کچھ لاپرواہ ثابت ہوئی ہے۔اس لیے انہوں نے کئی خطوں میں رضیہ سے کہا کہ وہ خط کی رسیدگی سے ضرور مطلع کر دیا کریں۔ خطوں کے تاخیر سے پہنچنے کے مسئلے سے تنگ آ کر اپنے 18 اکتوبر کے خط میں رضیہ کو لکھتے ہیں کہ آئندہ سے وہ انہیں جیل کے پتے پر خط نہ لکھا کرے بلکہ وزیر منزل (ان کا آبائی گھر) کے پتے پر بھیجا کرے جہاں سے اس کا خط انہیں بھیج دیا جائے گا۔ یہ صلاح انہوں نے یہ سوچ کر دی کہ اس طرح شاید کچھ جلدی ہو جائے اور اس طریقے سے انہیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ خط آیا ہے تاکہ سنسر سے تقاضہ کر سکیں۔اس کے بعد انہوں نے سینٹرل جیل سے جتنے خط لکھے تقریباً ہر ایک میں وہ خط دیر سے ملنے کی یا رضیہ کے خط لمبے وقفے کے بعد لکھنے کی باقاعدہ شکایت ہے اور ساتھ ہی سنسر کی ستم ظریفیوں کا چرچا بھی۔ آخری خط جو انہوں نے جیل سے لکھا وہ 12 دسمبر 1941 کا تھا۔ اس سے پہلے کے خط میں انہوں نے ان جذبات کا اظہار بھی کیا ہے جو تنہائی سے پیدا ہوتے ہیں، تنہائی جو وقت پر خط موصول نہ ہونے کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ چونکہ اس امر کو انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے اس لیے اس خط کا کچھ حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

> ''جان جہاں۔خدا خدا کر کے کل تمہارے دو خط ایک ساتھ ملے تو جان میں جان آئی۔ایک خط (پہلا) اجمیر پہنچنے کے دوسرے دن کا تھا اور اس کے بعد والا ایک دن ناغہ دے کر تھا۔ بیچ کا ایک خط مجھے نہیں ملا۔ غالباً ایک دو دن میں مل جائے گا۔تم خط لکھنا کم نہ کرنا۔تمہارے خط میرے لیے مسیحائی کا کام کرتے ہیں

۔جس طرح میرے جسم کو برسات کی ٹھنڈی ہوا سے فرحت حاصل ہوتی ہے اسی طرح میرے دل کو تمہاری تحریر دیکھ کر بے انتہا مسرت اور سکون حاصل ہوتا ہے۔تم اس بات کا اندازہ مشکل سے کرسکتی ہو کیونکہ تم باہر''دنیا'' میں ہو جہاں ہزاروں باتیں دل و دماغ کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہتی ہیں۔ یہاں کی خوشیاں بہت محدود اور یہاں کے احساسات بہت تنگ دائرے میں گھرے ہوتے ہیں۔اس وجہ سے ان میں گہرائی اور تیزی بھی بہت ہوتی ہے۔ ذرا سی بات سے خوشی رنج میں بدل جاتی ہے۔اور وہی دل جو محبت کے چند کلمے سن کر لذت و سرور سے لرزاں ہو جاتا ہے دوسرے لمحہ میں غمگین خیالوں کی لہر اسے درد اور بے چینی کے طوفان میں غرق کر دیتی ہے۔''(۷)

دسمبر 1941 میں طبیعت ناساز ہو جانے کی وجہ سے سجاد ظہیر کو کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔رہائی تک وہ اسپتال میں ہی رہے۔ وہاں سے انہوں نے رضیہ کے نام گیارہ خط لکھے۔ یہ تمام تر خطوط ان کے جیل میں سے لکھے ہوئے خطوں سے زیادہ طویل بھی ہیں اور زیادہ وسیع موضوعات پر نقطہ دانی بھی کرتے ہیں۔اسپتال سے لکھا ہوا سب سے پہلا خط 23 دسمبر 1941 کا ہے جس کا دلچسپ پہلو جیل سے باہر اسپتال کے ماحول کا تذکرہ ہے۔ لکھتے ہیں:

''میں کل جیل سے یہاں اسپتال لایا گیا۔ پونے دو سال بعد جیل کے پھاٹک کے باہر نکلنا اور موٹر پر سوار ہو کر یہاں آنا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا تھا۔اب میں کل سے یہاں یورپین وارڈ کے ایک کمرے میں ہوں۔ باہر جیل کے وارڈوں کا پہرہ ہے۔لیکن وہ 25 فٹ اونچی دیواریں، تالہ اور جنگلہ یہاں نہیں ہے۔ برآمدے اور صحن میں نکل کر چہل قدمی کر سکتا ہوں اور نیچے کے باغ میں کھلے ہوئے سُرخ گلاب کے پھولوں کی کیاریاں، لان، شاہ مسینا کا مزار اور اس سے ملحق مسجد دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ دور افق پر پرانے لکھنؤ کی چھتیں، برجیاں اور کوٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ یکہ، تانگہ چلنے کی آواز آتی ہے۔الغرض معمولی دنیا کا نقشہ ہے لیکن اس دو سال کی اسیری کے بعد میرے لیے کس قدر

غیر معمولی، یہاں میرے لیے جیل کے بمقابلہ تنہائی زیادہ ہے کیونکہ وہاں اور ساتھی بھی تھے اور یہاں صرف ڈاکٹر اور نرسیں۔''(۸)

جیسا کہ بنّے بھائی نے کہا ہے اسپتال میں صرف وارڈرز ہی پہرہ دیتے تھے اور وہاں جیل جیسا سنسر بھی نہیں تھا۔ اس وجہ سے خط ملنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ جو خط رضیہ کی کوتاہی سے دیر سے لکھے جاتے انہی کے خلاف شکایت ملتی ہے۔ یہ شکایت دو یا صرف تین خطوں میں ظاہر کی گئی ہے بلکہ حقیقتاً صرف دو ہی خط ایسے ہیں۔ 24 جنوری 1942 کے خط میں لکھتے ہیں'' میری جان۔ یہ کیا حرکت ہے؟ آج پورے ایک ہفتے بعد مجھے تمہارے دو خط 17 اور 18 کے ایک ساتھ ملے (ان میں سے ایک خط اور ایک چھوٹا سا رقعہ) اور حالانکہ یہ 17 اور 18 کے تھے لیکن اجمیر کی مہر دونوں پر 21 کی تھی۔ تو اس حساب سے جہاں تک ڈاک اور سنسر کا سوال ہے، مجھے خط ملنے میں دیر نہیں ہوئی۔ ایک ہفتہ تو بہت لمبی مدّت ہے خاص کر جبکہ ہر دو دن میں خط ملنے کی عادت ہو۔ تمہارے یہاں یا تو ڈاک کا حساب گڑبڑ ہے یا پھر یہ ہے کہ تم کو تاریخ یاد ہی نہیں رہتی اور تم 17 کو 18 اور 18 کو 19 اس طرح سمجھتی چلی جاتی ہو۔ بہرحال نتیجہ ایک ہی ہوا یعنی میرا قتل۔'' اس کے بعد صرف اگلے خط میں کچھ معمولی سی شکایت کی ہے کہ پھر آج پورے چار دن گزر گئے اور تمہارا کوئی خط نہیں آیا۔ اسپتال سے جو آخری خط انہوں نے لکھا اس میں کسی بات کی پردہ پوشی کا شبہ ہوتا ہے۔ چونکہ اس خط کا پہلا حصہ دلچسپی بھرا ہے اس لیے اُسے ہو بہو درج کیا جاتا ہے:

> ''میری دل کی رانی۔ کل شام کی یاد سے میرا دماغ، دل و جسم ابھی تک مست اور سرشار ہیں۔ تم میں کیا جادو ہے؟ یا یہ ہماری محبت کی لافانی آگ ہے جو یکبارگی پھر سے بھڑک اُٹھی ہے۔۔۔ کہ یہ زمین کا فرش 12 دسمبر کے بستر عروسی سے بھی بڑھ گیا۔
>
> یہاں سے تمہیں کیا تحفہ بھیجوں اپنی دلی اور روحانی شکرگزاری کی یادگار، سوا ان چند لفظوں کے! اور یہ کتنے ناکافی ہیں۔ اس لطافت اور لذت کا اظہار کرنے کے لیے جو تم نے کل رات مجھے بخشی!''(۹)

اس تحریر کا حقیقی مطلب تو صرف رضیہ اور سجاد ظہیر ہی جانتے ہوں گے لیکن ہر کوئی اپنی ذہنی

کیفیت کے مدِ نظراس کے معنی کسی بھی امر سے ماخوذ کرسکتا ہے۔ بہر حال

بیخودی بے سبب نہیں غالبؔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

میاں بیوی میں کچھ نہ کچھ خفیہ طور پر ضرور ہوا ہوگا جس کی طرف سجاد ظہیر نے اشارہ کیا ہے۔

ہم نے دیکھا کہ سجاد ظہیر نے جیل سے جتنے بھی خط لکھے ان میں رضیہ کے جوابی خطوں کی بے قاعدگی اور سنسر کی پابندیوں کے خلاف اپنی نفیس اور مخصوص ادبی زبان میں احتجاج کیا ہے جس کے نقوش تقریباً ہر خط میں ملتے ہیں۔ ان کے تمام دورِ اسیری میں رضیہ کی ہستی ہی ان کے ذہن پر چھائی رہی۔ رضیہ کے خطوط کے بعد اُس کا دوسرا پہلو جو ہر وقت ان کے دل و دماغ پر چھایا رہا وہ تھا رضیہ کی صحت اور اپنی نوازئیدہ بٹی نجمہ۔ پہلے خط میں تو انہوں نے زیادہ تر اپنے نئے ماحول کا ہی ذکر کیا ہے مگر دوسرے خط میں جو انہوں نے 23 مارچ 1940 کو لکھا اس میں رضیہ کی صحت اور قید سے پیدا شدہ پریشانیوں کا جس طرح اظہار کیا ہے وہ صرف محبت کرنے والا شوہر ہی کرسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سجاد ظہیر جیل کی ذاتی پریشانیوں سے تو بے نیاز تھے لیکن بیوی اور بچّی کے لیے فکر مند تھے۔ لکھتے ہیں:

> ''مجھے اس جیل میں اگر کوئی کوفت، تکلیف اور پریشانی ہے تو اس بات کی کہ میں تمہارے لیے کتنی پریشانیوں کی وجہ بن گیا ہوں۔ ایسی حالت میں اور ایسے وقت میں جبکہ تمہارے جسم کو آرام، دل کو مسرت اور دماغ کو سکون کی ضرورت ہمیشہ سے زیادہ ہے۔ تمہارا خط تو اتنا پریشان کن تھا کہ مجھے بھی بہت تشویش بڑھ گئی۔ لیکن میری جان! انسان کا امتحان تو مشکل وقت میں ہی ہوتا ہے۔ یہ مت بھولنا کہ تمہیں اپنی جسمانی اور دماغی صحت کا خیال صرف اپنے اور میرے لیے ہی نہیں بلکہ اس چھوٹی سی جان کے لیے بھی رکھنا ہے جس کی تم حامل اور ضامن ہو۔ اگر یہ معلوم ہو کہ تمہاری صحت اچھی ہے اور تم اس تکلیف دہ جدائی کے باوجود بھی اپنی زندگی نارمل بسر کرتی ہو، سیتی پروتی ہو، پڑھتی لکھتی ہو، ٹہلتی ہو، سنیما جاتی ہو، لوگوں سے ملتی جلتی ہو وغیرہ تو اس اسیری کا بوجھ بہت ہلکا ہوجائے گا۔ اور یہاں کی یہ خاکی دیواریں، اکیلا پن، بے کاری، کم تکلیف دہ ہوں گے۔'' (۱۰)

بنے بھائی کے جیل جاتے وقت رضیہ حاملہ تھیں اور نجمہ ان کے پیٹ میں تھی۔ایسی حالت میں بیوی کی صحت کے بارے میں شوہر کا فکر مند ہونا قدرتی امر ہے۔نجمہ بنے بھائی کی نظر بندی کے کوئی پانچ ماہ بعد پیدا ہوئی۔اس دوران انہوں نے رضیہ کی صحت اور ان کی ذات سے متعلقہ دیگر حالات پر لگاتار نظر بنائے رکھی اور تقریباً ہر خط میں ان باتوں کا لگاتار ذکر کرتے رہے۔جناب غلام امام جوان کے وکیل تھے انہوں نے بنے بھائی کو بتایا کہ حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کے مقدمے میں،کوئی باز پُرس،کوئی پیش گوئی نہ ہوگی اور غیر متعین مدت تک انہیں جیل میں رکھا جائے گا۔جب جلد رہائی کی کوئی صورت نظر نہ آئے تو انسان مایوسی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنوں کی فکر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔سجاد ظہیر کا ردِ عمل کچھ ایسا ہی تھا۔رضیہ نے انہی دنوں ایم۔اے کا امتحان دیا تھا۔اس کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کی خواہش انہیں اور بھی پریشان کرنے لگی تھی۔اس لیے 19 اپریل کے خط میں رضیہ کو سخت تاکید کرتے ہیں کہ وہ اپنی صحت کا حال،امتحان کا حال اور اپنے دیگر تمام پروگرام یاد سے لکھا کرے۔اگلے خط میں اُسے کہتے ہیں کہ تم نے خواہ مخواہ ایسی حالت میں کتابوں کو ٹھیک کرنے کی مشقت اپنے ذمہ لے لی۔اسے تنبیہ کرتے ہیں کہ تھکنا مت اور سب دوائیں کیلشیم وغیرہ کھاتی رہنا۔

جون میں جب رضیہ اپنے والد کے گھر اجمیر جاتی ہے تو وہ ایک خلا سا محسوس کرنے لگتے ہیں۔16 جون 1940 کے خط میں وہ اپنی ذہنی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں:

''پیاری کل شام جو آدمی کھانا لایا اس نے بتایا کہ تم چلی گئیں۔حالانکہ یہ بات مجھے معلوم تھی لیکن اس کی تصدیق کے بعد دل جیسے سنسان سا ہو گیا۔میری جان !تم کیوں گئیں۔تم تھیں تو میرے لیے لکھنؤ میں روشنی تھی۔اس قید خانے میں امید کی مہک آجاتی تھی اب یہ لق ودق فاصلہ تمہارے اور ہمارے بیچ میں !لیکن دل جیسے اور قریب ہو گئے ہیں۔کون سا لمحہ ہے جب تمہارا خیال نہیں آتا۔رات بھر سوچتا رہا کہ اب تم اُناؤ پہنچی ہوں گی۔اب کانپور۔اب وہاں سے چلی ہوں گی۔اب اور آگے اب اور آگے،اور آخر کار صبح کو دہلی۔اور اس وقت نو بج چکے ہیں اور تم اپنے گھر میں ہوں گی۔امید ہے کہ اچھی طرح ہو۔بالتفصیل لکھو کہ

کانپور میں کیا ہوا۔ پھر دہلی میں ڈیڈی مل گئے۔ سفر کیسا کٹا۔ برتھ خالی مل گئی تھی، کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ انجیکشن لے لیا یا ابھی نہیں۔ ضرور لے لینا۔ ڈاکٹرنی کو دکھا لینا اور اس زمانے کی خاص خاص ہدایتوں پر پوری طرح عمل کرنا۔''(۱۱)

یہ تحریر واضح کرتی ہے کہ گھر کے اور رضیہ کے متعلق ہر چھوٹی سے چھوٹی بات بھی سجاد ظہیر کے دماغ میں رہتی تھی اور کسی بات کو دیدہ دانستہ نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ جیل کے باہر شاید یہ باتیں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں لیکن اسیری میں ہر وقت یہ انسان کی آنکھوں کے سامنے گھومتی رہتی ہیں۔ بنّے بھائی چھوٹے بڑے، اپنے پرائے سب کے لیے فکر مند رہتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں ''جسو باجی کے دونوں بچوں کی طبیعت ابھی تک اچھی نہیں ہوئی۔ رضو میاں کا ٹمپریچر البتہ رفتہ رفتہ گھٹ رہا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ نینی تال سے باجی بچوں کی تیمارداری کے لیے آئی ہیں۔ آئی تو تھیں ایک ہفتہ کے لیے لیکن ابھی تک ٹھہری ہیں۔'' یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جب انسان تنہا مایوسی کے ماحول میں ہوتا ہے تو گھریلو حالات فلم کی تصویروں کی طرح ابھر کر جیسے کسی اسکرین پر آنے لگتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ سجاد ظہیر کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ باجی کے بچوں کی ناسازگاری کچھ ایسا واقعہ تو نہیں جس کا ذکر رضیہ سے کرنا ضروری تھا۔ لیکن بنّے بھائی کے لیے ہر چھوٹی بڑی بات ایک جیسی اہمیت رکھتی تھی۔ ایسی ہی باتیں سجاد ظہیر کے کردار کی بلندی کی علامت تھیں۔ وہ جب تک زندہ رہے اپنے دوستوں یاروں اور واقف کاروں کی ہر موقع پر مدد کرتے رہے اور ان کے دکھ سکھ میں صدق دلی سے شامل ہوتے رہے۔

رضیہ کے اجمیر چلے جانے سے وہ بہت مطمئن تھے کیونکہ وہاں اس کی خاطر خواہ نگہداشت ہو سکے گی اور اُسے ہر طرح کا آرام اور سکون بہم پہنچایا جا سکے گا۔ پھر بھی اسے ہدایت کرتے ہیں کہ وہ چہل قدمی ضرور جاری رکھے چاہے زیادہ چاہے کم۔ رضیہ نے لکھا ہوگا کہ بچّی کی ولادت، دسویں جولائی کے بعد کبھی بھی ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں لکھتے ہیں:

> '' تم نے اپنے اس خط میں لکھا ہے کہ دسویں جولائی کے بعد کسی دن بھی ولادت ہوگی حالانکہ پہلے اگست کے دوسرے ہفتے کا خیال تھا۔ یہ کیا گڑ بڑ ہے بھائی۔ کیا اگست کے بدلے جولائی لکھ گئیں؟ آج کل تم کیسے لگتی ہو؟ جیسے یہاں

سے جانے کے وقت تھیں یا اب اور ''بڑھ'' گئیں۔ آج کل تو چوبیس گھنٹے یاد آتی ہو۔ اور عجیب بات یہ کہ کبھی کبھی تو تمہاری ہنسی کی آواز کانوں میں آنے لگتی ہے۔ میری جان سے زیادہ پیاری! تم گھبرانا بالکل مت اور پریشان نہ ہونا۔ اپنے ماں باپ اور بھائی سے مل کر خوش رہنا۔ ہم دونوں جو اس وقت جدا ہیں اس کی مدت زیادہ نہ ہوگی اور اس دوری کی وجہ سے تم دل میں ایسی پیوست ہوگئی ہو جیسے جسم میں جان یا رگوں میں خون اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جب ہم پھر ملیں گے تو اپنی زندگی کو پہلے سے کہیں زیادہ گہری، خوبصورت اور دلآویز بنا سکیں گے۔'' (۱۲)

حمل کے دوران جسم میں کئی طرح کی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ رضیہ بنّے بھائی کو ان حالات سے آگاہ کرتی رہتی تھیں۔ ایک خط میں غالباً لکھا ہوگا کہ اُسے کہیں جسم میں درد ہوا ہے۔ یہ جان کر سجاد ظہیر کو بہت تشویش ہوئی لیکن یہ معلوم کر کے کہ اب اسے کچھ افاقہ ہے کچھ اطمینان بھی ہوا۔ اسے تسلی دیتے ہیں کہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ مرحلہ بھی طے ہو جائے گا اور وہ ولادت کے عہد سے کامیاب ہو کر نکلیں گی۔ کہتے ہیں کہ یہ مت بھولنا کہ میں دل و جان سے ہر وقت، ہر لمحہ، ہر دم تمہارے ساتھ ہوں۔ رضیہ کو یقین دلاتے ہیں کہ سب کچھ بخیر و بخوبی ہو جائے گا کیونکہ وہ تمام حالات موجود ہیں جن کی ضرورت ہے یعنی رضیہ کی صحت اچھی ہے اور بہترین ڈاکٹری انتظام بھی ہے۔ اس لیے کسی گڑبڑ ہونے کی کوئی وجہ بالکل نہیں۔ رضیہ کو لکھتے ہیں کہ اس کی تکلیف کا حال معلوم کر کے انہیں تشویش تو ہوتی ہے مگر پھر یہ خیال بھی آتا ہے کہ یہ تکلیف تو ہر عورت کو برداشت کرنی ہی پڑتی ہے کیونکہ ابھی تک عقل انسانی نے اس تکلیف پر قابو پانے کی کوئی صورت نہیں نکالی بلکہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ تکلیف کچھ بڑھی ہے، کم نہیں ہوئی۔ یہ دردِزہ قبائلی اور غیر مہذب قبیلوں کی عورتوں کو برائے نام ہی ہوتا ہے۔ کچھ طنزیہ لہجے میں لکھتے ہیں:

'' تو بیگم تم کو جو اتنی پریشانی ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ تم گریجویٹ ہو اور آدھی ایم۔اے ہو۔ یہی خیریت ہے پوری ایم۔اے نہیں ہو ورنہ کیا معلوم شاید اور زیادہ تکلیف ہوتی۔ خیر جی تم زیادہ پریشان نہ ہو۔ چند روز کی بات ہے پھر یہ تکلیف خوشی میں بدل جائے گی۔

تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ برسات میں بچہ پیدا ہونا ٹھیک نہیں ہے اس
لیے کہ ہندوستان کی ایک بڑی برگذیدہ اور دلچسپ ہستی کی ولادت بھی اسی موسم
میں ہوئی تھی۔ یاد کرو کہ جب کرشن جی پیدا ہوئے تھے تو رات کے بارہ بجے تھے
اور پانی موسلا دھار برس رہا تھا۔ سخت طوفانی موسم تھا۔ اسی وجہ سے تو ان بے چارے
کی جان بچ گئی ورنہ ان کی ماں پر تو پہرہ بٹھا دیا گیا تھا۔ باقی قصہ تم جانتی ہو۔ اگر نہ
جانتی ہو تو اپنی اماں جان سے پوچھنا۔ تمہارا بچہ تو ایسے طوفان میں پیدا ہو رہا ہے
جس کی کوئی انتہا نہیں۔ ساری دنیا کی عمارت ڈگمگا رہی ہے اور اس کی ماں نہیں
بلکہ باپ قید ہے۔" (۱۳)

رضیہ کے والد جنہیں سب ڈیڈی کہتے ہیں انہوں نے بذریعہ تار بنّے بھائی کو مطلع کیا کے بچّی پیدا ہوئی ہے اور رضیہ کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ اس خبر سے پیدا شدہ اپنے دل کی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایسی حالت میں تم سے سینکڑوں میل دور ہونا حد سے زیادہ تکلیف دہ ہے اور جو خوشی اس خبر سے ہوئی کہ اب تمہارے اور ہمارے بیچ کی محبت کی ایک جیتی جاگتی ننھی سی نشانی موجود ہوگئی، اور یہ کہ ان انتظار کے دنوں کا خاتمہ ہوا اور تم اس تکلیف دہ مرحلے سے بخیر و بخوبی نجات پا گئیں، یہ تمام خوشی اس نا قابل برداشت فراق کی بدولت اضطراب میں بدل گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس وقت مجھے تمہارے پاس ہونا تھا مگر قہر درویش بجان درویش۔ اس لیے سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہیں۔

بچّی کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ بچّی کیسی ہے چھوٹی یا بڑی اور اس کا وزن کیا ہے؟ پھر خود ہی کہتے ہیں کہ ابھی تو صرف رونا، سونا اور دودھ پینا ہی جانتی ہوگی۔ آنکھ بھی شاید مشکل سے کھلتی ہوگی۔ بنّے بھائی کو تو لڑکی کی خواہش تھی لیکن رضیہ کو لڑکا نہ ہونے کا کچھ حد تک افسوس ضرور ہوا ہوگا کیونکہ اس زمانے میں لوگ لڑکے کے لیے ہی دُعا مانگا کرتے تھے۔

تعجب کی بات ہے کہ سجاد ظہیر جیسا قد آور ادیب اور سیاست دان جس نے ترقی پسند تحریک کا انعقاد کر کے پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا، اس کے دل و دماغ پر ہر وقت رضیہ چھائی رہتی تھی اور وہ کبھی اس بات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ ہر خط میں وہ لکھتے ہیں کہ انہیں ہر دم رضیہ کا

ہی خیال رہتا ہے اور نظروں میں ہر وقت اسی کی صورت رہتی ہے۔ بچّی کی پیدائش کے بعد رضیہ کی جو تصویر ان کے ذہن میں نمودار ہوتی ہے اس کی عکس آرائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''میری نظروں میں بس ہر دم تمہاری صورت رہتی ہے۔ پلنگ پر لیٹی ہوئی نحیف، پاس تمہاری ماں اور نرس۔ اور شاید دوسرے کمرے میں بچّی ممی کے پاس، یا تمہارے ہی کمرے میں رہتی ہے۔'' اگرچہ انہوں نے بچّی کے کئی نام سوچ رکھے تھے لیکن آخری فیصلہ رضیہ سے ملاقات کے بعد دونوں کی رضامندی سے کیا جانا تھا۔ لکھتے ہیں کہ ابھی مجھے جو نام پسند آرہا ہے وہ ''نجم السحر'' ہے یا فارسی کی ترکیب پسند کرو تو نجم سحر ہے۔ کہتے ہیں کہ صبح کے ستارے سے بڑھ کر دلکش اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس نام کی پسندیدگی کی دوسری وجہ یہ بتاتے ہیں کہ وہ اس وقت پیدا ہوئی جب دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ بچّی دونوں کی محبت کی مشترکہ زندگی کا ستارہ ہے۔

بچّی کی پیدائش کی خوشی ان کے ہر لفظ سے نمایاں تھی۔ 18 اگست 1940 کا ان کا خط ظاہر کرتا ہے کہ وہ بچّی اور اس کی ماں کی خیریت و دیگر تفصیلات جاننے کے لیے کتنے بے چین تھے۔ اس خط میں پہلی بار انہوں نے رضیہ کو مخاطب کرتے ہوئے 'میری بچّی کی ماں' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ خط آدھے سے زیادہ صرف رضیہ اور اس کی بچّی کے متعلق ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''میری جان' میری بچّی کی ماں' میری پیاری اچھی بیوی۔ ولادت کے بعد میں تمہیں دو خط بھیج چکا ہوں جو ملے ہونگے۔ اب یہ دستی جائے گا۔ مُنن میاں لے کر جائیں گے۔ وہ تم کو اور بچّی کو خود دیکھیں گے، اور پھر وہاں سے آکر یہاں تم دونوں کا حال مجھے بتائیں گے۔ تین دن سے تمہارے گھر سے کوئی خط نہیں آیا۔ تعجب ہے۔ حالانکہ میں نے یہ لکھ دیا تھا کہ دو حرف روزانہ کوئی نہ کوئی خیریت کے لکھ دیا کرے۔ لگتا ہے ڈیڈی ممی نواسی کے پیدا ہونے کی خوشی میں یہ بھول گئے۔
>
> تم تو ابھی کمزور ہوگی۔ میری پیاری اب تو تم ماں ہو گئیں۔ کیسا پیارا لفظ ہے۔ تم اپنی خیریت کے متعلق کسی سے بالتفصیل لکھوا دو۔ کوئی بات نہ چھوٹے۔ ولادت کے بعد ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟ ان کی ہدایات کیا ہیں۔ تمہاری غذا کیا ہے۔ کب تک چل پھر سکو گی؟ اور نارمل زندگی کب سے بسر کرو گی؟

میری جان ڈاکٹروں کی ہدایات پر پورا عمل ہونا۔ یہ زمانہ سخت احتیاط کا ہے۔ تم اُٹھ کر چلنے پھرنے میں یا غذا کے معاملے میں جلدی اور بے احتیاطی نہ کرنا۔ یہ تو ظاہر کہ میں جلد از جلد ملنا چاہتا ہوں اور بچّی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس معاملے میں قطعی جلد بازی سے کام نہ لینا اور جب تک تم پوری طرح مضبوط نہ ہو جاؤ یہاں آنے کا خیال نہ کرنا۔ رہ گیا الہ آباد کا معاملہ اور وہاں حاضری کا قصہ تو وہ بھی طے ہو جائے گا۔ تم اس کی فکر نہ کرنا۔

کیا تم بچّی کو دودھ پلانے لگی ہو۔ دودھ کافی ہوتا ہے یا نہیں اور اس سلسلے میں کوئی تکلیف تو تم کو نہیں ہے۔ اور کوئی تو شکایت نہیں۔ سب تفصیل سے لکھوانا۔ میں اپنے اس سے پہلے والے خط میں بچّی کا نام تجویز کر کے تمہیں لکھ چکا ہوں۔ مجھے تو یہ نام ''نجم السحر'' روز بروز زیادہ پسند آتا جاتا ہے۔ امید ہے کہ تم اور تمہارے والدین بھی پسند کریں گے۔ عرف نجمہ بھی بہت خوشگوار اور خوش آواز ہے۔ اس نام میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ معمولی نہیں۔ ممتاز ہے۔

میری جان! میں بہت خوش ہوں اور بہت مغموم۔ خوش چونکہ اب یہ چھوٹی سی معصوم جان ہمارے اور تمہارے درمیان میں عشق و محبت کی نشانی اور سند۔ بہترین اور عزیز ترین سند موجود ہوگئی۔۔۔۔، رنج اس لیے کہ ہم ایسی خوشی کے وقت میں ایک دوسرے کے پاس اس کم بخت ظالمانہ، بے رحم نظام کی وجہ سے نہیں ہو سکتے۔ لیکن تم نے جس ہمت اور بہادری کے ساتھ اس سخت تکلیف دہ مرحلے کو کاٹ دیا ہے۔ اس سے میرے دل کو سکون اور تقویت پہنچتی ہے۔ ایسی بہادر بیوی، جانباز ماں اور سچے ساتھی پر کون فخر نہ کرے گا۔ تمہاری بچّی بھی جب بڑی ہوگی تو اس زمانے کو کبھی نہیں بھول سکتی۔'' (۱۴)

اس خط سے اور دیگر خطوں سے بھی یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ چونکہ وہ نئے شادی شدہ تھے اس لیے رضیہ ان کے دل و دماغ پر چھائی رہتی تھی۔ پھر بچّی پیدا ہوئی تو اُس میں بھی بے انتہا دلچسپی لیتے تھے اور اپنے خطوں میں اس کی ہر حرکت کا ذکر کرتے تھے۔

بنّے بھائی کے داماد علی باقر نے ایک مقالے میں سجاد ظہیر کے ان خطوں کے اقتباسات لیے ہیں جو انہوں نے لندن میں علی باقر اور اپنی بیٹی نجمہ کو 1968 اور 1973 کے پانچ سال کے عرصے میں لکھے تھے۔ ان کی مکتوب نگاری کے متعلق علی باقر لکھتے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ خط نصف ملاقات ہوتی ہے۔ اور یہ بات حقیقت پر مبنی بھی ہے۔ ساحر ہوشیار پوری نے بھی ایک شعر میں یہی مضمون باندھا ہے۔ شعر ہے۔

غنیمت ہے خط انکا آتا رہا
ادھوری ملاقات ہوتی رہی

اگر چہ خط سے نصف ملاقات ضرور ہوتی ہے لیکن بنّے بھائی کا خط آدھی ملاقات سے کہیں زیادہ ہوتا تھا۔ وہ بڑی تفصیل سے سب باتیں لکھتے تھے جیسے کلاسیکل مصور کی تصویروں میں ہر چھوٹی چھوٹی بات کی تفصیل ہوتی ہے۔ وہ ہر موضوع کا ذکر کرتے تھے جیسے گھر کی باتیں، محلے داروں کی باتیں، دوستوں اور عزیزوں کی باتیں۔ سیاست اور سیاسیات کی باتیں، معاشیات کی باتیں، ادب اور ادیبوں کی باتیں شعر وحکمت کی باتیں، شاعروں کی باتیں، وطن کی اور حب الوطنی کی باتیں وغیرہ وغیرہ۔ بنّے بھائی جیسا خط لکھتے تھے تو جان پڑتا تھا کہ وہ اپنے ماحول سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی تحریروں میں کسی خاص قسم کی پابندی بالکل نہیں ہوتی تھی اور ان کی نظر بھی کسی پابندی میں مقید بالکل نہیں ہوتی تھی اس لیے خط لکھتے وقت وہ جو محسوس کرتے تھے وہی لکھتے تھے۔ ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ ان کی زبان سہل اور ان کا لہجہ نرم تھا اور ان کا طرز محبت بھرا ہوتا تھا۔ باقر لکھتے ہیں کہ ''ان کے خط ان کی شخصیت کی طرح جاذب نظر، خوش شکل، خوش لہجہ ہیں، سنجیدہ ہیں، مخلص ہیں، منفرد ہیں، محبت ہیں۔''

ہر وہ انسان جو قیدِ زنداں میں سلاخوں کے پیچھے زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا ہے تو وہ اپنی اسیری کی صعوبتوں کو کم کرنے کا کوئی نہ کوئی ذریعہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ جس قیدی میں تخلیقی صلاحیتیں ہوتی ہیں وہ ادب کا سہارا لیتا ہے اور ادب تخلیق کرتا ہے جس میں کہانیاں، ناول، مضامین اور خطوط وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ بنّے بھائی بھی بلند پائے کے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ پختہ ذہن تخلیق کار بھی تھے۔ اپنی زندگی میں انہوں نے ہزاروں خط لکھے جو ان کی مخصوص شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ یہ خط ظاہر کرتے ہیں کہ مکتوب وہ ہستی تھا جسے انسانوں سے محبت تھی، انسانیت سے محبت تھی، جس نے محبت

کرتے وقت لوگوں کو اچھے اور برے گروہوں میں بانٹنے کا فلسفیانہ عمل نہیں کیا بلکہ جس نے ہر انسان، ہر بات، ہر ماحول، ہر دور، ہر حرکت میں خوب سے خوب تر کو تلاش کیا اور جس کی جستجو ناکام نہیں رہی۔ ان خطوں کے بارے میں علی باقر کہتے ہیں کہ ''یہ اس شخص کی تحریریں ہیں جس کی نگاہ صرف خوبصورتی پر جا کر رکتی تھی اور جسے ہر جگہ ہر زمانے' ہر حالات میں خوبصورتی مل جاتی تھی۔ بنے بھائی اور حسن کی جیسے کوئی خفیہ سازش تھی، یہ دونوں طرح طرح کے بہانے ڈھونڈ کر ایک دوسرے سے مل جاتے تھے۔ جون کے مہینے میں جہنم کی طرح تپتے ہوئے دہلی میں اور برف سے چھپے ہوئے ماسکو میں، افریقہ کے پہاڑوں میں اور سمندر کے قریب، انگلستان کے باغات میں، جوانوں کے جوش اور ولولے میں، بوڑھے تجربے میں اور روایات میں، نظموں اور شعروں میں، اخباروں اور افسانوں میں۔'' 'کالی پوت کے لچھے' میں علی باقر نے کوئی چوبیس خطوط سے اقتباس لیا ہے لیکن وہ تمام خط بنے بھائی کے دورِ اسیری کے بعد کے ہیں اور اس لحاظ سے 'نقوشِ زنداں' کے خطوں سے بالکل مختلف ہیں۔ اسی مضمون میں علی باقر نے لکھا ہے:

> ''بنے بھائی حسن کی تلاش کرتے تھے، حسن بنے بھائی کو پا لیتا تھا اور وہ ہر چیز جو بنے بھائی کو حسین لگتی تھی اسے ہر احساس میں جذب کر لیتے اور دوسروں سے کہہ دیا کرتے، کبھی خطوں کی سرگوشی میں کبھی جوشیلی تقریروں میں تاکہ سُننے والے بھی اپنی نظر، اپنی فکر، اپنے تخیل، اپنے عمل میں رنگین پھولوں کی خوشبو اور ان کی ریشمی پتیوں کا گداز سما لیں۔ فطرت اور انسان کی بے شمار اور تہہ دار خوبصورتیوں کو ڈھونڈنے، پرکھنے اور ان کی تعریف کرنے کے لیے غیر معمولی نظر اور توانائی درکار ہوتی ہے اور وہ توانائی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ بنے بھائی کے خطوں میں عیاں ہے۔

بنے بھائی کے خطوں میں طرح طرح کے حالات، احساسات، جذبات، مشاہدات اور تجربات کے بارے میں ذکر ہے، کبھی ضمنی طور پر کبھی تفصیلی طور،، گر اس رنگا رنگی میں عجیب طرح کی ہم آہنگی ہے جیسے اندر دھنش کے رنگ ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔ یہ پھولوں، پتیوں، درختوں،

پہاڑوں سے محبت، یہ موسیقی، آرٹ، کلچر سے لگاؤ، یہ تاریخ کو ایک نئے اور معنی خیز انداز سے سمجھنے اور سمجھانے کا سلیقہ، یہ سیاست کے داؤ پیچ، یہ مباحث، یہ ادبی اور شعری رجحانات پر تبصرے، یہ تمام انسانوں سے دوستی کرنے کی دھن۔ یہ سب اور ایسی بہت سی اور باتیں ہمیں بنے بھائی کے خطوں میں ملتی ہیں۔ جب تک ہمیں بنے بھائی کی ان جمالیاتی احساسات اور ادبی اور سیاسی قدروں کا ٹھیک طور پر اندازہ نہیں ہوگا، ہم ان کی مکمل شخصیت کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتے۔

بنے بھائی کے پاس چاہے آرام و آسائش کے سامان نہ رہے ہوں مگر محبت کی فروانی تھی۔ محبت جو انہوں نے دوسروں سے کی، اپنی بیوی اور بچوں سے کی، اپنے ساتھیوں اور رفیقوں سے کی، اپنے عزیزوں اور واقف کاروں سے کی، اپنے مسلک اور کلچر سے کی، اور ان ہزاروں اور لاکھوں انسانوں سے کی جن سے شاید وہ کبھی نہ مل سکے مگر جن کا درد وہ سمجھتے تھے کیونکہ وہ درد بنے بھائی کا اپنا درد تھا۔ میرے لیے بنے بھائی کے خط خوشبوؤں سے بسی خوشگوار ہوا کا جھونکا تھے۔" (۱۵)

سجاد ظہیر کے صد سالہ یوم پیدائش کے سلسلے میں ہندوستان و پاکستان میں جگہ جگہ جشن ہوئے۔ بھوپال میں بھی ایسا ہی ایک جشن ہوا جس میں نجمہ علی باقر کے ساتھ گفتگو سے ایک اقتباس لیا گیا جو جناب شکیل صدیقی نے شائع کیا ہے۔ اس میں نجمہ نے بھی بنے بھائی کے خطوں کے بارے میں ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ جب بنے بھائی پاکستان میں قید تھے تو ان کے خطوط سے ہی ان کی بیوی بچوں کو سہارا ملتا تھا۔ ان کے خط ایسے جاندار ہوتے تھے جن سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ پاس ہی ہیں۔ اپنے خطوں میں وہ ایک ایک چیز کے بارے میں پوچھتے تھے۔ بچوں کی پڑھائی کے بارے میں، پھلوں اور پھولوں کے بارے میں۔ انہیں ہر ایک کا خیال رہتا تھا۔ مالی کا، نوکروں کا ودوسرے سب لوگوں کا۔ اگرچہ خط سنسر ہو کر آتے تھے تو بھی ان کا مفہوم واضح رہتا تھا۔

بنے بھائی کی تحریریں بہت خوش خط ہوتی تھیں اور وہ چھوٹے حروف میں خط لکھتے تھے۔ ان کی تحریر پر نظر ڈالتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ انہوں نے بہت محنت سے خط لکھا ہے۔ ان کا ہر خط محبت

سے بھر پور ہوتا تھا۔علی باقر کہتے ہیں کہ ''میں جب بھی بنّے بھائی کی تحریر دیکھتا ہوں تو مجھے حیدر آباد کی سہاگنوں کے گلے میں پڑی ہوئی کالی پوت کی مہین قطاریں یاد آ جاتی ہیں۔۔۔ویسی ہی خوبصورتی، ویسا ہی تسلسل، ویسا ہی پیام کہ محبت کرنے والا ابھی زندہ ہے۔سہاگ ابھی سلامت ہے۔''

نجمہ کی ولادت کے بعد بنّے بھائی کا ذہن ہر وقت اسی کے گرد گھومنے لگا تھا۔وہ کیسی لگتی ہوگی، کیسی کیسی حرکتیں کرتی ہوگی، کیا کیا صورتیں بدلتی ہوگی وغیرہ۔ نجمہ کے بارے میں وہ بہت جذباتی ہو گئے تھے۔جیل کی چار دیواری میں بند ہونے سے انسان کے سوچنے کا انداز بہت بدل جاتا ہے۔اچانک خوشی یا اچانک غم سے آنسو نمودار ہو جاتے ہیں۔اس لیے جب رضیہ کی ارسال کردہ تصویریں بنّے بھائی کو ملیں تو بنّے بھائی کی آنکھوں میں بھی آنسو ابھر آئے۔نجمہ صورت سے بھولی اور نیک معلوم ہوتی تھی۔تصویریں دیکھ کر بنّے بھائی نے محسوس کیا کہ نجمہ کی پیشانی کشادہ اور خوبصورت ہے اور جب ابھی سے اس کی آنکھیں اتنی اچھی ہیں تو بڑی ہونے پر اور بھی اچھی لگیں گی۔ نجمہ کا وزن اب کتنا ہوگا، پیدا ہونے کے بعد تو گھٹا ہی ہوگا کیونکہ یہ فطرتی امر ہے۔معدہ بھی کچھ نادرست رہتا ہوگا۔کہیں رضیہ بچّی کو اپنے ساتھ پلنگ پر تو نہیں سلاتی۔اسے ایسا نہ کرنا کیونکہ ڈاکٹری اصولوں کے مطابق بچّہ اگر ماں سے علیحدہ اپنے چھوٹے سے کھٹولے پر سوئے تو اس کی صحت کے لیے مفید ہوتا ہے۔

علی باقر کا بھی یہی کہنا ہے کہ بنّے بھائی اپنے خطوں میں چھوٹی سی چھوٹی بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔رضیہ کے نام اپنے 10 ستمبر 1940 کے خط میں جو تفصیل انہوں نے لکھی ہے وہ علی باقر کے بیان کی تائید کرتی ہے۔لکھتے ہیں:

> ''ڈیڈی کے خطوں سے خیریت معلوم کر کے بڑا اطمینان ہوا۔امید ہے کہ تمہاری صحت بھی نارمل ہو جائے گی۔ نجمہ بی بی کا وزن تو پیدا ہونے کے بعد کچھ گھٹا ہی ہوگا کیونکہ یہ فطرتی امر ہے۔اور شاید معدہ بھی کچھ نادرست رہا ہو مگر اب تو اسے اچھا ہو جانا۔تم بچّی کو اپنے ساتھ پلنگ پر تو نہیں سُلاتیں۔میرا خیال ہے کہ ڈاکٹری اصول سے یہی بہتر سمجھا جاتا ہے کہ بچّہ کھٹولے پر ماں یا نرس سے علیحدہ سوئے۔یہ صحت کے لیے بھی مفید ہے اور عادت بھی نہیں بگڑتی۔تم کو تو آج کل بچّی کی دیکھ بھال میں بڑی مشقت کرنی پڑتی ہوگی۔دودھ پلانا، نہلانا، دھلانا اور سلانا ہی چوبیس گھنٹے کا مسلسل

کام ہے۔ رات کو اُٹھ کر بچی روتی تو نہیں اور تمہیں سونے کو کافی ملتا ہے یا نہیں؟ اگر سونا اور غذا ٹھیک رہے تو پھر تم بہت جلد مضبوط ہو جاؤ گی۔ کمزوری تو اب بالکل رفع ہو جانی۔ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں کیوں کمزوری ہے؟ الہ آباد تو اب غالباً دسہرے کی چھٹیوں کے بعد جاؤ گی۔ اچھا ہی ہے۔ اس وقت تک بچی بھی ذرا بڑی ہو جائے گی اور تم بھی مضبوط۔'' (۱۶)

مندرجہ بالا تحریر بتاتی ہے کہ سجاد ظہیر کو ہر شخص اور ہر چیز کا کتنا خیال رہتا تھا۔ ان کے خطوں کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا جیسے باتیں کر رہے ہوں۔ جیل میں تو ان کا یہ احساس اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ ایک خط میں رضیہ سے یہ بات بھی پوچھتے ہیں کہ وہ کمرے میں سوتی ہے یا باہر اور اسے تاکید کرتے ہیں کہ اگر وہ اندر سوئے تو اس کمرے میں سوئے جس میں اسٹڈی ہے کیونکہ گھر میں سب سے روشن اور ہوادار کمرہ وہی ہے۔ اسے خاص طور پر اندر والے بڑے کمرے میں سونے سے منع کرتے ہیں کیونکہ وہاں اندھیرا ہے اور اس میں دھوپ بھی نہیں آتی۔ اس حد تک کسی اپنے کے لیے سوچنا اور اس سے متعلقہ ہر قسم کی اہم یا غیر اہم معلومات حاصل کرنا سجاد ظہیر کی شخصیت کی خاص خوبی تھی۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ میں باہر صحن میں دھوپ میں بیٹھا یہ خط لکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ تم بھی ہمارے کمرے کے سامنے والے برآمدے میں بیٹھی نجمہ کے ساتھ دھوپ کھا رہی ہو گی جیسے پار سال ہم دونوں بیٹھا کرتے تھے۔ رضیہ سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ سامنے والے مکان والے کی بیوی اب بھی کھڑکی سے جھانکتی ہے کہ نہیں۔ ایک عام آدمی ان معمولی باتوں کی طرف توجہ نہیں دیتا خاص کر جب وہ قید میں پریشان حال ہوتا ہے لیکن بنے بھائی اپنی قسم کے واحد انسان تھے جو اپنے لوگوں کے اندر گھس کر ان کے حالات معلوم کرتے تھے جن میں چند ایسے حالات بھی ہوتے تھے جو اس شخص کو خود بھی معلوم نہ ہوں۔ سجاد ظہیر کی موت کے بعد جب دنیا کے کونے کونے سے آنے والے تعزیت کے خطوں کی بھرمار ہونے لگی اور ماتم پرسی کرنے والے لوگوں کا تانتا لگ گیا تو حیرت ہوتی تھی کہ اس شخص کی مقبولیت کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ ان کی بیوی رضیہ خود حیران تھیں کہ ایک آدمی اتنے سارے انسانوں کو یہ یقین کیسے دلوا سکتا ہے کہ وہ ان کو اتنا ہی چاہتا ہے جتنا کسی اور کو نہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ بات غور طلب ہے کہ نہ صرف اردو بلکہ ساری زبانوں کے لوگ ان سے متفق ہو جاتے تھے اور ان کا

فیصلہ قبول کر لیتے تھے۔ ایسا تبھی ہوا کیونکہ اس شخص کی بے تعصبی پر لوگوں کو بھروسا تھا اور اس کے اقدامات اور کلام میں کوئی منفعت پوشیدہ نہیں تھی۔ سجاد ظہیر کی شخصیت پر اس معاملے میں جیل کے ماحول کا کوئی اثر سرزد نہیں ہوا۔ وہ جیسے جیل کے باہر تھے ویسے ہی جیل کے اندر بھی رہے۔ بے لاگ محبت، انسان پروری، دوستوں سے پیار یہ ان کی شخصیت کے لازوال جز تھے جو جیل میں بھی پیش پیش تھے۔

جیل میں وہ جتنے دن رہے رضیہ کے لیے تو فکر مند رہتے ہی تھے لیکن نجمہ کے آنے کے بعد اب وہ اس کے بارے میں بھی ہر وقت سوچنے میں مصروف رہتے تھے۔ نجمہ سے وابستہ ہر چھوٹی بڑی بات ان کے ذہن میں موجزن رہتی تھی۔ ایک خط میں رضیہ سے پوچھتے ہیں کہ نجمہ کو گائے کے دودھ کی فیڈنگ کی وجہ سے معدے کی شکایت تو نہیں ہوئی؟ رضیہ کو تنبیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ دودھ صرف ڈیری کا ہی منگوایا کرے اور بند بوتل میں کیونکہ اِدھر اُدھر کا دودھ محفوظ نہیں ہوتا۔ چونکہ ان دنوں رضیہ الہ آباد میں اپنے سسرال کے ہاں رہتی تھی اس لیے اسے ینی کی ڈیری کا ہی دودھ منگوانے کا مشورہ دیتے ہیں کیونکہ وہ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اگلے خط میں خاص طور پر پوچھتے ہیں کہ کیا بچّی کو گائے کا دودھ ٹھیک سے ہضم ہونے لگا ہے کہ نہیں۔ دودھ کتنی بار دن میں دیا جاتا ہے، پہلے کے مقابلے کچھ موٹی ہوئی کہ نہیں۔ ایک خط میں جب رضیہ ان کو لکھتی ہے کہ بچّی کی طبیعت ٹھیک نہیں تو انہیں سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ بچّی کی طبیعت کیوں اچھی نہیں؟ کیا دانت نکل رہے ہیں؟ کچھ قبل از وقت سا معلوم ہوتا ہے۔ بہت تردد اور فکر ہے، معلوم نہیں اس جاڑے میں تمہاری طبیعت کیسی رہی۔۔۔۔۔۔ آخر مایوس ہو کر لکھتے ہیں ''افوہ! یہ کمبخت بیماریاں جیسے ان کے بغیر ہمارے لیے کافی دکھ اور پریشانیاں نہیں ہیں۔''

انہیں جب یہ خبر دی گئی کہ نجمہ کے دو دانت نکل آئے ہیں تو ان کے چہرے پر ایک معصوم بچّے کی سی خوشی پھیل گئی۔ کہتے ہیں کہ یہ چھوٹی سی خبر کہ نجمہ بی بی کے دو دانت نکل آئے ہیں اور یہ کہ اب وہ گر پڑ کر تھوڑا سا بیٹھ لیتی ہے میرے لیے بہت بڑی خبر ہے، اس لیے کہ اب کئی دن تک بار بار اسی کا خیال آئے گا۔ اس کی صورت نظر کے سامنے اور اس کی غوں غوں کی بازگشت کانوں کے لیے سب سے اچھی موسیقی ہوگی، تو گویا یہ ہماری عید ہوئی۔ کیونکہ یہاں تو جتنی خوشیاں ہیں سب خیالی ہیں۔ تکلیفیں بھی جسمانی اتنی نہیں جتنی روحانی۔

جیل میں قیدیوں کو جو صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں ان کا ذکر سجاد ظہیر نے اپنے خطوں یا اپنے ملاقاتیوں سے بہت کم کیا ہے۔ اپنے دکھوں اور تکلیفوں کو ظاہر کرنا ان کے کردار میں شامل نہیں تھا۔ لیکن ایک خط میں انہوں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں ایک ذہنی صعوبت بیان کر ہی دی ہے۔ 18 فروری 1941 کے خط میں علاوہ نجمہ کے ذکر کے انہوں نے جیل کے اس پہلو کو بھی رضیہ کے آگے پہلی بار ظاہر کیا ہے۔ اس سے پہلے کبھی کبھی وہ جیل کا حال ضرور لکھ دیتے تھے مگر آہستہ آہستہ ان کی مایوسی بڑھتی گئی اور دل کی شکستگی سے تنگ آ کر اس جذبے کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میری جان! یہ جیل بڑی بُری جگہ ہے اور گیارہ مہینے کے تجربے نے مجھے یہ اچھی طرح بتا دیا کہ انسان کی انسانیت کو ختم کرنے اور اس کے کیریکٹر کو پست کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ طبیعت چھوٹی سی ہو جاتی ہے، ذرا ذرا سی تکلیفوں کا ایک پہاڑ بن جاتا ہے۔ فیاضی اور سخاوت کا جذبہ فنا ہو جاتا ہے۔ تخئیل میں جدت اور ندرت مفقود ہو جاتی ہے اور آدمی کے لیے اپنی انسانیت کو برقرار رکھنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ یہاں آ کر آزادی کی قدر اور بڑھ جاتی ہے اور محکوم عوام کی حقیری اور خواری، روحانی اضمحلال اور دماغی پستی کا راز جیسے کھل جاتا ہے۔'' (۱۷)

جیل کی سلاخوں کے پیچھے کا کرب اور ذہنی بے چینی کہیں کہیں ان کی تحریروں میں لاوے کی طرح پھوٹ پڑتی ہے۔ 7 جون 1941 کے خط میں اپنی دل آزاری کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''وہ کیسی رات تھی میری جان! جس کی خوشبو سے میری روح اب معطر ہے۔ اور اب یہ کمبخت، بے خطا و قصور، بے مقدمہ و باز پرس، بے میعاد قید جس کی ابتدا معلوم ہے لیکن انتہا معلوم نہیں، دل کی ہر تمنا اور خواہش کو بے رحمی سے جیسے مسل کر گذشتہ مسرتوں کے نقوش بھی رفتہ رفتہ مٹاتی جا رہی ہے اور ایک اتھاہ درد اور رنج اور بے حسی ساری ہستی پر قابو پاتے جاتے ہیں۔'' (۱۸)

ویسے تو جیل کی زندگی مشکلوں سے بھری ہوتی ہے۔ لیکن بنے بھائی کہتے ہیں کہ قیدی کے لیے صرف دو خوشیاں ہوتی ہیں۔ ایک کبھی کبھی کی ملاقات اور دوسرے خط۔ اس لیے بیوی کو کہتے

ہیں کہ تم جتنے لمبے اور زیادہ خط لکھو گی اتنی ہی میری خوشی زیادہ ہوگی گویا اتنی دیر میں مَیں نہیں ہوتا بلکہ تم سے خیالی باتیں کرتا ہوتا ہوں۔ ان خطوں کا خیال انہیں ہردم رہتا تھا اور جب خطوں کی رفتار کم ہو جاتی یا زیادہ دیر ہو جاتی تو وہ پچھلے خطوں کو پھر سے پڑھ کر پرانی یادوں کو تازہ کر لیا کرتے تھے۔ جیل میں نہ صرف انہوں نے محبت سے اپنا رشتہ قائم رکھا بلکہ ادب کا دامن بھی پوری طرح تھامے رکھا۔ جو کتابیں وہ جیل میں پڑھتے تھے ان پر اپنے کئی خطوں میں تبصرہ بھی کیا ہے۔ اگر کبھی کبھار کوئی ادیب یا شاعر جیل میں آ کر ان کے ساتھ رہنے لگا تو اس تعلق کا ذکر بھی ان خطوں میں کئی جگہ ملتا ہے۔ بد قسمتی سے 'نقوش زنداں' کے علاوہ دیگر خط جو انہوں نے اپنے دوستوں اور رفیقوں کو جیل سے لکھے وہ کہیں بھی دستیاب نہیں ہیں اس لیے یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ ان لوگوں کو انہوں نے اپنے تاثرات کس طرح بیان کیے۔
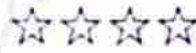
کتابیات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر/پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	10
۲)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	9
۳)	صلیبیں میرے دریچے میں	فیض احمد فیض	کلاسیک۔لاہور		49
۴)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	39
۵)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	49
۶)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	83
۷)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	150
۸)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	221
۹)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	269
۱۰)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	14
۱۱)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	32
۱۲)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	51
۱۳)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	61
۱۴)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	74
۱۵)	کالی پوت کے لچھے	علی باقر	پرگتی شیل وسودھا۔بھوپال	2005	
۱۶)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	86
۱۷)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	138
۱۸)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	151

☆☆☆☆

۳۔ جیل میں ادب، فن اور شاعری سے وابستگی

سجاد ظہیر چونکہ ترقی پسند تحریک، پی۔ ڈبلیو۔ اے اور اپٹا سے گہرے طور پر منسلک تھے اس لیے اپنے ادبی کارناموں پر توجہ نہ دے سکے۔ اس لیے وہ جتنا ادب تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اُتنا نہ کر پائے۔ ان کی محرکتہ الآرہ تخلیقات دو ہی ہیں 'روشنائی' اور 'ذکر حافظ'۔ لیکن ان کے اندر ایک شاعر بھی مستور تھا جس کا ذکر بہت کم ہوا ہے۔ قید و بند کے حالات میں خاص کر پاکستان کی جیلوں میں جہاں فیض احمد فیض بھی ان کے ساتھ تھے بنّے بھائی نے ہر مشاعرے میں باقاعدہ شرکت کی تھی۔ 1964 میں ان کی شاعری کا ایک مجموعہ 'پگھلا نیلم' کے نام سے نئی روشنی پرکاشن دہلی سے شائع ہوا تھا جس میں ان کی زیادہ نظمیں نثری انداز میں ہیں۔ ان کے علاوہ بنّے بھائی کی ایسی کوئی خاص ادبی کاوش نہیں جو انہیں ممتاز ادیبوں کی صف میں لاکر کھڑا کردے۔ ان کا ناول جسے ناولٹ کہا جاتا ہے وہ اپنی قسم کی خاص تخلیق ہے کیونکہ اس میں ایک نیا تجربہ کیا ہے جو تب تک کسی اور ادیب نے نہیں کیا تھا۔ مگر اس ناولٹ اور ان کی کتابیں روشنائی اور ذکر حافظ کے علاوہ کوئی اور ادبی کارنامہ کسی خاص ادبی تعریف کا بہت زیادہ حق دار نہیں مانا جاتا۔ سید مظہر جمیل کے مطابق سجاد ظہیر کے بارے میں بالعموم یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ اپنی غیر معمولی اور متنوع سیاسی، سماجی اور تنظیمی معروفیت کے باعث ادبی تصنیف و تالیف اور لکھنے پڑھنے کے کام پر بہت کم توجہ دے پائے اس لیے ان کے چھوڑے ہوئے ادبی ترکے میں محض ایک مختصر ناولٹ 'لندن کی ایک رات' پانچ چھ افسانے جو 'انگارے' میں شامل تھے، ایک چھوٹا سا ڈرامہ 'بیمار' ایک نیم ادبی تاریخ اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی

روداد روشنائی' ایک چھوٹی سی تنقیدی کتاب 'ذکر حافظ' جیل سے لکھے گئے خطوط کا ایک مجموعہ 'نقوشِ زنداں' اور ایک اور مجموعہ 'مضامین سجاد ظہیر' جس میں مختلف موضوعات پر لکھے گئے چودہ مضامین شامل ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن بنے بھائی کے ادبی شعور کے بارے میں محض یہی اندازہ اخذ کرنا نامناسب ہوگا۔ کیونکہ 1936 سے جب انہوں نے ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کی اور 1973 تک جب الماتا روس میں وہ وفات پا گئے ، یہ 37 سال ان کے لیے اعصاب شکن مصروفیت کے سال تھے۔ اس عرصے میں وہ دس بارہ برس تو روپوشی یا، قید و بند میں ہی بسر کرتے رہے اور باقی عرصہ کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں میں اور 'قومی جنگ' اور 'حیات' کی ادارتی ذمہ داری سنبھالنے میں مصروف رہے۔ اس لحاظ سے ان کا چھوڑا ہوا ادبی سرمایہ اتنا بے مایہ بھی نہیں۔ یہی ادبی ذوق ہر جگہ سایہ بن کر ان کے ساتھ رہا۔ لکھنؤ سینٹرل جیل سے جو خط انہوں نے اپنی شریک حیات کو لکھے ان میں ان کی ادب شناسی کا سراغ جگہ جگہ ہر خط میں ملتا ہے۔ کہیں کوئی تبصرہ، کہیں کسی کتاب کو پڑھنے یا لکھنے کا ذکر، کسی کی تخلیق تنقید وغیرہ ان خطوں میں عام نظر آتے ہیں۔ جب جب ماحول نے یاری کی انہوں نے ادبی تالیفات سے بالکل گریز نہیں کیا۔ جیل میں اندھیرا شروع ہوتے ہی وہ مطالعہ شروع کر دیتے تھے یا خط لکھا کرتے تھے۔ ہر روز چھ سے آٹھ خط لکھتے تھے جن میں رضیہ کے علاوہ اپنے دوستوں اور متعارف لوگوں سے بھی مخاطب ہوتے تھے۔ انہیں پڑھنے کا بہت زیادہ شوق تھا۔ یہاں تک کے سوتے وقت بھی ان کے ہاتھ میں کتاب رہتی تھی جو سوتے وقت ان کی چھاتی پر رکھی رہ جاتی تھی۔ ان کی تحریروں میں ان کی لکھائی باریک مگر خوبصورت ہوتی تھی۔ ان کے ایک ساتھی حسن عابدی تھے جو عمر میں ان سے کافی چھوٹے تھے مگر وہ اپنی روپوشی کے دوران انہی کے ساتھ رہے اور وہی ان کے تمام ذاتی کام بھی کرتے تھے۔ وہ اپنے ایک مضمون 'بولنا مہنگا پڑا' میں لکھتے ہیں کہ ان کی عمدہ تحریر کی ایک خوبی حروف کا روشن اور صاف ہونا بھی تھا۔ ان کی لکھاوٹ کھلی ہوئی نہ تھی لیکن حروف باریک ہوتے ہوئے بھی صاف پڑھے جاتے تھے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ بنے بھائی سیاسی مصروفیت کے باوجود ادب کے آدمی تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''لیکن بنے بھائی سیاسی مصروفیت کے باوجود ادب کے آدمی تھے یہ میرا ہی اندازہ نہیں، بہت سے لوگوں نے، ہر اعتبار سے بہتر لوگوں نے، یہ بات کہی

> ہے۔ جن دنوں کا یہ تذکرہ ہے، مرزا شوق کی مثنوی 'زہرِ عشق' پر ایک تنقید نگار کا مضمون چھپا تھا جس میں اسے ترقی پسندی کے برعکس تاثیر کا حامل بتایا تھا۔ جواب میں بنّے بھائی نے ایک مختصر تخلیق لکھی اور مجھے پڑھنے کو دی، پھر کچھ زبانی گفتگو کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ مثنوی 'زہرِ عشق' نوابی عہد کے گھٹے ہوئے پچھڑے پردہ دار سماج کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی۔ چنانچہ نوابوں اور تعلقداروں نے یو پی کے گورنر پر زور ڈالا کہ 'زہرِ عشق' کی اشاعت اور ڈرامائی پر پابندی لگا دی جائے۔ عشق ایک سچا اور فطرتی جذبہ ہے۔ عشق کا بیان رجعت پرست نہیں البتہ اس کے فطری شائستہ اظہار کی راہ میں دیوار کھڑی کرنا رجعت پرستی ہے۔ بنّے بھائی غالباً انہی دنوں اپنی آئندہ تصنیف 'ذکرِ حافظ' کا ابتدائی خاکہ مرتب کر رہے تھے۔"(۱)

ایک خط میں اپنی بیوی کو لکھتے ہیں کہ میں نے تمہارے لیے 'دیوانِ حسرت' خریدا تھا جو اس کمرے کی میز پر رکھا تھا جہاں میں لکھنؤ میں ٹھہرا تھا۔ امید ہے تمہیں کل مل گیا ہوگا۔ اسی خط میں اسے یہ بھی تاکید کرتے ہیں کہ مہربانی کر کے تم پنڈت جواہر لال نہرو سے مل کر ان کی وہ کتاب واپس کر دینا جو میں اس دن ان کے یہاں سے لایا تھا۔ کتاب کا نام Light on Moscow ہے جس پر میں نے بادامی رنگ کا کاغذ چڑھا دیا تھا اور جو میرے لکھنے کی میز پر پڑی تھی۔ کہتے ہیں کہ ان کی دوسری کتاب لکھنؤ میں پڑی ہے۔ کوئی جاتا ہوگا تو واپس ہو جائے گی۔ اس سے یہ اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتابوں کی بالکل اس طرح پہنچان رکھتے تھے جیسے کوئی اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو پہنچاتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ وہ کتابیں جو مجھے مُنّے بھیا نے دی تھیں اب ختم ہو رہی ہیں۔ تم دھون سے بھی میری چاروں کتابیں واپس منگوا لینا کیونکہ مجھے ان کی اس لیے ضرورت ہے کہ میں اس فلسفے پر لکھنا چاہتا ہوں۔

جیل میں پڑھنا اور لکھنا ان کا اہم ترین شغل تھا۔ یہ ان کی روزمرہ کی مشغولیت میں بقدرِ اتم شامل تھا۔ شام ہوتے ہی وہ پڑھنے اور لکھنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اپنے پہلے ہی خط میں اپنا روزانہ کا پروگرام بڑی تفصیل سے لکھتے ہیں۔ اس پروگرام میں تحریر و مطالعہ خاص طور پر شامل نظر آتے ہیں۔ بنّے بھائی نے جو اپنا روزانہ کا پروگرام اپنے خط میں اتنی تفصیل سے لکھا اس میں کافی حصہ

مطالعہ کا ہے جس میں وہ پڑھتے اور لکھتے تھے۔ سیاسی قیدی جن میں تخلیق کارانہ صلاحیتیں ہوتی ہیں وہ اپنا بیشتر وقت ادبی مصروفیت میں صرف کرتے ہیں۔ فیض احمد فیض جب پاکستانی جیلوں میں بند تھے تو انہوں نے اپنی بہترین نظمیں اسی دوران ہی لکھی تھیں۔ بنّے بھائی نے بھی دو مشہور کتابیں یعنی 'روشنائی' اور 'ذکر حافظ' بلوچستان کی مچھ جیل میں لکھی تھیں۔ جیل میں بھی ان کی کتابوں اور رسالوں کی بھوک برقرار رہی۔ رضیہ وقتاً فوقتاً اس بارے میں کافی حد تک ان کی مانگ پوری کر دیتی تھی۔ ان کی بھیجی ہوئی کتابوں کی رسیدگی کی خبر وہ اپنے خطوں میں اُسے پہنچا دیتے تھے۔ اُسے لکھتے ہیں تمہاری بھیجی ہوئی کھانے کی چیزیں، کپڑے اور کتابیں مل گئیں۔ اردو رسالہ بھی ملا جس کا شکریہ۔ کہتے ہیں کہ آج مُنّے بھیا سے میں نے نظموں کی کتاب بھی بھیجنے کو کہا ہے اور تم آنا تو اپنے ساتھ جوش کا 'نقش و نگار' 'حرف و حکایت' اور اگر مل گیا ہو تو 'فکر و نشاط' ضرور لیتی آنا۔ جیل کے ناخوشگوار ماحول میں کتابیں پڑھتے پڑھتے اکثر جی گھبرانے لگتا ہے اس لیے شعر سے ہی دل بہلانے میں مزا آتا ہے۔ جیل میں ان کے پاس شاعری کی کتاب صرف 'شعر و شبنم' ہی تھی۔ انگریزی شاعری کی جو کتابیں انہوں نے گھر سے منگوائی تھیں وہ انہیں تب تک نہیں ملی تھیں۔ رضیہ کو تنبیہ کرتے ہیں کہ اگر ہو سکے تو وہ امرناتھ جھا صاحب کی کتاب Chinese Novel جو ان کی میز پر رکھی ہے انہیں واپس کر دے۔

یہ بار بار کہا گیا ہے کہ کتابیں پڑھنے کا نشہ جیل میں بھی ان پر پوری طرح طاری تھا۔ وہ کوئی کتاب پڑھنے یا باہر سے منگوانے کا ایک بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ جب بھی کوئی اچھی کتاب شائع ہوتی اسے طلب کرنے کی کوشش ضرور کرتے تھے۔ 19 اپریل 1940 کے خط میں رضیہ کو لکھتے ہیں:

> ''میرا شغل وہی پڑھنا ہی پڑھنا ہے۔ ایک بہت اچھی کتاب Social Function of Science حال ہی میں ختم کی اور اس کے علاوہ زیادہ تر فلسفہ کی کتابیں پڑھتا ہوں اور نوٹ بھی بناتا ہوں۔ اگر کافی کتابیں دستیاب ہو گئیں تو فلسفہ مادیت ارتقا بالضدین پر کچھ لکھوں گا۔ اس بیچ ایک خالص ادبی مضمون بھی لکھا ہے 'اردو شاعری' پر۔ معلوم نہیں چھپنے کا کب موقع ملے گا۔ 'نیا ادب' کا تازہ پرچہ تمہارا بھیجا ہوا ملا جسے شروع سے آخر تک چاٹ گیا۔ جوش کی

نظم پسند آئی۔ جوش کی 'حروف وحکایت' بھی ملی اور اقبال کے دو مجموعے بھی۔
مجھے سبط حسن سے شکایت ہے کہ نظموں کا وہ مجموعہ جو انہوں نے شائع کیا تھا وہ مجھے نہیں بھیجا۔ وہ تو مجھ سے آ کر مل بھی سکتے تھے۔ غالباً ادبی لوگوں سے ملاقات کرنے پر سرکار بہادر کو اعتراض نہ ہوگا۔

میں نے مُنّے بھیا سے اس کتاب کے لیے کہا لیکن وہ علی گڑھ چلے گئے اور ابھی تک وہ کتاب مجھے نہیں ملی۔ معلوم نہیں اس مضمون کے چھپنے کا کیا ہو رہا ہے جو میں الہ آباد میں ختم کر چکا تھا اور جسے میں نے لکھنؤ میں ڈاکٹر علیم کے پاس بھجوا دیا تھا۔ تم اگر ان لوگوں سے ملو یا ان کو لکھو تو پوچھنا۔ امید ہے کہ 'نیا ادب' بند نہ ہوگا بلکہ سہ ماہی ہو کر ہی سہی مگر جاری رہے گا۔" (۲)

جیل کی المناک زندگی میں جہاں کمر توڑ تنہائی ایک بارگراں کی طرح انسان کے ذہن کو دبوچ کر رکھتی ہے، تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والے قیدی کے لیے کتابیں ہی ایک مانند سہارا ہوتی ہیں۔ اگر کتابیں بھی نہ ہوں تو انسان بالکل ٹوٹ جائے گا۔ اس کرب ناک تنہائی میں بھی کبھی کبھی معمولی سی چیز کے دستیاب ہونے سے بڑا سکون ملتا ہے۔ ایک بار انہیں رضیہ نے یورپ کا نقشہ بھیجا۔ وہی حاصل کر کے انہیں بہت تسکین ہوئی اور اُسے انہوں نے میز کے سامنے دیوار پر چسپاں کر دیا تا کہ آتے جاتے دیکھ سکیں۔ بذات خود اس نقشے کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن جیل میں جب وقت کاٹے نہیں کٹتا تو یہی چیزیں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر کتابیں نہیں ہوتیں تو دماغ کی نہ معلوم کیا حالت ہوتی۔

جیل میں بنے بھائی کتابیں پڑھتے رہے اور لکھتے بھی رہے جس وجہ سے وہ اس دشوار گزار دور سے مرعوب نہیں ہوئے۔ کوئی اچھی کتاب ہاتھ لگتی تو اس پر تبصرہ بھی کرتے تھے اور اس مصنف کے بارے میں اپنے بے باک تاثرات بھی ظاہر کرتے تھے۔ 16 جون 1940 کے خط میں لکھتے ہیں:

"آج تاریخ کی ایک موٹی کتاب ختم کی۔ اس کے ساتھ ساتھ دو اور کتابیں پڑھ رہا ہوں۔ ایک فرانسیسی ناول اور ایک اقتصادیات کی کتاب۔ اس فرانسیسی

مصنف کو میں جانتا تھا۔ یہ فرانس کا بہت بڑا جدید شاعر بھی ہے۔ اسے امریکن ٹائم میں پڑھا تھا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو کر محاذ پر چلا گیا۔ معلوم نہیں بے چارے کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ اسپین کی لڑائی میں میرے دو دوست بھی مارے گئے ہیں جن میں رالف فاکس بھی تھا اور اب اگر کبھی یورپ جانا ہوا تو شاید ایک ملاقاتی بھی نہ ملے۔'' (۳)

پچھلے ایک خط میں انہوں نے رضیہ کو لکھا تھا کہ وہ ایک نئی کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ 25 جون کے خط میں لکھتے ہیں کہ اس کتاب کی تحریر انہوں نے شروع کر دی ہے لیکن جیل میں مکمل اور قابلِ اطمینان طریقے سے لکھنا کافی دشوار ہوتا ہے۔ اس لیے کہ حوالے کی کتابیں ملنے میں بڑی مشکل ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جو سکونِ قلب و دماغ ایسی کتاب لکھنے کے لیے ضروری ہے وہ جیل میں نصیب نہیں ہوتا۔ رضیہ کی زبان دانی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جیل سے باہر نکل کر اس کتاب پر ایک نظر ثانی کی ضرورت پڑے گی اور پھر تم کو ایک دو مرتبہ دہرانا بھی ہوگا کہ زبان کی غلطیاں اور گٹھلیاں ٹھیک کر دو کیونکہ تمہاری زبان دانی کے آگے تو میں طفلِ مکتب ہوں۔ یہ بنّے بھائی کی انکساری ہے کہ خود اتنے نامور ادیب ہونے کے باوجود زبان دانی کا رتبہ رضیہ کو ہی بخشتا ہے۔ بڑے ادیبوں اور مصنفوں کی ہمیشہ یہ خاص خوبی رہی ہے کہ وہ اپنی قابلیت کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ سجاد ظہیر کے سبھی جاننے والوں نے ان کی اس صلاحیت کو ایسے ہی سراہا ہے۔

جس کتاب کے بارے میں وہ پہلے کہہ چکے ہیں تب تک انہوں نے اس کا کوئی ایک تہائی حصہ ختم کر لیا تھا۔ یہ بات رضیہ کو بڑے رومانی اور ڈرامائی انداز میں بتاتے ہیں۔ اپنے 15 جولائی کے خط میں لکھتے ہیں:

''تمہارے 10 جولائی کے خط میں لکھا تھا کہ میرے اس فقرے پر کہ ''تم وہاں اچھی طرح ہو اور مجھے اطمینان ہے'' تمہیں دلی صدمہ پہنچا۔ میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی اور بہت رنج ہوا کہ اس بات کے تم نے کتنے دور دراز معنی نکالے، جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ میں نے تو اس وقت کی حالت کا اظہار کیا تھا نہ کہ اپنی مشترکہ زندگی کے مستقبل کا پروگرام تجویز کیا تھا۔ بس

جناب ذرا ذرا سی بات کو پکڑ کر اس کے الٹے سید ھے معنی نہ نکالیے اور دلی رنج کو نکال کر ''آنا ساگر'' کی موجوں میں غرق کر دیجیے۔ آج کل برسات میں وہ کافی بہار پر ہوگا۔ واہ! واہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ اور یہ کہ آخر میں کتاب کس کے لیے لکھ رہا ہوں۔ تمہیں یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ وہ ایک تہائی یعنی تقریباً 50 صفحہ کے قریب ہو چکی ہے۔ ڈیڑھ سو صفحے سے کچھ زیادہ ہوگی اور اس طرح کی تین کتابیں اس پورے مضمون کو کور (Cover) کریں گی جس پر میں نے لکھنا شروع کیا ہے۔ الغرض جب تم مع اہل و عیال کے یہاں تشریف لاؤ گی تو تمہارے لیے کافی مصالحہ تیار ہوگا۔''(۴)

بنّے بھائی جیسے لوگوں کے لیے جیل میں کوفت کی سب سے بڑی وجہ موسم کی بے اعتدالی اور بے رخی ہوتی تھی۔ جب گرمی بڑھ جاتی تو طبیعت مضمحل ہونے لگتی تھی اور بے چینی قدرے بڑھ جاتی تھی اور مزاج خوشگوار ہونے کے باوجود تصنیف کا وہ معیار قائم نہیں رکھ پاتے جس کے وہ قابل تھے۔ موسم کی بیدردی کا ذکر انہوں نے کئی خطوں میں کیا ہے اور شروع شروع میں تو پنکھے مہیا نہ ہونے کی شکایت بھی کی ہے۔ یہ پریشانی گرمی کے پورے موسم میں ان کے ہمراہ رہی۔ 19 جولائی کے خط میں ان کا یہ شکوہ بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میری طبیعت بھی اچھی ہے اور ''مزاج'' بھی اچھا ہے۔ آج کل لکھنے کی مشغولیت رہتی ہے اور اس محنت کے بعد ایک طرح کی خوشی بھی ہوتی ہے کہ اس بے ہودہ اور روح فرسا جگہ میں کم از کم میرا دماغ تو اتنا صحیح ہے کہ تھوڑا بہت اچھا کام کیا جاسکتا ہے۔ اگر گرمی اور بند ہونے کی تکلیف اور الجھن روز روز کی نہ ہوتی تو شاید اس کام کی Quality بہتر ہوتی۔''(۵)

کتاب کا انتساب کس کے نام ہونا اس مضمون پر بھی بنّے بھائی رضیہ سے خوب مذاقیہ انداز میں بات کرتے ہیں۔ دراصل 'نقوشِ زنداں' میں جتنے خطوط شامل ہیں ان میں دونوں کے حسین جذبات اور احساسات کا بڑے عاشقانہ طریقہ سے اظہار کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے 'نقوشِ زنداں' ایک معاشقہ خیز کتاب بن گئی ہے۔ پڑھنے سے کسی ریگستان میں سرسبز گلستان کا احساس ہوتا

ہے۔ جوش ملیح آبادی جنہوں نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے کہتے ہیں کہ اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جو عاشق اور معشوق کے خطوں میں ہوا کرتا ہے۔ اسی جذبے کا اظہار بنّے بھائی اپنے 26 جولائی کے خط میں کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''تین چار دن سے میں نے کچھ نہیں لکھا ہے بلکہ نوٹ تیار کر رہا ہوں۔ آج کتاب کی لکھائی پھر شروع کروں گا۔ کل سوچ رہا تھا کہ اس کتاب کو تمہارے اس طریقے پر معنون کرونگا ''اپنی محبوبہ کے نام جس کے طعنہ و تشنیع کے بغیر کبھی نہ لکھی جاتی۔'' ٹھیک ہے نا؟ بھئی یہ تو پرانی مثل ہے کہ ''ہر فرعونِ را موسیٰ۔'' تو گویا تم ہماری کلیم اللہ ہو۔'' (٦)

کتاب کا تو جیسے بنّے بھائی کو خبط ہو گیا تھا۔ یہ ان کے کردار کی خصوصیت تھی کہ جو کام ہاتھ میں لیتے تھے جب تک اسے مکمل نہیں کر لیتے چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ ایک خط میں کہتے ہیں کہ کتاب تقریباً ختم ہو چکی ہے کیونکہ صرف کوئی 20 صفحے ہی باقی ہیں۔ کتاب کو جلد ہی ختم کرنا چاہتے تھے کیونکہ ذہنی طور پر کافی تھک گئے تھے۔ کہتے ہیں ختم کرنے کے بعد خوب ست ہو کر پڑ جاؤں گا تا کہ چند دن میں یہ تھکاوٹ مٹ جائے۔ کتاب کے باقی 20 صفحے بھی بنّے بھائی نے جلد ہی ختم کر لیے اور اگلے خط میں رضیہ کو لکھا کہ کتاب ختم کرنے کے بعد ابھی تک میرے آرام کا سلسلہ جاری ہے جس کے معنی ہیں ناول اور اردو رسالے۔ اس دوران انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی 'تفسیر القرآن' پڑھی جو کسی مذہبی عقیدے کی وجہ سے نہیں بلکہ اردو اسلامی تاریخ کا مزید علم حاصل کرنے کے لیے تھی۔ یہ اعتراف بنّے بھائی ہی کر سکتے تھے کہ وہ قرآن مذہبی عقیدے سے نہیں پڑھتے۔ یہ بات ان کے سبھی گھر والے اور دوست یار جانتے تھے کہ وہ مذہب میں اعتقاد نہیں رکھتے لیکن عید کا تہوار بڑے جوش و خروش سے مناتے تھے کیونکہ عید ایک روایت ہے جسے وہ کبھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔

جیل کا ماحول ہی ایسا ہے کہ اچھے خوش مزاج قیدی پر بھی وقتاً فوقتاً مایوسی کا عالم غالب ہو جاتا ہے۔ صبح و شام وہی لوگ، وہی کوٹھری اور وہی پہرے دار انسان کو مایوس کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ بنّے بھائی تو مطالعہ میں مصروف رہتے تھے لیکن کبھی کبھی ماحول کی بوریت انہیں مطالعہ

سے باز بھی رکھتی تھی۔ 25 نومبر 1940 کے خط میں لکھتے ہیں:

''کیا لکھوں؟ تحریری کام قریب قریب بند ہے۔ دماغ پر عجیب قسم کی افسردگی ہے۔ پڑھائی کا حال بھی بہت اچھا نہیں ہے۔ کبھی بہت سی کتابیں ایک ساتھ پڑھنے کو جی چاہتا ہے جس سے دماغ کا انتشار معلوم ہوتا ہے۔ پھر کوئی کتاب مل جاتی ہے جس کو چھوڑنے کا دل نہیں چاہتا اور کام کا پروگرام بالکل گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ پھر کئی صبحیں ایسی ہوتی ہیں کہ پڑھنے کے خیال ہی سے وحشت ہوتی ہے۔''(۷)

یوں تو بنّے بھائی کے ساتھیوں میں سبھی سیاسی قیدی ہی تھے۔ جرم آلودہ قسم کا کوئی بھی مجرم جیل میں نہیں تھا۔ لیکن جب بھی کوئی شاعر یا ادیب نظر بند ہونے کے لیے آتا تھا تو بنّے بھائی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ ہوتی تھی۔ پاکستان میں انہیں فیض احمد فیض سے قریب ہونے کا بھی شرف حاصل ہوا تھا۔ لیکن لکھنؤ سینٹرل جیل میں بھی کبھی کبھار کوئی ایسی شخصیت آ جاتی تھی۔ اس سے تنہائی کا کرب قدرے کم ہو جاتا تھا۔ بنّے بھائی کے ساتھ کچھ عرصہ نقوی صاحب بھی رہے جن کی صحبت سے وہ فیضیاب ہوتے رہے۔ جب وہ چلے گئے تو تنہائی کی کوفت بڑھ گئی تھی۔ لیکن بعد میں دو اور سیاسی قیدی آ گئے تھے جس کی وجہ سے تکلیف کافی حد تک کم ہو گئی تھی۔ اس بات کا ذکر انہوں نے اپنے ایک خط میں رضیہ سے بھی کیا ہے۔ کچھ عرصے بعد وہ دونوں قیدی بھی رخصت ہو گئے تو انہیں لگا کہ جیسے وہ ایک طرح کی تنہائی کی سزا ہے۔ لیکن شکایت کس سے کریں۔ حکومت کو تو اس کی پرواہ نہیں تھی بلکہ اس کی یہی بڑی عنایت تھی کہ بنّے بھائی کو لکھنؤ میں ہی رکھا جس کی وجہ سے انہیں کھانے اور عزیزوں سے ملنے کی سہولت میسر تھی۔ کبھی کبھی کوئی دانشور بھی آ جاتا تھا جیسے دو نامور ادیب آچاریہ نریندر دیو اور پنڈت سمترا نندن پنت جو ہندی کے مانے ہوئے دانشور تھے وہ بھی سینٹرل جیل لکھنؤ میں نظر بند ہوئے۔ اپنے 21 جنوری اور 25 جنوری 1940 کے خطوں میں اس امر کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''پرسوں یہاں آچاریہ نریندر دیو کے علاوہ ایک اور ساتھی ہمارے پنڈت موہن لال گوتم بھی آ گئے۔ تو گویا اب دو سیاسی نظر بند میرے علاوہ یہاں اور ہیں۔ اور اس سے چہل پہل کافی بڑھ گئی ہے۔ سنا جاتا ہے کہ ایک دو سیاسی قیدی ابھی اور

ہماری بیرک میں آنے والے ہیں۔ پھر تو یہ 'خانہ' بالکل بھر جائے گا۔ میں نے آج کل ہندی سیکھنے پر زیادہ وقت صرف کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس لیے کہ آچاریہ جی سے بہتر استاد کبھی بھی نہ مل سکے گا۔ موقع غنیمت ہے۔ اس لیے پورا فائدہ اٹھالوں۔ کیا معلوم کب تک یہ ساتھ رہے۔۔۔۔

میں آج کل سمترا نندن پنت (ہندی کے مشہور شاعر) کی نئی چھپی ہوئی نظموں کی کتاب 'گرامیا' پڑھ رہا ہوں۔ اس میں ہندوستان کے دیہات کی زندگی کے بارے میں نظمیں چھپی ہیں۔ اور بعض تو بہت ہی اچھی ہیں۔ اب جو ہندی سمجھ میں آنے لگی ہے تو ان میں بڑا لطف آتا ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ جب یہ پوری کتاب ختم کرلوں گا تو پھر میں ان میں سے دس پندرہ نظموں کا انتخاب ہندی سے اردو میں ترجمہ کروں گا اور تمہارے پاس بھیجوں گا تا کہ تم اردو اور ہندی کی جدید ترقی پسند شاعری کا مقابلہ کرسکو۔'' (۸)

پنڈت سمترا نندن پنت کی شاعری جیسے بنے بھائی کے دل و دماغ میں پیوست ہو گئی تھی۔ ان کی ایک نظم کو انہوں نے نثر کا جامعہ پہنانے کی کوشش بھی کی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایسا کرنے سے نظم کا بہت سارا حسن ختم ہو گیا ہے۔ رضیہ کو وہ نظم بطورِ ہدیہِ خلوص ارسال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' میری لکھائی پڑھائی آج کل زیادہ تر ہندی تک محدود ہے۔ سمترا نندن پنت کی شاعری مجھ پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کا ایک ہدیہ تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ نثر میں کرنے سے اس کا بہت سا حسن ختم ہو گیا ہے۔ لیکن پھر بھی:

﴿ یہ آفتاب و مہتاب کی دنیا جہاں ہزار ہا جُھنڈ میں تارے ہنستے ہیں۔ جہاں چڑیا چہکتی ہیں۔ جہاں بجلی سے روشن ہو جانے والے بادل ہر ہر لمحہ رنگ بدلتے ہیں۔

﴿ یہاں سبزہ ہے اور کھیتوں کی ہریالی
یہاں پھول ہیں، یہاں شبنم، یہاں کوئل اور آم کی ڈالی ہے۔
یہ سب یہاں رہتے ہیں اور نیلا آسمان اور بوئی ہوئی زمین۔

سورج کی وسیع روشنی، چاندنی کا چپ چاپ حسن۔
یہ ارض قدرت، جہاں تنکا تنکا، ذرہ ذرہ شگفتہ، زندہ یہاں اکیلا انسان ہی ہمیشہ مضمحل ہے۔ زندہ مگر مردہ۔''(۹)

لکھنے اور پڑھنے کا شغل تمام تر اسیری میں بنّے بھائی سے دامن گیر رہا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید قید میں زندگی دشوار ہو جاتی۔ لیکن جیل میں تحریر اور مشغولیت اتنی آسان بھی نہیں ہوتیں، ایسی دشواریوں کا ذکر انہوں نے 'روشنائی' میں بھی کیا ہے اور کہا ہے کہ جیل میں تعلیم اور تحریر کے تعین میں چند مشکلیں درپیش ہوتی ہیں جن پر قابو پانا لازمی ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''قید و بند کے حالات میں تعلیم اور تحریر کے راستے میں چند در چند عملی اور نفسیاتی دشواریاں حائل ہوتی ہیں۔ بہرحال کوشش اور خود تدبیری سے کسی حد تک ان دشواریوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس زمانے میں اپنی زبان اردو، ہندی اور فارسی ادب کو خاص توجہ سے پڑھا۔ جدید ادب کی رفتار کا اندازہ 'ادب لطیف' 'ادبی دنیا' 'نیا ادب' اور 'نگار' کبھی کبھی انجمن ترقی اردو کا رسالہ 'اردو' پڑھنے سے ہوتا رہتا تھا۔ میں گرفتار ہی تھا جب مجھے (غالباً 1942 میں) فیض کی 'نقشِ فریادی' اور راشد کی 'ماورا' (جو شاید اسی مہینے میں شائع ہوتی تھی)، سردار جعفری نے بھیجی۔ سردار چند مہینے پہلے رہا ہو چکے تھے۔ علیم بھی شاید 1941 کے وسط میں چھوڑ دیے گئے تھے اور لکھنؤ میں اپنی جگہ رکھ لیے گئے تھے۔

قید کی المناک فرصت اور روح فرسا تخلیہ اپنی صلاحیتوں، اور اپنے ضمیر کے بار بار تجزیے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اب رہا ہو کر مجھے اپنا زیادہ وقت ادبی کاموں میں ہی صرف کرنا اور عملی سیاست میں نسبتاً کم حصہ لینا۔ میری محبوب شریک حیات بھی جن کے ساتھ مشکل سے میں چند مہینے ہی زندگی بسر کر سکا تھا اسی رائے کی تھیں اور خود بھی یہی کرنا چاہتی تھیں۔ ہم نے لکھنے پڑھنے اور کتابوں کی طباعت اور اشاعت کے بہت سے منصوبے میری گرفتاری کے زمانے میں ہی کر لیے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا ایک ذمہ دار رکن

ہونے کے باوجود سیاسی مشغولیتوں کی وجہ سے میں نہ تحریک کی تنظیم اور نہ لکھنے پڑھنے پر ہی خاطر خواہ توجہ کر سکا تھا۔ اس سلسلے میں بھی اب اپنی گزشتہ کوتاہیوں کو پورا کرنے کا خواہش مند تھا۔'' (۱۰)

مندرجہ بالا اقتباس اس امر کی گواہی ہے کہ جیل میں بھی بنّے بھائی کی رگوں میں ادبی ذوق سرایت کرر ہا تھا۔ اگر کسی ادبی تصنیف پر ان کی کوئی نظر پڑ جاتی تو اس پر اپنے تاثرات ظاہر کرنے کا موقع نہیں گنواتے تھے۔ پٹنہ سے ایک مولانا کلیم الدین احمد نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام 'اردو شاعری پر ایک نظر' تھا۔ اس کتاب میں مصنف نے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں پر سخت طنز کیا تھا اور ترقی پسند تحریک پر بھی ناخوشگوار تنقید کی تھی۔ بنّے بھائی نے اس کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات رضیہ کو 18 فروری 1941 کے خط میں ارسال کیے تھے۔ لکھتے ہیں:

'' حال میں ایک اچھی سی کتاب پڑھ رہا ہوں۔ شاید تم نے بھی پڑھی ہو، 'اردو شاعری پر ایک نظر' از کلیم الدین احمد (پٹنہ)۔ ترقی پسند شاعری کی خوب دھجیاں اڑائی ہیں، تمہارے 'شاعر' مجاز کو بری طرح لتاڑا ہے۔ مجھے ان کی بہت سی باتوں سے سخت اختلاف ہے کیونکہ اور بہت سے رجعت پسندوں کی طرح وہ بھی ترقی پسندی کو پوری طرح سمجھ ہی نہیں پائے ہیں۔ پھر بھی اس کتاب کے مصنف فن شاعری کے اعتبار سے اچھی تنقید کرتے ہیں اور انکی تنقید یقیناً ایسی ہی ہے جو اردو شاعری کے لیے مفید ثابت ہوگی۔'' (۱۱)

جب سے آچاریہ نریندر دیو جیل میں آئے تھے بنّے بھائی کے جیسے دن ہی بدل گئے تھے۔ وہ بہت خوش تھے اور اپنی خوشی کا اظہار انہوں نے اپنے خطوں میں کئی جگہ کیا بھی ہے۔ آچاریہ سے وہ ہندی سیکھنے لگے تھے اور اس زبان پر قدرے عبور بھی حاصل کر لیا تھا۔ ان کی وجہ سے بنّے بھائی کی ہندی کی تعلیم جاری تھی لیکن یہ خطرہ بھی لگا رہتا تھا کہ کہیں ان کا تبادلہ کسی اور جیل میں نہ کر دیا جائے۔ آخر وہ نامراد دن آ ہی گیا اور آچاریہ نریندر دیو کا تبادلہ گورکھ پور جیل میں ہو گیا۔ اس سے بنّے بھائی کی تعلیمی کاوش کو بہت بڑا دھکہ لگا۔ لکھتے ہیں ایک عالم اور زندہ دل شخصیت کی صحبت سے محروم ہو گیا ہوں۔

''مسز وجے لکشمی پنڈت نے پنڈت نہرو کے کہنے پر مجھے ایک بڑی اچھی سی کتاب تحفہ بھیجی ہے، یہ کتاب ہے 'راج ترنگنی' یا دریائے شاہاں یعنی River of KIngs۔ایک پرانی سنسکرت کتاب کا انگریزی ترجمہ ہے جو مسٹر پنڈت کا کیا ہوا ہے۔ بڑی سی ضخیم کتاب ہے جسے ایک کشمیری برہمن نے ۱۱۰۰ء عیسوی کے قریب تصنیف کیا تھا۔ اس میں کشمیر کی پرانی تاریخ ہے۔ منظوم جس میں نہ صرف بادشاہوں کے حالات ہیں بلکہ ازمنہ وسطیٰ کے ہندوستان کے معاشرتی حالات کا بھی بڑا دلچسپ تذکرہ ہے۔ بیچ بیچ میں فلسفیانہ نکات، شاعرانہ پرواز خیال، رنگین عشقیہ تذکرے سب کچھ ہے۔ اور جب اس خطۂ جنت نظیر کے سر بفلک برفستانوں، صنوبر کے درختوں، سرسبز مرغ زاروں، مست ہواؤں کے حالات پڑھتا ہوں تو بار بار میرے دل میں ہوک سی اٹھتی ہے کہ ہم تم بھی وہاں چلیں، انسانوں کی بستیوں سے دور اور خوب گھومیں، سیر کریں، یہاں تک کہ تھک کے چور ہو جائیں اور پھر رات کو عشق ومحبت کے افسانے ایک دوسرے کو سناتے سناتے سو جائیں۔'' (۱۲)

راج ترنگنی کشمیر کے ایک وددان کلہن نے سنسکرت میں لکھی تھی جو شاعری میں ہے اور جس میں کشمیری بادشاہوں کے عہد کا ذکر بڑی دلچسپی سے کیا گیا۔ کلہن نے اپنی کتاب کی تمہید 1149ء سن میں لکھی تھی اور مکمل کتاب اگلے سال یعنی 1150ء میں تیار ہوئی تھی۔ اس کا انگریزی ترجمہ سب سے پہلے رنجیت سیتارام پنڈت نے کیا تھا۔ اس کتاب کا پیش لفظ پنڈت جواہر لال نہرو نے ڈیرہ دون جیل سے 1934 میں لکھا تھا اور ساہتیہ اکیڈمی نے اسے شائع کیا تھا۔ اس سے پہلے اس کتاب کے ایک حصے کا ترجمہ فارسی میں اس زمانے ایک بادشاہ زین العابدین کے حکم سے ہوا تھا جس کا نام بادشاہ نے 'بحر الاسمار' رکھا تھا۔ یہ پرانی فارسی زبان تھی جسے سمجھنا بہت مشکل تھا اس لیے اسے کوئی خاص مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ایم۔اے۔ سٹین نے سن ء 1892 میں کیا تھا جو ادب میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے۔ یہ کتاب ایک طرح کی حوالیہ کتاب ہے اور ہر لحاظ سے مکمل تسلیم کی جاتی ہے۔

بنے بھائی جب آچاریہ نریندر دیو سے ہندی کی تعلیم حاصل کررہے تھے تب انہیں راجستھانی زبان سے بھی واسطہ پڑا اور انہوں نے راجستھانی نظمیں اور گیت بڑی دلچسپی سے پڑھے۔ خاص کر میرا بائی کے۔ پرتھوی راج اور چمپا دے بھی راجستھانی شاعر تھے جو آپس میں میاں بیوی بھی تھے۔ ان دونوں نے اپنا زیادہ تر کلام دونوں کے نام سے ہی لکھا ہے۔ بنے بھائی نے ان دونوں کا کلام بھی پڑھا اور میرا کے گیت بھی۔ بنے بھائی راجستھانی زبان سے پہلے تو واقف نہیں تھے لیکن آچاریہ نریندر دیو کی صحبت میں انہوں نے یہ زبان بھی سیکھ لی اور اس سے لطف اندوز بھی ہوئے۔ یہ ان کی ذاتی خوبی تھی کہ جو زبان انہیں اچھی لگتی اس پر جلد ہی عبور حاصل کر لیتے تھے۔ اس زبان کے متعلق 4 نومبر 1941 کے خط میں رضیہ کو لکھتے ہیں:

''ہندی پڑھنے کے سلسلے میں راجستھانی زبان کی نظمیں اور گیت بھی میں نے پڑھے مثلاً میرا بائی اور پرتھوی راج اور چمپا دے (یہ دونوں میاں بیوی شاعری کرتے تھے اور ان کا بہت سا کلام دونوں کے نام سے ہے) وغیرہ کی چیزیں۔ یہ گیت ایسے ہیں جو قدیم خسرو اور اس زمانے کے برج بھاشا کی شاعری سے قریب ہیں۔ اور اس طرح اردو اور ہندی کے مشترکہ ماخذ مانے جاسکتے ہیں۔ میرا کا ایک بڑا سندر گیت جو تم نے سنا ہو لکھتا ہوں۔ آج کل بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ سنو:

گھڑی ایک نہیں آوڑے — تم درسن بن ہوئے
تم ہو میرے پران جی — کا سن جیون ہوئے
دھان نہ بھاوے نیند نہ آوے — برہ ستاوے موئے
گھائل سی گھومت پھروں رے — میرا درد نہ جانے کوئے
دوس تو کھائے گمائیو — رین گمائی سوئے
پران گمائیو جھورتان رے — نین گمائی روئے
جو میں ایسا جانتی رے — پریت کیے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹی رے — پریت نہ کریو کوئے

پنتھ نہاروں ڈگر بُہاروں ادبی مارگ جوئے
میرا کے پربھو کب رے ملوگے تم ملیا سکھ ہوئے

اب میرا سے بہتر کس طرح تم سے اپنی محبت کا اظہار کروں۔ اُس کے لیے تو مجازی اور حقیقی میں فرق تھا۔ میرے لیے تو مجازی بھی تمہیں ہو اور حقیقی بھی۔ تو بھلا بتلاؤ بغیر تمہارے ملیاں کیسے سکھ ہوئے۔'' (۱۳)

سجاد ظہیر ہمیشہ اس حق میں تھے کہ ہندی اور اردو کو مشترکہ زبان تسلیم کیا جائے اور اس کا رسم الخط رومن ہو۔ ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی تھی کہ ہندی اور اردو دونوں کو یکساں اہمیت ملنی تبھی یہ ہمارا اگنگا جمنی کلچر ترقی کر سکے گا۔ انہوں نے اس موضوع پر ایک لسانی مضمون 'اردو۔ ہندی۔ ہندوستانی کا مسئلہ' کے عنوان سے لکھا تھا جو 'نیا ادب' کے 1946 کے شمارے میں شائع بھی ہوا تھا۔ اس مضمون میں انہوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ ہندی دان ادیب اردو کے خلاف ہیں اور اردو کے ادیب ہندی کے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو اور ہندی اپنی موجودہ ادبی تحریری شکل میں الگ الگ ہونے کے باوجود ان کی نحوی ساخت بنیادی طور پر ایک ہے۔ اس لیے انہیں دو الگ الگ زبانیں تسلیم کرنا صحیح نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عام بول چال کی زبان ہندی اور اردو دانوں میں بہت بڑی حد تک مشترک ہے۔ اس لیے ہم جب ایک دوسرے کے خیالات و جذبات سے واقف ہو جائیں گے، ایک دوسرے کے ادب کے بہترین خزانوں سے بہرہ مند ہوں گے تو مروجہ جہالت جو اردو کے طرف داروں میں ہندی کے طرف سے اور ہندی کے حمایتیوں میں اردو کی طرف سے آج موجود ہے کم ہونے لگے گی اور وہ مضحکہ خیز حرکتیں جو آج کل دونوں زبانوں کے حمایتی ایک دوسرے کے مروجہ الفاظ کو ترک کر کے کر رہے ہیں، حماقت اور جہالت کی نشانی سمجھی جائے گی۔ لہٰذا دونوں زبانوں کے ادیبوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ ادیب دونوں زبانیں سیکھیں اور اس سلسلے میں پریم چند، اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر تاراچند اور پنڈت سندر لال کی مثال پر عمل کریں۔ یہ دونوں زبانیں جاننے سے ہی ادیب باآسانی اپنی کتابیں اردو اور ہندی میں شائع کر سکیں گے۔

اپنے خیالات کا اظہار انہوں نے 21 نومبر 1941 کے خط میں رضیہ سے کیا ہے۔ اس میں انہوں نے ہندی اور اردو کی یکسانیت پر زور دیا ہے اور کہا ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کو ہندی اور اردو

کے اتحاد کی صورت نکالنی۔ اس خط میں چند اور کتابوں کا بھی ذکر ہے جو انہوں نے حال ہی میر خریدی تھیں۔ لکھتے ہیں:

''ہندی پڑھنے کے بعد میں بہت چاہتا ہوں کہ ہماری موجودہ زبان کے مشترکہ خزانے کو کھود کر نکالا جائے، یعنی کس طرح ہندوستان کی بھاشاؤں میں رفتہ رفتہ تبدیلی ہو کر اردو اور ہندی بنی۔ اس کے بارے میں مَیں نے بہت سے نظریے سوچے ہیں۔ جب تم سے ملاقات ہوگی تو بتاؤں گا۔ ترقی پسندوں کو ایسا نظریہ پیدا کرنا جس کی وجہ سے ہندی اردو کا جھگڑا کم ہو اور اتحاد کی صورت نکلے۔

پیاری۔ میں نے حال ہی میں اردو کی دو نئی کتابیں خریدی ہیں۔ ایک تو جوش کا تازہ ترین مجموعہ 'آیات ونغمات'۔ اس میں کئی ایک بڑی زبردست نظمیں ہیں اور وہ مشہور مرثیہ بھی 'حسین اور انقلاب' جو یہاں انہوں نے ایک مجلس میں بھی پڑھا تھا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس مجموعے کو ہم دونوں ساتھ پڑھتے، کبھی تم پڑھتیں میں سُنتا اور کبھی میں پڑھتا تم سُنتیں۔ اس کے علاوہ بہت سی اچھی چیزیں اس مجموعے میں ہیں۔ میری رائے میں یہ جوش کا بہترین کلام ہے۔ بڑی خوشی اس بات سے ہوتی ہے کہ جوش کے کلام میں تخئیل، ترکیب، فن، حسن سب کے لحاظ سے مسلسل نمو اور ترقی ہے۔ دوسری کتاب 'نئے زاویے' ہے۔ یہ کرشن چندر نے ترقی پسندوں کے افسانوں اور جدید ترین نظموں کا منتخب مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ بہت خوب ہے۔ ہاں تم نے نئے ادب کے پرچے کا ذکر کیا تھا جس میں رسم لخط پر مضمون تھا وہ مجھے آج تک نہیں مل سکا حالانکہ میں نے کئی بار اسے منگوانے کی کوشش کی ہے۔'' (۱۴)

قید میں بنّے بھائی کو کوئی جسمانی اذیت کبھی نہیں پہنچائی گئی جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ سیاسی قیدی تھے کوئی مجرم نہیں تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ لارڈ سر وزیر حسن کے بیٹے تھے جو ایک نامور وکیل تو تھے ہی، کچھ عرصہ جسٹس بھی رہ چکے تھے۔ پھر ان کی والدہ اسمبلی کی ممبر بھی تھیں۔ اس کے علاوہ بنّے بھائی کی اپنی شخصیت ہی ایسی تھی جیسے حمید اختر کے الفاظ میں کہ وہ جس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے

تھے وہ عمر بھر کے لیے انہیں کا ہو جاتا تھا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے سجاد ظہیر کو جیل میں کسی طرح کی کوئی جسمانی تکلیف نہیں تھی لیکن تنہائی اور جدائی بے حد کربناک تھی۔ اسی پریشانی کی وجہ سے ان کی طبیعت خراب رہنے لگی اور 22 دسمبر 1941 کو ان کا سینٹرل جیل سے کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ میں تبادلہ کر دیا گیا۔ اسپتال کا ماحول ویسے تو خوشگوار تھا لیکن وہاں بھی تنہائی کی کوفت برقرار تھی۔

جیل اور اسپتال کی زندگی میں ایک خاص قسم کا تضاد موجود رہتا ہے جسے صرف ایک قیدی ہی محسوس کر سکتا ہے۔ جیل میں کچھ ہم خیال ساتھی تھے جن سے بنّے بھائی تبادلہ خیال کر سکتے تھے۔ وہاں ادبی بحث ومباحثے بھی ہوتے تھے جس سے تنہائی کا احساس قدرے کم ہو جاتا تھا۔ اسپتال میں دیگر جتنی بھی سہولتیں میسر تھیں ان سب پر ایک وحشت زدہ تنہائی غالب ہو جاتی تھی۔ ایک خط میں اس ماحول کا ذکر یوں کیا ہے:

> ''ساری تمنائیں کس طرح اُبھر آتی ہیں، خواہشوں کا کیسا ہجوم ہوتا ہے، کیسی نامعلوم سی خلش، موسم سے جستجو سینے میں کہرام مچاتی ہے، اور یہ میری تیسری بار اس اسیری میں ہوگی۔ تم اور تمہارا خیال کس طرح میرے دل و جان میں پیوست ہو گئے ہیں۔ یہاں اسپتال میں میرے لیے نسبتاً تنہائی ہے اس لیے کہ جیل میں تو کچھ نہ کچھ ساتھی ہر دم ساتھ رہتے تھے۔ یہاں کوئی نہیں ہے سوا اس کے کہ کوئی عزیز ملنے آ جائے، شام کو تھوڑی دیر کے لیے۔ اور آج کل جب سردی ہوتی ہے اور دن بھر کمرے میں اندر ہی پڑا رہنا ہوتا ہے تو کبھی کبھی طبیعت بہت گھبراتی ہے، تم یاد آتی ہو، بہت۔ کبھی بڑی محبت سے اور کبھی یہ یاد جدائی کے دکھ سے اتنی بھری ہوتی ہے کہ اس سے الگ کوئی چیز نہیں معلوم ہوتی۔'' (۱۵)

جیسے ہر رات کے بعد سویرا ہوتا ہی ہے، ہر رُت بدلتی ہے اور گردش دوراں اپنے طے شدہ عمل کے تحت اپنا کام کرتی ہے، ویسے ہی انسان کے دن بھی بدلتے ہیں۔ اپنے آخری خط میں بنّے بھائی نے ایک خفیف سا اشارہ اس طرف کیا ہے۔ انہیں حکومت کی طرف سے ایک مراسلہ بھیجا گیا تھا جس میں لکھا تھا کہ گورنمنٹ سیاسی قیدیوں کے حالات اور معاملات پر نظر ثانی کرنا چاہتی ہے لہٰذا اگر بنّے بھائی کو بھی اس سلسلے میں کچھ کہنا ہو تو وہ حکومت کو لکھیں۔

انہوں نے منجملہ دیگر باتوں کے یہ بھی لکھا کہ جنگ کی موجودہ صورت میں جنگ کی کسی قسم کی مخالفت کو وہ غلط سمجھتے ہیں بلکہ وہ تو تمام فاشسٹ قوتوں کی مکمل شکست کی خواہش رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہندوستان فاشسزم کو پورری طرح شکست دینے کے لیے اس جنگ میں حصہ لے۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ سوائے اس بیان کے وہ اور کسی قسم کی سیاسی انڈرٹیکنگ (Undertaking) دینے کے لیے بالکل تیار نہیں۔اس بیان کا انجام یہ ہوا کہ حکومت نے بنّے بھائی کو غیر مشروط طریقے سے رہا کر دیا اور 14 مارچ 1942 کو ذیل کا حکم نافذ کیا:

"حکم نافذ کیا جاتا ہے کہ سید سجاد ظہیر کو لکھنؤ سینٹرل جیل سے غیر مشروط طریقے پر فوراً رہا کیا جائے۔"

حکم نامہ حکومت ہندوستان 14 مارچ 1942

اس حکم کے ساتھ بنّے بھائی اپنے پہلے دورِ اسیری سے رہا ہو کر اپنی شریکِ حیات اور اپنی بیٹی نجمہ سے ملنے کی بے انتہا مسرت حاصل کر سکے۔اس دورِ اسیری کی اچھی بُری یادیں جو انہوں نے جیل سے رضیہ کے نام بھیجے ہوئے خطوں میں بڑی دلچسپی سے نمایاں کی ہیں ان کا مجموعہ 'نقوشِ زنداں' کے نام سے مکتبہ شاہراہ دہلی سے 1951 میں شائع ہوا تھا جو ادب کی دنیا میں ایک معیاری کارنامہ ہے۔

کہتے ہیں کہ ہر قیدی اپنے کسی دوست، رفیق یا عزیز کے آنے کا پل پل انتظار کرتا ہے اور جب کوئی ملاقاتی کبھی آ جاتا ہے تو باہر کی زندگی کے حالات سے لیس ہو کر آتا ہے اور اپنے ساتھ قیدی کے اہل خانہ کی صحت، تندرستی یا بیماری کی خبریں بھی لاتا ہے۔جس سے قیدی کو باہر کی معلومات دستیاب ہوتی ہے۔ حمید اختر کہتے ہیں کہ 1951 میں جب وہ پہلی بار گرفتار ہوئے تو لاہور سینٹرل جیل میں بہت سے دوست، رفیق اور ہم خیال ساتھ تھے۔لاہور سینٹرل جیل میں بہت سے دوست سیاست خانہ نامی ایک ہی وارڈ میں رہے تھے۔احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، محمد افضل، دادا فیروز الدین منصور اور دوسرے بھی بہت سے ہم خیال اور دیرینہ رفیق اس ہجوم میں شامل تھے۔وہ سب مل کر تاش کھیلتے، لطیفے سناتے اور بحث و مباحثے میں مصروف رہتے تھے۔دو مہینے بعد جب انہیں ملتان ڈسٹرکٹ جیل میں بھیج دیا گیا تو وہ ان کے لیے بہت کڑا وقت تھا۔نہ کوئی ملاقاتی، نہ باہر کی دنیا کی کوئی خبر آتی تھی۔ یہی جذبات بنّے بھائی نے بھی سینٹرل جیل لکھنؤ کی زندگی کے بارے میں اپنے خطوں میں ظاہر کیے

یں۔لیکن جو بات ہر کسی کی دلچسپی کا باعث رہی ہے وہ یہ کہ جیل کی تنہائی اور دشوار گزاری کے باوجود
ںے بھائی نے نہ کبھی حالات سے ہار مانی اور نہ کسی مجبوری کے آگے گھٹنے ٹیکے۔ یہ ان کی کردار کی بلندی
کا ثبوت ہے۔

جیل میں رہنے سے انسان کی ذہنیت کس طور پر متاثر ہوتی ہے یہ امر بہت اہم ہے۔ کچھ
رصہ جیل میں دیگر قیدیوں کی صحبت میں رہنے سے انسان کی سوچ اور روش کس حد تک اثر انداز ہوتی
ہے اس کا موازنہ فیض سے بہتر کسی دوسرے نے آج تک نہیں کیا۔وہ کہتے ہیں:

''جیل خانے میں ذہنی کیفیات کے جو مختلف دور گزرتے ہیں ان کا ذکر پہلے
کر چکا ہوں۔ان میں سب سے زیادہ ضدی کیفیت وہ ہے جسے طبی زبان میں
Prison Coma کہنا۔ایک طرح کی خواب آلودہ نیم بیداری۔ جب ہر
چیز کہیں دور چلی جاتی ہے اور سب کچھ غیر اہم اور بے وقعت نظر آتا ہے۔ جب
کوئی درد باقی رہتا ہے اور نہ کوئی راحت اور عرش بریں بے آباد معلوم ہوتا ہے۔
یہ کیفیت بھی گزر جاتی ہے جیسے سب گزر جاتا ہے لیکن جب تک طاری رہتی ہے
یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ کبھی ختم نہ ہوگی اور آدمی کسی ایسے کیڑے کی طرح بن جاتا
ہے جو زیرِ زمین بے سدھ پڑا ہو۔'' (۱۶)

☆☆☆☆☆☆
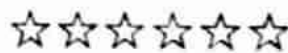
کتابیات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر/پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱)	بولنا مہنگا پڑا	حسن عابدی	پرگتی شیل وسودھا۔بھوپال	اکتوبر 2005	117
۲)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	24
۳)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	34
۴)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	54
۵)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	57
۶)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	62
۷)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	109
۸)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	126
۹)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	130
۱۰)	روشنائی	سجاد ظہیر	پرائم ٹائم پبلیکیشن۔لاہور	2006	234
۱۱)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	130
۱۲)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	155
۱۳)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	192
۱۴)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	203
۱۵)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔دہلی	جون 1951	233
۱۶)	صلیبیں میرے دریچے میں	فیض احمد فیض	مکتبۂ دانیال۔کراچی	1986	190

☆☆☆☆

۴۔ جذبات کی رو

علی باقر نے سجاد ظہیر کے خطوں کی معرفت ان کی شخصیت کا جو تذکرہ کیا ہے اس کا تعلق ان کے اس جذبہ محبت سے بھی ہے جو محبت انہوں نے انسانوں سے کی ہے۔ انہیں ہر شے سے محبت تھی چاہے وہ قدرتی مناظر ہوں، موسیقی ہو یا وہ پرند چرند ہوں۔ انہوں نے جو خط لکھنؤ سینٹرل جیل سے رضیہ کے نام لکھے ان سے اس امر کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ عالم تنہائی میں جیل کی بند کوٹھری کی بندش بڑی کربناک ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں مایوسی کا غلبہ عین قدرتی بات ہے۔ لیکن وہ تو ایک ادیب تھے جن کی پہلی محبت ادب تھا۔ ادیب ہونے کے ناطے وہ اپنی جیل کی تاریک زندگی میں کیسے بسر اوقات کرتے تھے۔ اس کے متعلق علی باقر 'کالی پوت کے لچھے' میں لکھتے ہیں:

> ''بنے بھائی کے یہ خط جو انہوں نے مجھے اور نجمہ کو لکھے تھے، ان سے الگ طرح کے ہیں جو انہوں نے جیل سے رضیہ آپا کو لکھے تھے اور 'نقوشِ زنداں' کے نام سے کتابی شکل میں چھپے تھے۔ ہر زمانے میں، ہر ملک میں، ہر جیل میں قیدی اپنی میعاد کی تلخی اور صعوبت کو کم کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ نکالتا ہے۔ وہ جن میں تخلیقی صلاحیت ہوتی ہے ادب کا سہارا لیتے ہیں۔ کہانیاں، ناول اور خط وغیرہ لکھتے ہیں۔ بنے بھائی کے پاس ان دنوں کافی وقت تھا، سوچنے اور فکر کرنے کی مہلت تھی، ان کے ذہن میں ایک لگن تھی، برٹش راج سے زور آزمائی کا ولولہ تھا، رگوں میں جوانی کا خون تھا، وہ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھے۔

بنے بھائی کے یہ خطوط جن کے اقتباسات اس ... خطوں میں شامل ہیں

بالکل دوسرے زمانے میں لکھے گئے تھے۔ ملک کو آزادی ملے پورے اکیس سال ہو چکے تھے جب بنے بھائی نے مجھے پہلا خط لکھا تھا۔ دلی میں ان کی زندگی بہت مصروف ہو گئی تھی، لوگ ملنے آتے انہیں جگہ جگہ جانا پڑتا تھا مگر اس تیز بھاگ دوڑ میں ہر مہینے کم از کم ایک یا دو بار ہمیں خط لکھنے کا موقع نکال لیتے۔ یہ ان کا بڑا احسان تھا۔ بنے بھائی میں پہاڑی دریاؤں کی تیزی نہیں رہی تھی، وہ ایک اتھاہ اور گہرے سمندر تھے۔''(۱)

بنے بھائی کی شخصیت کی جو تصویر علی باقر نے دکھائی ہے اس تصویر کا شخص ایک ادیب، ایک سیاست داں اور ایک جذباتی انسان ہی ہو سکتا ہے۔ انہیں خوبیوں کو سبط حسن، حمید اختر، رؤف ملک اور دیگر ان لوگوں نے بھی بیان کیا ہے جو سجاد ظہیر سے بخوبی واقف تھے۔ وہ بہت نرم جذبات کے مالک تھے اس لیے ہر منظر، ہر مقام، ہر حادثہ ان پر گہرائی سے اثر کرتا تھا۔ موسم کی گرمی یا سردی، بارش، پرندوں کا چہچہانا، راہگیروں کی مترنم آواز وغیرہ کو بہت جلد محسوس کر لیتے تھے۔ اس لیے کہ دوستوں یاروں اور جاننے والے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں، ان کی ضرورتوں اور ان کی محبت کا انہیں ہر وقت خیال رہتا تھا۔

یہ کئی بار کہا گیا ہے کہ جیل میں قیدی کی خوشنودی اور مسرت کے لیے دو واقعات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی ملاقاتی ملنے کے لیے آجائے تو باہر کی دنیا کا حال معلوم ہو۔ دوسرا واقعہ جو اسی تاثیر کا حامل ہے وہ اس کا یوم رہائی کا تصور ہے۔ ہر قیدی ان اوقات کی آمد کا بے قراری سے انتظار کرتا ہے۔ ان لمحات کا تصور قیدی کے دل کو مردہ نہیں ہونے دیتا۔ اس تصور نے فیض کو بھی جیل میں حوصلہ بخشا اور انہوں نے کہا کہ جو دن بھی گزرتا ہے اس سے نجات کی منزل کا فاصلہ اور کم رہ جاتا ہے لیکن اس آزمائش کے خاتمے تک صبر و تحمل کا دامن نہیں چھوڑنا۔ فیض احمد فیض کے جیل کی زندگی کے چند تاثرات کا ذکر ڈاکٹر ایوب مرزا نے اپنی تصنیف 'فیض نامہ' میں بہت سلیقے سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''فیض احمد فیض جیل آنے سے پہلے سمجھتے تھے کہ اسیری کوئی شجاعانہ اور بلند مرتبہ

بات ہے۔ جیل جا کر ان پر کھلا کہ اُس میں نہ شجاعت کا کوئی مضمون ہے نہ عالی حوصلگی کا۔ اس میں صرف درد ہے اور نا قابل بیان درد۔ اس درد کا صحیح احساس فیض کو ایک گرفتار شکاری پرندے سے ہوا جس کی کچھ دنوں سے وہ دیکھ بھال کر رہے تھے۔ بقول فیض ''یہ چھوٹا سا ایک شکرا تھا جو فیض کے غسل خانے میں آ گیا تھا اور جسے خدمت گار قیدیوں نے پکڑ کر اس کی ٹانگ میں رسی باندھی اور اُسے ٹوکرے کے اندر بند کر دیا تھا۔ اُسی شام کسی طور وہ ٹوکرے سے نکل گیا اور اُڑ کر صحن کے ایک پیڑ پر جا بیٹھا۔ اس کی رسی شاخوں میں اُلجھ گئی اور وہ تمام رات پھڑ پھڑاتا رہا اور فیض اس کی گلوگیر فریاد سُنتا رہا۔ اگلی صبح فیض نے اسے نیچے اتارا تو معلوم ہوا کہ اس کی ٹانگ کئی جگہ سے ٹوٹ چکی ہے۔'' بے کسی کے عالم میں شکرا صحن میں دبکا بیٹھا تھا۔ کہتے ہیں ''جس کی آواز سے جن کوؤں، چڑیوں اور میناؤں کی جان خطا ہوتی تھی اب وہی پرے باندھے اس کے قریب جمع ہو کر شور مچا کر اسی کی ہنسی اُڑا رہے تھے۔ اس تذلیل پر شکرے کی مغرور چمکدار آنکھیں درد سے دھندلا گئیں۔'' پرندے رو تو نہیں سکتے لیکن اس کی بے بسی دیکھ کر فیض کا دل بھر آیا۔ انہوں نے شکرے کو اچھی طرح کھلایا پلایا۔'' غالباً دو چار دن میں وہ مر جائے گا۔'' اس خیال سے فیض کو معلوم ہوا کہ '' نظامِ فطرت میں بے زبان مخلوق کی بے بسی کا علاج یہی ہے۔ فطرت میں ان کے درد کا دارو موت ہے۔ یہ صرف انسان کا مقدر ہے کہ وہ اپنا درد اور اپنے زخم دل میں لیے جیئے جائے۔ سالہا سال، نسل در نسل، قرن در قرن۔ کیونکہ اس درد کا علاج مرنے سے نہیں جینے سے ہوتا ہے۔ اس کے مسائل مرنے سے نہیں جینے سے حل ہوتے ہیں۔ اسی خاطر اسے وہ ایمان اور وہ نظر بخشی گئی جو اس کی ذات سے پرے اور اس کے عہد سے آگے دیکھ سکتی ہے۔ اسی سہارے پر وہ دکھ اُٹھائے جاتا ہے اور امید کیے جاتا ہے، اس دن کی امید میں جو شاید اسے کبھی دیکھنا نصیب نہ ہو۔ وہ دن جب سارے غم مٹ جائیں گے، سب درد تھم جائیں

گے۔ ان گنت صدیوں کے بعد جب انسان نے ہاتھ پاؤں سے کام لینا سیکھا، انہی صدیوں میں بولنا اور سوچنا سیکھا اور شاید وہ وقت قریب آرہا ہے جب وہ خوش رہنا بھی سیکھ لے گا۔''(۴)

فیض نے جس انداز سے جیل کی سراسمیگی، ناداری اور بے کسی کی نقاشی کی ہے اسے پڑھ کر آنکھوں میں آنسو اُبھر آتے ہیں۔ انسان بے بس ہو جاتا ہے اور ایک دائمی مایوسی کا شکار ہونے لگتا ہے۔ فیض کو جب ایک دوست نے جیل میں رنگین پرندے بھیجے تو انہوں نے اپنی اہلیہ ایلس کو لکھا کہ انہیں پرندے تو بہت پسند ہیں لیکن وہ قید خانے میں مزید قیدیوں کا اضافہ نہیں کرنا چاہتے۔

یہ بات تو صاف ہے کہ جیل خانے میں قیدیوں کو بہت فراغت ہوتی ہے۔ لیکن ہر قیدی کسی نہ کسی طرح مصروف رہنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ جیل کا دروازہ جب کسی قیدی کے پیچھے بند ہوتا ہے تو وہ ماضی کے پیرہن کو تار تار کر کے مختلف صورتوں میں دوبارہ بُننے کی تگ ودو میں لگا رہتا ہے۔ جیل کے لمحات شدید تنہائی اور کربناک اذیتوں سے لبریز ہوتے ہیں اس لیے ان سے دو چار ہونے کا کوئی طریقہ ڈھونڈنے کی کوشش میں ہر ایک قیدی مصروف رہتا ہے۔ کچھ لوگ بقول فیض'' آنے والے دنوں کو دامِ تصور میں مقید کر کے ان سے اپنی مرضی اور پسند کے مرقعے ترتیب دیتا رہتا ہوں۔ یہ بے کار سا شغل ہے، اس لیے کہ خوابوں کو حقیقت کی زنجیروں سے آزاد نہیں کیا جاسکتا۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ کچھ دیر کے لیے آدمی تخئیل کے بل بوتے پر گردوپیش کی دلدل سے پاؤں چھڑا سکتا ہے۔ فراریت بری بات ہے۔ لیکن جب ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہوں تو آزادی کی واحد صورت یہی رہ جاتی ہے۔ اسی نسخے کے طفیل مجھے جیل کی سلاخیں بہت ہی حقیر اور بے حقیقت دکھائی دینے لگی ہیں اور بیشتر ان کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔''

حمید اختر نے راقم الحروف کی گزارش پر ایک مضمون لکھ کر لاہور سے ارسال کیا ہے۔ جس میں جیل کی زندگی کے بارے میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قیدی کی عیاشی کا سب سے اہم دن وہ ہوتا ہے جب کوئی دوست، کوئی عزیز اس سے ملنے آتا ہے۔ تب وہ اسے باہر کی زندگی سے آگاہ کراتا ہے اور قیدی باہر کی زندگی کی ہوائیں محسوس کرتا ہے۔ قیدی کی دوسری بڑی عیاشی یہ ہوتی ہے کہ اسے ایسے ہم نفسوں سے واسطہ رہے جن کے بیچ وہ قید وتنہائی کے قلق سے بے نیاز

رہے۔فیض بھی یہی کہتے ہیں کہ جیل میں اسیروں کی سب سے بڑی خواہش باہر بسنے والے اپنے پیاروں سے ملنے کی ہوتی ہے اس لیے ان کا سب سے خوبصورت دن ملاقات کا دن ہوتا ہے۔

فیض احمد فیض جب راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے تو وہ اور ایک میجر محمد اسحٰق جو اسی سلسلے میں گرفتار ہوئے تھے تقریباً چار سال ایک ساتھ رہے۔میجر اسحٰق خود لکھتے ہیں کہ وہ کچھ مہینے کم چار سال دن رات فیض کے ساتھ رہے۔اسی قربت کے طفیل فیض کے کلام 'زنداں نامہ' کا پیش لفظ لکھنے کی ذمہ داری میجر محمد اسحٰق کو ہی سونپی گئی۔انہوں نے یہ دیباچہ 'روودادِ قفس' کے نام سے لکھا ہے۔اس میں میجر صاحب نے جیل میں جس طرح ایک قیدی کی ذہنیت اثر انداز ہوتی ہے اس کا بہت تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔لکھتے ہیں:

> ''جیل ایک طرح کا طلسماتی آئینہ خانہ ہوتا ہے جہاں صورتوں کے نہیں سیرتوں کے عکس عجیب وغریب شکلیں بنا کر ظاہر ہوتے ہیں۔کسی کی طبع جھگڑے کی طرف مائل ہے تو وہ ہر کسی سے لڑائی مول لینے کی فکر میں ہوگا۔کوئی بزدل طبیعت کا ہے تو وہ گوبر کے کیڑے کی طرح ہر وقت سر چھپانے کی دھن میں ہوگا۔کسی کے مزاج میں قنوطیت ہے تو وہ ہر اچھی بری خبر سے اپنی دل شکنی کے اسباب ڈھونڈ لائے گا۔کسی کو کوئی خبط ہو تو وہ دیوانگی کی حد تک ترقی کر جائے گا۔طبیعتوں میں کمینگی اور تنگ نظری خاص طور پر پھلتی پھولتی ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنے ساتھیوں اور جیل والوں سے جھگڑے ہو جاتے ہیں۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انسان کی ساری کائنات جیل کی چار دیواری میں محدود کر دی جاتی ہے اور اس کی فکر ونظر میں تنگی آجاتی ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانوں پر حیوانی بندشیں عائد کر دی جاتی ہیں۔کوٹھری میں بند کرنا، ایک احاطے میں محصور کر دینا، بیڑیوں کا استعمال، عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات پر پابندیاں، بے بسی کا عالم، یہ سب چیزیں اسیروں کے دل پر نوک سوزن کا کام کرتی ہیں۔جیل کے بعض افسر بھی قیدیوں کی دل شکنی کے مواقع ڈھونڈتے ہیں اور قیدیوں کی عزتِ نفس اور وقار کو ٹھیس پہنچانے میں خاصے ماہر ہوتے

ہیں۔اگر چہ یہ بات سب کے بارے میں صحیح نہیں۔

ان حالات میں ایک آدمی قید ہوکر اپنی روزمرہ کی شخصیت قائم نہ رکھ سکے تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔کمال ان لوگوں کا ہے جو جیل جا کر بھی وضع داری قائم رکھ سکتے ہیں۔جن لوگوں کو میں جیل جانے سے پہلے جانتا تھا ان میں فیض صاحب ہی ایسے تھے جو بظاہر ٹس سے مس نہ ہوئے۔لیکن عام آدمیوں کی طرح طبیعتوں کا بوجھ کم کرنے کے لیے لڑائی جھگڑے، دنگا فساد اور اس قسم کے دوسرے سیفٹی والو (Safety Valve) استعمال نہ کرنے سے فیض صاحب پر جو ذہنی اور جسمانی فشار پڑا وہ ان کے دوستوں سے مخفی نہیں۔شاعری غنیمت تھی جس کے ذریعے دل کا غبار نکال لیا کرتے تھے۔لیکن شاعری بذات خود دل وجگر کے ایندھن پر جلا پاتی ہے۔"(۳)

اس میں شک نہیں کہ جیل میں قیدی کی شخصیت میں طرح طرح کی تبدلیاں رونما ہو جاتی ہیں لیکن جیسا کہ میجر محمد اسحٰق نے کہا کہ کمال ان لوگوں کا ہے جو جیل جا کر بھی وضع داری قائم رکھتے ہیں۔سجاد ظہیر بھی ایسے لوگوں میں گنے جاتے ہیں۔سینٹرل جیل لکھنؤ کا ماحول بھی ویسا ہی تھا جیسا ہر جیل کا ہوتا ہے لیکن اس ماحول کا سجاد ظہیر کی شخصیت پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔کبھی کبھی مایوسی اور بے بسی کا احساس ضرور ہونے لگتا تھا لیکن ان کی ذہنی کیفیتیں، جذباتی احساس اور قدرتی مناظر سے دلچسپی کا عالم ہمیشہ برقرار رہا۔گرمی، سردی، برسات، بسنت اور پت جھڑ، پرندوں کا چہکنا اور شور وشر کرنا وغیرہ ان کے احساس میں ہلچل مچاتے رہتے تھے۔رضیہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں ہماری بیرک میں کبوتر ، چڑیا، مینا تو مستقل طور پر رہتے ہیں۔چنانچہ آج کوٹھری کی کھپریل میں اس قدر شور وشغب مچایا گیا اور اوپر سے گھاس پھوس کی وہ بارش ہوئی کہ کرسی میز پر بیٹھ کر پڑھنا دشوار ہوگیا۔آگے اسی خط میں لکھتے ہیں کہ رات کو ایک بلی بھی نعمت خانے کا جائزہ لینے آتی ہے۔لیکن بلی سے سب خفا ہیں، اسے بھگا دیتے ہیں۔چڑیوں سے البتہ دوستی ہے اور وہ تکلیف بھی پہنچاتی ہیں تو سہہ لیتے ہیں۔

جیل میں بھی سجاد ظہیر نے اپنے باریک احساسات کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ پرندوں کی حرکات کو جس جذباتی انداز میں انہوں نے اوپر بیان کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔قدرتی

مناظر کا بیان کرتے ہوئے اسی خط میں لکھتے ہیں:

''بیرک کے باغ میں دو بڑے بڑے درخت ہیں۔ ایک نیم کا جو ٹھیک میری کھڑکی کے سامنے ہے۔ دوسرا گولر کا۔ اس گولر والے پیڑ کو میں بہت دنوں تک پیپل سمجھا کیا۔ خوب بڑا اور خوبصورت ہے۔ اس پر صبح و شام کبھی کبھی بُلبُل چہکتا ہے۔ جب رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے تو اس کے پیچھے آسمان کا وہ چھوٹا سا ٹکڑا جو ہمارے حصے میں پڑتا ہے دکھائی دیتا ہے۔ اور پتیوں، ڈالوں اور شاخوں کے بیچ میں سے چمکتے ہوئے تارے نظر آتے ہیں۔ انگریزی سرکار کا لاکھ لاکھ شکر کہ یہ آسمان، یہ رات، یہ تارے اور ان خوش نما پیڑوں کی چھاؤں اس نے قیدیوں کو دے رکھی ہیں۔'' (۴)

معلوم ہوتا ہے کہ پرندوں میں ان کی دلچسپی سجاد ظہیر کی شخصیت کا ایک اہم پہلو تھی۔ جب بھی کسی پرندے پر جیل میں نظر پڑ جاتی وہ ان کے اقدام کا بغور جائزہ لیتے تھے۔ ان جذبات کا احساس انہیں جیل میں بڑی شدت سے ہونے لگا تھا۔ جیل کے باہر لکھی گئی ان کی تصنیفات میں ایسا ذکر کہیں خاص نہیں ملتا۔ لیکن جیل کے اندر وہ ان جذبات سے بے بہرہ نہیں تھے۔ اپنے 16 اپریل کے خط میں رضیہ کو لکھتے ہیں:

''پرسوں شام کو جب سورج ڈوب رہا تھا اور پچھم کا آسمان گلابی تھا تو جیل کی اونچی دیوار پر یک بارگی دو مینائیں آ کر بیٹھ گئیں۔ آسمان کی سُرخی میں ان کے پروں کی سیاہی اُبھر آئی اور یہ جوڑا نظروں کے سامنے بالکل نمایاں ہو گیا۔ پھر یک بارگی ان دونوں نے چلانا شروع کیا، خوب پھڑ پھڑائے اور ہماری ۲۵ فٹ اونچی دیوار پر سے ہچکولے لیتی ہوئی پھر سن سن کرتی اڑ گئیں۔ مجھے اس وقت تمہارا اور اپنا خیال آیا اور ان دو آزاد چڑیوں پر بڑا رشک ہوا۔

کیا تم بھی یہ محسوس کرتی ہو کہ ایسی چاندنی جیسی ادھر دو دن سے نکلتی ہے اور ہوا کی یہ گرمی ملی ہوئی رات کی خفیف سی خشکی اور فضا کا اس قدر سکون اور پیڑوں کے نیچے چاندنی اور چھاؤں کی گہرائی ہمیشہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ایسے

خوشگوار اور دل خوش کن جیسے کہ آج بھی یہ ہو سکتے اگر ہم یکجا ہو سکتے۔"(۵)

موسم کا تذکرہ انہوں نے اپنے یکم جولائی کے خط میں بھی کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس سال بارش معمول سے کم ہو رہی ہے لیکن آج کئی دن بعد زور سے پانی برسا جس کی وجہ سے گرمی کم ہو گئی اور اس برسات میں پارسال الہ آباد میں برسات کی یاد تازہ ہونے لگی ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ ہوا بند ہے۔ مینڈکوں کی غیں غیں کی آواز آرہی ہے اور دور اسٹیشن سے ریل کی سیٹی۔ یہ بھی کچھ عجیب موسم ہوتا ہے۔ گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ۔ اس موسم کی گھٹاؤں کی طرح کبھی دل پر پرانی یادوں کے بادل چھا جاتے ہیں، کبھی ٹھنڈی ہوا سے گرمی سے مارے ہوئے جسم میں تازگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور کبھی بجلی کی طرح آئندہ آنے والی مسرتیں دل و دماغ میں کوند جاتی ہیں۔ اسی ضمن میں لکھتے ہیں کہ گرمی پہلے سے کم ضرور ہے لیکن نمی اور گرمی ساتھ ساتھ بڑی تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ جہاں ذرا ہوا بند ہوتی ہے بدن پسینے پسینے ہو جاتا ہے۔ تین دن پھر سے پانی نہیں برسا۔ آج دن کو تو ٹھنڈی ہوا چلی لیکن اب گرمی پھر بڑھ گئی ہے لیکن حالت نا قابل برداشت نہیں ہے۔

سجاد ظہیر کے جاننے والے کئی لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ان میں کسی بھی بات کے مزاحیہ پہلو کا لطف اُٹھانے کی صلاحیت قدرے کم تھی یعنی ان میں Sense of humour نہیں تھی۔ ان کی بیٹی نور نے بھی یہی کہا ہے۔ ایک جگہ سبط حسن نے بھی اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔ لیکن راقم الحروف ان لوگوں سے اتفاق نہیں رکھتا۔ جیل سے ان کے تمام خطوط سنسر ہو کر نکلتے تھے اس لیے سب کو دیر سے ملتے تھے۔ بنے بھائی کو ہمیشہ اس عذاب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ انہیں خاص کر اس بات کی شکایت رہتی تھی کہ رضیہ کو خط ملنے میں ہمیشہ تاخیر ہوتی تھی۔ رضیہ کو ایک خط میں سنسر کی شکایت کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ کیا میرے خط اتنے لمبے اور دلچسپ ہوتے ہیں کہ سنسر کو پڑھتے پڑھتے کئی دن لگ جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مزاج میں طنز و مزاح کے عناصر موجود تھے۔

رضیہ کو انہوں نے جتنے خطوط لکھے ان میں زیادہ تر میں وہ موسم کا ذکر کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ اس سال چونکہ بارش کافی زیادہ ہوئی تھی تو اس کا ذکر تو انہیں کرنا ہی تھا۔ اور پھر جیل کی کوٹھری میں اس زوردار بارش کا اثر کیا ہوا اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کمرے تو پرانے تھے ہی بارش کی مار کہاں سہہ سکتے تھے۔ بقول مرزا غالب بارش اگر تین گھنٹے برستی تھی تو چھت چھ گھنٹے۔

مندرجہ بالا خط میں ہی بارش کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کل یہاں ایک گھنٹہ اتنی سخت بارش ہوئی جیسے آج تک اس سال نہیں ہوئی۔ تمام جیل جل تھل ہو گیا اور ہماری چھت خوب ٹپکی۔ خیریت ہوئی کہ دن تھا اور وہ گوشہ جس میں پلنگ تھا محفوظ رہا۔

اپنے 2 اگست کے خط میں پھر بارش کا حال لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں گذشتہ تین چار دنوں میں خوب پانی برسا۔ جب پانی برستا ہے تو خوب ٹھنڈک ہو جاتی ہے لیکن اس وقت یعنی صبح دس بجے بارش رک گئی ہے اور گرمی بڑھ گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ جیل کی چھتوں کی مرمت ہر دوسرے ہفتے ہوتی رہتی ہے لیکن پھر بھی پانی زور سے برسنے پر رحمت الٰہی کی افراط سے اکثر کمرے میں بھی پہنچ جاتا ہے۔

برسات کے موسم میں جب بارش کی بوندیں زمیں سے بغل گیر ہوتی ہیں تو زمین بھی ایک حسین محبوبہ کی طرح اپنے قدرتی عمل کے لیے تیار ہو جاتی ہے یعنی اس میں پیڑ پودے پیدا کرنے کی حسرت اُجاگر ہو اٹھتی ہے۔ اس ماحول میں بنے بھائی کو باغبانی کا شوق جاگ اُٹھا اور جیل میں اپنے احاطے میں باغبانی شروع کر دی۔ 14 اگست کے خط میں باغبانی کے عمل کو ذیل میں بیان کیا ہے:

> ''آج کل کافی وقت اپنے چھوٹے سے احاطے میں باغبانی میں صرف کرتا ہوں۔ جاڑوں کی فصل کے پھول بوئے جا رہے ہیں، زمین تیار کرنا، کھاد ڈلوانا، کیاریاں درست کرنا، آبپاشی، تخم ریزی، قلمیں لگانا کافی دلچسپ مشغلہ ہے۔ ایک سوکھے ہوئے پودے کو مرنے سے بچالیا، زمین کو روز غور سے دیکھ رہے ہیں کہ بیج جم گیا کہ نہیں، اس کی پریشانی کہ کہیں دانہ نہ اُگے اور اُگنے پر اس کی نشو و نما کو دیکھنا، ایک ایسی دنیا ہے جس میں انسان تھوڑی دیر کے لیے اتنا مشغول ہو جاتا ہے کہ باقی باتیں پریشان نہیں کرتیں۔''(٦)

انسان جب کوئی پودا اگاتا ہے تو اُس کی دیکھ بھال اپنی اولاد کی طرح کرتا ہے اور اُسے اس دن کا بڑی بے چینی سے انتظار رہتا ہے کہ اس میں پھول آئیں۔ نجمہ کی پیدائش کا بھی بنے بھائی ایسی ہی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ جب باغبانی شروع کی تو لازمی ہے کہ پودوں میں پھول پیدا ہونے سے انہیں بے حد مسرت حاصل ہوئی ہوگی۔ ان کے لگائے ہوئے پودوں میں جب پہلا پھول

کھلا تو تھوڑی دیر کے لیے اپنی کربناک تنہائی اور جیل کی تنگ کوٹھری کی صعوبت بھری زندگی کو بھول گئے اور اس نئے فرد کی آمد کو خوش آمدید کہہ کر بہت بے حد خوش ہوئے۔ اس واقعہ کی تمام تفصیلات رضیہ کو اپنے 16 نومبر کے خط میں لکھیں۔ معمولی سی معمولی نقطے کو بھی نظرانداز نہیں ہونے دیا۔ لکھتے ہیں:

''دو دن ہوئے میرے لگائے ہوئے فصلی پھولوں میں سے پہلا پھول کھلا۔ ایک کمرے میں ایک فٹ اونچے دبلے پتلے پودے کی سب سے اونچی پھنگی پر ایک چھوٹا سا سرخ آٹھ پتیوں کا شرمایا ہوا سا پھول جس کے بیچوں بیچ کا حصہ زرد تھا۔ اس چھوٹے سے مغرور پودے کو دیکھ کر جو آس پاس کے خالی پودوں کے مقابلے میں تاج اور کلغی سے سجا ہوا تھا، کیسی خوشی ہوئی۔ اس کی مہربانی تو دیکھو، ابھی اس کے پھولنے کی فصل تو کئی ہفتہ بعد شروع ہوگی لیکن یہ رحیم و کریم شاید اس خیال سے کہ جیل کی چار دیواری میں ہونے کی وجہ سے اس کی ذمہ داری بڑھ گئی ہے، پہلے سے ہی ہم سے ملنے کے لیے نکل آیا ہے اور اس طرح اس غریب نے اپنی قدرتی زندگی کے دن کم کر لیے۔ اس احاطہ میں ہمارا کام کرنے کے لیے جو پانچ چھ قیدی رہتے ہیں یہ بے چارے سیدھے سادھے کسان ہیں جو زمین پر جھگڑا کر کے مصیبت میں پھنس گئے۔ وہ بھی سب باری باری سے اس اکیلے پھول سے ملنے کے لیے آئے، اسے دیکھ کر سب خوشی سے ہنس دیئے۔ معلوم نہیں وہ کونسی دل کشی تھی اس ذرا سی چیز میں کہ اتنے دلوں کو تھوڑی دیر کے لیے بھلا گئی۔'' (۷)

پھول کھلنے کے اس معمولی واقعہ کو اتنی خوبصورتی سے اس طرح کے شاعرانہ انداز میں بیان کرنا بنّے بھائی کا حق و حصہ ہے۔ یہ پڑھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ادیب نہیں بلکہ محض سیاست داں تھے۔ ان کی ادبی صلاحیتوں پر بہت سے لوگوں نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی ہے اور کئی مانے ہوئے قلمکاروں نے کہا ہے کہ وہ سیاست داں زیادہ تھے اور ادیب کم۔ یہاں تک کہ ان کے قریب ترین دوست سبط حسن نے بھی انہیں غزل کہنے سے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن وہ شخص جو محض ایک پھول کھلنے کے واقعہ کو اس طرح بیان کر سکتا ہے وہ یقیناً بہت بڑا ادیب ہے۔

بنّے بھائی شاعر تھے اس لیے نازک مزاج بھی تھے۔ پھول پودے، پیڑ پتے، پرندے وغیرہ اکثر انہیں بہت متاثر کرتے تھے۔ ہم سب نے سینکڑوں بار پرندوں کو اڑتے، چہچہاتے اور چوری سے دانہ مُنہ میں دبا کر بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہر آدمی ایسے واقعات کو اپنے ذاتی نظریے سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ لیکن بنّے بھائی کو پیڑوں کی سرسراہٹ، چڑیوں کے چہکنے کی آواز میں ایک آفاقی نغمہ محسوس ہوتا تھا جس کی موسیقی ان کے دل کے تاروں کو جھنجھوڑ دیتی تھی۔ جیل میں موسیقی کی اجازت نہیں تھی لیکن پرندوں کی آمد پر جیل کا کوئی قانون عائد نہیں ہوتا۔ یہ پرندے بن بلائے مہمانوں کی طرح آتے تھے اور جیل کے تمام قانون دیدہ دلیری سے توڑ کر نغمے سناتے تھے۔ اگلے خط میں ایک ایسے ہی واقعہ کا ذکر بیان کرتے ہوئے رضیہ کو لکھتے ہیں:

''اس وقت پودے، باغ، پھول اور یہاں کی چڑیاں دل بہلاتی ہیں۔ کل صبح ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں اپنی کوٹھری کے سامنے والے برآمدے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا (جیسا کہ روز کا دستور ہے) کہ یکبارگی سامنے والے جامن کے پیڑ سے کئی چڑیوں کے چہکنے کی آواز آئی۔ اس موسم میں پہلی مرتبہ بُلبُلوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ قید خانے کے اس غم کدہ میں آ پہنچا۔ کیسا آسمانی نغمہ تھا ان کا۔۔۔۔۔ یہاں موسیقی کی اجازت نہیں نہ گانے کی نہ کسی قسم کا کوئی باجہ رکھنے کی۔ اور یہ تو تم جانتی ہو کہ باہر کا کوئی ملنے والا ہماری شاندار کوٹھریوں میں ہم سے نہیں مل سکتا۔ مگر یہاں تو ایک نہیں کئی مہمان تھے، اور کتنے بے تکلف۔ کبھی گیندے کے سنہری پھول سے لپٹ گئے تو کبھی گلاب کی ڈال پر جھومنے لگے۔ غرض جتنی دیر رہے خوب خوش رہے۔ اُچھلتے رہے کودتے رہے، ہنستے بولتے رہے اور پھر تھوڑی دیر میں جس طرح آئے تھے، جیل کی اونچی اونچی دیوار پھاند کر، ویسے ہی نکل گئے۔ اور جاتے جاتے بھی گاتے گئے۔ اس دیدہ دلیری سے انہوں نے جیل کے ہر قانون کو توڑا کہ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہونے لگا کہ ہم بھی قید نہیں بلکہ آزاد ہیں۔ جس سے چاہیں ملیں، اور بے کھٹکے اور بے رکاوٹ گانے سنیں۔ اپنے ان بن بلائے مہمانوں کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔'' (۸)

معلوم ہوتا ہے کہ پھول سجاد ظہیر کے ذہن پر چھائے رہتے تھے۔ جہاں ان پر نظر پڑی کہ جذبات اُبھر آئے۔ جب پھول نہیں ہوتے تو وہ پرندوں سے دوستی کر کے تسلی اور تشفی کا راستہ نکال لیتے تھے۔ایک خط میں رضیہ کو لکھتے ہیں کہ آج کل پھولوں کے علاوہ میں نے دوستی کا ایک نیا سلسلہ پیدا کیا ہے اور وہ اس احاطے کی چڑیوں کی محبت ہے۔ دو مینائیں، دو چڑیاں، کچھ کبوتر، دو فاختہ ہر روز صبح ناشتے کے وقت آجاتے تھے اور ان کے میز کے اردگرد پھدکنے لگتے تھے اور ناشتے میں شرکت بھی کرتے تھے۔رضیہ کو لکھتے ہیں:

> ''ایک اچھی اندرونی خبر یہ ہے کہ ہمارے احاطے میں دو سُرخ گلاب آج کل پھر بہار پر ہیں اور ان میں سے ایک تو پھولوں سے لدا ہوا ہے۔ حالانکہ میں پیڑ پر لگے ہوئے پھول کو میز کے گلدستے پر ترجیح دیتا ہوں، لیکن یہاں تو اتنے بہت سے پھول تھے کہ میں نے تین توڑ کر اپنے شیشے کے گلاس میں لگا لیے اور اس وقت ان سے چھ انچ کے فاصلے پر بیٹھا ان کی تعریفیں لکھ رہا ہوں۔ بے چارے شرم سے لال ہوئے جا رہے ہیں۔''(۹)

پھولوں کا حسن کتنا ہی دلفریب کیوں نہ ہو قید تنہائی میں ان سے دل مغموم ہو جاتا ہے اور پھولوں کی حالت پر افسوس بھی ہوتا ہے کہ جیل میں ان کے حسن کا کوئی قدرداں نہیں۔ نہ بچے ہیں جو انہیں توڑنے کے لیے لپکیں گے اور نہ عورتیں ہیں جو انہیں بالوں میں سجائیں گی۔ ویسے بھی جیل کی بھونڈی اور کالی سلاخوں کے پیچھے وہ بات کہاں جو باہر پھولوں کے حسن کو دوبالا کرتی ہے۔رضیہ سے پوچھتے ہیں کہ کیا تم نے کبھی محسوس کیا ہے کہ اکیلے میں قدرت کا حسن بھی غمگین کرتا ہے، جتنا زیادہ حسن ہوتا ہے اتنا ہی رنج اپنے ساتھ لاتا ہے اور عجیب طرح کے خیالات دل میں اُٹھنے لگتے ہیں۔

بنے بھائی کے کئی خطوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیل میں باغبانی ان کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا اور اسی مشغلہ میں وہ اپنی پیاری بیوی کے فراق سے فرار پاتے تھے۔ باغبانی کا طرح طرح سے ذکر کیا ہے اور پھولوں کے ان اجزا کا جائزہ لیا ہے جن پر ایک عام آدمی کی نظر عموماً نہیں جاتی۔انہیں خود بھی تعجب ہوتا تھا کہ دنیا جبکہ جنگ کی آگ کی لپیٹ میں ہے اور ہر طرف بمباری، خون خرابہ اور بربادی ہو رہی ہے وہ کیونکر باغبانی میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ لیکن یہ ان کی بنیادی خصوصیت تھی جسے نہ وقت

نہ حالات نیست و نابود کر سکتے تھے۔ 17 اکتوبر کے خط میں ایک بار پھر اپنی اس بیش قیمت دلچسپی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

''آج کل میں اپنا کافی وقت باغبانی میں صرف کرتا ہوں۔ جاڑے کے پھولوں کی تیاری کا زمانہ ہے۔ کیاریاں کھودنا، بیج بونا، پودوں کو ایک جگہ سے نکال کر دوسری جگہ لگانا، گل داؤدی کے گملے کو ٹھیک کرنا وغیرہ۔ مگر تم اتنا پڑھ کر گھبرا گئی ہوں گی کہ آج کل دنیا میں جبکہ آتش و آہن کا سیلاب انسانیت کو غرق کرتا جا رہا ایسے بھی لوگ ہیں جن کو باغبانی کی فرصت ہے۔ لیکن یہاں تو فرصت کی اس قدر کثرت ہے کہ ۔

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

کچھ لکھتا ہوں، ساتھیوں سے گپ کرتا ہوں۔ کبھی برج کھیلتا ہوں، کبھی اخبار پڑھتا ہوں کبھی کتابیں رسالے۔ ہندی کے سبق لیتا ہوں۔ اردو لکھنے کی مشق کرتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں کہ زندگی کے یہ قیمتی لمحے گذرے جا رہے ہیں اور میرا دنیا میں ہونا نہ ہونا برابر ہو گیا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ انسان انسان کے دشمن کیوں بنے جا رہے ہیں۔''(۱۰)

یہ پہلے ہی بڑی وضاحت سے کہا جا چکا ہے کہ لکھنؤ سینٹرل جیل میں سیاسی قیدی مل جل کر پیار محبت سے رہتے تھے اور وہاں ان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ہندوؤں کی دیوالی ہو یا مسلمانوں کی عید ان میں تمام قیدی شرکت کرتے تھے۔ سجاد ظہیر کے کئی خطوں میں ایسے تہوار منانے کا ذکر آیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ کل دیوالی تھی جسے ان کے ساتھیوں نے جیل میں بھی منایا یعنی مٹھائی بانٹی گئی، دیئے روشن کیے گئے اور سب نے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ پھر کچھ لوگوں نے گانے سنائے۔ لکھتے ہیں کہ ایک طالب علم جسے ایک سال کی سزا تھی بڑے درد بھرے انداز میں گانے لگا 'دکھ کے اب دن بیتے ناہیں'۔ لکھتے ہیں کہ اس دھن نے تمام قیدیوں پر بہت گہرا اثر کیا اور وہ کافی دیر تک مغموم ہو کر خاموش رہے۔

22 دسمبر 1941 کو سجاد ظہیر جیل سے کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ منتقل کر دئے گئے۔ انہیں گلے کی شکایت تھی اور پیٹ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ گلے کا آپریشن تو ہونا ہی تھا اور پیٹ کی

ایکسرے کے ذریعے تفتیش کرنی تھی۔اسپتال کا ماحول تو جیل سے بہت بہتر تھا مگر تنہائی زیادہ تکلیف دہ تھی۔اپنی حالت کے بارے میں کنگ جارج اسپتال سے رضیہ کو لکھتے ہیں:

''پیاری! اب میری حالت سنو۔ ویسا ہی ہوں۔ دن بھر برآمدے میں آرام کرسی پر پڑا رہتا ہوں۔ اِدھر اُدھر کی کتابیں پڑھتا ہوں یا پھر سامنے شہر اور اسپتال کے ٹریفک، مسجد کے میناروں، شاہ مینا کے مزار، چوک اور نخاس کے مکانوں کی چھتوں کو دیکھا کرتا ہوں اور دماغ اِدھر اُدھر کے بھٹکتے ہوئے خیالوں سے بھرا رہتا ہے۔ کیسا دل میں ایک بے چین سا، عجیب سا، بالکل دھندلا، انجان سا درد ہوتا ہے اور اس کا بھی صرف احساس ہوتا ہے، شعور نہیں۔ میری جسمانی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں۔ سوائے اس کے کہ وزن کسی قدر گھٹا ہے۔ آپریشن کب ہوگا معلوم نہیں۔'' (۱۱)

کنگ جارج اسپتال میں بنے بھائی کو محسوس ہونے لگا تھا کہ ان کے دن بدلنے والے ہیں اور رضیہ سے طویل جدائی اختتام پذیر ہونے والی ہے۔ کچھ دن پہلے تو بہت مایوس تھے۔اس لیے رضیہ کو لکھا کہ ''لڑائی کس بُری طرح بڑھتی جا رہی ہے۔آخر جاپان کب ہارے گا۔ مجھے تو اس خیال سے اس قدر وحشت ہوتی ہے کہ ہندوستان کی اتنی بڑی آبادی اور ہم لوگ کچھ کر نہیں سکتے اور جاپان نے چین میں جس وحشیانہ بربریت سے کام لیا ہے وہ تو ایسی ہے کہ ہمیں جہاں بھی ہو اور جس طرح بھی ہو اس مصیبت سے بچنا ہی۔ لیکن یہ مایوسی چند روز میں ہی غائب ہوگئی جب انہیں گورنمنٹ آف انڈیا کا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ گورنمنٹ اس کیس کے مجرموں کے حالات اور معاملات پر نظر ثانی کرنے والی ہے۔اس خط سے مجرموں میں رہائی کی امید بن گئی۔ رضیہ اسپتال میں انہیں ملنے کے لیے آنے والی تھی یعنی اجمیر سے لکھنؤ آرہی تھی۔اُسے لکھتے ہیں کہ لکھنؤ آنے کا فیصلہ پورے غور و غوض کے بعد کرے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ رضیہ کی اپنی ساس سے نہیں بنتی اس لیے وزیر منزل میں انہیں کوئی خوشی نہ ملے گی۔اور اس لیے بھی کہ ان کے خیال میں معاملات کی صورت کچھ ایسی ہو رہی ہے کہ کچھ عجب نہیں کہ کچھ ہی دنوں میں رہا کر دیئے جائیں۔ اپنے 30 جنوری کے خط میں ایسے ہی جذبات کا ذکر کیا ہے:

''ایک بات اور ہے۔ یہ سنجیدگی سے لکھ رہا ہوں۔ خوب غور کر کے فیصلہ کرنا اور
ذمے داری اس فیصلے کی تمہاری ہوگی۔ اور وہ یہ ہے کہ میری غیر موجودگی میں
وزیر منزل میں تم کو اور بچی کو تکلیف ضرور ہوگی۔ اور جو کچھ بھی میں یہاں پڑے
پڑے کروں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر مجھ کو قابو نہیں۔ اس لیے اگر تمہارا جی
چاہے تو آنا کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دو۔ میرا خیال ہے کہ معاملات کی
صورت کچھ ایسی ہو رہی ہے کہ عجب نہیں میں کچھ دنوں میں چھوڑ دیا جاؤں۔
اب اگر تم آؤ گی تو دو باتیں ہیں۔ ممکن ہے کہ وزیر منزل میں تمہیں تھوڑے دن
اکیلے رہنا پڑے، اور اس صورت میں آجانے سے کوئی حرج نہیں۔ دوسری
صورت یہ ہے کہ اگر مجھے چھوٹنے میں تھوڑا ہی عرصہ ہے تو میں خود وہاں آ کر تم کو
یہاں لاسکتا ہوں۔ اور پھر اس کے بعد اپنا علاج وغیرہ کر سکتا ہوں۔ اب تم جیسا
مناسب سمجھو ویسا کرو۔'' (۱۲)

یہ تو سب جانتے ہیں کہ بنے بھائی کے تمام خطوط سینسر ہو کر باہر جاتے تھے۔ یہاں تک کہ جو خط وہ اپنے بچّوں کو لکھتے تھے وہ بھی سینسر کی لپیٹ سے نہیں بچ پاتے تھے۔ راقم الحروف نے بنے بھائی کی بڑی بیٹی نجمہ علی باقر جو دہلی میں قیام پذیر ہیں، اس موضوع پر تبادلہ خیال کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ بنے بھائی بڑے جاندار خط لکھتے تھے جس سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ان کے پاس ہیں۔ اپنے خطوں میں وہ ایک ایک چیز کے بارے میں پوچھتے تھے۔ بچّوں کی پڑھائی کے بارے، پھولوں پھلوں کے بارے ، مالی اور گھر کے نوکروں کے بارے۔ دورانِ گفتگو نجمہ نے راقم الحروف کو ایک نہایت دلچسپ بات بتائی۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ ان کی دادی بالکل ان پڑھ تھیں اس لیے ایک سیکریٹری انہیں اخبار پڑھ کر سناتے تھے۔ کہتی ہیں کہ نہ جانے انہوں نے کونسا طریقہ ایجاد کیا تھا کہ وہ رضیہ کے نام خطوں کا وہ حصہ بھی پڑھ لیتے تھے جو سینسر والے نکال دیتے تھے۔ نجمہ کہتی ہیں کہ جیل میں فیض احمد فیض بھی ان کے ساتھ تھے۔ جب فیض صاحب کوئی نئی غزل کہتے تو اس پر وہ اپنے خیالات رضیہ کو ضرور لکھتے تھے۔ اس بات کی تائید ان کے کئی خطوں سے بھی ہوتی ہے۔ 4 فروری 1942 کے خط میں لکھا ہے:

''جان! یہ فیض کی نقشِ فریادی کے بعض نظمیں تو بہت ہی اچھی ہیں۔ بار بار

پڑھتا ہوں پھر بھی دل نہیں بھرتا۔ اور بس یہ دل چاہتا ہے کہ تم ہوتیں اور ہم دونوں ایک ساتھ پڑھتے۔ کبھی تم پڑھتی میں سُنتا اور کبھی میں پڑھتا تم سُنتیں۔'' (۱۳)

اس سے پہلے کے ایک خط میں بھی فیض کی نظموں کا ذکر کیا ہے۔ انہیں جب جیل میں 'آزادی کی نظمیں' کتاب ملی جو سبطِ حسن نے مرتب کی تھی تو اس کا ذکر کرتے ہوئے رضیہ کو لکھا کہ اس کتاب میں فیض کی ایک نظم پڑھی تو بالکل حسبِ حال معلوم ہوئی، اس لیے بہت پسند آئی۔ فیض کی نظم کا یہ شعر خاص کر انہیں بہت پسند آیا۔

اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بارِ ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

اپنے 25 جنوری 1941 کے خط میں بھی جس کا ذکر غالباً پہلے آ چکا ہے، انہوں نے پھر فیض کی شاعری کا ذکر کیا ہے اور فیض کی ایک نظم کے چند اشعار بھی لکھے۔ اس نظم کی انہوں نے بہت تعریف بھی کی ہے۔

اس خط میں بنّے بھائی نے فیض کی نظم کی نہ صرف تعریف کی ہے بلکہ اس کے چند اشعار بھی نقل کیے۔ اسی عمل سے ان کی گہری دوستی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ فیض اور بنّے بھائی کے درمیان پاکستان کی جیلوں میں وقتی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔ فیض کی اکثر نظمیں جو بعد میں 'دستِ صبا' میں شائع ہوئیں، انہیں جیل سے سجاد ظہیر اپنی بیگم کو بھیجتے رہتے تھے۔ یہ بھی لکھتے ہیں کہ انہیں یاد ہے کہ ان دنوں فیض کی جیل سے بھیجی ہوئی نظمیں اور غزلیں شائقین میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی شہرت شہروں شہروں پہنچ جاتی تھی۔

بنّے بھائی اور فیض احمد فیض میں بہت گہرا دوستانہ تھا حالانکہ فیض عمر میں بنّے بھائی سے کوئی چھ سال چھوٹے تھے۔ فیض نے جب اپنی نظموں کا ایک مجموعہ 'زنداں نامہ' کے نام سے شائع کیا تو اس کا سرِ آغاز سجاد ظہیر ہی نے لکھا۔ یہ دوستی بنّے بھائی کے انتقال تک قائم رہی۔ یہاں تک کہ جب 1973 میں بنّے بھائی نے الماتا (روس) میں وفات پائی تو فیض ہی ان کی لاش لے کہ ہندوستان آئے تھے۔ اور ان کے لیے ایک بڑا دردناک مرثیہ بھی لکھا تھا جس کا عنوان ہے 'جامِ الوداع'۔

سن 2005 میں جب پرگتی شیل وسودھا کا خاص نمبر سجاد ظہیر کی صد سالہ یوم پیدائش کے سلسلے میں نکالا جانے والا تھا تو اس رسالے کے چیف ایڈیٹر (کملا پرشاد) نے ان کے متعلق تمام معلومات حاصل کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو پائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے کئی دوستوں اور قلمکاروں سے امداد مانگی مگر ناکام رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی بنّے بھائی کی پاکستان کی جیلوں سے وابستہ زندگی سے جُڑی یادوں پر روشنی ڈالے لیکن کسی سے بھی کوئی ایسا ذریعہ دستیاب نہ ہوا جس سے اس متعلقہ مواد تک رسائی حاصل ہو پاتی۔ بنّے بھائی کے ہزاروں خطوط دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں جو ابھی تک پردہ پوشی میں ہیں۔ شاید اس لیے کہ خط پانے والے حضرات اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اور جو لوگ حیات ہیں وہ اپنے پرانے پتے پر نہیں رہتے۔ بہر حال راقم الحروف نے اپنے ذاتی ذرائع سے یا ادبی محنت مشقت سے جو کچھ بھی بنّے بھائی کے دورِ اسیری سے متعلقہ مواد حاصل کیا اس کو پوری ایمانداری سے اس کتاب میں سمونے کی انتھک کوشش کی ہے۔

بنّے بھائی کے ایک اور ساتھی جو آخری دم تک ان کی قائم کردہ ترقی پسند تحریک سے جُڑے رہے وہ علی سردار جعفری تھے جو بہت نامور شاعر بھی تھے۔ انہوں نے ایک مضمون 'رقصِ شرر' کے عنوان سے لکھا ہے۔ جس میں انہوں نے بڑا مختصر سا ذکر لکھنؤ سینٹرل جیل کا کیا ہے جہاں وہ بنّے بھائی کے ساتھ کچھ عرصہ نظر بند رہے۔ بنّے بھائی سردار جعفری سے عمر میں آٹھ سال بڑے تھے مگر انہوں نے کبھی کسی کو عمر کے اس فاصلے کا احساس نہیں ہونے دیا۔ مندرجہ بالا مضمون میں جعفری صاحب نے لکھا ہے:

> ''ستمبر 1939 میں دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ پہلے بنّے بھائی گرفتار کیے گئے پھر شروع دسمبر میں مجھے بھی گرفتار کر لیا گیا۔ مجھے لکھنؤ کی ڈسٹرکٹ جیل میں رکھا گیا جہاں میں بنّے بھائی کے بڑے بھائی ڈاکٹر حسین ظہیر اور کانگریسی لیڈر چندر بھان گپتا کے ساتھ تھا۔ بنّے بھائی سینٹرل جیل میں بند تھے۔ دونوں جیلوں کے بیچ بس ایک دیوار حائل تھی۔ جس دن میں وہاں پہنچا اسی دن ایک ہمدرد وارڈن نے ایک چھوٹا سا پُرزہ لا کے دیا جو بنّے بھائی نے مجھے بھیجا تھا اور قید خانے میں میرا خیر مقدم کیا تھا۔ اب ان تحریروں کی آمد و رفت شروع ہو گئی جو عام طور پر ادب اور شاعر کے بارے میں ہوا کرتی تھیں۔ ایک بار ایک تحریر جیلر

نے پکڑلی۔اس نے کیٹس (Keats) کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔ وہ یہ سمجھا کہ کسی بڑی سازش کے لیے شناخت کا نام ہے۔ جب میں نے کتاب کھول کر اسے دکھائی اور اسے کیٹس کا ایک سانٹ پڑھ کر سُنایا تب اس احمق نے میری جان چھوڑی۔"(۱۴)

علی سردار جعفری کے علاوہ کیفی اعظمی بھی ان کے قریبی دوستوں اور ساتھیوں میں گنے جاتے تھے۔ یہاں تک کے کیفی کی شادی بھی ان کے گھر میں ہوئی تھی۔ان کی بیٹی نادرہ ببر کہتی ہیں کہ شوکت اعظمی جن سے کیفی کی شادی ہوئی تھی وہ ان کی امّی کی چوتھی کا جوڑا پہن کر دلہن بنی تھیں۔ شوکت اعظمی کو پیار سے موتی بھی کہتے تھے۔ نادرہ کے کہنے کے مطابق شوکت کے گھر والے اس شادی کے خلاف تھے۔ لیکن شوکت کی ضد پراس کے والد نے اس رشتے کو قبول کرلیا۔ حمید اختر نے بھی 'آشنائیاں کیا کیا' میں اس شادی کا ذکر کیا ہے۔اور یہی بات لکھی ہے۔

شوکت کیفی نے چند برس پیشتر ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے 'یادوں کی رہگزر' جو سٹار پبلیشرز دہلی نے شائع کی ہے۔اس کا ایک انگلش ایڈیشن بھی چھپا ہے جسے نسرین رحمان نے ترتیب دیا ہے۔اردو والی جلد میں شوکت نے اپنے ایک خط کا بھی حوالہ دیا ہے جو اس نے کیفی کو لکھا تھا اور جس میں اپنی بے پناہ محبت کا اظہار بھی کیا تھا۔اس میں لکھا ہے:

"کیفی مجھے تم سے محبت ہے۔ بے پناہ محبت۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ پہاڑ، دریا، سمندر، لوگ، آسمان، فرشتے، خدا اور پتہ نہیں کیا کیا۔

تمہاری اور صرف تمہاری

شوکت "(۱۵)

یہ سب کچھ جان کر تعجب ہوتا ہے کہ 'نقوش زنداں' کے خطوں میں ان دونوں ادیبوں کا یعنی کیفی اور سردار جعفری کہیں نام تک نہیں آتا۔ یہ حیرت کی بات ہے مگر حقیقت بھی ہے۔

ان خطوں کے متعلق علی سردار جعفری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اپنے مضمون 'رقصِ شرر' میں لکھا ہے:

”خط لکھنا تو عام دنیا کا دستور ہے لیکن سجاد ظہیر کے یہ خط ان معنی میں دوسروں سے الگ ہیں کہ ان میں ایک شوہر سے زیادہ اس دوست اور ساتھی کے دل کی آواز ہے جو دور ہوتے ہوئے بھی اپنی شریک حیات کو جینے کا حوصلہ دے رہا ہے۔ رضیہ کے لیے یہ اپنی شادی کے بعد پہلا موقع تھا کہ جب سجاد ظہیر کو ان سے دور اور وہ بھی جیل میں رہنا پڑا تھا۔ ایک بیوی کی حیثیت سے وہ جو بھی سوچتی رہی ہوں لیکن سجاد ظہیر نے ان کے بارے جو کچھ بھی سوچا وہ ان خطوں کے ایک ایک لفظ میں سانس لے رہا ہے۔ یہ ان خطوط کا نتیجہ ہے جو آگے چل کر رضیہ وہ رضیہ نہیں رہی جو معینیہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید رضا حسین کی بیٹی تھی۔ اب وہ رضیہ سجاد ظہیر تھی اور انہیں آگے چل کر سچے مددگار کی حیثیت سے سجاد ظہیر کا ساتھ دینا تھا۔“ (۱۶)

مندرجہ بالا تحریروں سے سجاد ظہیر کے قیامِ اسیری کے جذبات اور ان کے جیل سے لکھے خطوط کا تاثر مکمل طور پر واضح ہو جاتا ہے اور اس کے علاوہ کچھ بھی لکھنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ سب کا مشترکہ بیان ایک ہی ہے کہ ان کی خوبیاں، ان کا درد اور تسلی اور ان کا ادب اور سیاست پر تبصرہ ان کے دل کی ہی زبان ہے اور وہ آواز 'نقوشِ زنداں' کے خطوط کے ہر لفظ سے جھلکتی ہے۔

☆☆☆☆

﴿کتابیات﴾

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر / پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱)	کالی پوت کے پچھے	علی باقر	پرگتی شیل وسودھا۔ بھوپال	اکتوبر 2005	214
۲)	فیض نامہ	ڈاکٹر ایوب مرزا	کلاسیک۔ لاہور	2005	226
۳)	کلامِ فیض	فیض احمد فیض	ایجوکیشنل بک ڈپو۔ علی گڑھ	جون 1951	54
۴)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔ دہلی	جون 1951	21
۵)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔ دہلی	جون 1951	29
۶)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔ دہلی	جون 1951	97
۷)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔ دہلی	جون 1951	105
۸)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔ دہلی	جون 1951	109
۹)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔ دہلی	جون 1951	127
۱۰)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔ دہلی	جون 1951	184
۱۱)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔ دہلی	جون 1951	225
۱۲)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔ دہلی	جون 1951	249
۱۳)	نقوشِ زنداں	رضیہ سجاد ظہیر	مکتبہ شاہراہ۔ دہلی	جون 1951	264
۱۴)	سجاد ظہیر۔ شخصیت اور فکر	ڈاکٹر سید جعفر احمد	مکتبہ دانیال۔ کراچی	2005	148
۱۵)	یاد کی رہگزر	شوکت اعظمی	سٹار پبلیکیشنز۔ نئی دہلی	2006	55
۱۶)	سجاد ظہیر۔ شخصیت اور فکر	ڈاکٹر سید جعفر احمد	مکتبہ دانیال۔ کراچی	2005	74

☆☆☆☆

چوتھا باب

آزادی کے بعد

۱۔ قیام پاکستان۔ وجوہات ونتائج

آزادی کی جدوجہد کی تاریخ جس کے نتیجہ کے طور پر 1947 میں ہندوستان نے حکومتِ برطانیہ کی غلامی کا طوق نکال کر پھینک دیا اور ملک آزاد ہوگیا، بہت پرانی ہے۔ یہ جنگِ عظیم سے بھی بہت پہلے نمود میں آئی تھی اور رفتہ رفتہ اس نے اتنا طول پکڑا کہ انگریزوں کے لیے ہندوستان چھوڑ دینے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ اس جدوجہد کا ذکر پچھلے کچھ ابواب میں کیا جا چکا ہے۔ آزادی کی تحریک تو پورے ملک کی آزادی کی تھی نہ کہ اس کے بٹوارے کی۔ لیکن اس بٹوارے سے جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اس کی مثال بہت مشکل سے ملتی ہے۔ کروڑوں لوگ گھروں سے بے گھر ہو گئے۔ دس لاکھ سے زیادہ لوگوں کو قتل کر دیا گیا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ لاتعداد عورتیں بیوہ ہوگئیں، بچے یتیم ہوگئے اور بے شمار نوجوان لڑکیوں کی عصمت دری ہوئی۔ لوگوں کے ضمیر پر وحشت نے قبضہ کر لیا تھا اور انسان درندے بن گئے تھے۔ ایسا سرحد کے دونوں طرف ہوا۔ اگر ملک صرف آزاد ہو جاتا اور اس کا بٹوارہ نہ ہوتا تو اس دہشت گردی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ملک کے ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم ہونے کا ہی یہ ردِعمل ہوا۔ لہٰذا اگر پاکستان نہ بنتا تو وحشت کی یہ بھیانک تصویر سامنے نہ آتی۔ اگر ہم آزادی کی جدوجہد کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس تحریک کے ابتدائی دور میں کسی کے ذہن میں پاکستان کے قیام کا خیال تک بھی نہیں تھا۔ ہر قومی رہنما کا رجوع صرف آزادی حاصل کرنے کی طرف تھا اور اس میں ہندو، مسلمان اور سکھ بھی شامل تھے۔ کسی نے الگ ہندوستان یا الگ پاکستان کی مانگ نہیں کی تھی۔ پاکستان کا بحیثیت خود مختار ملک کا دھندلا سا تصور علامہ اقبال کے اس

خطبہ صدارت میں ضرور ملتا ہے جو انہوں نے 1930 میں مسلم لیگ کی میٹنگ میں پڑھا تھا۔ یہ تصور بہت ہلکا تھا اور اس میں پاکستان کی کوئی صاف تصویر نہیں بن پائی تھی۔ لیکن اقبال کے خطبے سے تقریباً آدھا صدی پہلے کی تاریخ میں بھی جھانک کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ سر سید احمد خان نے 1888 میں ایک ایسے ملک کا قیاس کیا تھا جو بعد میں پاکستان کی صورت میں اُبھر کر سامنے آیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس میں دو مختلف قوموں کا قیام ہے اور یقینی طور پر دونوں قوموں میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے باہم تصادم ہونے کے بھاری امکانات ہیں۔ انہوں نے کہا: ''یہ ناممکن ہے کہ دو قومیں ایک ہندو اور ایک مسلمان ایک ہی تخت پر بیٹھ کر اقتدار میں برابر کے حصے دار بنیں۔ اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ دونوں میں سے ایک قوم دوسرے پر حاوی ہو جائے اور اُسے اپنے ماتحت کر لے۔ یہ اُمید رکھنا کہ دونوں برابر کے حقدار رہیں تو بالکل ناممکن ہے۔'' حالانکہ اس تقریر میں سر سید احمد خان نے کہیں نہیں کہا تھا کہ دونوں قومیں اپنے الگ الگ ملکوں کی سربراہی کریں لیکن انہوں نے اس کے کچھ بیج ضرور بو دیئے تھے۔ اس زمانے میں انگریزوں کے ذہن میں ہندوستان چھوڑنے کا خیال تک نہیں تھا۔ لیکن سر سید اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دونوں قوموں کی علیحدہ حکومت کا تصور عملی نہیں محض خیالی ہے۔ لیکن انہیں یہ خطرہ بھی منڈلاتا نظر آ رہا تھا کہ اکثریتی قوم اپنے ملک کی اقلیت کو ہمیشہ دبا کر رکھے گی اگر منتخب نمائندوں کے ذریعے حکومت عمل میں لائی گئی جس کی مانگ کانگریس ایک عرصے سے کر رہی تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اکثریت چونکہ ہندوؤں کی ہے اس لیے ہندو ہمیشہ اقلیتی قوم کو دبا کر رکھیں گے اور ان کے جائز حقوق کو بھی نظر انداز کر دیں گے۔ لیکن چالیس سال تک کسی نے سر سید احمد خان کے بیان کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ آزادی کے بعد جو بربریت فرقہ وارانہ فساد کی صورت میں ظاہر ہوئی وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سر سید کے شبہات کافی حد تک درست تھے۔

جب 1935 میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ لاگو ہوا تو اس وقت تک بھی نہ تو حکومت برطانیہ کو اور نہ ہی تحریک آزادی کے رہنماؤں کو پاکستان بننے کا کوئی اندازہ تھا۔ بلکہ مسلم لیگ اور خود محمد علی جناح مسلمانوں کے حقوق دیگر طریقوں سے محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے مانگ کی کہ طرز حکومت ایسا ہونا کہ اکثریت کو مکمل خود مختاری نہ دی جائے۔ چنانچہ پرانی ترکیب کو ترک

کر کے نئی ترکیب پیش کی گئی جس سے ہر صوبے کو مناسب خود مختاری حاصل ہو نہ کہ محض سینٹرل گورنمنٹ کو۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر دیا گیا اور گیارہ میں سے چار ایسے صوبے وجود میں آئے جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس تنظیم سے مسلم لیگ کو تسلی تھی اس لیے انہوں نے اسے خوشی سے قبول کیا۔ یہ چار صوبے تھے بنگال، پنجاب، سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ۔ لیکن بدقسمتی سے یہ سلسلہ زیادہ عرصہ چل نہ سکا اور ایک سال کے اندر ہی مسلم لیگ اور کانگریس کے تعلقات میں دراڑ پیدا ہوگئی۔ اس میں کچھ قصور مسلم لیگ کا بھی تھا لیکن زیادہ قصور کانگریس کا تھا جس نے جانے انجانے میں وہی سب کیا جو وہ جماعت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اگرچہ پہلے صوبائی انتخاب میں کانگریس اور مسلم لیگ نے مل کر شمولیت کی لیکن چونکہ کانگریس کو مسلم لیگ کی نسبت زیادہ کامیابی حاصل ہوئی اس لیے حکومت قائم کرتے وقت وہ مسلم لیگ کو اقتدار میں حصہ دینے سے گریز کرنے لگی۔ اتنی بڑی کامیابی کے بعد کانگریس نے محسوس کیا کہ اُسے مسلم لیگ کو حکومت میں شریک کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ مسلم لیگ کو صاف لفظوں میں بتایا گیا کہ وہ صرف اس شرط پر حکومت میں شریک ہوسکتی ہے کہ وہ ایک علیحدہ گروپ نہ بن کر صرف کانگریس کے اصولوں پر کاربند رہے یا کسی ایسی جماعت میں شامل ہوجائے جس میں اکثریت ہندوؤں کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کانگریس نے مسلم لیگ کو حصہ داری حق نہ دے کر صرف اس میں جذب ہونے کا حق دیا تھا۔ یہ سب سے بڑی غلطی کانگریس سے سرزد ہوئی۔ اور مستقبل میں پاکستان کے قیام کی وجہ بھی بنی۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی وجوہات ہیں جن کی بناء پر کانگریس اور مسلم لیگ ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔ کانگریس کی اس ضد سے کہ مسلم لیگ خود کو کانگریس میں جذب کر دے، نہ صرف پارٹی ہی خفا ہوئی بلکہ ملک بھر کے مسلمانوں میں کانگریس کے خلاف غم و غصہ پھیل گیا۔ کانگریس کو اس بات کا رتی بھر احساس نہ ہوا کہ غم و غصہ کی یہ خطرناک لہر آنے والے دنوں میں ملک کو کس قدر نقصان پہنچا سکتی ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ کشیدگی کا کوئی علاج تلاش کرتی کانگریس نے مسلم عوام کے ساتھ فرداً فرداً رابطہ قائم کرنے کی ''ماس موومنٹ'' کی مہم شروع کر دی۔ یہ سب کچھ پنڈت نہرو کے مشورے سے کیا گیا۔ اس سے مسلم لیگ کو یہ خطرہ درپیش ہوا کہ کانگریس اس کی ہستی کو ہی نیست و نابود کرنا چاہتی ہے اور مسلمانوں کو لیگ سے علیحدہ کرنے کی یہ ایک شرمناک سازش ہے۔ نتیجے کے طور پر پاکستان کے قیام کی مانگ زور پکڑنے

لگی تا کہ مسلمانوں کو اپنا الگ ملک حاصل ہو جس کی حکومت وہ اپنے دستور سے چلا سکیں۔

اگر غور کیا جائے تو ہندو مسلم فرقہ وارانہ تفرقات کا حل محض یہی ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو ہندوستان سے مسلم اکثریت کے علاقے کاٹ کر انہیں الگ ملک کے طور پر دے دیئے جائیں۔ لیکن نہ تو کانگریس اس کے حق میں تھی اور نہ ہی بہت سے مسلمان لیڈر۔ پنڈرل مُون نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "Divide and Quit"۔ اس میں انہوں نے سکندر حیات خان جو اس وقت پنجاب کے چیف منسٹر تھے، ان سے ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے جس میں قیام پاکستان کی بات کا بھی چرچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اکتوبر 1938 میں سر سکندر سے دورانِ گفتگو، میں نے قیام پاکستان کی خوبیوں کو جوش و خروش سے بیان کیا اور یہ بھی واضح کیا کہ فرقہ وارانہ مسئلے کا شاید یہ سب سے بہترین حل ہے۔ سر سکندر عام طور پر ایسے حالات میں اپنا صبر و تحمل کبھی نہیں کھوتے۔ لیکن اس دن میرا مشورہ سُننے کے بعد ان کی آنکھیں غصے سے لال ہو گئیں اور اپنی ناراضگی کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا:

'تم ایسا کیسے کہہ سکتے ہو۔ تم دراز عرصے سے مغربی پنجاب میں قیام پذیر ہو اور مسلمانوں سے بخوبی واقف ہو۔ کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا کہ پاکستان کا قیام ان مسلمانوں کو دعوت دینا ہے کہ وہ ہر ہندو بنیئے کا گلا کاٹ دیں۔'

تب اپنے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ تفریق ملک کے بعد بہت سے مسلمان ہندوستان میں ہونگے اور بہت سے ہندو پاکستان میں۔ اس لیے کوئی بھی قوم اقلیت کو نقصان نہیں پہنچائے گی کیونکہ اسے ڈر ہوگا کہ سرحد کی دوسری طرف ان کے لوگوں کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا۔ اس پر سر سکندر کہنے لگے کہ مغربی پنجاب کے بلوچی اور آوان ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کی پرواہ نہیں کریں گے۔ اس لیے یہ Hostage Theory بالکل بے بنیاد ہے۔ سرحد کے دونوں طرف بیحد خون خرابہ ہوگا۔ انہوں نے پھر ذرا سختی سے مجھے کہا کہ میں دوبارہ تم سے یہ بے ہودہ بات نہیں سُننا چاہتا۔''(۱)

لیکن وہی سکندر حیات خان اٹھارہ مہینے سے بھی کم عرصے میں پاکستان کے قیام کی مخالفت میں کمزور پڑ گئے اور جب پاکستان بنانے کا ریزولیوشن پیش کیا گیا تو اس کے حق میں انہوں نے اس ریزولیوشن پر دستخط کر دیئے۔ وجہ یہ تھی کہ 1940 تک تو بہت سے بلند خیال مسلمان سر سکندر کی قیامِ پاکستان کی مخالفت سے اتفاق رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ایک عام مسلمان کے ذہن میں یہ بات گھر کر گئی کہ ایک علیحدہ ملک ہی ان کی تمام اذیتوں کا حل ہے کیونکہ ہندوؤں کے چلے جانے سے تمام تر سیاسی اور معاشی اقتدار ان کے اپنے قبضے میں ہوگا اور کسی بیرونی عناصر کا وہاں کوئی دخل نہ ہوگا۔

1941 کے آخر تک حکومتِ برطانیہ ملک کی تقسیم کے متعلق بے نیاز تھی۔ انگریزوں میں بٹوارے جیسی کوئی تجویز نہیں تھی۔ بعد میں مارچ 1942 سر سٹیفورڈ کرپس ملک کی سیاسی پارٹیوں میں اتحاد قائم کرنے کی غرض سے ہندوستان تشریف لائے۔ وہ اپنے ساتھ ہندوستان کو آزادی دینے کی کچھ تجویزیں بھی لائے تھے۔ ان میں پاکستان کے قیام کی کچھ دھندلی تصویریں بھی تھیں۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ حکومت برطانیہ نے ملک کی تقسیم کے متعلق سوچا ہی نہیں تھا بلکہ اقبال بھی کیا تھا کہ تقسیم ممکن ہے۔ کرپس مشن کو سب سے پہلے محمد علی جناح نے رد کیا اور بعد میں کانگریس نے۔ اس تردد میں گاندھی جی کا بھی بہت اہم رول تھا۔ صرف ایک راج گوپال آچاریہ ہی واحد شخص تھے جنہوں نے کرپس کے مجوزہ مسودے پر غور کرنے کی صلاح دی لیکن گاندھی کی قد آوری اور شخصیت نے اسے دبا دیا۔ راج گوپال آچاریہ گاندھی جی کی ہندوستان چھوڑو مہم کے بھی سخت خلاف تھے اور عوام میں کھلے عام کہتے تھے کہ اگر انگریزوں نے اس ملک کو اس مرحلے پر خیر باد کہہ دیا تو وہ ہندوستان کے حق میں بہت بڑا ظلم ہوگا۔ مئی 1942 میں انہوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ میں ایک ریزولیوشن پیش کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ قیام پاکستان کی تجویز کو مان لینا۔ بدقسمتی سے اسے بھاری اکثریت سے رد کر دیا گیا۔ سیاست میں خود اعتمادی کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ اس لیے آچاریہ جیسے پختہ دماغ انسان کو بھی مطلب پرست عناصر کے آگے مات کھانا پڑی۔ مسٹر مون کہتے ہیں کہ 1942 میں بہت سارے مسلم لیگی اور خود جناح بھی ملک کی تقسیم کے حق میں نہیں تھے۔ اگر اس دوران کانگریس قیام پاکستان کی تجویز قبول کر لیتی تو مسلم لیگ کے ساتھ فیصلہ بڑے اچھے طریقے سے ہو جاتا۔ لیکن ایسا کرنے کی بجائے انہوں نے گاندھی جی کی ہندوستان چھوڑو مہم میں شمولیت کا راستہ اختیار کرنا مناسب

سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت بڑے پیمانے پر کانگریس کے لیڈر اور کارکن گرفتار ہوئے اور تین سال کے بعد جرمنی سے جنگ بندی کے بعد جب وہ رہا ہوئے تو محمد علی جناح پاکستان کے متعلق بہت سخت رویے کے حامل بن چکے تھے اور ہندوستان کے تمام مسلمان ان کے ساتھ متحد تھے۔

1947 کے ابتدائی مرحلے میں یہ تقریباً طے ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کو وہ علاقے سونپ دیئے جائیں جن میں ان کی اکثریت ہے۔ مسلم اکثریت میں پنجاب کا صوبہ سرفہرست تھا۔ پورے پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً 57 فیصدی تھی۔ اگرچہ لاہور والی طرف مسلم آبادی بہت زیادہ تھی لیکن ایسٹ پنجاب میں ان کی تعداد بہت کم تھی۔ ایسٹ پنجاب میں نہ صرف ہندو ہی مقیم تھے بلکہ ایک بہت بڑی تعداد سکھوں کی بھی تھی جو محض 100 سال پہلے پورے پنجاب پر حکومت کر چکے تھے۔ سکھ بڑے دلیر اور جنگجو لوگ تھے اس لیے ان سے سکہ لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ اگر پنجاب جہاں مسلمانوں کی تعداد تقریباً 57 فیصدی تھی، سارے کا سارا پاکستان میں شامل کر لیا گیا تو سکھ لوگ آسانی سے اپنا علاقہ ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ لہٰذا جناح کی پاکستان کی مانگ سے سکھوں کو بہت تشویش تھی کہ سارا پنجاب پاکستان میں چلا جائے گا۔ اب تک جناح نے پارٹیشن کے متعلق اپنا رویہ مکمل طور پر واضح کر دیا تھا کہ مسلم اکثریت کے تمام علاقوں کو یکجا کر کے ایک علیحدہ ملک تعمیر کیا جائے جس کا نام پاکستان ہو۔ اس سے کم وہ کسی چیز پر قناعت کرنے والے نہیں تھے۔ لہٰذا بمبئی کی ایک میٹنگ میں مسلم لیگ نے حصول پاکستان کے لیے 'ڈائریکٹ ایکشن' کا اعلان کیا اور جناح نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''آج سے ہم ملک کے قانونی دستور کو الوداع کہتے ہیں۔'' اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ مسٹر ایٹلی جو ان دنوں برطانیہ کے پرائم منسٹر تھے انہوں نے ہاؤس آف کامنز میں اعلان کیا کہ حکومتِ برطانیہ کی یہ نہایت پختہ خواہش ہے کہ وہ تمام ضروری اقدامات اٹھائے جائیں جن سے ہندوستان کی حکومت ان کے لوگوں کو سونپ دی جائے اور یہ کام جون 1948 تک مکمل ہو جانا۔ اس سلسلے میں اس نے تمام سیاسی پارٹیوں کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ اس حصولِ مقصد کے لیے اپنے ذاتی تفرقات کو دفنا دیں۔ لیکن ہندوستانی عوام بخوبی جانتی تھی اور سیاسی پارٹیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ کیبینٹ مشن کی تجاویز کا بھی وہی حشر ہوگا جو کرپس مشن کا ہوا تھا۔ اور ہوا بھی وہی۔ مشن کی یہ تجویز تکمیل تک نہ پہنچ پائی۔ مسٹر ایٹلی نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا تھا کہ ہندوستان میں آزادی کی تجویز کو

ملی جامہ پہنانے کے لیے گورنر جنرل کا بھی تبادلہ کیا جائے گا اور ایک نیا گورنر مقرر ہوگا۔ اس کے تحت لارڈ ویول کو ہٹا کر اس کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بڑی سوجھ بوجھ اور تمام پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہوئے ملک کی تقسیم کا ایک تسلی بخش نقشہ تیار کیا جو تمام سیاسی پارٹیوں کو منظور تھا۔ مئی 1947 کے وسط میں اس پلان کا درمیانی مدعا خفیہ طور پر تمام سیاسی پارٹیوں کو ان کی منظوری کے لیے بھیجا گیا جسے انہوں نے بنیادی طور پر منظوری دے دی۔ اس پلان کے مطابق ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا جس میں ایک کا نام ہندوستان اور دوسرے کا پاکستان ہوگا۔ سندھ اور سرحدی صوبہ جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی پورے کے پورے پاکستان میں شامل ہو جائیں گے اگرچہ بنگال اور پنجاب کو مذہبی اکثریت کی بناء پر بانٹا جائے گا اور مسلم اکثریت کے حصے پاکستان کو مل جائیں گے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ جون 1948 تک انتظار کرنے کے بجائے آزادی دینے کی تاریخ 15 اگست 1947 رکھی جائے گی۔ آزادی کیسے عمل میں آئی اس سے متعلقہ حالات کا ترتیب وار اور مناسب سلسلہ تفصیل سے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ ان حالات سے یہ بالکل ثابت نہیں ہوتا کہ کوئی خاص شخص یا کوئی ایک پارٹی ملک کی تقسیم لیے ذمہ دار ہیں۔ لیکن کئی لوگوں نے ایک دوسرے کو اس بٹوارے کا ذمہ دار ٹھہرانے کوشش کی ہے۔

جب شری ایل۔ کے۔ اڈوانی سے پوچھا گیا کہ ملک کی تقسیم اور اس سے پیدا شدہ حالات کا ذمہ دار کون ہے تو انہوں نے کہا کہ بنیادی طور پر مسلم لیگ ہی اس کی ذمہ دار ہے۔ ان کے خیال میں مسلم لیگ کی دو قوموں والی تھیوری خامیوں سے بھری ہوئی تھی اور اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان ہزاروں سالوں سے امن اور رواداری سے اکٹھے رہ رہے تھے۔ اس لیے دونوں طبقوں کو الگ الگ قومیں قرار دینا ان کی ایک ہزار سالہ تاریخ کے نام پر بدنما دھبا تھا۔ مسلم لیگ کی دو قوموں کی تھیوری میں جو خامیاں تھیں ان کو مسلم لیگ کے 'ڈائریکٹ ایکشن' سے اور تقویت ملی۔ ڈائریکٹ ایکشن کی مہم اگست 1946 میں شروع کی گئی جس کا ظاہری نتیجہ یہ ہوا کہ کلکتہ میں بہت سارے بے قصور انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا جن میں زیادہ تر ہندو تھے۔ 6000 لوگوں کی جانیں گئیں۔ 20,000 زخمی ہوئے اور تقریباً 1,00,000 گھر سے بے گھر ہو گئے تھے۔ لیکن ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس تمام خون خرابے کی ذمہ داری واحد مسلم

لیگ پر عائد ہوتی ہے۔اڈوانی جی کہتے ہیں کہ مسلم لیگ اکیلی اس کی ذمہ دار نہیں۔ایک انگریز مصنف وولپرٹ کی کتاب Shameful Flight (2007) سے اقتباس لے کر وہ کہتے ہیں کہ اس قتل و غارت کے جرم میں جو پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے سلسلے میں وارد ہوا لارڈ لوئس ماؤنٹ بیٹن برابر کے حصے دار ہیں۔ان کے مطابق گورنر جنرل کو مکمل آگاہی تھی کہ فسادات ہونے والے ہیں اور اگر وہ مناسب قدم اُٹھاتے تو ہونے والی تباہی کو روکا جا سکتا تھا۔اپنی کتاب My Country My Life میں اڈوانی جی لکھتے ہیں:

''ملک کے بٹوارے کے متعلق میرے جذبات کا اظہار نامکمل رہے گا اگر کانگریس کے کردار پر تبصرہ نہ کیا گیا۔دیگر حب الوطن انسانوں کی طرح میں بھی ان کی قدر کرتا ہوں جنہوں نے آزادی کی جدو جہد میں ہماری رہنمائی کی ہے۔ پھر بھی ذہن میں یہ خیال بار بار اُٹھتا ہے کہ کیا ہمارے سیاسی لیڈر ایسی خون آلودہ تقسیم ملک کو روک سکتے تھے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر رام منوہر لوہیا سے متفق ہوں۔اپنی کتاب The Guilty Men of Partition میں رام منوہر لوہیا نے لکھا ہے کہ صرف مہاتما گاندھی کو چھوڑ کر تمام سیاسی لیڈر جدو جہد سے تھک کر تنگ آچکے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی زندگی میں ہی ہندوستان آزاد ہو جائے۔اس لیے انہوں نے گاندھی جی کے مشورے کے خلاف آزادی کی تجویز کو قبول کر لیا کیونکہ گورنر جنرل نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ ہندو مسلم فسادات کا اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے۔

پنڈت نہرو نے بعد میں اس غلطی کا اقبال بھی کیا اور کہا کہ ''جب ہم نے بٹوارے کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا تو کسی کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ بٹوارے کے بعد لوگ ایک دوسرے پر ایسا قہر و ستم برپا کریں گے۔دراصل ہم نے اس خون خرابے سے بچنے کے لیے ہی بٹوارے کو مانا تھا۔۔۔۔۔۔بعد میں سردار پٹیل نے بھی یہی بیان دیا کہ ہمیں ملک کو تقسیم کرنے کا پلان نہیں ماننا تھا۔انہوں نے کہا کہ ہم سمندر اور ندیوں کے پانی کو کیسے تقسیم کر سکتے ہیں۔

صرف مہاتما گاندھی آخری دم تک اڑے رہے کہ فرقہ وارانہ لحاظ سے ملک کو
تقسیم کرنے کے بے حد بھیانک اور خطرناک نتیجے نکلیں گے۔ اگرچہ بعد میں وہ
بھی مان گئے لیکن وہ محض اس خیال کے تحت مانے کہ شاید بٹوارے سے یہ خون
خرابہ ٹل جائے۔''(۲)

بی۔آر۔نندا کا ذکر جسونت سنگھ نے اپنی کتاب Jinnah میں کیا ہے۔ جسونت سنگھ کہتے ہیں کہ نندا نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے Nehru , the Indian National Congress and , the Partition۔ اس کتاب میں نندا نے لکھا ہے کہ نہرو اور پٹیل نے ملک کی تقسیم کے مسودے کو اس لیے قبول کیا کیونکہ وہ جلد از جلد سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جسونت سنگھ لکھتے ہیں کہ گاندھی جی بالکل بٹوارے کے حق میں نہیں تھے۔ اپنی کتاب میں انہوں نے گاندھی جی کی تقریر سے ایک چھوٹا سا اقتباس بھی لیا ہے جس میں گاندھی جی نے کہا ہے کہ مجھے کوئی ایسا پُر امن طریقہ دکھائی نہیں دیتا جس میں ہندوستان کے 8 کروڑ لوگوں کو مجبور کر سکوں کہ وہ ہندوستان کی دیگر عوام کا ساتھ دیں چاہے اکثریت کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو۔ مسلمانوں کو اپنے فیصلے خود کرنے کا وہی حق ماننا چاہیے جو ہندوستان کے دوسرے لوگوں کو میسّر ہے۔ ہم ایک کنبے کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں کسی بھی شخص کا یہ حق ہے کہ وہ تقسیم کا مطالبہ کرے۔ جسونت سنگھ کی کتاب سے ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

> ''دو وجوہات جن کی بناء پر نہرو نے ہندوستان کا بٹوارہ قبول کیا وہ سب ان کے اپنے بیان میں ملتی ہیں جو لیونارڈ مُوسلی نے قلم بند کی ہیں۔ مُوسلی لکھتے ہیں کہ میرا خیال تھا کہ یہ حالات کا تقاضہ ہے کہ ہم جس رو پر چل رہے ہیں اس سے کوئی گرہ کھلنے والی نہیں۔ ایک جذبہ یہ بھی ہے کہ ایسے حالات میں آزادی مل بھی جائے تو وہ ہندوستان بہت کمزور ملک ہوگا۔ یعنی مرکزی حکومت تو ہوگی لیکن تمام طاقت صوبہ جات کے پاس رہے گی۔ متحدہ ہندوستان کو بہت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور لگاتار علیحدگی کی کوشش بھی جاری رہے گی۔ نہرو نے مُوسلی سے گفتگو کے دوران یہ بھی کہا کہ سچ تو یہ ہے کہ ہم تھک چکے ہیں اور عمر بھی گزرتی جا رہی

ہے۔ اوراب بہت سے لوگوں میں یہ طاقت بھی نہیں رہی کہ پھر سے نظر بند ہو کے
جیل میں داخل ہوں۔ ہم نے اگر متحدہ ہندوستان کا انتخاب کیا ہوتا جیسا کہ ہم چاہتے
تھے تو جیل ہمارا انتظار کر رہی ہوتی۔ ہمیں پنجاب میں آتش زنی قتل وغارت اور
لوٹ کھسوٹ کی خبریں روز ملتی رہی ہیں۔ صرف بٹوارہ ہی اس کا حل تھا۔" (۳)

اسی کتاب میں نہرو کے حوالے سے جسونت سنگھ لکھتے ہیں کہ اگر ہمیں گاندھی جی نے کہا ہوتا کہ تقسیم ملک قبول نہ کرو تو ہم نہیں کرتے اور جدوجہد جاری رکھتے۔ ہمیں امید تھی کہ تقسیم محض عارضی ہے اور پاکستان پھر سے ہندوستان میں شامل ہو جائے گا۔ نہرو کی طرح بعد میں گاندھی کے نظریے میں بھی تبدیلی آئی اور انہوں نے 1942 کے 'ہریجن' کے شمارے میں لکھا کہ اگر مسلمانوں میں اکثریت یہ چاہتی ہے کہ ہندوستان تقسیم ہو جائے تو ایسا ہونا ہی۔ بلکہ 1944 میں حقیقت میں انہوں نے محمد علی جناح سے اسی مسئلے پر گفتگو بھی کی کہ تقسیم کس بنا پر ہوئی۔ لیکن کسی نامعلوم وجہ سے گاندھی نے پھر اپنا رویہ تبدیل کیا اور 3 مارچ 1947 کو مولانا آزاد سے بات چیت کے دوران کہا کہ اگر کانگریس نے تقسیم قبول کی تو انہیں یہ ان کی لاش کے اوپر کرنا پڑے گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جب تک وہ زندہ ہیں وہ ملک کا بٹوارہ نہیں ہونے دیں گے اور اگر ان کے بس میں ہوا تو وہ کانگریس کو بھی ایسا نہیں کرنے دیں گے۔

بٹوارے کا فیصلہ لینے کے بعد ملک میں جو تشدد اور قتل وغارت کا ماحول پیدا ہوا وہ دل دہلا دینے والا تھا۔ پٹیالہ (پنجاب) میں ایک نہر کتنے دنوں تک معصوموں کے خون سے لال ہو کر بہتی رہی۔ سرحد کے دونوں طرف شاذ و نادر ہی کوئی کنبہ ہوگا جس میں کوئی بیٹھا آنسو نہ بہا رہا ہوگا۔ خود راقم الحروف 1947 میں تقریباً 11 سال سے اوپر کی عمر کا تھا اور پورے ہوش و حواس میں تھا۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے نعشیں گرتی ہوئی دیکھی ہیں۔ انسانوں کو جانوروں کی طرح کاٹا جا رہا تھا۔ اللہ اور ایشور کو ماننے والے لوگ ان واردات سے گھبرا کر روپوش ہو گئے تھے۔ آج بھی جب وہ نظارہ آنکھوں کے آگے دوبارہ آ جاتا ہے تو روح کانپ اُٹھتی ہے۔ اسی ردِعمل کو آچاریہ کرپالانی نے یوں بیان کیا ہے:

" ہندو اور مسلمان دونوں ظلم و تشدد میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانا
چاہتے ہیں۔ میں نے ایک کنویں کا نظارہ دیکھا ہے جہاں 107 عورتیں اور

بچے حفظانِ عزت کی خاطر کود گئے اور جان دے دی۔ اور ایک جگہ جو عبادت گاہ تھی مردوں نے اس خطرے کے تحت کہ ان کی عصمت دری ہوگی اپنی تمام عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں نے ایک گھر بھی دیکھا جہاں ہڈیوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ اس گھر میں 307 لوگوں کو جن میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے بند کر کے زندہ جلا دیا گیا تھا۔ اس دہشت گردی کے باوجود ہم پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہم نے بٹوارہ خوف زدہ ہو کر مان لیا ہے۔ کچھ حد تک اس الزام میں سچائی ضرور ہے لیکن اس میں کچھ فرق بھی ہے۔ ڈر محض انسانی زندگیوں کو تلف کرنا، بیواؤں کی چیخ و پکار اور بچوں کی کراہنے کی آوازوں سے تعلق نہیں رکھتا۔ ڈر یہ بھی ہے کہ اگر ہم ادلے کا بدلا کرنے میں لگے رہیں گے یا ایک دوسرے کی ہتک عزت کو اپنا مفہوم بنالیں گے تو وہ وقت دور نہیں جب ہماری حرکتیں ہمیں وحشی درندہ بنا دیں گی۔ ہر نیا ظلم پچھلے ظلم سے زیادہ خطرناک بنانا روزمرہ کا عمل بن گیا ہے۔" (۴)

بہت سے لوگوں نے محمد علی جناح کو بٹوارے کا ملزم ٹھہرایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سیاسی پارٹیوں کا اس میں برابر کا حصہ ہے۔ ملک کی تقسیم سے کچھ روز پہلے یعنی 7 اگست 1947 کو جناح ہمیشہ کے لیے ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان کا گورنر جنرل بننے کے لیے دہلی سے کراچی روانہ ہوئے۔ ان کے دل میں کوئی انجان سا بوجھ تھا اور الفاظ جذبات سے بوجھل تھے۔ شاید وہ بٹوارے سے خوش نہیں تھے۔ تمام راستہ سوائے ایک آدھ ضروری جملہ ادا کرنے کے وہ خاموش ہی رہے۔

ایک اور انگریز مصنف ہیکٹر بولیتھو نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے In Quest of Jinnah'۔ اسی کتاب میں انہوں نے جناح کی کراچی کی طرف روانگی کو اس طرح بیان کیا ہے:

"7 اگست 1947 کو جناح روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ میں، احسان اور مس جناح بھی تھے۔ ہم لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ڈکوٹہ ہوائی جہاز میں دہلی سے کراچی

روانہ ہوئے۔ بہت کم لوگ ہمیں الوداع کہنے کے لیے آئے تھے۔ گھر چھوڑنے سے پہلے جناح نے مجھے ایک چوکڑی تھمائی جس میں کچھ دستاویز تھے اور کہا کہ میں انہیں جہاز تک لے جاؤں۔ جہاز اڑنے سے پہلے انہوں نے اپنی تصویر اتروائی لیکن وہ بالکل خاموش تھے۔ جب جہاز اڑنے کے لیے تیار ہوا تو وہ ذرا سا بڑبڑائے کہ "لو سب ختم ہوگیا۔"

انہوں نے ہمیشہ کی طرح سفید شیروانی پہن رکھی تھی اور کالا چشمہ چڑھایا ہوا تھا۔ مس جناح آگے کی سیٹ پر بیٹھی تھی اور میں جناح کے بغل میں۔ ان کے پاس اخباروں کا بہت بڑا بنڈل تھا جنہیں انہوں نے جہاز اڑتے ہی پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے کچھ اخبار مجھے بھی دیئے اور کہا "کیا تم یہ پڑھنا چاہو گے۔"

چار گھنٹے کے سفر کے دوران بس وہ اتنا ہی بولے۔ لیکن جو انہوں نے کہا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ان کی زندگی کا سب سے اہم مرحلہ تھا۔ وہ شام کراچی پہنچے۔ جب ہم موری پور سے گزر رہے تھے جناح نے نیچے دیکھا جہاں ہزاروں لوگ، آدمی، عورتیں اور بچے ان کا استقبال کرنے کے لیے ریت پر کھڑے تھے۔ تب بھی نہ تو ان کے چہرے پر کوئی خاص تاثرات نمودار ہوئے اور نہ ہی ان کی زبان سے کوئی لفظ نکلا۔ سب سے پہلے وہی ہوائی جہاز سے باہر آئے پھر مس جناح۔ وہاں بہت سے قدآور اور نامور ہستیاں ان کے انتظار میں موجود تھیں۔ انہوں نے کچھ لوگوں سے ہاتھ ملایا اور پھر کار میں بیٹھ گئے۔

وہاں ہزاروں لوگ نعرے لگا رہے تھے 'پاکستان زندہ باد' 'قائدِ اعظم زندہ باد' لیکن ان کے چہرے پر کوئی خوشی کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔ وہ بہت تھکے سے لگ رہے تھے اور بنا ایک لفظ کہے وہ پہلی بار گورنمنٹ ہاؤس میں داخل ہوئے۔ ان کے چہرے پر کہیں بھی خوشی نظر نہیں آ رہی تھی۔" (۵)

مندرجہ بالا تفصیل کے مدِ نظر یہ کہنا مناسب نہیں کہ پاکستان کی مانگ جناح نے صرف

ذاتی اقتدار حاصل کرنے کے لیے کی تھی۔ ان کے دماغ میں یہ ضرور رہا ہوگا کہ اس میں کچھ بڑے مسئلے بھی درپے ہیں۔ اگر چہ وہ مذہبی قسم کے انسان نہیں تھے لیکن انہوں نے ایمانداری سے یہ محسوس کیا ہوگا کہ پاکستان کے قیام سے ہی مسلمانوں کا مستقبل محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ یہ احساس ٹھیک تھا یا غلط اس پر بہت لمبی بحث ہو سکتی ہے لیکن اکیلے جناح کو ہی ملک کی تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرانا غیر مناسب ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ بٹوارے کے دوران انسانوں نے دوسرے انسانوں پر بہت بے دردی سے ظلم کیے لیکن اس بٹوارے کا سب سے زیادہ اثر پنجاب اور بنگال میں ہوا کیونکہ ان دونوں صوبوں کو کاٹ کر ہندوستان اور پاکستان میں شامل کیا گیا تھا۔ پنجاب کے ہر ضلع میں کیا کیا ظلم ہوا اس کا ذکر پنڈرل مُون نے اپنی کتاب Divide & Quit میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے پنجاب کے ضلع میں اقلیت پر ڈھائے ظلموں کا حقیقت پر مبنی ذکر کیا ہے۔ راقم الحروف بھی اس علاقے کے بارے میں تشدد کی اطلاع بہم پہنچانا چاہتا ہے جہاں اس کے آبا و اجداد رہتے تھے۔ وہ علاقہ ضلع کیمبل پور کا ہے۔ راقم الحروف کے آبا ایک گاؤں دومیل کے رہنے والے تھے۔ اگر چہ مُون نے دومیل کے بارے میں کچھ نہیں کہا لیکن اس کے گرد و نواح کے گاؤں میں ظلم و تشدد کا لمحہ بہ لمحہ کا ذکر کیا ہے۔ وہاں کے حالات اسی کے حوالے سے ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔

ایک مسلم ہجوم نے 11 مارچ 1947 کو گاؤں بسال پر حملہ کیا جس میں چار ہندو مارے گئے اور 11 زخمی ہوئے۔ ہندوؤں کی تمام دکانیں اور مکان لوٹ لیے گئے۔ یہی حال پڑوسی گاؤں کسراں کا بھی ہوا۔ اس گاؤں میں راقم الحروف کا ننھیال بسا ہوا تھا۔ کسراں میں بہت سے لوگوں کو قتل کیا گیا۔ صرف وہی لوگ بچ گئے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ 13 مارچ ایک بار پھر بسال پر حملہ ہوا جس میں 27 ہندوؤں کی جان گئی۔ بسال آخری ریلوے اسٹیشن تھا جہاں سے ہم لوگ پیدل اپنے گاؤں جاتے تھے۔ مارچ کے فسادات میں کُل ملا کر 72 گاؤں پر حملے ہوئے۔ لہٰذا بسال اسٹیشن کے بغل میں ایک کیمپ قائم کیا گیا جس میں ہندوؤں کو پناہ دی گئی۔ کیمبل پور ضلع اور اس کی دو تحصیلیں تلہ گنگ اور فتح جنگ ایسے علاقے تھے جہاں کافی تعداد میں ہندو مقیم تھے۔ ان پر حملہ ہوا تو کافی لوگ مارے گئے۔ جو بچ گئے وہ پنجہ صاحب گوردوارے میں منتقل ہو گئے۔ کیونکہ پنجہ صاحب پر زبردست پہرہ تھا اس لیے وہاں کسی قسم کا کوئی حملہ نہیں ہوا۔

18 مارچ کو تقریباً 5000 مسلمانوں نے بسال کے قریب ایک گاؤں پر حملہ کردیا۔ جو عورتیں اور لڑکیاں صبح کے وقت کھیتوں میں قدرتی حاجت رفع کرنے کے لیے گئی تھیں انہیں اغوا کرلیا گیا۔ اس حملے میں ہندوؤں نے شروع میں حملہ آوروں کا جم کر مقابلہ کیا۔ دو دن تک حملہ آوروں نے گاؤں کو گھیرے رکھا۔ لیکن جب ہندوؤں کا اسلحہ ختم ہوگیا تو مسلمان حملہ آوروں نے قتل عام شروع کیا جس سے کوئی نہ بچ سکا۔ ایک اندازے کے مطابق کوئی 350 لوگ مارے گئے اور اس سے زیادہ زخمی ہوئے۔ باقیوں نے اپنا مذہب تبدیل کرلیا۔ دو دن کے بعد بلوچ ملٹری آئی اور جو بچ گئے تھے ان سب کو نزدیکی اسکول میں منتقل کردیا گیا۔ پندرہ روز کے بعد ان سب لوگوں کو واہ کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ جس ٹرین سے ان لوگوں کو واہ کیمپ بھیجا گیا اس پر گولرا ریلوے اسٹیشن کے قریب کچھ مسلمانوں نے حملہ کیا جو باجرے کے کھیتوں میں چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس حملے میں کچھ لوگ زخمی ضرور ہوئے لیکن کوئی مرا نہیں اور ٹرین حفاظت سے واہ کیمپ پہنچ گئی۔

راقم الحروف کے ماں باپ بہن بھائی اور دیگر رشتہ دار جو دومیل اور کسراں گاؤں سے بچ کر آئے تھے وہ بھی اسی ٹرین میں تھے۔ یہ تمام نظارہ راقم الحروف کی آنکھوں کے آگے آج بھی گردش کرتا رہتا ہے۔ واہ کیمپ میں ہم لوگ صرف تین یا چار روز ہی رہے اور پھر ایک ٹرین سے لاہور کے راستے امرتسر وارد ہوئے۔ واہ کیمپ میں یا اس کے اردگرد راقم الحروف کی نظر میں کوئی شخص قتل نہیں ہوا اور نہ ہی واہ کیمپ پر کسی نے حملہ ہی کیا۔

3 ستمبر کو چند ہندو لاوا گاؤں کو چھوڑ کر نکل آئے۔ باقی کوئی ڈھائی سو لوگ سواری نہ ملنے کی وجہ سے وہیں رہ گئے۔ 5 ستمبر کو ان لوگوں پر حملہ ہوا اور کئی لوگ مارے گئے۔ باقی سب نے اسلام قبول کرلیا۔ بعد میں سارے کا سارا گاؤں لوٹ لیا گیا۔

ہندوؤں کا ایک قافلہ 30 اگست کو فتح جنگ سے گزر رہا تھا جب اس پر مسلمانوں نے حملہ کردیا۔ 20 ہندو مارے گئے اور 15 زخمی ہوئے۔ ایک اور گاؤں کوٹی گل پر 5 ستمبر کو حملہ ہوا۔ دو ہندو مارے گئے اور سات زخمی ہوئے۔ باقی ماندہ لوگوں کو اسلام قبول کرنا پڑا۔ ہندوؤں کی تمام دکانیں لوٹ لی گئیں۔

29 ستمبر کو ایک قافلہ جو ایک بڑی تعداد میں ہندوؤں کو کیمبل پور سے واہ کیمپ لے جارہا تھا

اس پر کیمبل پور سے تقریباً دو میل دور مسلمانوں نے حملہ کیا۔ ملٹری کے وہ لوگ جو اس قافلے کی حفاظت کے لیے ساتھ تھے انہوں نے لوگوں کو بچانے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ کچھ یورپین افسروں نے حملہ آوروں پر گولیاں چلائیں مگر مسلمان سپاہی اپنی ذمہ داری سے بے نیاز رہے۔ اس حملے میں کم از کم دو سو لوگ مارے گئے۔ اس کے علاوہ پناہ گزینوں کے جو قافلے پنڈی گھیب، فتح جنگ اور پنڈ سلطانی سے سڑک کے راستے واہ کیمپ جارہے تھے ان پر بھی کئی جگہ حملے ہوئے لیکن مرنے والوں کی تعداد کا کسی کو کوئی علم نہیں۔

یہ تمام وہی علاقے تھے جن کے ساتھ راقم الحروف کا کسی نہ کسی حوالے سے واسطہ رہا تھا۔ کسی جگہ وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ کہیں اس کے ماموں اور چچا رہتے تھے اور کہیں اس کی شادی شدہ بہنیں قیام پذیر تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں ہوئے قتل و غارت اور خون خرابے کا درد آج بھی دل سے نہیں جاتا۔

ایسٹ پنجاب میں جو ہندوستان کے حصے میں آیا مندرجہ بالا علاقے سے بھی زیادہ بے دردی سے مسلمانوں کو لوٹا اور مارا گیا اور نوجوان عورتوں کی عصمت دری بھی کی گئی۔ چاہے وہ ہندو تھے یا مسلمان سرحد کے دونوں طرف انہیں تقسیم کا خمیازہ اپنی جانیں دے کر چکانا پڑا۔

ملک کی تقسیم سے کتنا جانی نقصان ہوا اس کا اندازہ اس وقت کے ایک جسٹس کھوسلہ نے تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد لگایا تھا جس کے مطابق کم سے کم پانچ لاکھ لوگ مارے گئے۔ جو لوگ مغربی پاکستان کو ہندوستان سے ہجرت کر گئے تھے ان کی تعداد کوئی 75 لاکھ بتائی گئی ہے۔ اتنی ہی تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو مغربی پاکستان سے بھاگ کر ہندوستان آگئے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی چار لاکھ لوگ سندھ چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے۔ ان حالات میں یہ ایک قدرتی سوال اٹھتا ہے کہ کیا یہ بھیانک واردات ٹالی جاسکتی تھی؟ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اس خطرے کا پہلے سے ہی احساس تھا۔ اس لیے اس نے بارڈر فورس کے کوئی 50 ہزار فوجی ان لوگوں کی حفاظت کے لیے بٹھا دیئے تھے لیکن نہرو نے برطانوی فوجیوں کی شرکت کو نامنظور کردیا تھا۔ اس لیے جب فسادات عمل میں آئے تو دونوں طرف کے ملکوں کے فوجی افراد نے اپنے اپنے لوگوں کی ہی طرفداری کی۔ اور جب پناہ گزینوں کے لمبے قافلے ہندوستان اور پاکستان دونوں طرف جاتے دکھائی دیئے تو غم و غصے کا جذبہ لوگوں میں اور

بھی تیز ہو گیا اور جس مرحلے کو گورنر جنرل ٹالنا چاہتے تھے وہی ایک خونی انقلاب بن کر سامنے آ گیا۔ جب فسادات تھم گئے تو ریفیوجیوں کو بحال کرنے کا مسئلہ پیدا ہوا جو اور بھی پیچیدہ تھا۔

تقسیم سے پیدا شدہ حالات کا ذکر محض اس لیے کیا گیا ہے کہ ایسے مضر حالات میں بھی سجاد ظہیر نے کمیونسٹ پارٹی کے فیصلے پر پاکستان جانا منظور کر لیا تھا۔ اس لحاظ سے ان کی ہمت اور پارٹی کے تئیں جواب دہی کی داد دینی ہوگی۔

بٹوارے کا سجاد ظہیر کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے ادیبوں پر بھی کافی اثر پڑا۔ فیض، حمید اختر، سبط حسن، عبداللہ ملک وغیرہ نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ ان کے برعکس خود سجاد ظہیر، جوش، ساحر، سردار جعفری اور مجاز ہندوستان میں ہی رہ گئے۔ حمید اختر جن حالات میں لاہور پہنچے اس کا ذکر انہوں نے 'آشنائیاں کیا کیا' میں کچھ اس طرح سے کیا ہے:

> "19 اگست کو میں صرف پندرہ روز کے لیے بمبئی چھوڑنے اور لدھیانہ جانے کے لیے تیار ہوا۔ ابن انشا مرحوم اس زمانے میں دہلی میں تھا۔ میں دہلی میں اترا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک روز قبل انبالہ چلا گیا۔ دہلی ان دنوں خوفناک فسادات کی لپیٹ میں تھا۔ پنجاب بھی جل رہا تھا مگر مجھے حالات کا صحیح اندازہ نہیں تھا اس لیے اسی رات دہلی سے انبالہ پہنچا جہاں سے انشا نے مجھے کھڑے کھڑے لدھیانہ بھیج دیا اس لیے کہ اس کے خیال میں میرا انبالہ تک پہنچنا ہی ایک معجزہ تھا۔ لوگ مارے جا رہے تھے۔ گاڑیاں کٹ رہی تھیں مگر ایک تو مجھے صورتِ حال کا علم نہیں تھا، دوسرے کچھ جوشِ جوانی اور انسانی اقدار پر غیر متزلزل اعتماد کی وجہ سے میں بڑے آرام سے لدھیانہ پہنچ گیا جہاں جا کر یہ پتہ چلا کہ میرے تینوں بڑے بھائی جو سرکاری ملازمت میں تھے پاکستان چلے گئے اور بہنیں بھاوجیں اور بچے گاؤں میں ہیں جو لدھیانہ سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں جانے اور پھر وہاں سے اجڑنے کی طویل اور المناک داستان پر آئندہ تفصیل سے لکھوں گا۔ مختصر یہ کہ گاؤں (تہاڑ) سے نکلنے اور دریائے ستلج عبور کر کے نکودر کیمپ میں پناہ لینے کے بعد مجھے تقریباً تین ماہ موت وحیات کی

کشمکش میں گزارنا پڑے اور میں نومبر 1947 کے آخر میں لاہور پہنچا۔ اس
وقت تک میری ذہنی اور جسمانی حالت ایسی ہو چکی تھی کہ میں کچھ کرنے یا
سوچنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ آزادی کی صبح ایسی خوں چکاں داستانوں کے جلو
میں طلوع ہوئی تھی کہ پنجاب خون کے دریا میں ڈوبا ہوا تھا۔ لاکھوں افراد اپنے
گھروں سے محروم ہو چکے تھے اور خلق خدا خوار و زبوں دھکے کھا رہی تھی۔" (۶)

پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کی شیرازہ بندی کے لیے صرف سجاد ظہیر کا ہی انتخاب کیوں کیا گیا اس کے متعلق ہم سید مظہر جمیل کے خیالات سے واقفیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کچھ لوگوں نے اس ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جناب شہزاد انجم نے ایک مقالہ 'سجاد ظہیر کے افکار کی عصری معنویت' کے نام سے لکھا ہے جو انہوں نے اس دو روزہ سیمینار میں پڑھا تھا جو ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 17 اور 18 دسمبر 2005 کو دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ یہ ایک بین الاقوامی سیمینار تھا جس میں ہندوستان کے علاوہ دیگر کئی ممالک کے ادیبوں نے بھی شرکت کی تھی۔ اس مقالے میں شہزاد انجم نے سجاد ظہیر کے انتخاب کی کئی ایک وجوہات بتائی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرعہ فال سجاد ظہیر کے حق میں پڑنے کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ان کی شخصیت بے حد دل نواز تھی۔ ان کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک بے نیازانہ مسکراہٹ رقص کرتی رہتی تھی اور مزاج میں محبت و مروت کی سرشاری تھی۔ انہوں نے ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی بنیاد رکھی اور جس ثابت قدمی سے اس کی پیروی کی کوئی دوسرا اس جیسا پیدا ہی نہیں ہوا جو ایسی بے لاگ پختگی سے اسے سر تکمیل تک لے جا سکتا۔

انجم صاحب کے مطابق اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں غریبی، مفلسی، رجعت پرستی ،فرقہ واریت اور ذات پات جیسے مسائل بہت بری طرح معاشرے کے درپیش تھے۔ ایسے مسائل آج بھی موجود ہیں بلکہ آزادی کے بعد چند ایک معاملات میں تنزلی ہی ہوئی ہے۔ انہی مسائل کے خلاف تو ترقی پسند تحریک کے ادیب اپنی قلم اٹھانے پر مجبور ہوئے تھے۔ اس مہم کی کامیابی کا سہرا صرف سجاد ظہیر کے سر ہی جاتا تھا اور پارٹی کو پوری امید تھی کہ اپنی تنظیمی صلاحیتوں کے باعث وہ پاکستان میں بھی کامیاب رہیں گے۔

تیسری وجہ جو وہ بتاتے ہیں وہ یہ ہے کہ سیاسی نظریات کے معاملے میں سجاد ظہیر بڑے پختہ

مزاج تھے اور یہ بھی کہ وہ ادب میں سیکولرزم پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ کسانوں، مزدوروں، غریب غربا اور پچھڑے ہوئے انسانوں کو سرمایہ پرستی اور جاگیردارانہ نظام سے آزاد کرانے کی کوشش میں پوری ایمانداری سے جٹے ہوئے تھے۔ چونکہ ہندوستان اور پاکستان کے تمام حالات نسلی اور گروہی طور پر ایک جیسے تھے اس لیے پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کے قیام کے لیے صرف سجاد ظہیر جیسے انسان کی ہی ضرورت تھی۔ سبط حسن صاحب کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''اس میں کوئی کلام نہیں کہ تنظیمی ناتجربہ کاریوں اور روپوشی کی صعوبتوں کے باوصف بنے بھائی جنرل سیکریٹری کے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے پورے کیے۔ سکھ اور ہندو کامریڈ ہندوستان جا چکے تھے۔ بنے بھائی نے یہاں کے بچے کھچے ساتھیوں کی مدد سے یہ تار پھر سے جوڑے، نئے کارکنوں کی تربیت کی اور تین سال کی مختصر مدت میں کمیونسٹ پارٹی کو ایک فعال اور بااثر سیاسی جماعت بنا دیا۔ اب پارٹی دفتر لاہور، گجرنوالہ، لائل پور، راولپنڈی، پشاور، کراچی، سکھر، حیدرآباد، ملتان اور رحیم یار خان میں باقاعدگی سے کام کر رہے تھے۔ پارٹی کارکن مزدوروں کی یونینوں، کسان کمیٹیوں، طالب علموں اور ادیبوں کی تنظیموں میں بڑھ چڑھ کر کام کر رہے تھے۔ بڑی بات یہ کہ پوری پارٹی میں فکر و عمل کی وحدت پائی جاتی تھی۔ نہ گروہ بندیاں تھیں نہ رقابتیں۔'' (۷)

جن حالات میں بنے بھائی نے پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی باگ ڈور سنبھالی وہ بہت سخت گیر دور تھا۔ ان دنوں کمیونسٹ پارٹی کے اکثر و بیشتر لیڈر ہندو یا سکھ تھے۔ ان میں کئی لوگ تو ایسے تھے جن کا تعلق غدر پارٹی سے بھی تھا اور اس وجہ سے کئی کئی سال جیل میں بھی گزارے تھے۔ لیکن جب ملک تقسیم ہوا تو ان سب لوگوں کو بھی ہندوستان کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ نتیجے کے طور پر پارٹی بکھر گئی۔ سبط حسن کہتے ہیں کہ سجاد ظہیر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تین سال کی مختصر مدت میں کمیونسٹ پارٹی کے نہ صرف بکھرے ہوئے تاروں کو از سر نو جوڑا بلکہ نئے کارکنوں کی سیاسی تربیت کر کے اس نوزائیدہ پارٹی کو ایک نہایت باعمل اور منظم جماعت میں تبدیل کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ سجاد ظہیر کو پاکستان کے حالات سے کوئی زیادہ واقفیت نہیں تھی اور روپوش رہنے کی وجہ سے ان

کا عام آدمیوں سے میل جول بھی نہیں تھا۔ لیکن ان کی شخصیت میں جو بلا کی کشش تھی اس کی وجہ سے پارٹی کا ہر کارکن ان پر پورا بھروسا کرتا تھا اور ذاتی طور پر سجاد ظہیر کی وجہ سے ہی پارٹی سے اپنائیت محسوس کرتا تھا۔ ہر شخص کو ان کے کام کرنے کے طریقے پر مکمل بھروسا تھا۔ سبط حسن کہتے ہیں کہ یہی وہ اوصاف تھے جن کی وجہ سے وہ پارٹی کے اندر فکر و عمل کی وحدت کو فروغ دینے میں کامیاب ہوئے۔

اگرچہ سجاد ظہیر نے کمیونسٹ پارٹی کو پاکستان میں ایک فعال اور رسوخ والی پارٹی بنا کر کھڑا کر دیا تھا لیکن حقیقت تو یہ بھی ہے کہ پارٹی کو اس حد تک مضبوط بنانے کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت تھی وہ بنے بھائی میں نہیں تھیں۔ پاکستان کے قیام سے وہاں کے زیادہ تر کمیونسٹ لیڈر ہندوستان چلے گئے جس کی وجہ سے پارٹی میں خلا پیدا ہو گیا تھا۔ اس خلا کو پورا کرنے کے لیے کسی ایسے تجربہ کار شخص کی ضرورت تھی جو پاکستان کے معاشی اور سماجی حالات کا علم رکھتا ہو، جو وہاں کی سرزمین سے واقف ہو اور اس میں اس کی جڑیں بھی پیوست ہوں۔ لیکن بنے بھائی میں یہ خوبیاں نہیں تھیں۔ ان کی تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی وہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ ایک سست مزاج شخص تھے جنہوں نے کبھی جسمانی محنت نہیں کی تھی اور نہ انقلابیوں جیسی دوڑ دھوپ کرنے کے اہل تھے۔ اس پر وہاں کا تمام انتظام انہیں روپوش رہ کر کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن داد دینی اس شخص کی مستقل مزاجی کی کہ ان تمام خامیوں کے باوجود اس نے اپنے مشن کو کامیاب کر کے دکھا دیا۔

کتابیات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر/پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱	The Partition Omnibus (Divide and Quit)	Pandrel Moon	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ نئی دہلی	1989	20
۲	My Country My Life	ایل۔ کے۔ اڈوانی	روپا اینڈ کمپنی۔ نئی دہلی	2005	56
۳	Jinnah	جسونت سنگھ	روپا اینڈ کمپنی۔ نئی دہلی	2009	458
۴	Jinnah	جسونت سنگھ	روپا اینڈ کمپنی۔ نئی دہلی	2009	460
۵	Jinnah	جسونت سنگھ	روپا اینڈ کمپنی۔ نئی دہلی	2009	464
۶	آشنائیاں کیا کیا	حمید اختر	بک ہوم۔ لاہور	2008	15
۷	مغنیٔ آتش نفس سجاد ظہیر	سبط حسن	مکتبہ دانیال۔ کراچی	2005	44

☆☆☆☆

۲۔ روانگیِ لاہور اور روپوشی

جب بنّے بھائی اپریل 1948 میں لاہور پہنچے تو ان کی روانگی لاہور کے متعلق کئی لوگوں نے خیالات آرائی کی ہے۔ ملک راج آنند جو ترقی پسند تحریک کے ابتدائی زمانے سے ہی بنّے بھائی کے ساتھ رہے تھے اور صرف دوسری جنگ عظیم کے دوران ان سے جدا ہوئے تھے، کہتے ہیں ہم لوگوں نے انہیں سانتا کروز کے چھوٹے سے ہوائی اڈے سے پاکستان کے لیے الوداع کہا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ پاکستان میں روپوشی کی حالت میں کام کریں گے اور اس خفیہ کام کو کراچی میں رہ کر عمل میں لائیں گے کیوں کہ کراچی کا شہران کے مزاج کے لیے موزوں تھا۔

رمیش تھاپر اپنے وقت کے مانے ہوئے کمیونسٹ تھے اور کراس روڈز کے نام سے ایک رسالہ شائع کرتے تھے جو کمیونسٹ پارٹی کی ترجمانی کرتا تھا۔ انہی دنوں آر۔ کے۔ کرنجیا بھی اپنا ہفتہ وار بلٹز (Blitz) نکالتے تھے جو کراس روڈز (Crossroads) کی ہی طرح نڈر اور کامیاب رسالہ تھا۔ رمیش نے 1945 میں راج سے شادی کی جو شادی سے پہلے ملہوترہ کہلاتی تھیں۔ شادی کے بعد وہ راج تھاپر کہلانے لگیں۔ رمیش کی موت کے بعد راج نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام ہے All These Years جس میں رمیش کے ساتھ گزری ہوئی زندگی کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ دراصل 1959 میں راج کمیونسٹ پارٹی سے دل برداشتہ ہوکر علیحدہ ہوگئے تھے اور Crossroads کو چھوڑ کر اپنا ایک نیا ہفتہ وار 'سیمینار' شائع کرنا شروع کردیا تھا۔ راج تھاپر نے اپنی مندرجہ بالا کتاب میں بنّے بھائی کی لاہور روانگی کا بھی ذکر کیا ہے۔ کتاب انگریزی میں ہے لیکن

اس کا اردو میں ترجمہ راقم السطور نے خود کیا ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"وہ بھاری بھرکم، اونچے لمبے اور شریف ڈیل ڈول کے انسان تھے جن کے متعلق یہ افواہ بھی تھی کہ وہ جب سوچنے میں مشغول ہوتے تھے تو اکثر کمیونسٹ پارٹی کے دفتر کی بجائے کسی اور کے دفتر میں جا گھستے تھے۔ لیکن یہ صرف مضحکہ خیز بات تھی کیونکہ بنے بھائی بہت پڑھے لکھے تھے اور اپنی تہذیب اور روایت سے بخوبی آشنا تھے۔ پھر بھی پارٹی میں لوگوں کو یہ احساس ہمیشہ ہی رہتا تھا کہ بنے بھائی مستقل مزاج نہیں تھے اور کئی بار مقصد سے بھٹک جاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود کمیونسٹ پارٹی نے اپنی غیر معمولی سوجھ بوجھ سے انہیں ہی منتخب کیا کہ وہ پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی رہنمائی کریں اور اس کی تنظیم کریں۔

شروع شروع میں پارٹی کے اس فیصلے سے ہمیں تشویش ہوئی۔ بنے بھائی روپوشی کی صعوبتوں کو کیسے برداشت کریں گے۔ یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ بنے بھائی جیسا کشادہ دل، بادہ نوش، جسم، اور ذہن سے بھاری بھرکم انسان کیسے پولیس سے چھپتا چھپاتا شہر در شہر گردش کرے گا اور سب کی نظروں سے بچ کر پارٹی کی کلیدی عملوں کے لیڈر کے طور پر رہنمائی کرے گا۔ تاہم پارٹی بہتر جانتی ہے اور اس نے یہ فیصلہ پوری طرح سوچ سمجھ کر ہی لیا ہوگا۔

بنے بھائی کے سپرد سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ وہ انڈین پارٹی سے ایک دستاویز لے کر جائیں جس سے پاکستان پارٹی کے ارکان کو بنے بھائی کے جنرل سیکریٹری ہونے کا یقین ہو جائے۔ یہ دستاویز انہیں کسٹم سے گزرنے کے بعد ہی دیا جائے گا۔ یہ طے ہوا کہ جیسے ہی بنے بھائی کسٹم کے پار پہنچیں گے وہ اور رمیش تھاپر کو کسی گفتگو میں مصروف ہوتے دکھائی دیں گے۔ پھر بنے بھائی رمیش تھاپر سے وہ اخبار طلب کریں گے جو رمیش کے ہاتھ میں ہوگی۔ رمیش وہ اخبار انہیں دے گا اور اس اخبار کے اندر وہ دستاویز بڑی صفائی سے رکھ دے گا۔

آخر وہ دن آ پہنچا۔ بنے بھائی ایک فوجی افسر کا لباس زیب تن کیے

ہوئے تھے۔ معنی، ہیئت وغیرہ۔ ان کے تمام دستاویز فرضی نام سے تھے۔ ان کی جاگیردارانہ طرز، زبان پر تسلط، ان کی سست رفتاری وغیرہ کا انہیں یہ فائدہ ہوا کہ بنا کسی شک وشبہ کے وہ کسٹم چیک سے بڑی خوبصورتی سے گزر گئے۔ اس دوران رمیش کسٹم چیک کی دوسری طرف ہاتھ میں اخبار لیے لوگوں کو آتا جاتا دیکھ رہے تھے لیکن بنے بھائی کا کوئی پتہ نہ تھا۔ وہ بنے بھائی کو زیادہ تلاش کرنے کی کوشش بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کہیں کسی کو شک نہ ہو جائے۔ لیکن ان کی تشویش بڑھنے لگی جب وقت گزرنے لگا۔ آخر اس گھبراہٹ نے انہیں گھیر لیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بنے بھائی کا راز فاش ہو گیا ہو اور انہیں پولس چپکے سے جیل لے گئی ہو۔ رمیش کے ذہن میں یہ بھی خیال آنے لگا کہ ان حالات میں رمیش کو بھی خاموشی سے غائب ہو جانا تاکہ راز کھلنے پر وہ پکڑا نہ جائے۔

جس وقت رمیش کا دماغ اس بات میں الجھا ہوا تھا کہ اگلا قدم کیا ہونا کہ اچانک اس کی نظر بنے بھائی پر پڑی جو اس وقت ہوائی جہاز کی پٹری پر منہ میں سگریٹ دبائے ہوئے بے نیازانہ شان سے چلے آرہے تھے۔ انہیں رمیش کو دیکھ کر حیرت ہوئی اور انہوں نے ہلکے سے اس طرف ہاتھ لہرایا۔ وہ بھول گئے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ ان کے چہرے سے معصومیت بالکل نمایاں تھی۔ رمیش نے پریشانی کی حالت میں جلدی سے اخبار بنے بھائی کی طرف اچھالا جس سے ان کے ہوش برقرار ہوئے۔ انہوں نے اخبار کو اس طرح سنبھالا جیسے کہہ رہے ہوں کہ وہ پورے ہوش وحواس میں ہیں۔ بعد میں رمیش سوچنے لگا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ بنے بھائی نے روپوشی کا رول اتنی خوبی سے نبھایا کہ انہیں یاد ہی نہیں رہا کہ حقیقت اور تصنع الگ الگ ہیں۔"(۱)

راج تھاپر نے جو تصویر بنے بھائی کی مرتب کی ہے وہ ان کے حق میں سراسر ناانصافی ہے۔ بنے بھائی کے ساتھیوں میں حمید اختر، سبط حسن، فیض احمد فیض، عبدالرؤف ملک وغیرہ سب نے بنے بھائی کی تنظیمی صلاحیتوں کی بھرپور تعریف کی ہے۔ 1948 سے 1951 یعنی لاہور میں آمد سے لے کر ان

کی گرفتاری تک کے تین سالوں میں انہوں نے جگہ جگہ پارٹی کے سینٹر قائم کیے اور اسے ایک فعال پارٹی بنادیا۔ سرحد سے سندھ تک صوبائی کمیٹیاں قائم ہوگئی تھیں جو مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں کو یکجا کرکے ان کے حق میں مظاہرے کررہی تھیں۔ اس پس منظر میں راج تھاپر کا بیان حقیقت سے بری نظر آتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے یہ ذاتی تفرقات کی بنا پر لکھا ہو۔

حمید اختر اپنی کتاب 'آشنائیاں کیا کیا' میں لکھتے ہیں کہ 1948 کے اوائل سے لے کر جب وہ پاکستان آئے اور 1951 میں ان کی گرفتاری کے وقت تک کا زمانہ کمیونسٹ پارٹی اور اس کے زیر اثر کام کرنے والی تمام تنظیموں کا انتہائی فعال زمانہ تھا۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ انہی کی صلاحیتوں کا اعجاز تھا کہ تمام تر سیاسی جبر اور مشکلات کے باوجود پاکستان کے محنت کش خیبر سے کراچی تک کمیونسٹ پارٹی کے پرچم تلے جمع تھے۔ سبط حسن اور سید مظہر جمیل نے بھی اس سے ملتے جلتے ہی بیان دیئے ہیں۔ لہٰذا راج تھاپر کی کتاب کی سچائی کوئی بھروسا مند نہیں دکھائی دیتی۔ لاہور میں بنے بھائی کی ورادت کا ذکر عبدالرؤف ملک نے اپنی ذاتی تجربے کی بنا پر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''یہ مارچ 1948 کے آخر کا ذکر ہے کہ ایک دن مجھے کامریڈ فیروزالدین منصور کا پیغام ملا کہ 114 میکلیو روڈ پارٹی کے دفتر پہنچوں۔ چنانچہ وہاں گیا تو کامریڈ ایرک سپرائمین اور کامریڈ منصور نے کہا کہ یہ تو تمہیں پتہ ہی ہے کہ پارٹی کی کلکتہ کانفرنس نے سجاد ظہیر کو پاکستان کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سکریٹری مقرر کیا ہے اور وہ پاکستان پہنچ چکے ہیں اور اب لاہور آرہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ حکومت نے سجاد ظہیر کے گرفتاری کے وارنٹ جاری کردیئے ہیں اس لیے کھلے عام لاہور نہیں آسکتے بلکہ روپوش ہوکر آرہے ہیں۔ وہ کل کراچی سے گاڑی میں آئیں گے۔ تم انہیں اور وہ تمہیں پہنچاتے اور جانتے ہیں اس لیے بطور پارٹی ممبر یہ کام تمہیں تفویض کیا جاتا ہے کہ تم انہیں منٹگمری (ساہیوال) اسٹیشن پر Receive کرو اور لاہور لاؤ۔
>
> اس کے بعد منٹگمری (ساہیوال) جانے اور کامریڈ سجاد ظہیر کو وہاں سے لے کر چتو کی ایک پارٹی ہمدرد کے ہاں جانے کا پروگرام طے ہوا۔ دونوں سینئر

کامریڈ نے بتایا کہ سجاد ظہیر کا فرضی نام مسعود ہے اور اس نام سے فرسٹ کلاس کے ڈبہ میں ان کی سیٹ بک ہے۔ ڈبہ کے باہر ان کے اس نام کی سلپ و دیگر فرسٹ کلاس پیسنجرز کے ناموں کے ساتھ لگی ہوئی ہوگی۔ ہدایت کی گئی کہ میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر سجاد ظہیر کے ساتھ بیٹھ جاؤں۔

مذکورہ ہدایت کے مطابق میں منٹگمری پہنچا اور فرسٹ کلاس کے اس ڈبہ میں جا بیٹھا جس میں بنّے بھائی بیٹھے تھے۔ باوجود اس کے کہ انہوں نے مونچھیں بڑھا رکھیں تھیں حالانکہ وہ بالکل کلین شیو ہوا کرتے تھے، مجھے انہیں پہنچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ مجھے تو خیر انہوں نے پہنچان ہی لینا تھا کیونکہ میرے حلیے میں کوئی تبدیلی نہ تھی۔ انہوں نے تپاک سے ہاتھ ملایا اور ساتھ بٹھالیا۔ ہم دونوں کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد پارٹی، اس کے کام، پارٹی ممبروں کے حالات و کوائف اور دیگر متعلقہ موضوعات مثلاً پی پی ایچ (پیپلز پبلشنگ ہاؤس) کیسے چل رہے ہیں۔ پارٹی کا اخبار 'سازِ نو' کتنا چھپتا ہے، کون کون اس کے لیے لکھتے ہیں، اسٹوڈنٹس فرنٹ پر کام کی کیا نوعیت ہے، مرزا ابراہیم کی ریلوے ورکرز یونین اور دوسری ٹریڈ یونین کیسے چل رہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے ہم پتوکی پہنچ گئے۔ وہاں ہم نے شفاعت کے ہاں رکنا تھا۔ یہ شفاعت صاحب ڈاکٹر اشرف (مرحوم) کے عزیز اور پارٹی کے ہمدرد تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ سجاد ظہیر اور میں وہاں ایک دو دن رک کر لاہور آئیں گے۔ لیکن وہاں پتوکی میں میری طبیعت اچانک خراب ہوگئی اور میں شدید بخار میں سجاد ظہیر کو وہاں ہی چھوڑ کر واپس آ گیا۔ وہ پروگرام کے مطابق شفاعت صاحب کے توسط سے لاہور پہنچ گئے۔" (۲)

سجاد ظہیر نے پاکستان آ کر لاہور کو ہی پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی صوبائی جماعت کا ہیڈ کوارٹر بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے کئی فائدے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہاں بہت سے تجربہ کار اور سلجھے ہوئے لیڈر موجود تھے جیسے کہ فیروز الدین منصور، مرزا ابراہیم، ایرک سپرائن، امیر حیدر اور محمد افضل وغیرہ۔

دوسرے یہ کہ وہاں میاں افتخار الدین جو پاکستان ٹائمز کے مالک تھے اور فیض احمد فیض جو اس اخبار کے ایڈیٹر تھے، دونوں سجاد ظہیر کے خاص دوست تھے۔ ویسے بھی لاہور نہ صرف تعلیم کا مرکز تھا بلکہ وہاں ٹریڈ یونین کی سرگرمیاں بھی زوروں پر تھیں اور وہاں سے کافی تعداد میں پرچہ جات بھی شائع ہوتے تھے۔ اس کے برعکس کراچی میں پارٹی کے ہندو ارکان کی ہجرت سے اس کے کلیدی عملہ میں بہت کمی پیدا ہوگئی تھی جس کی بھرپائی ناممکن تھی۔

پاکستان میں ابتدا سے ہی پارٹی کے لیڈروں میں ذاتی خلفشار پیدا ہوگئی تھی۔ ایرک سپرائن اور مرزا ابراہیم شروع سے ہی سجاد ظہیر کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ سپرائن جب کانگریس کی میٹنگ میں شرکت کر کے لوٹے تو انہوں نے بتایا کہ پارٹی کا خیال ہے کہ پارٹی کو مضبوط کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سست رفتاری سے کام کیا جائے۔ لیکن سجاد ظہیر جارحانہ یعنی جنگجو عمل کے حق میں تھے۔ اسی پالیسی میں محمد حسین عطا سجاد ظہیر کو مکمل تعاون دے رہے تھے اور ان کے خاص صلاح کار تھے۔ جب سجاد ظہیر لاہور میں پیر جمانے میں مصروف تھے تو ایرک سپرائن نے انہیں عطا کے غیر امدادی رویے کی شکایت کرتے ہوئے لکھا کہ عطا مسئلہ بن گیا ہے اور مغربی پنجاب میں اس نے طرح طرح کی مشکلیں پیدا کردی ہیں۔ عطا نے بھی سجاد ظہیر کو سپرائن اور مرزا ابراہیم سے اپنے اختلافات کے بارے میں لکھا اور ذاتی طور پر انہیں بتایا کہ پارٹی کے اعلیٰ ممبر انہیں (سجاد ظہیر کو) کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ عطا نے کہا کہ پارٹی کے سینئر ممبران کے سخت خلاف ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ انہیں درمہینہ 150 روپے پارٹی فنڈ سے نکالنے کا کوئی حق نہیں۔ لیڈروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ آپ نے سوائے ایک پرچے کے اب تک کچھ بھی نہیں لکھا اور آپ نے پارٹی کا جو پروگرام طے کیا ہے وہ بالکل تسلی بخش نہیں ہے۔ عطا نے انہیں بتایا کہ پارٹی کے دیگر لوگ جن سے وہ ملے ہیں وہ بھی اس بیان سے متفق ہیں اور کہتے ہیں کہ سجاد ظہیر اپنے لفظ پر کاربند نہیں رہتے اور سست مزاج بھی ہیں۔ یہ تھی پارٹی کے سرکردہ ورکروں کی سجاد ظہیر کی شخصیت کی تشخیص جس سے عطا خود بھی اتفاق رکھتے تھے۔ ایسے حالات کے زیر اثر سجاد ظہیر کے لیے پارٹی کی نئے سرے سے تشکیل کرنا آسانی کا کام نہیں تھا۔

سجاد ظہیر کی شروع سے یہی کوشش رہی تھی کہ پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے تحفظ اور تشکیل کے لیے ہندوستان سے تجربہ کار اور مخصوص قسم کے کارندے لائے جائیں۔ لہٰذا جو لوگ ہندوستان سے

اس مقصد کے لیے لائے گئے ان میں سبط حسن، مرزا اشفاق بیگ، حسن ناصر اور حسن عابدی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سبط حسن اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے اور ایڈون کرسچن کالج الہ آباد و علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے تھے۔ 1941 میں پارٹی کے کل وقتی کارکن بن گئے تھے۔ 1947 میں پارٹی کے حکم سے کراچی سے لاہور پہنچے اور آتے ہی سجاد ظہیر سے رابطہ قائم کیا۔ ان دنوں سجاد ظہیر فضل الرحمن کے ہاں رہائش پذیر تھے۔ سبط حسن بھی ان کے ساتھ ہی رہنے لگے۔ فضل الرحمن نے پارٹی کے اخبار 'نیا زمانہ' کی ادارت کے کام کے لیے سجاد ظہیر کا ہی انتخاب کیا۔

مرزا اشفاق بھوپال سے تھے اور انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔اے اور ایل۔ایل۔بی کی اسناد حاصل کی تھیں۔ وہ بھی پارٹی کے کل وقتی ورکر تھے اور ستمبر 1948 میں ہجرت کر کے بمبئی سے لاہور پہنچے تھے۔ سجاد ظہیر نے انہیں پارٹی کے خزانچی کا محکمہ سونپ دیا تھا۔ حسن ناصر حیدر آباد دکن سے اور ڈسٹرکٹ آرگنائزنگ کمیٹی کراچی کے ممبر تھے۔ حسن عابدی بھی یو پی سے ہی تھے اور 1948 میں کراچی میں تھے۔ انہیں لاہور آنے کا حکم دیا گیا جہاں وہ سجاد ظہیر کے پیغام رساں اور ذاتی اسسٹنٹ کے کام پر معمور کیے گئے۔

یہ تمام لوگ فرضی ناموں اور فرضی دستاویز کی بنا پر ہندوستان سے پاکستان وارد ہوئے اور روپوش رہ کر کام کرنے لگے تھے۔ انہیں اپنی شناخت خفیہ رکھنی پڑتی تھی اور مقام اور پتہ بار بار تبدیل کرنا پڑتا تھا۔ مقامی کمیونسٹ کارندے اگرچہ نظر بند نہیں تھے لیکن ان پر پولیس کی کڑی نگرانی تھی اور حکومت کو جب بھی کوئی بہانہ ملتا تھا ان سب کو جیل میں سیفٹی ایکٹ کے تحت قید کر لیتی تھی۔ پارٹی کے بڑے لیڈروں نے اپنے اپنے خفیہ اور اشاریہ نام رکھ لیے تھے۔ اس وقت حالات یہ تھے کہ پارٹی کے ارکان کو ایک دوسرے کے متعلق زیادہ جان کاری نہیں ہوتی تھی۔ پارٹی کا اپنا کوئی دفتر نہیں تھا مگر 144 میکلوئڈ روڈ کی کوہستان عمارت سے پارٹی کی کئی شاخیں اپنا اپنا کام بخوبی کر رہی تھیں۔

جناب حسن ظہیر نے راولپنڈی سازش کیس کے بارے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے The Rawalpindi Conspiracy.1951۔ یہ کتاب انگریزی میں ہے اور اس میں حسن ظہیر صاحب نے راولپنڈی سازش کا بڑا طویل تذکرہ کیا ہے۔ یہ کتاب 1948 میں Oxford University Press نے شائع کی تھی۔ انہوں نے ایرک سپرائن کا 3 نومبر

1995 میں اسلام آباد میں انٹرویو لیا تھا جس میں سبط حسن نے کہا تھا کہ وہ میاں افتخار الدین سے خوش نہیں ہے اور سجاد ظہیر کے نام اپنی ایک تحریر میں اس نے میاں صاحب کی کڑی نقطہ چینی کی تھی کہ وہ بے کار گفتگو میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے سبط حسن نے ان کو تنبیہ کی وہ میاں صاحب کے خلاف سخت رویہ اختیار کریں۔ اسی انٹرویو میں حسن ظہیر نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ جب پارٹی کے خفیہ دستاویزات حکومت نے ضبط کر لیے تو سبط حسن اس سے شدید دل شکن ہوئے اور انہوں نے اس کا ذمہ دار سجاد ظہیر ہی کو ٹھہرایا کیونکہ انہوں نے خود کو گرفتار ہونے دیا اس کے معنی یہ ہیں کہ لیڈر لوگ بنے بھائی کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے تھے۔

کراچی میں قیام کے دوران بنے بھائی اور حمید اختر کو ایک شام اس وقت کے مشہور افسانہ نگار سید انور کے ساتھ گزارنے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ صاحب پاکستان نیوی میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ چنانچہ ایک شام دونوں نیوی کے ہیڈ کوارٹر سید انور سے ملنے پہنچ گئے۔ انور کو بنے بھائی کی موجودگی سے سخت حیرت ہوئی۔ اگر چہ وہ ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں شرکت کرتے رہتے تھے لیکن سیاست کے لحاظ سے وہ غیر سیاسی انسان تھے۔ اس لیے ان دونوں کا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ اگر بنے بھائی کا راز کھل جاتا اور اگر وہ پکڑے جاتے تو سید صاحب کو نوکری سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ لیکن اس کے کردار کی بلندی دیکھئے کہ اس خطرے کی نزاکت کے باوجود وہ تمام وقت بنے بھائی کی آمد کی ممنونیت کا اظہار کرتا رہا۔

کراچی سے واپسی کا ذکر کرتے ہوئے حمید اختر لکھتے ہیں کہ اس سفر میں انہیں پھر یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ سجاد ظہیر لاہور اتریں یا کہیں اور۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ لاہور میں پولیس بہت چوکنا تھی اور وہاں پنجاب کی خفیہ پولس کا بھی پہرہ تھا۔ اس لیے یہ طے ہوا کہ دونوں ایک اسٹیشن جس کا نام رینالہ خورد تھا وہاں اتر جائیں۔ وہاں اترنے کی وجہ یہ تھی وہاں حمید اختر کے دونوں بھائی مقیم تھے۔ حمید اختر اور بنے بھائی دو روز تک ان کے ہی پاس رہے جہاں مذہبی، سیاسی اور تصوف کے مسائل پر طویل بحث ہوتی رہی۔ وہاں حمید اختر نے بنے بھائی کا تعارف پروفیسر مسعود کے نام سے کرایا تھا اور اس کے دونوں بھائی سجاد ظہیر کی شخصیت اور صاحب علم ہونے سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ لیکن آخر تک انہیں یہ نہ معلوم ہو سکا کہ پروفیسر مسعود اصل میں بنے بھائی ہی ہیں۔ رینالہ سے لاہور دونوں بذریعہ کار

روانہ ہوئے۔ راستے میں بنّے بھائی نے حمید اختر سے کہا ”حمید اختر جس قدر جلد ممکن ہو اپنے بھائیوں سے علیحدگی اختیار کرلو“ بنّے بھائی نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ حمید اختر کے دونوں بھائی اتنے اچھے، نیک اور محبت کرنے والے ہیں کہ ان کے ساتھ خاندانی رشتوں میں حمید اختر سیاسی کام نہیں کر پائیں گے۔

سید مظہر جمیل نے بھی بنّے بھائی کے دورہ پاکستان، بالخصوص ان کی روپوشی کا ایک ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس 1949 میں منعقد ہوئی جس کے فوراً بعد گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ان دنوں انجمن کے جنرل سیکریٹری احمد ندیم قاسمی تھے جو سب سے پہلے گرفتار ہوئے۔ پھر عبداللہ ملک جو آرگنائزنگ کمیٹی کے سیکریٹری تھے گرفتار ہوئے۔ راولپنڈی سے حسن ناصر، عارف جلالی، کراچی سے ابراہیم جلیس وغیرہ سیفٹی ایکٹ میں حکومت کے ہتھے چڑھے۔ یہ وہ حالات تھے جن میں سجاد ظہیر کمیونسٹ پارٹی کی از سر نو تنظیم کرنے میں مصروف تھے۔ اس زمانے میں روپوشی کی زندگی کس حد تک دشوار ہوتی ہوگی اس کا اندازہ صرف بنّے بھائی ہی لگا سکتے تھے۔

اب تک تو بنّے بھائی روپوش تھے لیکن راولپنڈی سازش کیس کے ساتھ ہی ملک بھر میں آزاد خیال اور روشن فکر لوگوں کی گرفتاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ سب سے پہلے کئی فوجی افسران کے ساتھ فیض احمد فیض گرفتار ہوئے۔ لیکن پولیس دیگر لوگوں کی تلاش میں بھی سرگرداں تھی۔ عابدی کہتے ہیں کہ اپنی گرفتاری کے آٹھ دن تک وہ پولیس کو اپنی اُلٹی سیدھی باتوں سے الجھاتے رہے اور خاموشی سے مار کھاتے رہے۔ آخر یہ سوچ کر کہ اشفاق بیگ نے بنّے بھائی کو وہاں سے نکال کر اب تک کسی محفوظ جگہ پہنچا دیا ہوگا اس لیے اب اس جگہ کی نشان دہی میں کوئی حرج نہیں، بول پڑا۔ لیکن یہ بولنا بہت مہنگا پڑا۔ بنّے بھائی پکڑے جا چکے تھے، ان کی گرفتاری عابدی کے لیے ایک ایسا کرب ناک سانحہ تھا جس نے ان کی روح کو بری طرح پامال اور زخموں سے چور کر دیا تھا۔ بنّے بھائی عابدی کے اس بولنے پر کئی سال بلوچستان کی مچھ جیل میں قید رہے۔

ظاہر ہے کہ جو ان کے خاص کوریئر اور مددگار تھے، ان کی گرفتاری کے بعد بنّے بھائی اپنے دوسرے ساتھیوں سے کٹ چکے تھے۔ صرف اشفاق بیگ ہی دوسرے شخص تھے جو بنّے بھائی سے رابطہ بنائے رکھے ہوئے تھے۔ لیکن انہیں بھی حالات کی نزاکت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ کسی

طرح بچتے بچاتے لاہور سے فرار ہو کر ماسکو جا پہنچے اور بنے بھائی بالکل تنہا رہ گئے۔ لہٰذا بنے بھائی کے پاس اب کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا سوائے اس کے کہ وہ خاموشی سے اپنی گرفتاری کا انتظار کرتے۔ اگر وہ اپنا موجودہ مقام چھوڑ دیتے تو کہاں جاتے۔ ایک تو خفیہ پولیس کا ہر سپاہی ہر گلی کوچے میں ان کو تلاش کر رہا تھا اور دوسرے بنے بھائی کو خود بھی اس نازک اور خطرناک وقت میں کسی بھی دوست کو آزمائش میں ڈالنا گوارا نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ حسن عابدی کے مندرجہ بالا بیان کی تصدیق حمید اختر نے بھی کی ہے۔ وہ راولپنڈی سازش کیس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انتخاب کی تاریخ سے ایک روز قبل جب ہم دن بھر خاک چھاننے کے بعد تھکے ہارے واپس اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچے تو لاہور کے اخبارات سے راولپنڈی سازش کیس میں گرفتاریوں کی خبر نظر آئی۔ فیض احمد فیض، جنرل اکبر خان، نسیم اکبر، میجر اسحاق، کیپٹن پوشنی اور کچھ دوسرے فوجی اور سیاسی رہنما گرفتار ہو چکے تھے۔ سازشیوں میں سجاد ظہیر کا نام بھی شامل تھا مگر وہ پنہاں ہونے کی وجہ سے گرفتار نہیں ہو سکے تھے۔

چند روز بعد ہی بنے بھائی بھی گرفتار ہو گئے۔ اس زمانے میں حسن عابدی کا براہِ راست ان ہی سے تعلق تھا اور ٹھکانہ بھی اس کے علم میں تھا۔ عابدی چار پانچ روز پہلے ہی گرفتار ہو چکا تھا۔ اس نے پورے پانچ روز پولیس کی مار کھائی، اسے ہر قسم کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا مگر وہ بنے بھائی کے ٹھکانے سے متعلق لاعلمی کا اظہار کرتا رہا۔ پانچ روز بعد اس نے یہ سوچ کر کہ اب وہ اس جگہ سے کہیں اور منتقل ہو گئے ہوں گے اس جگہ کی نشاندہی کر دی جہاں ان کا قیام تھا۔ حسن عابدی کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا کہ اس کی گرفتاری کی اطلاع کے پانچ چھ روز بعد بھی وہ وہاں سے کسی دوسری جگہ نہیں گئے۔ ایک طرح سے یہ رضا کارانہ گرفتاری تھی۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ وہ کسی دوسری جگہ اس لیے منتقل نہیں ہوئے کہ اس صورت میں بہت سے لوگ پولیس کے تشدد کا نشانہ بنتے۔" (۳)

2005 میں ساہتیہ اکادمی کے تحت جو سیمینار منعقد ہوا تھا اس میں اصغر ندیم سید نے 'یادوں' کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا۔ اس میں انہوں نے بھی وہی کچھ کہا ہے جو حمید اختر نے مندرجہ اقتباس میں کہا ہے۔ اصغر ندیم کہتے ہیں کہ حسن عابدی کو لیڈروں نے یہ کام سونپا تھا کہ انڈر گراؤنڈ لیڈر شپ کے ساتھ رابطے کا کام کریں۔ حسن عابدی یہ کام کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ لیڈر نے سبق پڑھایا تھا کہ اگر کوئی ہم میں سے پکڑا جائے تو وہ سب فوراً اپنے ٹھکانے بدل لیں۔ چنانچہ حسن عابدی چار دن تک لاہور کے شاہی قلعے میں مار کھاتے رہے۔ پانچویں دن انہیں یقین ہو گیا کہ اب لیڈر شپ اپنے ٹھکانے بدل چکی ہوگی۔ اس لیے انہوں نے سرنڈر کر دیا اور کہا کہ میں آپ کو سجاد ظہیر کے ٹھکانے پر لے چلتا ہوں۔ جب وہ اس جگہ پہنچے تو انہیں یقین تھا کہ سجاد ظہیر وہاں نہیں ہونگے۔ لیکن جب دروازہ کھلا تو وہ سامنے بیٹھے تھے۔ حسن عابدی حیران و پریشان سر پیٹ کر رہ گئے کہ لیڈر شپ نے جو سبق پڑھایا تھا اس پر خود عمل نہ کر سکے۔

سجاد ظہیر کی گرفتاری اپریل 1951 میں عمل میں آئی۔ ان کی قیام گاہ کی تلاشی میں جو کاغذات و دیگر لٹریچر پکڑا گیا یا جو لوگ گرفتار ہوئے ان کے بیانات کی بنا پر پارٹی کی نمائندہ تنظیم یعنی کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی شناخت مکمل طور پر ہوگئی۔ پارٹی کے پروپیگنڈا دستاویزات کے علاوہ پارٹی سے متعلقہ مندرجہ ذیل سیاسی جماعتوں کا بھی راز فاش ہوا اور یہ سب حکومت کی نظر میں آگئیں۔

(۱) امن کمیٹی۔ (۲) آزاد پاکستان پارٹی۔ (۳) ڈیموکریٹک وومنز (Womens) اسوسی ایشن۔ (۴) کسان کمیٹی۔ (۵) سندھ ہری کمیٹی۔ (۶) پنجاب یونین آف جرنلسٹ۔ (۷) آزاد پاکستان اسٹوڈنٹس اسوسی ایشن۔ (۸) ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس اسوسی ایشن۔ (۹) پیپلز پبلشنگ ہاؤس۔ (۱۰) پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن۔ (۱۱) پاک سوویٹ یونین کلچرل اسوسی ایشن۔ (۱۲) پاک چین کلچرل اسوسی ایشن۔ (۱۳) سول لبرٹیز یونین۔ اور (۱۴) پروگریسیو رائٹرز اسوسی ایشن۔

ان انکشافات سے پارٹی کو بہت صدمہ پہنچا اور دیگر اشخاص کے علاوہ خود ایرک سپرائن نے سجاد ظہیر پر ناراضگی ظاہر کی۔ ان کا خیال تھا کہ اتنی بڑی ذمہ داری سجاد ظہیر کے سر پر تھی تو اسے گرفتار نہیں ہونا تھا۔ سپرائن نے کہا کہ سجاد ظہیر ایک اشرافیہ کا رکن ہے یعنی امرا کے طبقے سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اپنے ساتھ ہمیشہ ایک یا دو مددگار رکھتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ سبط حسن سازش والی

کانفرنس میں جانے کے لیے تیار نہیں تھا اور چونکہ محمد حسین عطا اس وقت پاس ہی تھے اس لیے وہ اسے ہی ساتھ لے گئے۔ یہ بات عطا نے سپرائن کے ساتھ گفتگو میں بھی کہی تھی۔ سجاد ظہیر کی گرفتاری کے ساتھ پارٹی کے خفیہ ریکارڈ بھی حکومت نے ضبط کر لیے تھے جس کا ذمہ دار وہ سجاد ظہیر کو ہی ٹھہراتے تھے اور اس وجہ سے سجاد ظہیر سے سخت ناراض تھے۔ ان حالات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب تک سجاد ظہیر روپوشی کی حالت میں رہ کر کام کرتے رہے انہیں بے شمار مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان میں کچھ تو حالات کی پیدا کردہ تھیں اور کچھ پارٹی کے رہنماؤں کی بنائی ہوئی۔ لیکن انہوں نے نہ تو ناخوشگوار حالات سے اور نہ ہی پارٹی کے کارندوں کی بادِ مخالف سے ہار مانی اور بلا کسی شکوہ شکایت کے اپنے کام میں مشغول رہے۔ بعد میں 1951 میں جب وہ راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے اور چار سال جیلوں کی صعوبتیں برداشت کیں تو بھی کبھی کسی سے اپنی ذاتی تکلیفات کا ذکر نہیں کیا۔ اس لحاظ سے بنّے بھائی اپنی قسم کے واحد انسان تھے۔

پاکستان کے قیام کے بعد اس کے دونوں حصوں میں یعنی مشرقی اور مغربی پاکستان میں صنعتی پسماندگی کی وجہ سے مزدور طبقے کی حالت نہایت خراب تھی۔ مشرقی پاکستان میں صرف چائے کے باغات اور پٹ سن کے سوا کوئی اور صنعت نہیں تھی۔ مغربی پاکستان میں بھی صرف چند صنعتی ادارے تھے جیسے ریلوے لوکو ورکشاپ، اٹک آئیل کمپنی، راولپنڈی بجلی کمپنی، واہ سیمنٹ فیکٹری، باٹا شو فیکٹری اور کراچی شپ یارڈ۔ مزدور صرف انہیں انڈسٹری میں تھے یا کچھ عارضی ورکر نیم فوجی اداروں میں کام کرتے تھے۔ تقسیم سے پہلے لاہور میں مرزا محمد ابراہیم کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ رکن تھے اور ٹریڈ یونین کے فرنٹ پر سرگرم عمل تھے۔ پاکستان بننے کے بعد مرزا ابراہیم لاہور میں ریلوے یونین کی رہنمائی کرنے لگے تھے۔ بعد میں جب مرزا صاحب گرفتار ہو گئے تو ریلوے یونین کے صدر فیض احمد فیض مقرر ہو گئے۔ فیض پوسٹل یونین کے بھی صدر تھے۔ انہو نے ان یونینوں کے کئی پبلک جلسے بھی منعقد کیے جو موچی دروازہ اور لاہور وائی ایم سی اے ہال میں ہوئے۔ پھر بھی 1949 میں لیبر قوانین قسم کی کوئی چیز وہاں وجود میں نہیں آئی تھی۔ اس لیے ایسی یونینوں کو یو این او کا تحفظ حاصل نہیں تھا۔ لیکن فیض نے اپنی لگاتار محنت سے پاکستان میں پہلی بار پاکستان فیڈریشن آف لیبر قائم کی۔ لہٰذا بنّے کے پاکستان جانے کے وقت پاکستان میں کوئی بھی مستعد لیبر یونین نہیں تھی۔ لیکن

1948 میں جب بنّے بھائی وہاں پہنچے تو روپوشی کی صعوبتوں کے باوجود کم از کم 14 تنظیمیں قائم کردیں جوان کی گرفتاری کے وقت حکومت کی نوٹس میں آئیں اور جن کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بنّے بھائی کیسی کیسی تنظیمی صلاحیتوں کے مالک تھے۔

ابھی تک نوزائیدہ کمیونسٹ پارٹی اپنے پیروں پر کھڑی بھی نہ ہو پائی تھی کہ اس میں دراڑیں پیدا ہونی شروع ہوگئیں۔ پارٹی کے ایک اہم کارندے فضل الٰہی قربان کو کمیونسٹ پارٹی سے خارج کردیا گیا۔ انہوں نے اپنے طور پر ایک کسان تحریک منظم کرلی۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی سیاسی تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ مثلاً اس زمانے میں بہت لوگ مسلم لیگ اور لیاقت علی خان کی حکومت سے مایوس ہو چکے تھے اور بددل ہوکر انہوں نے آوازیں اٹھانی شروع کردی تھیں۔ میاں افتخار الدین اور سردار شوکت حیات خان جو مسلم لیگ کے سرکردہ رکن تھے انہوں نے پارٹی سے استعفےٰ دے دیا تھا۔ ان کے علاوہ حسین شہید سہراوردی جو مشرقی پاکستان کے انتہائی قابل اور متحرک رہنما تھے، انہوں نے بھی مسلم لیگ سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ ان تمام حالات کے مدنظر ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں:

> ''ملک میں افراتفری، مارا ماری اور اقربا نوازی کی وبا پھوٹ نکلی۔ بے عملی اور بے یقینی کے اس خوفناک دور کے آغاز میں ہی لیاقت علی خان کا لہجہ تند و تیز اور سخت گیر ہوتا گیا۔ انہوں نے وزارت عظمیٰ اور سربراہ مسلم لیگ کے عہدوں کو یکجا کر کے ابتدا میں ہی ملوکیت کا آغاز کردیا تھا۔ سیاست میں جمہوری روایت اور اداروں کی آبیاری کی بجائے ذاتی وفاداری کو سکہ رائج الوقت قرار دیا گیا۔ یوں ایک غیر متوقع لاقانونیت کے ماحول میں سیاست کی گاڑی پھسلتی ہوئی مطلق العنانی کی گہری کھائی کی سمت روانہ ہوگئی۔ اسے روکنے کے لیے جو آگے بڑھا اس کا سر قلم ہوا۔ (انوار الحق جالندھری) اسے پس زنداں ڈال دیا گیا۔ وہ جیالے جو جی جان سے پاکستان کے قیام کے دیوانے تھے اب حکومت کی نظر میں فاتر العقل، شرپسند اور غدار قرار دیئے جانے لگے۔'' (۴)

راقم الحروف پوری طرح سے حمید اختر سے اتفاق کرتا ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ بنّے بھائی ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے ذاتی زندگی کی تمام موجودہ آسائشوں سے کنارہ کشی کر کے بنی نوع

انسانی کے بہتری کے منصوبے بنائے۔ جنہوں نے اس دنیا سے دکھ، غم، بھوک، افلاس اور جہالت کے خاتمے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہی وہ کام ہے جس کے لیے اللہ تعالی نے دنیا میں پیغمبر بھیجے ہیں۔ اس لحاظ سے سجاد ظہیر جیسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے روح رواں تھے اور انہوں نے برصغیر کے شاعروں اور ادیبوں کو ادب کی صحت مندانہ روایات کی پاسداری کا شعور دیا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔

☆☆☆

کتابیات

نمبر شمار کتاب کا نام	مصنف	ناشر پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱) All These Years	راج تھاپر	سیمینار پبلیکیشن۔ نئی دہلی	1991	88
۲) سجاد ظہیر۔ مارکسی دانشور اور کمیونسٹ رہنما	عبدالروف ملک	پیپلز پبلشنگ ہاؤس۔ لاہور	2008	50
۳) آشنائیاں کیا کیا	حمید اختر	بک ہوم۔ لاہور	2008	29
۴) فیض نامہ	ڈاکٹر ایوب مرزا	کلاسیک۔ لاہور	2005	86

☆☆☆☆

۳۔ پاکستان میں فسادات اور سیاسی ماحول

پاکستان میں چونکہ سجاد ظہیر روپوش رہ کر ہی کام کر سکتے تھے اس لیے وہ نہ تو پارٹی کے کارندوں سے رابطہ قائم کر سکتے تھے اور نہ ہی مختلف تنظیموں سے۔ان کے لیے یہ سب سے بڑی دقت تھی۔ بہر حال اس مشکل پر کچھ حد تک قابو پانے کے لیے انہوں نے اپنے وفادار ہمدرد جیسے کہ سبط حسن ، حمید اختر ، حسن عابدی وغیرہ کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔لیکن یہ محض عارضی عمل تھا۔اس کے علاوہ پاکستان میں قتل و غارت کا دور دورہ بھی تھا۔اس سے پہلے چند ایک جگہ فسادات اور لوٹ مار کر ذکر کیا جا چکا ہے جو مغربی پاکستان میں ہوئے۔لیکن مشرقی پاکستان یعنی بنگال میں بھی خون خرابے کا ماحول ویسا ہی تھا۔ستمبر 1946 میں جناب فضل الحق نے جو حکمراں پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اپنی ہی حکومت کے خلاف بنگال اسمبلی میں ایک بیان دیا تھا جس کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے جسے پڑھ کر حساس انسان کی روح کانپ اُٹھتی ہے:

> ''قتل و غارت کی شرمناک اور کالی راتوں کو میں نے اپوزیشن ممبر کے نظریے سے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جو خبریں چھن کر جگہ جگہ سے مجھے موصول ہو رہی ہیں وہ وزیروں کے حق میں نہیں ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ان تمام فسادات کے دوران حکومت بالکل ناکارہ بن کر رہ گئی تھی۔ ہندو مسلمانوں کے آپسی تفرقات اس سے پہلے بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔لیکن ایسے زیادہ تر معاملوں میں مَیں نے مسلمانوں کے تحفظ کے سلسلے میں قدم اٹھائے ہیں۔لیکن

میں نے اپنی پوری زندگی میں آج تک ایسا انسانیت سوز نظارہ نہیں دیکھا جہاں ہندو اور مسلمان دونوں فریق بڑی بے دردی سے قتل کیے گئے ہیں جن میں نہ صرف مرد اور عورتیں ہی شامل ہیں بلکہ بہت بڑی تعداد بچّوں کی بھی ہے۔

جناب عالی۔ جہاں تک حکومت کا سوال ہے میں پارٹی کے حکم کے مطابق پابندی سے حکومت کے حق میں ہی ووٹ دوں گا۔ وہ صرف اس لیے کہ قانونی طور پر جبکہ ایسا مسئلہ اسمبلی میں اٹھایا گیا ہو ہم اپنی وزرات کو مخالف پارٹی کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔ لیکن میری ہمدردی ان لوگوں کے ساتھ بالکل نہیں جن کی یہ ذمہ داری ہے کہ عوام کے جان ومال کی حفاظت کریں۔

جناب میں کچھ ایسی وارداتوں کی طرف اسمبلی کی توجہ دلانا چاہتا ہوں جنہوں نے میری آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اتنے بڑے پیمانے پہ فسادات یکا یک نہیں پھوٹ پڑے بلکہ یہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت عمل میں لائے گئے ہیں۔

جمعہ کی صبح مجھے ٹیلیفون کے ذریعے بہت لوگوں نے اطلاع دی جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے کہ حالات بگڑ گئے ہیں۔ میں نے انہیں صلاح دی کہ پولیس سے مدد حاصل کریں۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ پولیس کچھ نہیں کر رہی بلکہ فسادات کے بارے میں اپنی لاعلمی ظاہر کر رہی ہے۔

اسی شام ملک بازار لوٹ لیا گیا۔ اس وقت میں اپنے برآمدے میں کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ موج مستی میں خوشی سے لوٹ کا سامان لیے ہوئے بھاگ رہے تھے اور پولیس والے جنہیں پہرے پر تعینات کیا گیا تھا ان لوگوں کی حفاظت کرنے کے لیے ان کے ساتھ چل رہے تھے۔

تب اس رات پارک سرکٹ کی مارکیٹ لوٹ لی گئی۔ میں نے اپنے ایک عزیز اور خیرالانام کو جو 'محمدی' کے مدیر تھے، سرکٹ کی چوکی کے لیے روانہ کیا تاکہ پولیس کی امداد طلب کریں۔ اسمبلی کے ممبران کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ

وہاں کی چوکی کا انچارج جو وہاں تھا اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کے پاس وقت نہیں ہے کہ جا کر حالات کا جائزہ لے۔ اس کے اگلے ہی دن مہی سول راج ہاؤس کو لوٹ لیا گیا۔ یہ عمارت میرے گھر سے تقریباً 40 گز کے فاصلے پر ہے اور اس عمارت کے بالکل سامنے پولیس کی چوکی ہے جہاں اس وقت کوئی ایک سو پولیس افسر موجود تھے۔ میں اس بات کا چشم دید گواہ ہوں کہ وہ تمام عمارت مکمل طور پر لوٹ لی گئی اور دو گھنٹے میں عمارت کے تمام سامان کا صفایا کر لیا گیا جبکہ پولیس یہ سارا نظارہ دیکھتی رہی۔ میں یہ نہیں بتانا چاہتا کہ یہ وبا کیسے اور کیوں شروع ہوئی اور اس کا ذمہ دار کون ہے لیکن اس اسمبلی سے یہ ضرور پوچھنا چاہتا ہوں کہ حالات اتنے بڑے پیمانے پر کیسے خراب ہو گئے کہ 24 گھنٹوں میں کنٹرول سے باہر ہو گئے۔ میں رات بھر سو نہیں سکا۔ غنڈوں کے گروہ پے در پے گشت کرتے رہے اور ہمارے گھروں پر دستک دیتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہماری زندگی کا آخری دن ہے۔

لال بازار سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک لمٹن واچ کمپنی ہے جو بو بازار اور ڈلہوزی سکویر کے جنکشن پر واقعہ ہے۔ اسے لوٹا گیا اور لوٹ کا تمام سامان ڈھائی گھنٹے میں ٹھکانے لگا دیا گیا۔ میرے ایک دوست جس نے یہ تماشہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا بعد میں مجھے بتایا کہ لوٹ مار کے آدھے گھنٹے بعد ہی بہت سے لوگ بھاگتے ہوئے دکھائی دیئے جن کے ہاتھوں میں گھڑیاں و دیگر قیمتی سامان تھا۔ ان لوگوں میں زیادہ تر پولیس والے تھے۔"(۱)

اوپر صرف ایسٹ بنگال (مشرقی پاکستان) کا حال مختصر طریقے سے اُس بیان میں دیا گیا ہے جو بیان فضل الحق جو بنگال اسمبلی کے ممبر تھے انہوں نے دیا ہے۔ اس لیے اس بیان کی حقیقت پر شبہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اب دیکھتے ہیں کہ پنجاب کے حالات کیسے تھے۔

مغربی پنجاب و پاکستان کے دیگر صوبوں میں ہندو اور سکھوں پر جو ظلم ہوئے وہ بھی بے حد دردناک تھے۔ لیکن جو لوگ سرحد پار کر کے مشرقی پنجاب (ہندوستان) پہنچے انہوں نے اپنے ساتھ ظلم

اور زیادتیوں کا ذکر کچھ اس ڈھنگ سے کیا کہ وہاں کی ہندو سکھ آبادی میں بہت زبردست ردعمل ہوا۔ انہوں نے اپنی داستان کچھ بڑھا چڑھا کر بھی سنائی ہوگی کیونکہ اکثر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ناکردہ گناہ بھی اپنے خلاف منسلک کر لیتا ہے۔ حقیقت جو بھی ہو لیکن یہاں کے لوگوں میں بدلہ لینے کی خواہش زور پکڑنے لگی۔ افواہیں پھیلنے لگیں کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں سکھوں کے گروہ امرتسر اور اس کے گردونواح میں گشت کر رہے ہیں اور اکا دکا مسلمانوں پر حملے بھی کر رہے ہیں۔ اس وقت لاہور آگ کے شعلوں میں تھا اور وہاں سے قتل وخون اور لوٹ مار کی جو خبریں آ رہی تھیں ان سے مشرقی پنجاب کے لوگوں میں کافی غم وغصہ پیدا ہونے لگا تھا۔ امرتسر میں فسادات کی شدت بڑھنے سے باقی علاقوں میں بھی حالات خراب سے خراب تر ہونے لگے۔ اگرچہ پنجاب کی تقسیم ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی درمیانی رات میں عمل میں آئی لیکن باؤنڈری کمیشن کا فیصلہ دو دن بعد سنایا گیا۔ اس فیصلے سے لوگوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ سکھوں نے کھلے عام اس بات پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کہ ان کے اہم مذہبی ادارے اور ان کا زرخیز علاقہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ انہیں محسوس ہونے لگا کہ ان کی قوم دو حصوں میں تقسیم ہو جانے سے ان کا سیاسی اقتدار بھی پنجاب کے دونوں حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ لاہور کے چلے جانے کا نقصان اور اس سے ملحقہ علاقوں کا پاکستان میں شامل ہو جانے سے ہندوؤں کو شدید صدمہ پہنچا۔ مسلمانوں پر یہ واضح ہونے لگا کہ ہندوؤں اور سکھوں پر ہوئے ظلموں کی وجہ سے وہ مسلمانوں سے ضرور بدلہ لیں گے۔ ایسا خوف محض بناوٹی نہیں تھا کیونکہ سب ایسا ہی ہو رہا تھا۔

امرتسر کے بعد لوٹ کھسوٹ کی وبا گورداس پور، جالندھر، ہوشیار پور، لدھیانہ اور فیروز پور کے ضلعوں میں بھی پھوٹ پڑی۔ شہروں کے بعد دیہاتوں میں بھی مارا ماری شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ فسادات نے ایک بہت بڑے پیمانے کی صورت اختیار کر لی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ کتنے لوگوں کی جان گئی لیکن یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہزاروں انسان موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ یہ نقصان زیادہ تر مسلمانوں کا ہی ہوا۔ جب تک مغربی پنجاب سے ہندو سکھوں پر ظلم ڈھانے کی خبریں آتی رہیں مشرقی پنجاب میں لوگوں کی تشویش بڑھتی رہی اور لوگوں میں غم وغصہ کی لہر تیز سے تیز تر ہوتی رہی۔ جیسے جیسے رفیوجیوں کے قافلے بڑھتے رہے تشدد بھی بڑھتا رہا۔ کسی کو اندازہ تک نہیں تھا کہ فرقہ وارانہ کشیدگی ایسی صورت اختیار کر لے گی۔

ستمبر 1947 میں پنجاب کے مشرقی حصے میں فرقہ وارانہ تصادم لگاتار ہوتے رہے۔ جس سے عوام کے لیے حسب معمول زندگی گزارنا مشکل ہوگیا تھا۔ امرتسر اور فیروز پور کی سرحدوں پر کئی طرح کی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ کئی بار مسلم لیگ نیشنل گارڈز اور مغربی پنجاب پولیس کے سپاہی مشرقی پنجاب میں گھس گئے اور وہاں کے مسلمانوں میں ناجائز اسلحہ تقسیم کیا جو ہندوؤں کے خلاف استعمال ہوا۔ بعد میں شملہ اور کانگڑہ کے ضلع بھی فسادات کی چپیٹ میں آگئے اور وہاں بھی کئی جگہ چھٹکر پھٹکر قتل و لوٹ کے حادثات ہوئے۔ لوکل اخبارات نے بھی آگ میں تیل کا کام کیا اور فسادات کی رپورٹوں کو بڑھا چڑھا کر فرقہ واریت کا رنگ دیا۔ یہ بات بڑی افسوس ناک ہے کہ سرحد کی دونوں طرف پولیس نے ایمانداری سے اپنا فرض نہیں نبھایا اور غنڈہ عناصر کا ساتھ دیا۔

عصمت چغتائی نے ایک کتاب لکھی ہے۔ جس کا نام ہے My Friend My Enemy جس کا ترجمہ طاہر نقوی نے کیا ہے۔ اس کتاب میں عصمت چغتائی نے بٹوارے کے نتائج کا بڑی خوبی سے جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> ''فرقہ وارانہ فسادات کا طوفان آیا بھی اور تمام تر بربادیوں کو لے کر لوٹ بھی گیا لیکن وہ اپنے پیچھے زندہ اور نیم مردہ جسموں کا انبار چھوڑ گیا۔ صرف یہی نہیں ہوا کہ ہمارے ملک کے دو حصے ہوگئے بلکہ جسم اور ذہن بھی تقسیم ہوگئے۔ اخلاقی قدروں کو ایک طرف پھینک دیا گیا اور انسانیت کے پُرزے بھی اڑا دیئے گئے۔ سرکاری افسر اور کلرک اپنے میز کرسیوں اور قلم دوات کے ساتھ اس طرح بانٹے گئے جیسے جنگ کا مالِ غنیمت۔ اگرچہ کچھ لوگوں کے جسم ثابت تھے لیکن ان کے دل ٹوٹ چکے تھے۔ خاندان بکھر گئے تھے۔ اگر ایک بھائی ہندوستان کو سونپا گیا تھا تو دوسرا پاکستان کو۔ ماں ہندوستان میں رہ گئی تو بچے پاکستان پہنچ گئے۔ خاوند ہندوستان میں تھا تو بیوی پاکستان میں۔ رشتوں کے بندھن ٹوٹ چکے تھے اور بالآخر بہت سے انسان ہندوستان میں رہ گئے جبکہ ان کی روحیں پاکستان چلی گئیں۔'' (۲)

ایسے حالات میں بنے بھائی کے لیے کام کرنا بے حد مشکل تھا کیونکہ وہاں کے حلقے کے

لوگ انہیں حملہ آور سمجھتے تھے۔ ان کے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے جنرل سیکریٹری ہونے کے ناطے سے ترقی پسند مصنفین کی انجمن کو کمیونسٹ پارٹی کا بغل بچہ سمجھا جانے لگا۔ لہٰذا انجمن ترقی پسند مصنفین پر طرح طرح کے حملے ہونے لگے تھے۔ سب سے پہلا حملہ یوں ہوا کہ یوم مئی منانے کے لیے ایک جلسہ منعقد ہوا۔ یہ جلسہ لاہور کے YMCA ہال میں ہوا تھا جس میں ترقی پسند ادیب اور دانشور شامل ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ مزدور یونین اور ٹریڈ یونین کے کارکن بھی کافی تعداد میں تھے۔ کہتے ہیں کہ ہال کے اندر اور باہر ہر طرف ہتھوڑا اور درانتی والے سرخ جھنڈے نظر آ رہے تھے۔ جلسے کی صدارت فیض احمد فیض نے کی تھی۔ اس زمانے میں اردو اخبار 'احسان' کافی مشہور تھا۔ اس اخبار نے ترقی پسند تحریک کی زوردار مخالفت کی۔ لیکن خود ترقی پسند رہنماؤں میں بھی تفرقہ پیدا ہو گیا تھا۔ نتیجہ کے طور پر فضل الٰہی کو پارٹی سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ان دنوں فیض مرزا ابراہیم والی ٹریڈ یونین کے صدر تھے۔ ان کے خلاف ایک وزیر خان جو مسجد کے خطیب تھے انہوں نے فتویٰ دائر کر دیا۔ یکہ بعد دیگرے لاہور کی چالیس مسجدوں کے مولویوں نے بھی ترقی پسندوں کے خلاف خطبے پڑھے اور عوام کو تشدد پر اکسایا۔ ترقی پسندوں نے جوابی حملہ کیا۔ انہوں نے موچی دروازہ لاہور میں ریلوے کی یونین کے مزدوروں کا جلسہ منعقد کیا جس کی صدارت مرزا ابراہیم نے کی۔ اس جلسے میں پوسٹل یونین کے لوگ بھی شامل ہوئے۔

پاکستان میں ترقی پسند تحریک چاہے جس نظریے سے شروع ہوئی تھی بعد میں اس میں انتہا پسندی پیدا ہو گئی تھی۔ فیض صاحب کہتے ہیں کہ پاکستان میں ترقی پسندوں میں اس انتہا پسندی کی بازگشت صاف سنائی دینے لگی تھی۔ انتہا پسندوں نے حقیقت پسندی کا رُخ جس جانب موڑنا چاہا اس کی ملک کے مخصوص سماجی اور سیاسی حالات میں کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ایسے ادب کی تخلیق ایک غیر سوشلسٹ ملک میں کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بہر حال ترقی پسند تحریک کو پاکستان میں کافی گہری چوٹ پہنچی اور یہ کام صرف چند انتہا پسندوں نے کیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ علامہ اقبال کا بُت توڑ دیا جائے۔ عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اور ن۔ م۔ راشد کو تحریک سے علیحدہ کیا جائے کیونکہ یہ لوگ ترقی پسند تحریک کے معیار پر پورے نہیں اتر سکتے۔ منٹو اور عصمت چغتائی پر فحاشی کا الزام لگایا گیا۔ لہٰذا فیض صاحب لکھتے ہیں:

''نتیجہ ظاہر تھا۔ ہماری ان سے جنگ ہوگئی۔ ہمارا موقف تھا کہ کسی بھی شاعر یا ادیب کی تخلیقات کو اس کی مجموعی تاثر اور عصری تقاضوں کے تناظر میں کیا جانا۔ اس کے کسی ایک ادب پارے کے ایک ٹکڑے سے اس کی تخلیقی ادب کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ رسکن وغیرہ اپنے دور کے ترقی پسند ادبا تھے۔ بوڑھا صنعتی دور کے بے رحم میکانکی تشدد کے خلاف آواز اُٹھاتے تھے۔ وہ انسان کی عظمت اور سربلندی کے گن تو گاتے تھے مگر اس کا صحیح راستہ متعین نہ کر سکتے تھے۔ یہی ان کی علمی اور شعوری پسماندگی تھی۔ ڈکنز کے موضوعات اور انداز بیان سے کون واقف نہیں ہے۔ نہایت چبھتے ہوئے خوبصورت پیرائے میں اس نے صنعتی سماج کے اسکولوں، کارخانوں، دفتروں، گرجوں اور گلی کوچوں میں بچّوں سے لے کر بوڑھوں تک جوان پر گزر رہی تھی اسے بیان کیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ صنعتی انقلاب کے خلاف اور جاگیرداری کے حق میں تھا۔ شیلی، کیٹس وغیرہ کو صنعتی دور کی ہماہمی ہرگز پسند نہ تھی۔ وہ رومانٹک شاعر تھے لیکن انہیں رجعت پرست ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ فیض نے کہا کہ پھر یار لوگوں نے ایک روز مظہر علی خان کے گیراج میں میٹنگ کی۔ صفدر میر صدر تھے۔ قاسمی (احمد ندیم قاسمی) صاحب سیکریٹری نے علامہ اقبال کے خلاف ایک مقالہ پڑھا۔ بھئی ہمیں تو بہت رنج ہوا۔ ہم نے اعتراض کیا کہ یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے۔ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ یہ تو ثقہ بند قسم کی بے معنی انتہا پسندی ہے۔ ہماری نہ مانی گئی۔ ہم بہت دل برداشتہ ہوئے۔ اس کے بعد ہم انجمن کی محفلوں میں نہیں گئے۔'' (۳)

فیض صاحب تو خود ہی ترقی پسند تحریک سے الگ ہو گئے لیکن منٹو اور عصمت چغتائی پر فحش نگاری کا الزام لگا کر انہیں تحریک سے خارج کر دیا گیا۔ ان دونوں کے علاوہ قرۃ العین حیدر اور ن۔م۔راشد کے متعلق بھی غلط رویہ اختیار کیا گیا۔ لہٰذا ایک ایک کر کے پرانے ترقی پسند ادیب اور شاعر اس تنظیم سے کنارہ کشی اختیار کرنے لگے۔

ترقی پسند تحریک کو ضرب لگنے سے سجاد ظہیر کی دشواریاں قدرے بڑھ گئیں کیونکہ جب ترقی پسند

ادیبوں کو اچھی نظر سے نہ دیکھا جانے لگا تو سجاد ظہیر اور ان کی پارٹی بھی مشکوک نظروں سے دیکھی جانے لگی۔ سجاد ظہیر بذات خود بھی طرح طرح کی دشواریاں محسوس کر رہے تھے۔ اگر چہ ان کی وفاداری اور ان کے اصولوں کی کاربندی پر کسی کو کوئی شک نہیں تھا لیکن وہ اس منصب کے اہل نہ تھے جس کی ذمہ داری انہوں نے اپنے ہوش وحواس کے ساتھ قبول کی تھی اور انہیں اس خامی کا پورا پورا احساس بھی تھا۔ انہوں نے خود کئی بار اس کا اعتراف کیا تھا۔ لیکن ان کی مجبوری تھی کہ پورے پاکستان میں کسی دوسرے شخص میں وہ صلاحیتیں بھی نہ تھیں جو اس کام کے لیے درکار تھیں اور نہ ہی کوئی یہ ذمہ داری لینے کے لیے تیار تھا۔ پارٹی میں مسلمان لوگ تقسیم کے بعد شامل ہوئے تھے۔ جو پہلے سے ہی موجود تھے انہیں تو مسلم لیگ میں شامل ہونے کی پارٹی نے اجازت دے دی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کی متحدہ کمیونسٹ پارٹی نے پاکستان کے قیام کی مانگ کی حمایت کی تھی۔ پارٹی کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ نوجوان مسلم لیگ میں شریک ہو کر مسلم لیگ کی حمایت جیت کر مسلم لیگ پر جو جاگیرداروں کے تسلط میں تھی، اس کا نظریہ تبدیل کر کے اس پر خاطر خواہ اثر ڈالیں گے۔ ان کے علاوہ صرف چند ہی پرانے مسلمان باقی تھے جو پارٹی کی تقویت میں مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ یہ لوگ تھے محمد حسین عطا جو صوبہ سرحد میں کام کر رہے تھے، جلال الدین بخاری جو سندھ میں تھے اور دادا فیروز الدین منصور اور مرزا محمد ابراہیم جو پنجاب میں پارٹی کے مزدور طبقے کے رہنما تھے۔ بٹوارے کے بعد جب ہندو اور سکھ کمیونسٹ لیڈر ہندوستان ہجرت کر گئے تو پارٹی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا جسے پُر کرنے کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو مغربی پاکستان کے سماجی، معاشی اور سیاسی ماحول سے بخوبی واقف ہوں یا جنہوں نے وہاں کچھ عرصہ تک کام کیا ہو اور وہاں کے لوگوں سے جڑے ہوئے ہوں۔ بنے بھائی ان تمام اوصاف سے بالکل عاری تھے۔ وہاں کے سیاسی ماحول کا انہیں کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ وہاں کی عوام کے ساتھ گھل مل کر رابطہ قائم کرنے کے بھی اہل نہیں تھے۔ اور انہیں کام بھی روپوش رہ کر کرنا پڑا جس نے ان دشواریوں میں اور بھی اضافہ کر دیا۔

پاکستان کے سیاسی حالات جاننا درکار ہو تو میاں افتخار الدین کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس وقت کی سیاست میں ان کا بہت اہم کردار تھا۔ بنے بھائی کے اصرار پر انہوں نے کانگریس چھوڑ دی اور مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد انہوں نے لیگ کے رویے کو اپنے

اصولوں پر حملہ تسلیم کیا۔ مسلم لیگیوں نے لوٹ مار سے اپنی جیبیں بھرنی شروع کردی تھیں جو عمل میاں صاحب کے لیے بہت ناگوار تھا کیونکہ جن اصولوں پر وہ ہمیشہ سے عمل کرتے آئے تھے وہ جمہوریت، شہری آزادی اور عوام کی فلاح و بہبودی کے عین مطابق تھے جن کے لیے انہوں نے کڑی قربانیاں دی تھیں۔ لیگی جو کچھ کررہے تھے وہ میاں صاحب کے ان اصولوں کے بالکل خلاف تھے۔ اس لیے وہ بار بار مسلم لیگیوں کے عوام دشمنی رویے کے خلاف بولتے رہے جس کی وجہ سے مسلم لیگی ان سے ناراض رہنے لگے۔ آخر کار وہ مسلم لیگ سے نکال دیئے گئے۔ ان دنوں دنیا کے کئی علاقوں میں کمیونسٹ پارٹی بائیں بازوں کی انتہاپسندی کی شکار ہوچکی تھی۔ ایشیا میں جگہ جگہ مسلح جدوجہد جاری تھی۔ بنے بھائی پر بھی انتہاپسندی کا گہرا اثر تھا۔

سبط حسن کے مطابق بنے بھائی محض کتابی مارکسٹ تھے اس لیے ملک کے سیاسی حالات سے صحیح طور پر واقف نہیں تھے۔ لہٰذا جب میاں صاحب ان کے پاس یہ مشورہ لے کر پہنچے کہ وہ سہروردی کے ساتھ مل کر ایک نئی پارٹی بنانا چاہتے ہیں تو بنے بھائی نے ان سے کہا کہ ''دیکھو افتی۔ سیاسی پارٹیاں اپنے اپنے طبقے کی نمائندہ ہوتی ہیں اور انہی کے مفاد کے لیے جدوجہد کرتی ہیں۔ اس وقت بنیادی طور پر ہمارے ملک میں دو سیاسی پارٹیاں موجود ہیں ایک مسلم لیگ جو جاگیرداروں اور سرمایہ دار طبقہ کی نمائندگی کرتی ہے اور دوسری کمیونسٹ پارٹی جو مزدوروں، کسانوں اور درمیانہ طبقے کے ترقی پسند عناصر کے مفاد کی نمائندگی کرتی ہے۔ اب یہ تم جو سہروردی کے ساتھ مل کر نئی پارٹی بنانے چلے ہو بتاؤ یہ کس طبقے کی نمائندگی کرے گی۔'' بنے بھائی کی دلیلوں کا اثر یہ ہوا کہ کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد میاں صاحب نے کہا کہ شام کو جب سہروردی ان سے ملنے آئیں گے تو وہ نئی پارٹی بنانے سے انکار کردیں۔ اور پھر وہی ہوا۔ شام کو جب سہروردی آئے تو وہ بہت خوش نظر آرہے تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد سہروردی نے کہا افتخار بتاؤ پارٹی کا کیا نام رکھا جائے۔ میاں صاحب شش و پنج میں پڑ گئے لیکن آخر میں کچھ تو بولنا ہی تھا۔ فرمانے لگے کہ کافی غور و غوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابھی نئی پارٹی بنانے کا وقت نہیں آیا۔

سیاسی حالات کا جائزہ لیں تو یہ بات بڑی قابل غور ہے کہ پاکستان میں پہلی بار بالغ آبادی کو حقِ رائے دہی کا اختیار اس وقت عطا کیا گیا جب پنجاب میں صوبائی اسمبلی کے انتخابات کا اعلان ہوا۔ جیسا کہ ہر جگہ ہوتا ہے پارٹیاں سیاسی اقتدار کے لیے جنگ میں جُت جاتی ہیں۔ مسلم لیگ

کے اندر بھی کئی گروپ پیدا ہو گئے تھے جن میں دو گروپ خاص اہمیت کے حامل تھے۔ ایک گروپ کا لیڈر نواب ممدوٹ تھا اور دوسرے کا ممتاز دولتانہ۔ بنیادی طور پر دونوں گروہ جاگیردارانہ نظام کی ہی نمائندگی کر رہے تھے لیکن اس نظام میں بھی گروہ بندیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اقتدار کی یہ جنگ اس طرح سے لڑی جا رہی تھی کہ یا تو یہ زور آزمائی اسمبلی میں ہوتی تھی یا مسلم لیگ کے دفتر میں یا نوابوں کے اپنے اپنے علاقے میں۔ کئی بار میکلیوڈ روڈ جہاں مسلم لیگ کا دفتر تھا وہاں دونوں گروہوں کے غنڈوں کا تصادم ہو جاتا تھا اور طرفین کے کئی کارکن زخمی ہو جاتے تھے۔ ایک وقت تھا جب مسلم لیگ پر اعتراض کرنے والوں کو غدار، ہندوستانی ایجنٹ اور دشمن اسلام کہا جاتا تھا۔ اب اسی مسلم لیگ کے متعلق لوگوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ لیگی لیڈروں کے دلوں میں ملک اور قوم کے لیے کوئی ہمدردی باقی نہیں رہ گئی۔ ملک کے قیام کے لیے انہوں نے کوئی قربانی نہیں دی تھی، نہ وہ قید ہوئے تھے اور نہ ہی پولیس کے ہاتھوں ان کی پٹائی ہوئی تھی۔ وہ تو محض اس لیے پاکستان کی تحریک میں شامل ہوئے تھے کہ آزادی کے بعد اس کا ذاتی فائدہ اٹھا سکیں۔

نواب ممدوٹ اور میاں ممتاز دولتانہ مسلم لیگ کے اندر اپنے اپنے گروہ کے رہنما تھے۔ نواب ممدوٹ پڑھ لکھ نہیں سکتے تھے اور نہ ہی تقریر کرنے کے اہل تھے۔ اس لیے انہیں وہاں کے لوگ گونگا پہلوان کہتے تھے۔ لیکن میاں ممتاز دولتانہ کافی پڑھے لکھے تھے، چالاک اور موقع شناس شخص تھے۔ ان کے دوستوں کا حلقہ کافی وسیع تھا لیکن ان پر کوئی اعتبار نہیں کرتا تھا۔ ان کے تمام وعدے جھوٹے ہوتے تھے اور وہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے اپنے قریب ترین رفیق کو بھی قربانی کا بکرا بنانے میں گریز نہیں کرتے تھے۔ ممتاز دولتانہ کا نواب زادہ لیاقت علی خان پر کافی غلبہ تھا اور ان کے ہی اثر ورسوخ سے میاں صاحب صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑ رہے تھے تاکہ نواب ممدوٹ کو سیاست سے نکال پھینکیں۔

کمیونسٹوں کو محض دو یا تین سیٹیں ہی جیتنے کی امید تھی لیکن انہوں نے دس گیارہ جگہوں سے اپنے امیدوار کھڑے کیے۔ سبط حسن کہتے ہیں کہ پارٹی کا مقصد الیکشن جیتنا بالکل نہیں تھا بلکہ پارٹی صرف اپنے مقاصد زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا چاہتی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کو اس بات سے کافی تسلی ہوئی کہ بہت بڑی تعداد میں لوگ پارٹی کے جلسوں میں شریک ہونے لگے تھے۔ ملتان اور لائلپور کے دیہاتوں سے پارٹی کے امیدوار کی کامیابی کی امید افزا خبریں آ رہی تھیں۔ مرزا محمد ابراہیم

لاہور کے مزدور حلقے سے الیکشن لڑ رہے تھے اور انہیں جیتنے کی پوری امید تھی۔ مختصر یہ کہ ہر طرف پارٹی کے امیدواروں کے بارے میں اچھی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ یہ خبریں صوبائی اور مرکزی حکومتوں کو بھی خفیہ پولیس کے ذریعے باقاعدگی سے موصول ہو رہی تھیں لیکن ان حکومتوں کو یہ ہرگز گوارہ نہیں تھا کہ ان کی پارٹی کے علاوہ کوئی دوسری پارٹی کامیاب ہو۔ لہٰذا یہ کہا جاتا ہے کہ راولپنڈی سازش کیس کمیونسٹ پارٹی کو بدنام کرنے کی ایک سازش تھی۔

پاکستان کے قیام کے بعد وہاں کے سیاسی ماحول کا ذکر نامکمل ہی سمجھا جائے گا جب تک وہاں کے ادیبوں کے حالات قلمبند نہ کیے جائیں۔ یوں تو دنیا کی ہر مہذب قوم اپنے ادیبوں، فنکاروں اور مفکروں کی ہر طرح سے عزت افزائی کرتی ہے اور ان کے ناز نخرے بھی اٹھاتی ہے لیکن سبط حسن سارترے کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ سارترے عرب مجاہدینوں کی طرف داری کرتے تھے۔ اگرچہ ان دنوں فرانس میں عربوں کا نام لینا بھی جرم تھا لیکن حکومت فرانس نے سارترے کے خلاف بالکل کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ تیمور اور محمود غزنوی تو اپنے وقت کے ادیبوں کو انعامات و اکرام سے نوازتے تھے۔ جنوبی ہندوستان کی سلطنتوں کے بادشاہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ بعد ازاں مغل شہنشاؤں نے بھی فن کاروں کی عزت افزائی کی جو مثال قائم کی وہ تاریخ میں سنہری الفاظ میں لکھی ہوئی موجود ہے۔ لیکن پاکستان میں فنکاروں کے ساتھ مناسب سلوک نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر بڑے غلام علی خان جیسا موسیقار پورے ایشیا میں کوئی نہیں ہوا۔ جب وہ پاکستان آئے تو ان کا خیال تھا کہ پورا ملک ان کے آگے پیچھے رہے گا۔ لیکن انہیں وہ عزت نہ ملی جس کی انہیں امید تھی۔ آخر بامر مجبوری وہ ہندوستان واپس چلے گئے جہاں عوام نے انہیں سر پر اُٹھالیا۔ انہی دنوں قرۃ العین حیدر جو اپنے وقت کی بے حد کامیاب اور ممتاز ادیبہ تھیں انہوں نے ایک ناول 'آگ کا دریا' کے عنوان سے لکھا جس پر پاکستان میں واویلا ہوا۔ ان پر فحاشی کے الزام لگائے گئے اور ان کی اتنی بے عزتی کی گئی کہ وہ مایوس ہو کر ہندوستان لوٹ گئیں۔ جوش ملیح آبادی اور اختر شیرانی اپنے وقت کے مایہ ناز شاعر تھے۔ وہ دونوں کیا کیا امیدیں لے کر پاکستان گئے تھے لیکن وہاں ان کی وہ حالت ہوئی کہ آخر عمر میں وہ بالکل بے یارومددگار تھے اور ضعیفی اور تنگدستی سے بے حد پریشان تھے۔ جوش نے تو ان حالات کا تذکرہ اپنی کتاب 'یادوں کی بارات' میں بڑے درد بھرے الفاظ میں کیا ہے۔

پاکستان میں 14 اگست 1947 کے بعد جو فسادات ہوئے اگر ان کا جائزہ لیں تو علاوہ ازیں کئی حادثے اور بھی سامنے آتے ہیں جو دل کو دہلا دیتے ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نئی دہلی نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے "The Partition Omnibus" جس کا دوسرا ایڈیشن سن 2004 میں چھپا تھا۔ اس کتاب کا پیش لفظ جناب مشیرالحسن نے لکھا ہے۔ مشیرالحسن صاحب جامیہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر ہیں اور ماڈرن انڈین ہسٹری کے پروفیسر بھی۔ اس کتاب میں تین کتابوں کو اکٹھا کیا گیا ہے جن میں ایک کتاب پنڈریل مُون نے لکھی ہے۔ اس کتاب کا عنوان ہے Divide and Quit۔ اس کتاب میں انہوں نے مغربی پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں پر ڈھائے گئے مظالم کا ہر شہر اور صوبے کے لحاظ سے بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ چونکہ ان فسادات کے بارے میں اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے اس لیے انہیں دوہرانے کی ضرورت نہیں سمجھی جا رہی۔ The Partition Omnibus میں ایک اور کتاب بھی شامل کی گئی ہے جس کا نام ہے Stern Reckoning اور جس کا مصنف جی۔ ڈی۔ کھوسلہ ہے جو اس زمانے میں ICS آفیسر تھا۔ اس نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے وہ زیادہ تر ان کے ذاتی علم میں تھے۔ اس لیے ان کی حقیقت کے بارے میں شبے کی گنجائش بہت کم ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ نوجوان عورتوں کو اغوا کرنا اور ان کی عصمت دری کی کہانیاں تاریخ کا سب سے بھیانک حصہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی معصوم لڑکیاں، نوجوان شادی شدہ عورتیں جن کے بغل میں نوزائیدہ بچے بھی تھے زبردستی اٹھالی جاتی تھیں اور انہیں دور دراز جگہوں پر لے جا کر ان سے زبردستی کی جاتی تھی۔ ایک کے بعد ایک کئی مرد اُن سے جبراً زنا کرتے تھے اور بعد میں انہیں مال یرغمال کی طرح بیچ دیا جاتا تھا۔ جب ہندوستان سے ان کے رشتہ دار فوج کے ساتھ ان کی تلاش میں آتے تھے تو انہیں چھپا دیا جاتا تھا تا کہ وہ ان کے ہاتھ نہ لگیں۔ جب وہ عورتیں وہاں کی پولیس کو مل جاتی تھیں تو انہیں پاس کے ریفیوجی کیمپ میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک کیمپ کے بارے میں ایک 21 سالہ نوجوان عورت اپنا ذاتی تجربہ کچھ اس طرح بیان کرتی ہیں:

> ''میں نے تقریباً دو مہینے اس کیمپ میں قیام کیا۔ کیمپ میں زندگی بے حد مضطرب قسم کی تھی۔ جو روٹیاں ہمیں کھانے کو ملتیں تھیں ان میں شورہ ملا ہوتا تھا۔ ہر روز ہماری عصمت دری ہوتی تھی۔ مولوی لوگ کیمپ میں آکر ہندوستان کے خلاف

درس دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے اگر ہم ان کے ساتھ رہیں گی تو ہمیں بہشت میں جگہ ملے گی۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہندوستان میں عورتوں کے لیے حالات بہت بدتر ہیں۔ اور یہ کہ سکھ لوگ ہندو عورتوں کو امرتسر سے باہر نہیں جانے دیتے اور ان کی عزت لوٹ لیتے ہیں۔'' (۴)

کچھ ہندو لڑکیاں خوش قسمت تھیں اس لیے ان کا واسطہ نیک دل مسلمانوں سے پڑا جنہوں نے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔ ایک شادی شدہ عورت کو ایک نیک مسلمان جس کے ساتھ اس کی زبردستی شادی کردی گئی تھی اپنی مرضی سے کیمپ لے آیا اور اسے اپنے رشتے داروں کے حوالے کردیا۔ ایک 22 سالہ نوجوان لڑکی جو لائل پور سے ایک پیدل قافلے کے ساتھ سفر کررہی تھی اس کا بیان یہ ہے:

''میں جب بڑی ہوئی تو یتیم ہوچکی تھی۔ جن لوگوں کے ساتھ میں رہ رہی تھی انہوں نے مجھے ایک بوڑھے شخص تارا سنگھ کے ہاتھ 500 روپے کے عوض بیچ دیا۔ تارا سنگھ نے مجھے اس لیے خریدا تھا کہ مجھ سے اولاد پیدا کرسکے۔ وہ نیک انسان تھا اور میرے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا۔ لائل پور سے جب ہمارا قافلہ چلا تو ہم بھی اس میں شامل ہوگئے۔ فوجی افسر جو قافلے کی رکھوالی کے لیے رکھے گئے تھے انہوں نے ہمارا سب کچھ لوٹ لیا۔ پہلے انہوں نے تمام اسلحہ ضبط کرلیا پھر ہماری تمام قیمتی اشیا ہم سے چھین لیں۔ راستے میں مَیں نہ جانے کیسے قافلے سے الگ ہوگئی۔ میں نے آدمیوں کو قتل ہوتے اور عورتوں کی عصمت دری کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اگر کوئی مزاحمت کرتا تو اسے ماردیا جاتا۔ ایک عورت کی کئی آدمیوں نے یکے بعد دیگر عزت لوٹی۔ میرے ساتھ بھی تین آدمیوں نے ایک کے بعد ایک بلاتکار کیا۔ ایک آدمی نے تو میرے ساتھ بالکل جانوروں جیسا سلوک کیا۔ اس نے مجھے جسمانی ضرب پہنچائی۔ میرے منہ میں زبردستی گائے کی ہڈی گھسیڑ دی تاکہ میں مسلمان بن جاؤں۔ جب میں نے اعتراض کیا تو اس نے مجھے پیٹا اور مجھے اپنی چارپائی کے نیچے ڈال دیا۔ اس نے میرے ہاتھ چارپائی کے پیروں کے نیچے رکھ دیے اور خود اس پر بیٹھ کر

نماز پڑھنے لگا۔ میرا درد سے برا حال تھا اور وہ مجھے نماز دہرانے کی ضد کر رہا تھا۔
چونکہ میں نماز دہرا نہیں سکتی تھی' اس نے اپنی بندوق اٹھا کر مجھے گولی مارنے کی
دھمکی دی۔ میں آٹھ دن تک اس مصیبت میں مبتلا رہی۔ اس کے بعد ملٹری نے
مجھے ڈھونڈ لیا۔ پہلے مجھے امرتسر لے گئے اور پھر گاندھی ونیتا آشرم۔'' (۵)

مندرجہ بالا و دیگر بھی کئی حالات لائل پور اور اس سے متعلقہ رفیوجی کیمپ سے وابستہ ہیں۔
اب کراچی کے حالات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ کراچی میں کچھ سکھوں کی آمد سے حالات نے نئی کروٹ لی۔ مسلمانوں نے جب سکھوں کو کراچی ریلوے اسٹیشن آتے ہوئے دیکھا تو انہیں بہت تشویش ہوئی۔ حکومت کے وہ ادارے جن کی ذمہ داری ان سکھوں کی حفاظت کرنے کی تھی انہوں نے حد درجہ لاپرواہی کا ثبوت دیا اور انہیں پولیس کی حفاظت میں کھلی گاڑیوں میں روانہ کیا۔ انہیں گوردوارہ رتن تلاؤ جانا تھا جس کے گرد و نواح کے گھروں پر رفیوجیوں نے قبضہ کر لیا تھا اور وہاں رہنے لگے تھے۔ سکھوں کی آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی اور سندھی و پنجابی مسلمانوں نے اپنے اپنے ہتھیار اُٹھا لیے اور گوردوارے کو گھیر لیا۔ رفتہ رفتہ حالات قابو سے باہر ہونے لگے اور پورے شہر میں سکھوں کو قتل کرنے کے منصوبے بننے لگے۔ آخر مندر اور گوردوارے پر حملے ہوئے اور ان کی بے حرمتی کی گئی۔ گورو رام داس دربار، جگن ناتھ مندر، چدن کاشی مندر، بھائی وسیہ رام کا مندر، گورو نانک مندر، رام گڑھی کھاتہ کے قریب والا گوردوارہ، ہنومان جی کا مندر، شیلا مندر، جیٹھ مل گوردوارہ اور شاردہ دیوی کا مندر ان تمام جگہوں پر مسلمان فسادیوں نے حملے کر دیئے اور جو بھی مذہبی کتابیں ان کے ہاتھ لگیں وہ سپرد آگ کر دی گئیں۔ ہندوؤں کی دکانیں لوٹ لی گئیں۔ اس لوٹ میں نہ صرف غنڈہ عناصر پیش پیش تھے بلکہ حکومت کے افسروں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

کراچی میں فسادات کا دور دو روز تک چلتا رہا۔ اس کے بعد اس کا زور کچھ کم ہوا۔ یہ بتانا تو ممکن نہیں کہ کل کتنے لوگ موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے لیکن کہا جاتا ہے کہ لاشوں سے بھری ہوئی کئی گاڑیاں شمشان گئیں اور لاشوں کے ڈھیر لگا کر انہیں جلا دیا گیا۔ جو لوگ قتل کیے گئے ان کی تعداد تین سو سے کم نہیں تھی اور جو زخمی ہوئے ان کی تعداد اس سے دُگنی تھی۔

آخر میں ایک 21 سالہ نوجوان لڑکی کی داستان رقم کی جاتی ہے جو خود اس کی اپنی زبانی

ہے اور جو کسی دیہات میں مقیم تھی۔ وہ کہتی ہے:

''شہر میں فسادات کی خبریں سن کر ہم بہت خوفزدہ ہوتے تھے لیکن گاؤں والے ہمیشہ کہتے تھے کہ پندرہ اگست آنے دو، تب کہیں جانے کا فیصلہ کریں گے۔ پہلے ہمارے پڑوسی گاؤں میں پریشانی شروع ہوئی۔ اس سے خوفزدہ ہو کر ہمارے کچھ رشتے دار گاؤں سے نکل پڑے۔ ہم ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے جب مسلمانوں کے ایک گروہ نے ہم پر حملہ کر دیا۔ میرے جسم میں پانچ جگہ چاقو گھونپا گیا۔ بہت سے لوگ مارے گئے اور باقی بھاگ نکلے۔ اس بھاگ دوڑ میں مَیں اپنے ماں باپ سے جدا ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنی عمر کی دو لڑکیوں کو اپنے نزدیک پایا۔ وہ میری طرح زخمی تھیں اور ان کے جسم سے خون بہہ رہا ہے۔ ان کے علاوہ آٹھ نو لاشیں پڑی تھیں۔ ہم تینوں اُٹھ کر گاؤں کی طرف جانے لگے۔ وزیر نام کے ایک مسلمان نے مجھے پکڑ لیا اور اپنے گاؤں لے جا کر اپنی بہن کے پاس چھوڑ گیا۔ جب وزیر باہر جا کر دوسرے گاؤں میں لوگوں کو لوٹنے جاتا تو میں اس کی بہن کے کہنے پر عمل کرتی۔ کچھ دنوں بعد وزیر نے مجھے اپنے کسی رشتے دار کے پاس ایک اور گاؤں بھیج دیا۔ وہاں میں بیمار پڑ گئی لیکن وہاں کی عورتیں بہت نیک تھیں۔ انہوں نے میری اچھی تیمارداری کی۔ جب میں تندرست ہوئی تو گھر کے مالک نے مجھ سے شادی کرنا چاہی۔ اس کی بیوی نے مجھے خفیہ طور پر بتایا کہ جب مولوی نکاح کے لیے کہے تو میں اس کی بات ماننے سے نکار کر دوں۔ میں نے وہی کیا جو اس عورت نے مجھ سے کہا لیکن جب مولوی صاحب رخصت ہوئے تو اس آدمی نے مجھے بہت مارا۔ وہ بزرگ آدمی رات کو میرے بستر پر آ گیا۔ اس نے میرے چہرے کو ناخنوں سے کریدا اور میرے کپڑے اتار کر مجھے الف ننگا کر دیا۔ میں مدد کے لیے چلائی لیکن اس گھر کی مالکن کی بھی کسی نے ایک نہ سنی۔ تب وہ اپنے بیٹے کو بلا لائی جس کی آواز سن کر اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ کچھ دنوں بعد اس بزرگ آدمی کے

بیٹے نے سرگنگا رام اسپتال لاہور بھیجنے کے لیے مجھے ایک مسلمان کے حوالے
کر دیا جو مجھے لاہور جیل لے گیا جہاں اس وقت بہت سی ہندو عورتیں رہ رہی
تھیں۔شام کو ایک مسلمان جس کا نام انور تھا اس کی بیوی مجھے اپنے گھر لے گئی۔
اس کے پاس پہلے سے ہی دو عورتیں رہ رہی تھیں۔ ہم تینوں عورتیں ایک ہی
کمرے میں سوتی تھیں۔انور کی بیوی نے مجھے کہا کہ جب اس کا بیٹا پڑھائی
سے فارغ ہو جائے گا تو وہ میری شادی اس سے کروادے گی۔اس وقت وہ
نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں ان کے گھر میں کوئی دو مہینہ رہی۔میرے
والد مجھے لاہور میں تلاش کر رہے تھے۔ایک دن ملٹری نے آکر اس گھر کو گھیر لیا
اور مجھے وہاں سے آزاد کروا کے لے گئی۔''(٦)

جی ڈی کھوسلہ کی دی ہوئی تفصیل ایک طرفہ سی معلوم ہوتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں
کہ مغربی پاکستان میں مسلم عوام نے غیر مسلم لوگوں پر بے انتہا ظلم ڈھائے۔لیکن مشرقی پنجاب اور
ہندوستان کے دیگر صوبوں جیسے یوپی اور بہار میں ہندوؤں اور سکھوں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ کوئی
کم زیادتی نہیں کی۔ دراصل اس زمانے میں سرحد کے دونوں طرف انسان وحشی درندے بن گئے
تھے اور انہوں نے اپنے ادب، تہذیب اور پدری اقدار کو نظر انداز کر کے صرف لوٹ مار اور ہوس پرستی
کو ہی اپنا نصب العین بنا لیا تھا۔مشرقی پنجاب میں جو فسادات ہوئے ان کی نوعیت کا کوئی خاطر خواہ
تذکرہ جی ڈی کھوسلہ نے کہیں نہیں کیا۔لیکن بہار میں ہوئے ظلم و تشدد کا کچھ حد تک حوالہ دیا ہے۔ لکھتے
ہیں اکتوبر کے مہینے میں ہندوؤں نے مشرقی بنگال میں ان کے اوپر کیے گئے ظلموں کی مزاحمت میں کئی
جلسے کیے۔اس وقت کے افسران نے حالات کا مناسب جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ان جلسوں پر
پابندی لگانا کوئی عقلمندی کی بات نہیں کیونکہ ایسا کرنے سے ہندوؤں کے جذبات بھڑک اٹھیں گے اور
وہ تشدد پر آمادہ ہو جائیں گے۔اس لیے حکومت نے ان پر پابندی نہ لگا کر صرف لوگوں کو تنبیہ کی کہ وہ
امن قائم رکھیں اور کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے فرقہ وارانہ تعصب کو تقویت پہنچے۔لیکن ان کی
ہدایات کا الٹا اثر ہوا۔اسی دوران ہندو مسلمان فسادات کی ابتدا ہوئی جو رفتہ رفتہ دوسرے علاقوں میں
بھی پھیلنے لگی اور تھوڑے ہی عرصے میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔فساد کی ابتدا چھپرا سے ہوئی جو سرن

ڈسٹرکٹ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ کچھ ہندو بد معاشوں نے ایک لیگی کارکن کو بری طرح زدوکوب کیا۔ شام تک اور بھی کئی جگہ سے فرقہ وارانہ تصادم کی خبریں موصول ہونے لگیں۔ میگھر ڈسٹرکٹ کے جمال پور شہر میں جہاں ہندو کالی کی پوجا کر رہے تھے وہاں کسی شرپسند عناصر نے پتھر پھینکے لیکن جلد ہی پولیس نے حالات پر قابو پالیا۔ لیکن تھوڑے ہی وقفے میں فسادات طول پکڑ گئے اور چھپرا اور اس کے اردگرد کے علاقے بھی آتش زنی کے گھیرے میں آ گئے۔ منگھیر ڈسٹرکٹ میں ہی بھاگل پور اور تارا پور علاقے میں بھی بلوا ہو گیا۔

مندرجہ بالا حالات کے زیر اثر پنڈت جواہر لال نہرو نے بہار کے بہت سارے علاقوں کا طوفانی دورہ کیا اور مسلمانوں پر کیے گئے مظالم کو دیکھ کر ہندوؤں کو برا بھلا کہا اور انہیں بتایا کہ بدلے کے اقدام سے حالات اور بگڑیں گے اور امن کو نقصان پہنچے گا۔ انہوں نے مسلمانوں سے ہمدردی کا اظہار کیا اور انہیں اپنی ہمت اور آپسی امن برقرار رکھنے کا مشورہ دیا۔ لیکن اس کے باوجود بہار میں امن قائم نہ ہو سکا اور ایک اندازے کے مطابق اس صوبے میں کوئی پانچ ہزار سے زیادہ مسلمانوں کا قتل ہوا اور تقریباً دو ہزار کے قریب زخمی ہوئے۔ ایک بڑی تعداد میں مسلمان عورتوں کو اغوا کر لیا گیا اور ان کی عصمت دری کی گئی۔

ہندو مسلم فسادات میں جتنی جانیں تلف ہوئیں ان کا اندازہ پنڈریل مون نے لگانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دسمبر 1947 میں انہوں نے مغربی پاکستان اور بہاول پور میں مارے گئے انسانوں کی تعداد کا اندازہ لگایا ہے۔ انہوں نے بہاول پور اور اس کے پڑوسی علاقوں میں قتل کیے گئے لوگوں کا اندازہ تقریباً سو فیصدی ٹھیک لگایا ہے کیونکہ وہ اس علاقے سے بخوبی واقف تھے۔ دوسرے علاقوں کے متعلق بھی ان کے ماتحت افسروں اور مجسٹریٹوں نے انہیں تقریباً صحیح اطلاع بہم پہنچائی تھی۔ اس لیے ان کا اندازہ کافی حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔ اس وقت مغربی پنجاب کے گورنر سر فرانس مڈی تھے۔ انہوں نے بھی قتل شدہ لوگوں کی تعداد کا اندازہ لگایا تھا اور ان کا اندازہ مون کے اندازے کے تقریباً مطابق ہی تھا۔ پنڈریل مون لکھتے ہیں:

"مجھے دیگر مقامات پر مرنے والوں کی تعداد کا علم تو نہیں تھا لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ مشرقی پنجاب میں ان کی تعداد مغربی پنجاب سے زیادہ تھی۔ اس

وقت مجھے لگتا تھا کہ ہندوستان میں مرنے والوں کی تعداد اس سے دگنی یعنی 1,20,000 ہوگی۔ اس لحاظ سے پنجاب، بہاول پور اور پنجاب کے دیگر صوبوں میں مرنے والوں کی کل تعداد کا اندازہ 1,80,000 لوگوں کا تھا۔ لیکن پاکستان میں فرنٹیر، بلوچستان اور سندھ میں اور ہندوستان میں بیکانیر، بھرت پور اور الور میں مقابلتاً کم لوگ مارے گئے۔ اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ کل مرنے والے تقریباً 2 لاکھ ہوں گے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ ہندوستان میں مرنے والوں کی تعداد پاکستان میں مرنے والوں کی تعداد سے دگنی نہ تھی اس لیے میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔'' (۷)

جی ڈی کھوسلہ کی کتاب سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ اس نے وہی لکھا جو اسے پاکستان سے آئے ہندو مصیبت زدگان نے بتایا۔ اس میں ان کی ذاتی دریافت کو کوئی دخل نہیں تھا۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس تفصیل میں انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں ہوئے مظالم کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس لیے اس کا بیان سو فی صدی قابل اعتبار نہیں سمجھا جا سکتا۔

﴿کتابیات﴾

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر/پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱)	The Partition Omnibus (Stern Reckoning)	گوپال داس کھوسلہ	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔نئی دہلی	1987	306
۲)	The Partition Omnibus (Stern Reckoning)	گوپال داس کھوسلہ	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔نئی دہلی	1987	xi
۳)	فیض نامہ	ایوب مرزا	کلاسیک۔لاہور	2005	97
۴)	The Partition Omnibus (Stern Reckoning)	گوپال داس کھوسلہ	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔نئی دہلی	1987	230
۵)	The Partition Omnibus (Stern Reckoning)	گوپال داس کھوسلہ	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔نئی دہلی	1987	231
۶)	The Partition Omnibus (Stern Reckoning)	گوپال داس کھوسلہ	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔نئی دہلی	1987	232
۶)	The Partition Omnibus (Stern Reckoning)	گوپال داس کھوسلہ	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔نئی دہلی	1987	293

☆☆☆☆

پانچواں باب

راولپنڈی سازش

۱۔ سازش کی نوعیت اور سازشیوں کی کارکردگی

۲۔ مقدمے کی کاروائی

۳۔ فیصلہ اور سزائیں

۱۔ سازش کی نوعیت اور سازشیوں کی کارکردگی

راولپنڈی سازش کچھ فوجی افسروں کی سب سے پہلی کوشش تھی جس کا مقصد قانونی طور پر منتخب حکومت کا تختہ الٹ کر حکومت کا اقتدار اپنے ہاتھوں میں لینا تھا۔ یہ ایک ایسی سازش تھی جس میں پاکستان کے فوجی افسروں نے ایک لادینی اور ترقی پسند سیاسی پارٹی سے ساز گانٹھ کر کے حکومت میں تبدیلی کرنے کی کوشش کی تھی حالانکہ بائیں بازو کے دانشور اس سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اینگلو امریکن بلاک نے ایک پلان گھڑا تھا جس کے تحت کچھ فوجیوں کی گرفتاری عمل میں آئی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد بائیں بازو کے دانشور اور ادیب روس کی کامیابی سے بہت متاثر ہوئے تھے اور ان کے مطابق معاشرے کی تمام برائیاں امریکہ کی کارکردگی سے تھیں۔ اس وقت کے چند جاگیردارانہ گھرانوں کی ہمدردی بھی روس کے ساتھ تھی۔ اگر چہ یہ لوگ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں تھے لیکن جو لوگ پارٹی کو کنٹرول کرتے تھے ان کے ساتھ اپنا رابطہ رکھتے تھے۔ کمیونسٹوں کا خیال تھا کہ امریکہ کی طرف داری کرنے والے عناصروں کو یہ ڈر تھا کہ کہیں پاکستان روس کے اثر میں نہ آجائے اور یہ ڈر ہی اس سازش میں فوجیوں کو گرفتار کروانے کے پس پردہ تھا۔ لیکن حقیقت کچھ اس کے برعکس تھی۔ کچھ حب الوطن فوجی افسر یہ چاہتے تھے کہ پاکستان کی حکومت اپنی خارجی اور ڈیفنس پالیسی برطانیہ اور امریکہ کے مفاد کے زیر اثر نہ بنائے بلکہ صرف پاکستان کے حق میں ہی بنائے۔ اس کے برعکس امریکہ کی نظروں میں روس اور اس سے ملحقہ علاقوں پر حملہ کرنے کے لیے پاکستان کی ایک خاص اہمیت تھی۔ اس لیے ان کے مطابق پاکستان میں حب الوطنی کو کھلی چھوٹ نہیں دی جاسکتی۔

کمیونسٹ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کوئی سازش تھی ہی نہیں لیکن یہ دعویٰ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ کیپٹن ظفر اللہ پوشنی اور میجر حسن خان جو اس سازش میں شامل تھے ان کا کہنا ہے کہ 23 فروری 1951 کو میجر جنرل اکبر خان کے گھر پر میٹنگ ہوئی تھی جس میں حکومت کا تختہ اُلٹنے کی تجویز پر غور ہوا تھا۔ اس لیے کمیونسٹوں کی یہ دلیل کہ سازش ہوئی ہی نہیں تھی قابل قبول نہیں لگتی۔ دراصل تمام افسران جو سازش میں پکڑے گئے تھے اور کچھ غیر فوجی جو اس میں شامل تھے سب مانتے ہیں کہ سازش تو ہوئی تھی لیکن وہ صرف اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ مقدمہ قانون کے مطابق نہیں چلایا گیا۔ سازش سے متعلق ملک کا قانون کیا تھا اس مسئلے پر عدالت کے فیصلے میں بڑی تفصیل سے بحث ہوئی ہے۔ ان کے مطابق ایسی سازش پاکستان کے پینل کوڈ کے دفعہ 121 کے مطابق سزا کی مستحق ہے۔ دراصل 1972 میں میجر اسحٰق اور ایر کموڈور ایم کے جنجوعہ کا ایک مقالہ پاکستان کے مشہور رسالے میں شائع ہوا تھا جس میں ان دونوں نے اس بات سے انکار کیا تھا کہ وہ اس سازش میں شامل تھے لیکن انہوں نے سازش کی حقیقت سے بالکل انکار نہیں کیا۔

اس سازش کا سنسنی خیز انکشاف پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے 9 مارچ 1951 کو ریڈیو پاکستان سے کیا۔ بعد میں لیاقت علی خان کا بیان روز نامہ 'امروز' میں شائع ہوا۔ اس بیان میں انہوں نے فرمایا:

> "(لاہور 9 مارچ 1951) پاکستان کے دشمنوں کی تیار کردہ ایک سازش کا انکشاف ابھی ہوا ہے۔ اس سازش کی غرض و غایت یہ تھی کہ متشدد ذرائع سے ملک میں ہلچل پیدا کی جائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے پاکستان کی دفاعی فوجوں کی وفاداری ختم کردی جائے۔ حکومت کو اس سازش کا علم بروقت ہوگیا۔ چنانچہ آج سازش کے سرغنہ لوگوں کو گرفتار کرلیا گیا جو میجر جنرل اکبر خان چیف آف دی جنرل اسٹاف، بریگیڈیر ایم۔ اے۔ لطیف (بریگیڈیر کمانڈر کوئٹہ)، مسٹر فیض احمد فیض ایڈیٹر پاکستان ٹائمز اور بیگم اکبر خان (اہلیہ میجر اکبر خان) پر مشتمل ہیں۔
>
> سازش میں شریک دونوں فوجی افسروں کو فوراً خدمات سے برطرف کردیا گیا ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ سازش جڑیں پکڑنے سے پیشتر

منکشف ہوگئی۔ یقیناً میری طرح پاکستان کے عوام کو بھی اس سازش کی اطلاع سے بے حد صدمہ پہنچے گا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ عوام اچھی طرح محسوس کریں گے کہ قومی تحفظ کی وجوہ کی بنا پر میرے لیے یہ بتانا ناممکن ہے کہ جو لوگ سازش میں شریک تھے ان کی اسکیم کی تفصیل کیا ہے۔ میں اس موقع پر صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان لوگوں کی اسکیم خدانخواستہ کامیاب ہو جاتی تو اس سے ہماری قومی زندگی کی بنیاد پر کاری ضرب لگتی اور پاکستان کا استحکام درہم برہم ہو جاتا۔ اگر یہ سازش ناکام ہوئی ہے تو اس کا سہرا ان لوگوں کے سر جاتا ہے جو پاکستانی فوجوں کی سلامتی کے تحفظ کے ذمہ دار ہیں۔ یقیناً اس سازش کی ناکامی پاکستان کی مسلح فوجوں کی غیر متزلزل وفاداری کے لیے ایک خراج تحسین ہے جو چند شر انگیز غدار سازشیوں کی شرارت سے بالکل متاثر نہ ہوئے اور انہوں نے پاکستان کے ان دشمنوں کی ساری ناپاک کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ ہم سب کو ان کی چوکسی کی وجہ سے خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کرنا۔ مجھے بے حد افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مجھے پاکستانی فوج کے دو بڑے افسروں کے خلاف اقدام کرنا پڑا ہے۔ لیکن ایسے حالات میں جب پاکستان کی دفاع پر برا اثر پڑنے کا خطرہ پیدا ہو وزیر اعظم اور وزیر دفاع کی حیثیت سے میرے فرائض واضح ہیں۔ مجھے پورا اعتماد ہے کہ میں نے اس سلسلے میں جو ناخوشگوار فرض ادا کیا ہے اس میں مجھے ساری قوم بالخصوص پاکستان کی دفاعی فوجوں کا پورا اعتماد حاصل رہا ہے۔ چنانچہ میں دفاعی فوجوں کے ہر شعبے کے سپاہیوں اور افسروں سے تعلق رکھتا چلا آیا ہوں۔ میں نے ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا جس کی وفاداری فوج سے تعلق رکھنے والوں سے بڑھ کر ہو اور جو اپنے ملک کو خون سے سینچنے کے لیے فوج سے بلند جذبات رکھتا ہو۔ دفاعی فوجوں نے ثابت کر دیا ہے کہ کوئی تخریبی اقدام انہیں ان کی غیر متزلزل وفاداری سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔ مین ان لوگوں کے اقدام کی داد دیتا ہوں جنہوں نے پاکستان کے ان دشمنوں کے اقدام کی

مخالفت کی ہے۔ ساتھ ہی مسلح فوجوں کو مبارکباد دیتا ہوں جنہوں نے پاکستان
سے پوری پوری وفاداری کا اظہار کیا ہے اور انتشار پھیلانے والے عناصر سے
متاثر نہیں ہوئے۔ یقیناً ان کی ان ہی صفات کی وجہ سے دشمنوں کی سازش
ناکام ہوئی۔ ساری قوم اس سلسلے میں مسلح فوجوں کی شکر گذار ہے۔ مجھے یقین
ہے کہ اس طرح خراج تحسین ادا کرنے میں ساری قوم میری ہمنوا ہے۔''(۱)

اس بیان کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کے دلوں میں گرفتار شدگان کے خلاف بے انتہا نفرت بھر گئی اور لوگوں نے مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ ان تمام سازشیوں کو فوراً سزائے موت دی جائے۔ کوئی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرر ہا تھا کہ یہ لوگ کس بنا پر غدار قرار دیئے جا رہے ہیں۔ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے گرفتار شدگان کے خاص دوستوں نے بھی خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ لیکن اس شک وشبہ کے ماحول میں بھی ایک دلیر شخص نے ان معصوم انسانوں کے حق میں آواز بلند کی۔ یہ شخص حمید نظامی تھا جو 'نوائے وقت' کا مدیر اعلیٰ تھا اور فیض احمد فیض کا دیرینہ ساتھی تھا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ گرفتار شدگان پر باقاعدہ مقدمہ چلایا جائے اور انہیں اپنی صفائی دینے کا موقع دیا جائے۔ اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو انصاف کا تقاضہ پورا نہ ہو پائے گا۔ اور اگر انصاف کا تقاضہ پورا کیے بغیر انہیں سزا دی گئی تو وہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہوگی۔ 'نوائے وقت' کے ایک شمارے میں انہوں نے فیض کے بارے میں یہ بھی لکھا کہ

''جرم ثابت ہونہ ہو وہ الگ بات ہے، لیکن جو کچھ انہوں نے کیا وہ اتنا برا نہیں ہے۔''

سوائے حمید نظامی کے تمام ملک میں سازشیوں کے خلاف بہت سخت ناراضگی تھی۔ 'ڈان' کے مدیر جناب الطاف حسین کی صدارت میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں ملک کے 18 روز ناموں کے ایڈیٹروں نے حصہ لیا اور انہوں نے متفقہ طور پر ایک ریزولیشن پاس کیا جس میں اس سازش کی مزمت کی گئی۔ انہوں نے ایک اور ریزولیشن بھی پاس کیا جس کے ذریعے وزیر اعظم کے اقدام کو سراہا گیا۔ یہ بھی طے ہوا کہ ایڈیٹرز کی یہ میٹنگ اپنی غیر مشروط اخباری امداد ہر کسی ایسے اقدام کے لیے موقف کرتی ہے جو حکومت اٹھانا ضروری سمجھے چاہے وہ کتنے ہی سنگین ہوں۔

ظاہر ہے کہ سازش کی خبر نے پورے پاکستان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ 9 مارچ 1951 کو وزیر اعظم نے سازش کا انکشاف کرتے ہوئے اپنا بیان دیا تھا۔ اگلے ہی روز یعنی 10 مارچ 1951 کو

پاکستان ٹائمز کے صفحہ اول پر بہت بڑی سرخی میں یہ خبر شائع ہوئی۔

''چیف آف جنرل اسٹاف کو گرفتار کرلیا گیا۔

بریگیڈیر لطیف اور فیض کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔

مبینہ سازش کے ذریعے تشدد آمیز فضا کو جنم دینا تھا۔

پرائم منسٹر کا اعلان''

انہی دنوں ملک میں الیکشن ہونے والے تھے جو حکومت وقت نے مقررہ وقت پر کروائے۔ لوگ سازش کے انکشاف سے ڈرے اور سہمے ہوئے تھے اس لیے گھروں سے باہر ہی نہ نکلے۔ جس سے مسلم لیگ کو بہت فائدہ ہوا۔ سازش کی خبر سے مسلم لیگ کا پلڑا بھاری ہوگیا اور جو پارٹی جیتنے کی کوئی امید نہیں رکھتی تھی وہ بڑی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی۔

سازش کی تفصیل بعد میں بیان کی جائے گی۔ فی الحال یہ جاننا ضروری ہے کہ اس سازش کے انکشاف کا پس منظر کیا تھا۔ ایسا جان پڑتا ہے کہ حکومت کو 1949 سے اس کی بھنک پڑ گئی تھی اس لیے اس سازش کے سرغنوں پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھی۔ فروری 1951 میں سی آئی ڈی NWFP کے انسپکٹر اصغر علی شاہ نے یہ اطلاع دی کہ چند فوجی افسر غیر آئینی طور پر حکومت کا تختہ الٹنے میں مصروف ہیں۔ اصغر علی کے اکبر خان سے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ اکثر حکوت کے خلاف ان سے کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کرلیتے تھے۔ اس لحاظ سے اصغر علی کو اس بات کا علم تھا کہ اکبر خان حکومت گرانے کی سازش کررہے ہیں۔ اس سلسلے میں اکبر خان اکثر اصغر علی سے یہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے کہ وزیراعظم اور گورنر جنرل کب پشاور آنے والے ہیں اور ان کی حفاظت کے انتظامات کیا ہوں گے۔ اصغر علی شاہ کا ایک بھائی تھا جس کا نام لیفٹننٹ کرنل سلطان علی شاہ تھا جو ان دنوں جنرل ہیڈ کوارٹر اسلحہ، راولپنڈی میں تعینات تھا۔ 19 فروری 1951 کو اکبر خان نے اصغر علی کو اس کے بھائی کی معرفت یہ پیغام بھیجا کہ وہ اسے 20 فروری کو ایک سرکاری کام کے سلسلے میں ملنے کے لیے آئے۔ اصغر علی نے انسپکٹر جنرل پولیس جی۔ ایچ کیانی سے اجازت طلب کی اور اسی روز رات کی گاڑی سے روانہ ہوگیا۔ اکبر خان کو تلاش کرتے ہوئے اصغر علی ان کے گھر پہنچا جہاں اس کی ملاقات بیگم نسیم اکبر خان سے ہوئی۔ تھوڑی دیر میں اکبر خان بھی آگئے اور کہا کہ وہ زیادہ دیر انتظار نہیں

کر سکتے۔تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اور بہت سارے ملٹری افسر حملے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔

اکبر خان نے یہ بھی کہا کہ انہوں نے لسٹ کا معائنہ کرلیا ہے اور وہ تمام افسر اس لسٹ میں ہیں جنہوں نے کشمیر میں ہندوستان کے خلاف جنگ لڑی ہے۔ اصغر علی شاہ 23 فروری کو لوٹ کر پشاور پہنچا اور کیانی کو بتایا کہ وہ روالپنڈی میں اکبر خان سے ملا ہے اور کہ کچھ فوجی افسران حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کرر ہے ہیں اور ان کا ارادہ مارچ کے پہلے ہفتے حکومت پر ضرب لگانے کا ہے۔ فوج کے کچھ دستے پہلے سے طے شدہ مقامات پر روانہ کردیئے جائیں گے۔ وزیر اعظم کو گرفتار کرلیا جائے گا اور وزیروں و دیگر اعلیٰ افسروں کو بھی حراست میں لے لیا جائے گا۔شروع میں اصغر علی نے متعلقہ فوجی افسروں کے ناموں کا اعلان نہیں کیا اور جو رپورٹ اس نے کیانی کو بھیجی اس میں صرف اکبر خان سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا۔ چونکہ اس وقت انسپکٹر جنرل، ڈپٹی انسپکٹر جنرل اور چیف منسٹر موجود نہیں تھے اس لیے کیانی نے حالات کی نزاکت کے مدنظر اسی دن گورنر جنرل سے ملاقات کی اجازت مانگی۔ وہ اگلے دن یعنی 24 فروری کو ہی گورنر جنرل سے ملاقات کر پایا۔ اس نے گورنر جنرل کے حوالے اصغر علی کی رپورٹ کی اور انہیں وہ سب کچھ بتایا جو اسے اصغر علی سے معلوم ہوا تھا۔ گورنر جنرل نے کیانی سے کہا وہ اصغر علی سے مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ لہٰذا کیانی نے لگا تار تین دن یعنی 24 ، 25 اور 26 فروری کو اصغر علی سے کئی سوالات کیے۔ گفتگو کے دوران کیانی نے ان افسروں کے نام معلوم کر لیے جو اس عمل میں شریک ہونے والے تھے۔ اصغر علی نے یہ بھی کہا کہ اگر اکبر خان کے گھر پر چھاپہ مارا گیا تو ثبوت کے طور پر بہت سے دستاویز دستیاب ہونگے جو اس سازش پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

جس روز اصغر علی نے سازش کا انکشاف کیا اس دن میجر جنرل اکبر خان کے گھر میں مختلف درجے کے فوجی افسروں کی میٹنگ ہو رہی تھی جس کی صدارت اکبر خان خود کرر ہے تھے۔ ان میں تین کمیونسٹ رہنما بھی شامل تھے۔ اس میٹنگ میں یہ طے کرنا تھا کہ کس روز کاروائی پر عمل درآمد کیا جائے۔ میجر جنرل اکبر خان حاضرین کو مخاطب کر کے کہہ رہے تھے کہ سب کو ان کے طے شدہ پلان کو قبول کرنا کیونکہ اس کی کامیابی یقینی ہے۔ ظفر اللہ پوشنی کے مطابق میٹنگ میں ہر شخص گھبرایا ہوا تھا اور نہ صرف صدیق راجہ بلکہ دوسرے لوگ بھی اس پلان کے حق میں نہیں تھے۔ ظفر اللہ پوشنی اس سلسلے

میں لکھتے ہیں:

''23 فروری 1951 کو میجر جنرل اکبر خان کے گھر پر ایک میٹنگ ہوئی جس میں بہت سے فوجی افسران کے علاوہ سید سجاد ظہیر، فیض احمد فیض اور محمد حسین عطا بھی شامل تھے۔ اس میٹنگ میں وہ دو فوجی افسر بھی شامل تھے جو بعد میں وعدہ معاف گواہ (approver) بنائے گئے یعنی لیفٹننٹ کرنل صدیق راجہ اور میجر یوسف سیٹھی۔ جنرل اکبر خان نے اپنا پلان پیش کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ چند ہفتوں بعد راولپنڈی میں گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین اور وزیر اعظم لیاقت علی خان آنے والے ہیں، انہیں گرفتار کرلیا جائے۔ گورنر جنرل سے اعلان کروادیا جائے کہ فوری طور پر لیاقت حکومت کو برطرف کیا جاتا ہے۔ پھر ایک نئی حکومت تشکیل کی جائے، جس کے سربراہ غالباً اکبر خان ہی بنتے۔ فوج کی زیر نگرانی الیکشن کرانے کا بھی ذکر تھا۔ کشمیر، زرعی اصلاحات اور دیگر کئی مسائل پر بھی جنرل صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس واقعہ کو 41 سال گزر چکے ہیں اور جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیلات تو اب مجھے یاد نہیں رہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ سات آٹھ گھنٹے کی بحث اور مغز ماری کے بعد اور معاملے کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد اس اسکیم کو اتفاق رائے سے رد کر دیا گیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جائے گا۔

بعد میں جب گرفتاریاں ہوئیں اور ہم لوگ خصوصی عدالت میں بطور ملزمان پیش ہوئے تو استغاثہ نے وعدہ معاف گواہوں سے صرف اتنا جھوٹ بلوایا کہ اس میٹنگ میں حکومت کا تختہ الٹنے پر اتفاق ہوگیا تھا۔'' (۲)

ظفر اللہ پوشنی کے مطابق پلان رد کر دیا گیا تھا لیکن درحقیقت سازش کو فی الحال صرف ملتوی ہی کیا گیا تھا۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ جنرل اکبر خان کراچی جا کر ایر کموڈور جنجوعہ سے مشورہ کریں کہ پلان کو عمل میں لانے کا طریقہ کار کیا ہونا۔ اکبر خان 25 فروری کو کراچی کے لیے روانہ ہوئے اور اپنے پرائیویٹ سیکریٹری کو یہ ہدایت کردی کہ وہ 26 فروری کو اصغر علی شاہ کو یہ پیغام بھیج دے کہ ''جس کام

کے لیے آپ آئے تھے وہ ابھی نہیں کرنا ہے۔'' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پلان کو ترک نہیں کیا گیا تھا بلکہ صرف ملتوی کیا گیا تھا۔

لیفٹننٹ کرنل محمد صدیق راجہ شروع میں سازش میں شریک تھا لیکن بعد میں وعدہ معاف گواہ بن گیا۔ اس نے مخصوص عدالت کے روبرو جو بیان دیا تھا اس میں اس نے کہا تھا کہ اس نے اس پلان پر اس وجہ سے شبہ ظاہر کیا تھا کیوں کہ اس میں فوجی افسروں کے علاوہ تین کمیونسٹ بھی تھے۔ میٹنگ کے فوراً بعد صدیق راجہ نے فوراً بریگیڈیر حبیب اللہ سے رابطہ قائم کیا اور اسے تمام حالات سے آگاہ کیا۔ حبیب اللہ نے حالات کی نزاکت کے بارے میں صدیق راجہ سے اتفاق کیا اور اور اسے کہا کہ جیسے ہی سازش کو عمل میں لانے کی کوئی تاریخ مقرر ہو وہ اسے فوراً اس کی اطلاع دے۔ ان دنوں حبیب اللہ ڈپٹی چیف آف جنرل اسٹاف کے عہدے پر فائز تھا۔

پنجاب میں صوبائی انتخابات 10 مارچ کو ہونے والے تھے اور وزیر اعظم لیاقت علی خان الیکشن پروپیگنڈا کے سلسلے میں صوبے کا دورہ کر رہے تھے۔ اس وقت صوبہ سرحد کے گورنر جنرل جناب آئی آئی چندریگر تھے۔ انہوں نے سی آئی ڈی کی رپورٹ وزیر اعظم تک پہنچائی۔ وزیر اعظم 26 فروری کو سرگودھا پہنچے اور جنرل ایوب خان کو وہیں طلب کیا۔ جنرل ایوب خان ابھی حال ہی میں یعنی 16 فروری 1951 کو پاکستانی فوج کے کمانڈران چیف مقرر ہوئے تھے۔ سکندر مرزا ڈیفنس منسٹر تھے۔ وزیر اعظم نے انہیں سرگودھا آکر ان سے ملنے کی ہدایت دی۔ دوپہر کے کھانے کے وقت وزیر اعظم لیاقت علی خان نے سی آئی ڈی کی رپورٹ کا تذکرہ کیا جس کے مطابق فوجی افسر حکومت کا تختہ الٹنے والے تھے۔

سرگودھا سے جنرل ایوب خان اور سکندر مرزا سیدھے پشاور گئے اور انہوں نے گورنر جنرل سے ملاقات کی۔ وہاں کیانی سے مزید اطلاع طلب کی گئی جس کے لیے ایوب خان اور اصغر علی دونوں نے کیانی سے بڑی تفصیل سے بات چیت کی۔ پشاور میں ہوئی بات چیت اور اس سے وابستہ حالات کا جائزہ جنرل ایوب خان نے اپنی کتاب Friends not Masters میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جب میں کیانی سے سوال جواب کر رہا تھا تب سکندر مرزا مُخبر سے پوچھ تاچھ
> کر رہے تھے۔ بہت جلد یہ ظاہر ہو گیا کہ بغاوت کی سازش کی اسکیم تیار کی گئی

تھی۔ سازشیوں میں بریگیڈیر صدیق بھی تھا جو کسی زمانے میں میرے ہی یونٹ میں کام کرتا تھا اور بنوں کی بریگیڈ کی رہنمائی کر رہا تھا۔ میں نے اسے لانے کے لیے ایک خاص ہوائی جہاز بھیجا اور جب وہ آیا تو میں نے اس سے کہا ''صدیق تم مجھے سب سچ سچ بتادو ورنہ میں تمہیں رسی سے باندھ کر الٹا لٹکا دوں گا۔'' صدیق نے سازش کے علم سے بالکل انکار کیا اور کہا کہ سی آئی ڈی کی رپورٹ بے بنیاد ہے۔ اور ہم نے اسے بنوں لوٹنے دیا۔ وہاں جا کر اس نے کرنل ارباب کو ٹیلیفون کیا جو بعد میں معلوم ہوا، کہ ایک اور سازشی تھا۔ صدیق نے اسے بتایا کہ راز فاش ہو چکا ہے۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش گھڑی جا رہی ہے۔''(۳)

میجر جنرل اکبر خان کو میجر جنرل کا رتبہ دسمبر 1950 میں عطا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں میجر جنرل ہیڈ کوارٹرز راولپنڈی میں چیف آف جنرل اسٹاف مقرر کیا گیا۔ اس وقت جنرل ایوب خان ڈپٹی کمانڈر ان چیف تھے اور تھوڑے ہی دنوں میں کمانڈر ان چیف بننے والے تھے۔ اکبر خان نے یہ بات ان پر پوری طرح واضح کر دی تھی کہ کشمیر کی جنگ بندی کے سلسلے میں حکومت کے ساتھ ان کی اختلاف رائے ہے۔ اس لیے نہ تو ان کی ترقی اس مرحلے پر واجب ہے اور نہ ہی ان کا چیف آف جنرل اسٹاف کا تقرر مناسب ہے۔ ایوب خان نے ان سے کہا کہ وہ تمام حالات سے واقف ہیں اور چونکہ انہوں نے خود ہی حکومت سے اکبر خان کو مانگا ہے اس لیے انہیں یہ تقرر قبول کر لینا۔ اس سلسلے میں Raiders in Kashmir میں اکبر خان لکھتے ہیں:

''23 فروری 1951 کو میرے مکان پر وہ آخری میٹنگ ہوئی جسے بعد میں راولپنڈی سازش کیس کا نام دیا گیا۔ اس میٹنگ میں چند دوسرے لوگوں کے علاوہ پاکستان ٹائمز کے فیض احمد فیض اور محمد حسین عطا بھی شریک تھے۔ سات گھنٹے کے غور و غوض کے بعد میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ قبل ازیں جس اقدام کی تجویز پیش ہوئی تھی اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

میں نے اجلاس میں جو تجویز پیش کی تھی اس کا ماحصل یہ تھا کہ کشمیر میں

کسی طرح کی کاروائی کرنے سے پہلے پاکستان میں ایک ایسی حکومت کے قیام کی ضرورت ہے جو ہماری پشت پناہ ہو۔ گورنر جنرل کی جانب سے مجوزہ اعلان کا مسودہ جو میرے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے راولپنڈی سازش کیس کی یاداشتوں میں اب تک محفوظ ہے۔ اس اعلان کے خاص نکات یہ بھی تھے کہ پرانی حکومت برخاست کردی جائے اور اس کی جگہ ایک نگران سول حکومت قائم کردی جائے، بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کی تاریخ مقرر ہوگی، آئین مرتب کرنے کے لیے ایک آئین ساز اسمبلی بنائی جائے گی۔ فوج کی غیر جانب دار مشینری استعمال کرکے انتخابات کے یکسر غیر جانب دار ہونے کی ضمانت دی جائے گی اور تمام جرنیلوں پر مشتمل ایک مشاورتی فوجی کونسل قائم کی جائے گی۔۔۔۔۔

میرے خیال کی رو سے 23 تاریخ کے فیصلے کے بعد سارا معاملہ ختم ہوگیا اور اب میرے لیے کچھ اور کرنا باقی نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ جو کچھ اب تک ہو چکا ہے حکومت کو اس کی خبر نہیں ہوگی۔ البتہ میں اس کاروائی سے بے خبر تھا جو میرے خلاف شروع ہو چکی تھی۔ پنجاب میں انتخابات سے ایک روز پہلے 9 مارچ 1951 کی صبح کو ہمیں گرفتار کرنے کا منصوبہ تیار کیا جا چکا تھا۔

اس وقت اس معاملے میں بہت کچھ کہا گیا اور جب سے اب تک بہت کچھ کہا جاتا رہا ہے کہ ہم نے اگر یہ کاروائی کی ہوتی تو بہت سے لوگوں کو ہلاک کردیا جاتا اور معلوم نہیں کیا کچھ ہوتا۔ لیکن یہ سب باتیں قطعی غلط ہیں۔ مقدمہ سازش میں استغاثہ کے اپنے گواہوں نے اور سلطانی گواہوں نے بھی عدالت کے سوالوں کے جواب میں یہ شہادت دی کہ کسی شخص کو گولی مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا بلکہ کوئی فرد گرفتار بھی نہ ہوتا۔ ٹریبونل کے جسٹس سر عبدالرحمن بہت حیران ہوئے جب انہیں مختلف سوالوں کے جواب ملے کہ میں نے بندوقوں کو کارتوس سے خالی رکھنے کی ہدایت کی تھی اور یہ کہ ایک فرد بھی میرے رائے میں گرفتاری

کے لائق نہیں تھا۔ اس کے باوجود بھی یہ حقائق ہر شخص کو بخوبی معلوم تھے۔ لیکن بہت سے لوگ اب تک یہ دعوے کرتے آئے ہیں کہ ہمیں ہلاک یا گرفتار کیا جانے والا تھا۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ یہ لوگ حکومت کی نظر میں مقبول اور اس کے محبوب بن جائیں۔" (۴)

بریگیڈیر صدیق راجہ کا کردار راولپنڈی سازش کیس میں بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ شروع میں تو وہ سازش میں شریک ہوا لیکن بعد میں میجر یوسف سیٹھی کے ہمراہ سلطانی گواہ بن گیا۔ اس کے بارے میں میجر جنرل اکبر خان کہتے ہیں کہ جس صبح گرفتاریاں ہونے والی تھیں اس سے پہلے صدیق راجہ جو اپنی رپورٹ جنرل ایوب خان کو پہلے ہی پہنچا چکا تھا، اکبر خان کو ملنے آیا اور انہیں بتایا کہ ان کے خلاف کاروائی شروع ہونے والی ہے۔ اس سلسلے میں صدیق راجہ نے اکبر خان کو یہ مشورہ دیا کہ انہیں اپنی حفاظت کے انتظامات طے کر لینے۔ یہ امر ثابت کرتا ہے کہ صدیق راجہ دو طرح کا کردار نبھا رہا تھا۔ جب پشاور میں وہ ایوب خان اور سکندر مرزا سے ملنے گیا تو اس میٹنگ کی سرگزشت کا ایک رخ جو جنرل ایوب خان نے ظاہر کیا اس کا ذکر تو اوپر کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس کا دوسرا رخ صدیق راجہ نے خود بیان کیا ہے۔ دراصل حسن ظہیر نے اپنی کتاب The Rawalpindi Conspiracy , 1951 لکھنے سے پہلے صدیق راجہ کا انٹرویو لیا تھا جس میں اس نے پشاور کی میٹنگ کی روداد کچھ اس طرح بیان کی:

"مجھے ایوب خان نے میرن شاہ سے پشاور طلب کیا۔ یہ کوئی 27 فروری کی بات ہے۔ تب تک ایوب خان کو سازش کا علم ہو چکا تھا۔ اس میٹنگ میں ایوب خان، سکندر مرزا، اے ایس بی شاہ اور کیانی پہلے سے موجود تھے لیکن میرے آنے کے فوراً بعد کیانی اور شاہ رخصت ہو گئے۔ سکندر مرزا نے جب مجھ سے سازش سے متعلقہ سوالات کرنے شروع کیے تو ایوب خان نے انہیں روک دیا اور کہا "مجھے اپنے افسر پر پورا اعتماد ہے۔ وہ وہی کرے گا جو میں اسے کہوں گا۔" اس کے بعد سکندر مرزا بھی چلے گئے۔ ایوب خان نے مجھ سے پوچھا کہ اکبر خان کیا کرنے والے تھے۔ میں نے جواب دیا کہ آپ نے ہی ان کی ترقی کا

حکم دیا ہے اور وہ آپ کے بغل میں ہی بیٹھتے ہیں۔اس لیے آپ کو ان کے بارے میں مجھ سے زیادہ علم ہے۔انہوں نے پھر آخر میں ہوئی میٹنگ کی تفصیل دریافت کرنا چاہی۔میں نے قبول کیا کہ اکبر جنگ شروع کرنا چاہتے تھے جس کا ذکر انہوں نے اکثر ایوب سے کیا تھا۔اس اثنا میں ایوب ایک ٹیلیفون سننے کے لیے باہر گئے جو ٹیلیفون غالباً بریگیڈیر حبیب اللہ کا تھا جنہوں نے ایوب خان کو یہ مشورہ دینے کے لیے ٹیلیفون کیا تھا کہ سازش کے سوالات کرنے میں وہ مجھ پر ناجائز دباؤ نہ ڈالیں۔بعد میں وزیراعظم نے ایوب خان سے رپورٹ طلب کی تو ایوب خان نے سازش کی سنجیدگی کو کئی گنا بڑھا کر بیان کیا کیونکہ وہ اس معاملے میں اتنے ہی گناہ گار تھے جتنے دوسرے۔''(۵)

26 فروری کی پوچھ تاچھ کے بعد اصغر علی اور کیانی دونوں کو گورنمنٹ ہاؤس بلایا گیا اور انہیں یہ فیصلہ سنایا گیا کہ اصغر علی کو لاہور جانا ہوگا جہاں ان سے مزید پوچھ تاچھ کی جائے گی۔چنانچہ اصغر علی کو ایک مخصوص جہاز کے ذریعے لاہور روانہ کیا گیا جہاں وہ 27 فروری کو یعنی اگلے دن پہنچا اور 28 فروری کی درمیانی رات کو انسپکٹر جنرل پنجاب عبدالقیوم نے اصغر علی کی کافی تفصیل سے چھان بین کی۔چونکہ کیس کیانی کے افسروں کے ہاتھ سے نکال کر پولیس کے حوالے کر دیا گیا تھا اس لیے کیانی اس تبدیلی سے ناخوش تھے۔مقدمے کے دوران کیانی شہادت دینے کے لیے کٹہرے میں کھڑے ہوئے تو انہوں نے کیس میں کوئی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔شاید یہی وجہ ہوگی کہ بعد میں کیانی ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئے اور حکومت اتنے بڑے اہم گواہ سے محروم ہوگئی۔

لیفٹیننٹ کرنل ضیاالدین جو ملزموں کی لسٹ میں شامل تھے ان کا کہنا ہے کہ جب ایوب خان کو یقین ہو گیا کہ سازش تو ضرور کی گئی تھی ،تو وہ یہ فیصلہ نہ کر پائے کہ اس کے بعد کیا کیا جائے۔شروع میں انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ جنرل نظیر کی نویں ڈویژن پوری کی پوری حراست میں لی جائے مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔حبیب اللہ غالباً ایک مخبر تھا جو ایوب خان کو خبریں پہنچاتا رہتا تھا۔آخر اسی کے مشورے سے جنرل ایوب خان نے محض سازشیوں کے سرغنہ اور چند چندہ شریک جرم شخصیتوں کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا۔ٹربیونل کے سامنے جو بیان صدیق راجہ نے دیا اس میں کہا کہ پہلی مارچ

1951 کو حبیب اللہ نے انہیں بتایا کہ اکبر خان کے پلان کا راز فاش ہو گیا ہے اس لیے کمانڈر ان چیف ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ صدیق راجہ سازش کے بارے میں جو کچھ جانتے تھے حرف بہ حرف انہوں نے کمانڈر ان چیف یعنی جنرل ایوب کو بتا دیا۔ 4 مارچ 1951 کو حبیب اللہ نے اپنی رپورٹ کمانڈر ان چیف کو پیش کی۔ دراصل حبیب اللہ جتنا ظاہر کر رہے تھے اس سے زیادہ چھپا رہے تھے۔ ان کے متعلق ٹربیونل نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کے کمانڈر ان چیف کے بعد حبیب اللہ واحد افسر ہے جن کو سازش کا علم تھا لیکن وہ صاحب اختیار لوگوں میں اپنی ساکھ قائم رکھنا چاہتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حبیب اللہ کا بیان اور ان کا رویہ قابلِ اعتبار نہیں تھا۔

مندرجہ بالا تمام تر سرگرمیوں سے بے خبر میجر جنرل اکبر خان سازش کے پلان کو مستحکم کرنے میں سرگرداں تھے۔ لطیف خان نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ اکبر خان نے انہیں کراچی آ کر ملنے کو کہا تا کہ چند عام فوجی معاملوں پر خیالات کا تبادلہ کیا جائے۔ لطیف خان کہتے ہیں کہ انہیں علم تھا کہ اکبر خان جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ اس قضیے سے دور رہنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جب اکبر خان نے ان پر حکم عدولی کا الزام لگانا چاہا تو ان کے پاس کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ چنانچہ وہ کراچی کے ہوائی اڈے پر اکبر خان سے ملے جہاں ایر کموڈور جنجوعہ بھی حاضر تھے۔ بعد میں اکبر خان نے ان دونوں کو بتایا کہ وہ مناسب ہدایت انہیں صحیح موقع پر بھیج دیں گے۔ یہ روداد بریگیڈیر لطیف کی وفات کے بعد Friday Times لاہور کے 25-19 اکتوبر 1995 کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں جو ثبوت ملے ان سے معلوم ہوا کہ ایر کموڈور جنجوعہ کو ایک اسپیشل جہاز سے کوئٹہ سے بریگیڈیر لطیف کو لانے کے لیے بھیجا تھا جس کا حکم اکبر خان نے دیا تھا جو جاننا چاہتے تھے کہ کراچی کو قابو میں رکھنے کے لیے وہ کیا مدد کر سکیں گے۔ تب تک لطیف خان سازش سے بددل ہو چکے تھے اور اس کی سرگرمیوں سے دور رہنا چاہتے تھے لیکن 26 فروری کو اکبر خان نے انہیں ایک خط لکھا جس میں ان کے بیچ پیدا شدہ غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی اور انہیں یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ پھر سے اس مقصد میں شریک ہو جائیں۔ چاہے اپنی مرضی سے چاہے اکبر خان کے دباؤ میں آ کر لطیف خان 28 فروری اور پہلی مارچ کو کراچی آئے اور اکبر خان کی میٹنگ میں حصہ لیا۔

شروع شروع میں اربابِ حکومت اکبر خان کو صرف مغربی پاکستان سے دور رکھنا چاہتے

تھے لیکن حالات اتنی تیزی سے عمل میں آئے کہ اکبر خان کے خلاف سخت قدم اٹھانے ضروری سمجھے گئے۔ لہٰذا وزیراعظم نے ایوب خان اور سکندر مرزا کی سفارش پر اکبر خان اور لطیف خان کی برطرفی کے احکامات جاری کر دیئے۔ لیکن کسی کو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بیگم نسیم اکبر خان اور فیض احمد فیض کو کن بنا پر حراست میں لیا گیا۔ سب کا اندازہ تھا کہ بیگم نسیم اکبر خان کو سازش میں شریک ہونے کے جرم میں اور فیض کو محض 23 فروری 1951 کی میٹنگ میں شامل ہونے کی وجہ سے گرفتار کرنا مناسب نہیں۔ ان چاروں کو اس لیے بنگال ریگولیشنز (Bengal regulations) کے تحت گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور ان کی رہائش گاہوں پر چھاپے مارنے کا حکم بھی صادر کیا گیا۔ لہٰذا میجر جنرل اکبر خان اور ان کی اہلیہ نسیم بیگم کی گرفتاری عمل میں لانے کے انتظامات بھی طے کیے گئے۔ اس مقصد کے لیے پنجاب کے کئی ضلعوں سے پولیس کے بڑے بڑے افسروں کو یہ کام سونپا گیا۔ 8 مارچ کی صبح سے ہی پولیس افسران نے راولپنڈی پہنچنا شروع کر دیا تھا۔ اس مہم کی لیڈرشپ سی آئی ڈی کے ملک حبیب اللہ کی سپرد کی گئی۔ جب وہ لاہور سے راولپنڈی آئے تو ان کے ساتھ منٹگمری (ساہیوال) کے ایس پی چودھری نظیر احمد، سی آئی ڈی کے ڈپٹی سپریڈنٹ اور ریلوے پولیس کے ڈپٹی سپریڈنٹ چودھری سکندر حیات بھی شامل تھے۔ وہ سب جناب نجف خان ایس پی راولپنڈی کے بنگلے پر اکٹھے ہوئے جہاں ایس پی کیمبل پور جناب مخدوم محمد رمضان پہلے سے موجود تھے۔ وہیں پر اگلے دن کا پروگرام طے ہوا اور یہ فیصلہ ہوا کہ وہ اگلے روز صبح 4 بجے وہیں ملیں گے۔ اگلی صبح جب وہ اکٹھے ہوئے تو پنجاب سیفٹی ایکٹ کے تحت ایس پی راولپنڈی نے چھاپہ مارنے کے وارنٹ پر دستخط کر کے سکندر حیات کو دیئے کہ وہ اکبر خان کی رہائش گاہ پر چھاپہ ماریں۔ لہٰذا پولیس کا ایک بہت بڑا عملہ 9 مارچ کی صبح 5 بجے کے قریب اکبر خان کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ یہ قافلہ قریب ایک گھنٹے میں اکبر خان کے گھر پہنچا۔ تمام گاڑیاں بنگلے کے باہر ہی روک دی گئیں اور پولیس کے سپاہی اور جونیئر افسران گھر کے چاروں طرف پھیل گئے تاکہ کسی کو باہر نکلنے کا راستہ نہ ملے۔ سکندر حیات جس کے حق میں تلاشی نامہ جاری کیا گیا تھا بنگلے کے پچھواڑے کا جائزہ لینے گئے کہ کہیں وہاں باہر نکلنے کا راستہ کھلا ہوا تو نہیں۔ جب انہیں تسلی ہو گئی کہ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں بچا تو وہ سامنے کے برآمدے میں آ گئے۔ سب سے پہلے ملک حبیب اللہ، نظیر احمد اور محمد زاہد بنگلے میں داخل ہوئے اور میجر جنرل اکبر

خان کو گرفتار کر کے لے گئے۔ وہاں نظیر عالم اور رمضان شاہ بھی آئے ہوئے تھے اور بیگم نسیم اکبر کے تیار ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ جنرل ضیاالدین اس آپریشن کی پیروی کر رہے تھے۔ بیگم اکبر خان اپنی الماری سے چند کپڑے نکال رہی تھیں جنہیں وہ ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔ ایک پولیس انسپکٹر جو اس وقت بنگلے کے اندر تھا اس نے ڈی آئی جی کو اطلاع دی کہ اس نے بیگم نسیم کو گھر کا دروازہ بند کر کے دستاویزات نکالتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس پر دو سینئر پولیس انسپکٹر اندر آ گئے اور بیگم کو زبردستی پکڑ کر لے گئے۔ بعد میں بیگم اکبر خان نے پولیس کی اس زیادتی کی شکایت بھی کی۔ اپنی گرفتاری کے بارے میں اکبر خان نے خود کیا محسوس کیا اس کا حوالہ ان کی شائع شدہ کتاب میں ملتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

"مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میرے معاملے میں کسی بھی قانونی ضابطے کی پابندی نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ جس وقت میں گہری نیند سویا ہوا تھا صبح کے جھٹپٹے میں کوئی ایک سو آدمیوں نے میرے مکان کو گھیر لیا اور ایک چوکیدار تھا جسے انہوں نے فاتحانہ طور پر دبوچ لیا۔ اس کے بعد صبح کے چھ بجے میجر جنرل ضیاالدین نے میری خواب گاہ کی کھڑکی پر دستک دی اور کہا کہ ایک نہایت اہم معاملے میں مجھے آپ سے فوراً ملنا ہے۔ یہ سننا تھا کہ میں ان سے ملنے کے لیے جوتا پہنے بغیر ننگے پاؤں بے اختیار باہر نکل پڑا۔ جونہی میں باہر نکلا سنگینیں اور مشین گنیں تانے ہوئے لوگ سامنے اور دائیں بائیں، غرض تین طرف سے مجھ پر جھپٹ پڑے۔

اس سے پہلے بھی میدان جنگ میں جاپانیوں کے ساتھ جھڑپوں کے دوران دشمن کے سپاہی مجھ پر جھپٹے تھے لیکن اس طرح کی جھڑپوں میں ایک اور بیس کا تناسب تو کبھی نہ تھا۔ اور نہ ہی میں ان کے مقابلے میں ہوتا تھا۔ مجھے اب پلک جھپکنے میں فیصلہ کرنا تھا، چنانچہ میں نے انہیں آگے آنے دیا۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ طفلانہ کھیل چونکہ مجھے مرعوب کرنے میں بالکل ناکام رہا اس لیے میری جانب جھپٹنے والے لوگ بیچ ہی میں ٹھٹک کر رک گئے اور ان چند لوگوں نے جنہوں نے مجھ پر ہاتھ ڈالے تھے، فوراً ہاتھ کھینچ لیے۔

یہ بتانے کے لیے کہ میں زیر حراست ہوں محض ٹیلی فون پر اطلاع دے دینا کافی تھا لیکن اس معاملے کو اس سے کہیں زیادہ اہم قیاس کیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ فوجوں کو تاکید کر دی گئی کہ فی الفور چوکس ہو جائیں۔ میرے یہاں آنے والے لوگوں کو اندیشہ تھا کہ گھمسان کا رن پڑے گا جس سے شاید انہیں ہتھیار ڈالنے کی نوبت آئے گی۔ اس واقعے کے خاصے عرصے بعد مقدمے کے دوران میں استغاثہ کے وکیل مسٹر اے۔ کے۔ بروہی حکومت کی توجہ اس طرف بہ اصرار دلاتے رہے اور بار بار کہتے رہے کہ میرے سرہانے جو ریوالور پایا گیا اس میں گولیاں بھری ہوئی تھیں۔

اس لطیفے کی شان نزول یہ ہے کہ جنرل ایوب خان کے یقین کے مطابق دو ڈویژن فوجیں میری حمایت کے لیے ایک آواز کی منتظر کھڑی تھیں۔ یہ دو ڈویژن فوجیں کہاں تھیں یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ افواج پاکستان کے درمیان تو ان کا وجود نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو بریگیڈیر حبیب اللہ اور لیفٹیننٹ کرنل صدیق راجہ سے انہیں اطلاع مل چکی ہوتی۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ وہ پہلے ہی تمام ڈویژن کے کمانڈروں سے رابطہ پیدا کر چکے تھے۔ اتنی بھاری بھر کم فوج جس میں کوئی تیس ہزار جوان شامل ہوتے ظاہر ہے کہ میرے مکان کے اندر یا اس کے آس پاس اس کامیابی سے تو نہیں چھپ سکتی تھی کہ اس کی موجودگی کی کسی کو ایک جھلک بھی نہ ملے۔ یہ بات قیاس میں نہیں آتی۔ تاہم یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آدمی کی پرواز تخیل اسے کہاں تک لے جا سکتی ہے۔ پھر ایک ایسا شخص جو ہمالیہ کے اس پار روسیوں کی پیش قدمی کو بھانپ سکتا تھا اسے تو یہ بات بالکل ہی بے سر و پا نظر آنی تھی۔"(۶)

9 مارچ 1951 کو مسلح پولیس کا ایک دستہ فیض احمد فیض کے گھر پہنچا۔ اس وقت وہ 41 ایمپریس روڈ لاہور پر مقیم تھے۔ انہوں نے فیض صاحب کو آواز لگائی کہ دروازہ کھولیں۔ دروازہ کھولنے پر وہ لوگ گھر کے اندر داخل ہوئے اور فیض صاحب کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ فیض صاحب

نے ایک بستر، کچھ کپڑے وغیرہ ساتھ لیے اور ان کے ساتھ چل دیئے۔ انہیں سرگودھا جیل لے جایا گیا جہاں جا کر انہیں ریڈیو پر خبر سن کر معلوم ہوا کہ انہیں کس بنا پر گرفتار کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ 8 مارچ 1951 کو ملک حبیب اللہ ایس پی صوبہ سرحد کو حکم دیا گیا کہ وہ راولپنڈی جائے اور جنرل اکبر خان اور ان کی بیوی کو گرفتار کرے۔ جنرل ضیاالدین کو کمانڈر ان چیف نے بلا کر اکبر خان کی برخاستگی کا حکم جاری کرنے کو کہا جو اکبر خان پر اگلی صبح تعمیل ہونا تھا۔ ایسا ہی کیا گیا اور اکبر خان کو نظر بند کر دیا گیا۔ ان کی بیگم کو گرفتار کر کے پہلے ڈی آئی جی پولیس کے گھر رکھا گیا۔ اکبر خان کے گھر کی تلاشی میں کوئی چار اہم دستاویزات دستیاب ہوئیں جن کی نوعیت کچھ ایسی تھی۔

پہلی دستاویز میں ملک کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس میں یہ کہا گیا تھا کہ پاکستان کی عوام لائق، مضبوط اور متحد ہیں مگر جن کے ہاتھ میں عنان حکومت ہے وہ بالکل سڑے ہوئے بے کار لوگ ہیں۔ ان کو آزادی کا مفہوم بھی سمجھ نہیں آتا۔ اس دستاویز میں عوام کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ وہ جدوجہد کریں اور حکومت کا بوسیدہ اور گلا سڑا ڈھانچہ گرا کر موجودہ حالات میں واضح تبدیلی لائیں۔ یہ دستاویز اکبر خان کی تیار کی ہوئی تھی اور ان کی بیگم کی تلاشی کے دوران پولیس کے ہاتھ لگی تھی۔ دوسری دستاویز میں پروگرام کا کھل کر ذکر کیا گیا تھا۔ یہ دستاویز بھی اکبر خان کے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تھی اور تلاشی کے دوران ہی ملی تھی۔ تیسری دستاویز 14 فروری سے 18 مارچ 1951 تک ہونے والی کاروائی کے متعلق تھی اور اکبر خان کی لکھی ہوئی تھی۔ چوتھی دستاویز بھی اکبر خان کے ہینڈ رائیٹنگ میں تھی۔ اس میں کچھ مخفف قسم کے الفاظ لکھے ہوئے تھے جیسے Black M, (ملٹری) Black C (سویلین)" SYM ", " OUT "۔

فیض احمد فیض کو گرفتاری کے بعد 15 مارچ 1951 کو پاکستان ٹائمز کی ادارت سے معطل کر دیا گیا۔ لیکن فیض کو کونسی جیل میں رکھا گیا اس کا کسی کو کوئی علم نہیں تھا۔ صرف ایک اخبار 'نوائے وقت' کو چھوڑ کر دیگر سب اخبارات راولپنڈی سازش کیس کے ملزموں کو نہایت سنگین سزائیں دینے کی مانگ کر رہے تھے۔ فیض کو پھانسی پر چڑھانے کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا۔ طرح طرح کی افواہیں اڑ رہی تھیں۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ فیض کے دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں کاٹ دی گئی ہیں۔ اور ان کا جسم زخموں سے بھر گیا ہے اور ان کی آنکھوں کو کھروچ کر نکال دیا گیا ہے۔ گرفتاری کے بعد

تین ماہ تک فیض لاپتہ رہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تین ماہ سے لائلپور جیل میں قید تنہائی میں دن گزار رہے تھے۔ فیض صاحب کی بیوی ایلس کو قطعی علم نہیں تھا کہ فیض زندہ ہیں کہ نہیں اور اگر زندہ ہیں تو کہاں ہیں۔ لیکن ایک دن نہ جانے کون سے ذریعے سے ایلس کو معلوم ہوا کہ فیض لائلپور جیل میں مقید ہیں۔

کیپٹن ظفر اللہ پوشنی فوجی عہدے میں تو سب سے چھوٹے تھے ہی، عمر میں بھی تمام ملزموں سے چھوٹے تھے۔ انہوں نے اپنی اور کئی دوسرے لوگوں کی گرفتاری کا ذکر اپنی کتاب 'زندگی زنداں دلی کا نام ہے' میں کافی تفصیل سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں راولپنڈی میں چرچ روڈ پر اپنے چچا اور چچی کے ساتھ رہتا تھا۔ ہمارا بنگلہ دو حصوں میں بنا ہوا تھا۔ ایک میں ہم لوگ تھے اور دوسرے حصے میں ایک جرمن ڈاکٹر اپنی بیوی بچوں کے ساتھ مقیم تھا۔ 15 مئی کی بات ہے۔ میں حسب معمول علی الصبح اٹھا۔ شیو بنا کر اور منہ ہاتھ دھو کر وردی پہنی اور آئینے کے سامنے کھڑا فوجی ٹوپی کو سر پر صحیح زاویے سے جمانے کی کوشش کر رہا تھا کہ نوکر نے آکر اطلاع دی۔۔۔۔۔'' صاحب۔ باہر ایک کار آکر رکی ہے۔ کوئی بڑا افسر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔'' یہ سنتے ہی میں لپک کر بنگلے سے باہر نکلا، دیکھا کہ ایک چھوٹی سی موٹر کار کھڑی ہے، کار میں ایک بریگیڈیر صاحب بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے ایڑیاں جوڑ کر ایک چست سیلوٹ مارا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ صبح ہی صبح یہ کون سی بلا نازل ہوئی ہے۔

بریگیڈیر صاحب نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیپٹن ظفر اللہ پوشنی'' میں نے جواب دیا ''جی ہاں''۔ کہنے لگے کہ کار میں بیٹھئے۔ آپ سے کچھ کام ہے۔

بریگیڈیر صاحب کار خود ہی چلا رہے تھے۔ میں ان کے ساتھ کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے سیلف دبایا، گیئر موڑا اور گاڑی چند ہی سیکنڈ میں سڑک پر پوری تیزی سے دوڑنے لگی۔ کانوینٹ اسکول اور گالف روڈ سے گزر کر ہم مال

روڈ پر پہنچے تو بریگیڈیر صاحب نے کہا" میں آپ کو پولیس اسٹیشن لے جا رہا ہوں۔ پولیس آپ سے کچھ سوال پوچھنا چاہتی ہے۔" میں نے کہا بہت بہتر۔ اس کے بعد نہ وہ بولے اور نہ میں نے کچھ کہنا مناسب سمجھا۔ ذرا دیر بعد کار لق و دق ایک سفید بنگلے کے احاطے میں داخل ہوئی۔ احاطہ اس بنگلے کا نہایت کشادہ تھا۔ یہاں پولیس کے آدمی باوردی اور سفید پوش ہر طرف چلتے پھرتے نظر آئے۔ موٹر کار جونہی رکی ایک شخص دراز قد، بھاری بھرکم، عینک پوش، ریشمی اچکن اور کلف لگی ہوئی لٹھے کی شلوار پہنے ہمارے پاس آیا۔ اس نے پہلے مجھ سے باہر نکلنے کو کہا، پھر ہاتھ ملاتے ہوئے سوالیہ لہجے میں بولا" کیپٹن ظفر اللہ پوشنی؟"۔ میں نے جواب دیا میرا ہی نام ہے۔"(۷)

وہ بھاری بھرکم شخص انسپکٹر باجوا تھا جو ظفر اللہ پوشنی کو ایک اور انسپکٹر رندھاوا کے حوالے کر کے رخصت ہو گیا اور انسپکٹر رندھاوا پوشنی کو ایک بند گاڑی میں جس میں دیگر قیدی بھی تھے، ان سب کو لاہور سینٹرل جیل لے گیا۔ اس گاڑی میں لیفٹیننٹ کرنل نیاز احمد ارباب پہلے سے ہی موجود تھے۔ راولپنڈی سازش کیس میں کُل 15 شخص ملوث تھے جن میں گیارہ تو فوجی افسر تھے اور باقی چار سویلین تھے جن میں میجر جنرل اکبر خان کی بیوی نسیم اکبر خان بھی شامل تھیں۔

یہ سب کچھ ہونے سے ہر باشعور شخص کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ راولپنڈی سازش کیس حقیقی تھا یا نام نہاد۔ بہت سے لوگوں نے اسے محض نام نہاد ہی قرار دیا ہے اس لیے اس حقیقت پر نظر ڈالنا نہایت ضروری ہے۔ کیپٹن ظفر اللہ پوشی جو اس سازش کیس میں گرفتار ہوئے تھے اور اب بھی بقید حیات ہیں وہ کہتے ہیں کہ سازش ہوئی تھی۔ اس سازش کے متعلق چار میٹنگ ہوئی تھیں۔ سب سے پہلی میٹنگ 14 دسمبر 1949 کو اٹک کے مقام پر ہوئی تھی جس میں مندرجہ ذیل اشخاص نے حصہ لیا تھا۔

۱۔ میجر جنرل اکبر خان

۲۔ میجر جنرل نظیر احمد

۳۔ بریگیڈیر صادق خان

۴۔ بریگیڈیر ایم اے لطیف خان
۵۔ لیفٹیننٹ کرنل صدیق راجہ

اس میٹنگ میں اس دورے کا چرچا تھا جو گورنر جنرل اور وزیر اعظم نے پنجاب کا کیا تھا۔ اس میٹنگ میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ سازش کے طے شدہ پلان پر عمل درآمد اس وقت کیا جائے گا جب گورنر جنرل اور وزیر اعظم پشاور میں قیام رکھتے ہوں تا کہ دونوں کو ایک ہی وقت گرفتار کیا جا سکے۔ اس میٹنگ میں یہ بھی قرار پایا گیا تھا کہ یہ کاروائی رات کو کی جائے اور صبح گورنر جنرل ریڈیو پر اعلان کرے کہ پاکستانی حکومت کو برطرف کیا گیا ہے اور حکومت کی باگ ڈور ملٹری کونسل کے حوالے کر دی گئی ہے جو مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل ہے۔

۱۔ اکبر خان
۲۔ ایم اے لطیف خان
۳۔ بریگیڈیر حبیب اللہ
۴۔ بریگیڈیر صادق خان
۵۔ لیفٹیننٹ کرنل صدیق راجہ

اس کے علاوہ اس میٹنگ میں یہ بھی فیصلہ ہوا تھا کہ مندرجہ بالا تبدیلی کے بعد پاکستان کے کمانڈر ان چیف میجر جنرل نظیر احمد ہوں گے۔

دوسری میٹنگ 21 دسمبر 1949 کو ایسی جگہ ہوئی جو راولپنڈی کوہاٹ روڈ پر فتح جنگ سے دو میل کے فاصلے پر واقع تھی اور جو کھلا میدان تھا۔ اس میٹنگ میں جن لوگوں نے شرکت کی ان کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ میجر جنرل اکبر خان
۲۔ بریگیڈیر ایم اے لطیف خان
۳۔ بریگیڈیر صادق خان
۴۔ لیفٹیننٹ کرنل صدیق راجہ

اس میٹنگ کو مخاطب کرتے ہوئے اکبر خان نے کہا تھا کہ بریگیڈیر حبیب اللہ کا خیال ہے

کہ شاید ان کا پلان کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ اس کامیابی کے لیے جتنی فوج درکار ہے وہ اس وقت دستیاب نہیں ہے۔انہوں نے حاضرین کو یہ بھی بتایا کہ انہیں ان کی مرضی کے خلاف انٹر سروسز اسٹاف کالج میں ٹریننگ کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ یہ بھی کہا کہ میجر افتخار اور شیر علی کی اچانک موت کے بعد ان کے کچھ لوگوں کے لیے ترقی کا راستہ کھل جائے گا اور ان کے وثوق سے کافی بڑی تعداد میں فوجی افسران ان کے حق میں آجائیں گے۔

تیسری میٹنگ سیالکوٹ میں مورخہ 14 اکتوبر 1950 کو ہوئی جس میں مندرجہ ذیل اشخاص نے حصہ لیا:

۱۔میجر جنرل اکبر خان

۲۔ بریگیڈیر صادق خان

۳۔لیفٹیننٹ کرنل صدیق راجہ

۴۔بیگم نسیم اکبر خان

یہ میٹنگ اکبر خان کے برطانیہ روانگی سے پہلے ہوئی۔میجر جنرل اکبر خان نے ان کے برطانیہ بھیجے جانے کے پس منظر کا ذکر کیا اور اس کے پیچھے حکومت کی منشا پر بھی چرچا کیا۔بیگم نسیم اکبر خان نے بڑی زوردار تقریر کی جو روس کے حق میں تھی۔انہوں نے حاضرین کو مشورہ دیا کہ وہ طے شدہ پلان پر کاربند رہیں۔

سازش کی چوتھی اور نہایت اہم میٹنگ 23 فروری 1951 کو میجر جنرل اکبر خان کی رہائش گاہ پر جو 191 کریچ روڈ راولپنڈی میں واقع تھی، وہاں ہوئی تھی اور مندرجہ ذیل لوگ اس میں شامل ہوئے تھے۔

۱۔میجر جنرل اکبر خان

۲۔لیفٹیننٹ کرنل محمد محی الدین صدیق راجہ

۳۔لیفٹیننٹ کرنل ارباب محمد نیاز

۴۔لیفٹیننٹ کرنل ضیا الدین

۵۔میجر خواجہ محمد یوسف سیٹھی

۶۔میجر حسن خان

۷۔کیپٹن ظفر اللہ پوشنی

۸۔کیپٹن خضر حیات

۹۔سید سجاد ظہیر

۱۰۔فیض احمد فیض

۱۱۔محمد حسین عطا

ڈاکٹر ایوب مرزا بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ اس میٹنگ میں یہی گیارہ اشخاص شامل تھے۔اس میٹنگ میں بڑی بھاری تعداد میں شمولیت اس لیے ہوئی کیونکہ یہ فیصلہ کن میٹنگ ہونی تھی۔کوئی لیفٹیننٹ کرنل طور گل اس میٹنگ کو خطاب کرنے والے تھے لیکن چونکہ وہ وقت پر نہ پہنچ سکے اس لیے اکبر خان نے ہی کاروائی شروع کی۔انہوں نے پاکستان کے سیاسی حالات پر بھی چرچا کیا اور حاضرین کو بتایا کہ پاکستان کے حالات شام اور برما سے مختلف نہیں ہیں۔اس لیے پاکستان میں بھی ویسے ہی ایکشن کی ضرورت ہے جو ان ملکوں میں لیا گیا۔انہوں نے کہا کہ جب وزیر اعظم لیاقت علی خان 31 اپریل 1951 کو راولپنڈی کے دورے پر جائیں گے تو پلان کے مطابق کاروائی شروع کی جائے گی۔اکبر خان خود جنرل ہیڈ کوارٹر میں رہیں گے اور تمام ڈویژنل کمانڈروں سے رابطہ بنائے رکھیں گے اور انہیں بتائیں گے کہ اچانک ایک خاص ایمرجنسی پیدا ہوگئی ہے۔ساتھ ہی ملٹری کا ایک دستہ پرائم منسٹر کو گرفتار کرنے کے لیے جائے گا جس کے ساتھ کمانڈر ان چیف اور جنرل ضیاالدین کو بھی راولپنڈی میں ہی رکھا جائے گا۔کراچی سے کاروائی کرنے والے دستے کی کمانڈ ایر کموڈور جنجوعہ کے سپرد ہوگی اور بروقت لطیف خان کو بھی کوئٹہ سے طلب کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ محمد حسین عطا کو 500 رائفلز دی جانی تھیں جس سے پیپلز آرمی کی بنیاد رکھی جانی تھی۔گرفتار شدہ وزیر اعظم سے ریڈیو پاکستان پر تقریر کروانی تھی کہ ملک میں ایمرجنسی لاگو ہوگئی ہے جس کی وجہ سے حکومت برخاست کی گئی ہے۔اور یہ بھی کہ حکومت کی باگ ڈور میجر جنرل اکبر خان سی ان سی (آرمی)، جنجوعہ سی ان سی (ایئر فورس) اور چودھری سی ان سی (نیوی) کے حوالے کی جاتی ہے۔

اس میٹنگ میں فیض احمد فیض نے بھی تقریر کی تھی جس میں انہوں نے ملک کے ناتسلی بخش سیاسی حالات کا جائزہ لیا تھا۔ سجاد ظہیر نے بھی تقریر کی تھی جس میں انہوں نے فیض کے خیالات کی تصدیق کی تھی۔ یکے بعد دیگرے میٹنگ میں شامل ہونے والے کئی لوگوں نے پلان کے حق میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ صرف لیفٹیننٹ کرنل صدیق راجہ پلان کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت کی برطرفی کے لیے ملٹری ایکشن کوئی محفوظ طریقہ نہیں ہوتا۔ آخر کار ہر طرح سے غور وغوض کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ فی الحال پلان ملتوی کر دیا جائے۔

ان تمام میٹنگوں سے یہ بات صاف طور پر نمایاں ہو جاتی ہے کہ حکومت کو برطرف کرنے کی سازش ایک سوچے سمجھے پلان کے تحت عمل میں لائی گئی تھی۔ یہ بات اور ہے کہ یہ سازش کامیاب نہ ہو پائی جس کے باعث اکبر خان اور کئی دیگر افسران نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ 23 فروری کی میٹنگ میں پلان رد کر دیا گیا تھا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ برطرفی کا پلان رد ہو گیا تھا تاہم سازش کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل میں درج حالات اس کا اہم ثبوت ہیں۔

جیسا کے پہلے کہا جا چکا ہے کہ کیپٹن ظفر اللہ پوشنی راولپنڈی میں چرچ روڈ اپنی چچا چچی کے بنگلے میں رہتے تھے۔ فروری کے ابتدائی ہفتے میں بیگم نسیم اکبر خان نے یوسف سیٹھی سے کہا کہ وہ پوشنی کو لے کر آئیں۔ جب وہ دونوں آئے تو بیگم اکبر خان نے انہیں بتایا کہ آنے والے چند دنوں میں کچھ مہمان راولپنڈی آنے والے ہیں اس لیے پوشنی اور دوسرے افسران کے رہنے کا انتظام کریں۔ اس سے پہلے انہوں نے ایسی درخواست اپنے بہنوئی میاں ریاض احمد سے بھی کی تھی جنہوں نے یہ کہہ کر معذرت چاہی کہ ان کی بیٹی بیمار ہے اور وہ خود بھی علیل ہیں۔ کیپٹن پوشنی نے بھی معذوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ خود ہی اپنے رشتے داروں کے پاس رہ رہے ہیں لہٰذا کسی اور کے رہنے کا کوئی انتظام نہیں کر سکتے لیکن بیگم نسیم کے بار بار کہنے پر انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ مہمانوں کے رہنے کا کسی دوست کے ہاں انتظام کرنے کی پوری کوشش کریں۔ البتہ یوسف سیٹھی کچھ مہمانوں کو دو تین دن کے لیے اپنے گھر رکھنے پر راضی ہو گئے۔ 20 فروری کو بیگم نسیم تین مہمانوں کو لے کر یوسف سیٹھی کے گھر گئیں جن میں ایک فیض احمد فیض تھے جنہیں سیٹھی جانتے تھے۔ باقی دو مہمانوں کا تعارف محمود اور شوکت کہہ کر کروایا گیا۔ مقدمے کے دوران سیٹھی نے سجاد ظہیر کی شناخت کی کہ یہ وہی

شخص تھے جن کا تعارف محمود کہہ کر کروایا گیا تھا۔ سجاد ظہیر عرف محمود اور فیض 24 فروری تک وہیں یوسف سیٹھی کے دولت خانے پر ہی مقیم رہے لیکن تیسرا شخص شوکت بنا کسی کو بتائے کہیں فرار ہو گیا۔

اکبر خان 21 فروری کی شام سیٹھی کے گھر پہنچے اور تینوں مہمان انہیں ڈرائینگ روم میں ملنے آئے۔ ان کے پاس کچھ کاغذات تھے اور ان کی میٹنگ کوئی دو گھنٹے جاری رہی۔ اس میٹنگ میں یوسف سیٹھی حاضر نہیں تھے۔ وہ کیپٹن نور حسین سے ملاقات کے لیے کھوٹا گئے ہوئے تھے۔ شام کو جب وہ لوٹے تو انہوں نے ان تینوں مہمانوں کے ہاتھوں میں کچھ کاغذات دیکھے جن پر وہ کچھ لکھ رہے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد اکبر خان پھر وہاں آئے اور تب مہمانوں نے کاغذوں کا ایک پلندہ ان کے حوالے کیا۔ ان میں سے چند کاغذات انہوں نے پڑھنے کے لیے یوسف سیٹھی کو دیئے جن میں ایک تو وہ اعلان تھا جو فوجی حکومت سے متعلقہ تھا اور جس میں ان تبدیلیوں کی تفصیل تھی جو عمل میں لانے والی تھیں۔ اکبر خان رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک وہیں رہے اور مہمانوں سے گفتگو کرتے رہے۔ جاتے ہوئے اکبر خان نے سیٹھی کو بتایا کہ اگلے روز CGS ہاؤس میں میٹنگ ہونی طے پائی ہے جس میں وہ ضیاالدین اور میجر حسن کو بھی بلا لائیں اور ان تینوں مہمانوں کو بھی ساتھ لائیں۔

اگلے روز یوسف سیٹھی وقت سے پہلے ہی CGS ہاؤس پہنچ گئے جہاں ڈرائینگ روم میں اکبر خان اور ان کی بیگم پہلے سے ہی موجود تھیں۔ ڈرائینگ روم سے ساتھ والے کمرے میں کانفرنس ہونے والی تھی۔ کیپٹن پوشنی، میجر حسن اور کیپٹن خضر حیات پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ اس کے چند منٹ بعد ہی وہ تینوں مہمان یوسف سیٹھی کے ہمراہ آ گئے۔ بعد میں صدیق راجہ اور پھر ضیاالدین بھی آئے جن کا تعارف سیٹھی نے مہمانوں سے کرایا۔ گھر کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی گئی تھیں اور بچوں کو ڈرائیور کے ساتھ کسی دوست کے گھر بھیجا گیا تھا۔ نوکروں کو سخت ہدایت تھی کہ وہ کسی سے بھی ان حالات کا ذکر بالکل نہ کریں۔ نسیم اکبر خان برآمدے میں بیٹھ کر تمام ماحول پر نظر رکھ رہی تھیں۔ کسی کو بھی کانفرنس والے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کانفرنس میں کوئی گیارہ لوگ شامل تھے۔ آخر اکبر خان بھی اندر آئے اور موجودہ اشخاص نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور اکبر خان نے اپنی کرسی پر بیٹھ کر کانفرنس کے رہنما کا فرض انجام دیا۔ اکبر خان نے پلان کی کارکردگی کی جو تفصیل وہاں بیان کی ہے وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

ایکشن 3 اور 4 مارچ کے درمیان شروع ہونا تھا جب الیکشن کے سلسلے میں وزیر اعظم راولپنڈی میں موجود ہوگا۔ اسی رات اکبر خان ہیڈ کوارٹر جا کر متعلقہ فوجی افسروں کو ہدایت دیں گے کہ وہ ان لوگوں کو حراست میں لے لیں:

۱۔وزیر اعظم لیاقت علی خان

۲۔میجر جنرل ضیاالدین ڈویژنل کمانڈر 7 ڈویژن

۳۔کمانڈر ان چیف

۴۔بریگیڈیر الطاف قادر

۵۔لوکل بریگیڈوں کے تمام کمانڈر

۶۔لیفٹیننٹ جنرل میکالے چیف آف اسٹاف

۷۔دیگر تمام فوجی اور سول کے افسران جن کی لسٹ مرتب ہو چکی تھی

اس پلان پر عمل کرنے کے لیے لیفٹیننٹ کرنل ارباب کی ایک بٹالین جو اس وقت ٹل کے مقام پر موجود تھی اور کاہوٹا سے AK-3 بٹالین مقررہ وقت سے پہلے راولپنڈی پہنچ جائیں گی۔ اگر مزید فوج درکار ہوگی تو وہ 13 / 4 فرنٹیئر فورس رائفلز جو راولپنڈی میں ہی مقیم تھی، مہیا کرے گی۔ اس کام کی ذمہ داری صدیق راجہ کے سپرد کی گئی تھی۔

پشاور میں موجود جنرل ماجد اور بریگیڈیر معصود کو ہیڈ کوارٹر بلایا جائے گا اور ان کی کمانڈ بریگیڈیر صادق خان کے حوالے کی جائے گی اور لیفٹیننٹ کرنل خورشید علی خان ان کی امداد کے لیے حاضر رہیں گے۔ ایبٹ آباد میں بریگیڈیر جیلانی کو ہیڈ کوارٹر بلا کر ان کی جگہ لیفٹیننٹ کرنل محمد اکبر کو دی جائے گی۔ اکبر خان نے حاضرین کو یہ بھی بتایا کہ محمد حسین عطا اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے کارکن روپوش ہو کر کام کریں گے اور انہیں 500 بندوقیں اس کام کے لیے مہیا کی جائیں گی۔

لاہور کے بارے میں اکبر خان نے یہ واضح کیا کہ وہاں کے حالات مکمل طور پر قابو میں ہیں۔ وہاں بریگیڈیر بختیار رانا کو تعینات کیا جائے گا جو اس پلان پر عمل کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔ پلان کے مطابق رانا پنجاب کے گورنر اور دیگر سول افسروں کو گرفتار کریں گے جس میں ان کی امداد بریگیڈیر حق نواز کریں گے۔ کوئٹہ میں جو بریگیڈ تھی اس کی کمانڈ اکبر خان کے اپنے ہی

لوگ کر رہے تھے۔ اس لیے کوئٹہ میں خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ انہیں اگر کوئی خدشہ تھا تو وہ میجر جنرل گریوز سے تھا جو انگریز تھے اور بہاول پور میں مقیم تھے اور جنہیں اپنے حلقے میں شامل کرنا بہت مشکل کام تھا۔ لیکن اکبر خان کا یہ خیال تھا کہ جب جنرل گریوز کو یہ بتایا جائے گا کہ وزیر اعظم نے حکومت کونسل کے حوالے کر دی ہے تو وہ کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔

کراچی کے بارے میں اکبر خان کو بہت تشویش تھی۔ کراچی کی ذمہ داری جنجوعہ کو دی گئی تھی مگر اکبر خان کو خوف تھا کہ جنجوعہ کے پاس مناسب فوج نہیں ہے۔ اس لیے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سٹاف کالج کوئٹہ سے میجر ماجد کو لے کر کراچی روانہ ہونے کے لیے کہا جائے گا تا کہ وہ جنجوعہ کی مدد کر سکے۔ وہیں انہوں نے جنجوعہ سے بات کی جنہوں نے بتایا کہ حالات قابو میں ہیں اور خطرے کی کوئی بات نہیں۔

اوپر دی گئی تفصیل سے یہ بالکل ظاہر ہے کہ سازش کا پلان بڑے پیمانے پر تیار کیا گیا تھا جس میں ناکامی کے تمام راستے بند کر دیئے گئے تھے۔ کوئی بھی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں تھی۔ پلان کے مطابق گرفتاری کے فوراً بعد یعنی 4 مارچ 1951 کی صبح وزیر اعظم ریڈیو پر اعلان کریں گے کہ انہوں نے حکومت کی باگ ڈور فوجی کونسل کے حوالے کر دی ہے۔ وزیر اعظم کے اعلان نامے کا مسودہ بھی اکبر خان نے پڑھ کر سنایا اور حاضرین کو بتایا کہ اس عام اعلان کے بعد عوام فوجی حکومت کے قیام کو قبول کر لے گی۔ وزیر اعظم کا وہ اعلان جو اکبر خان نے پڑھ کر سنایا یوں تھا:

> "ملک میں ہنگامی حالات پیدا ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے وزیر اعظم نے حکومت فوجی کونسل کو سونپ دی ہے جس کے ممبران ہیں فوج، ائیر فورس اور نیوی کے تینوں کمانڈران چیف۔ انہوں نے حکومت سے استعفیٰ دے دیا ہے اور یہ کہ عوام کو فوجی کونسل کے احکامات پر عمل کرنا اور یہ بھی کہ وہ خود بھی فوج سے درخواست کریں گے کہ فوجی کونسل کی حکم عدولی نہ کرے۔" (۸)

اس میٹنگ میں پلان کی جس نے زوردار مخالفت کی تھی وہ صدیق راجہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پلان میں کئی کمزوریاں ہیں اور یہ کہ پلان کی کامیابی کے لیے سب سے ضروری ہے کہ فوج کے دو مرکز یعنی راولپنڈی اور کراچی کو پوری طرح اپنے قبضے میں کر لیا جائے۔ صدیق راجہ کو یقین نہیں تھا کہ

جنجوعہ کراچی کو پورے طور پر اپنی تحویل میں لے سکیں گے۔ ان کی مخالفت کی ایک اور بہت اہم وجہ یہ بھی تھی کہ کشمیر کا معاملہ یو این او کے در پیش تھا اور امید بھی تھی کہ اس کا حل نکل آئے گا۔ ان وجوہات کی بنا پر صدیق راجہ محسوس کرتے تھے کہ عوام حکومت کی یہ غیر معمولی تبدیلیاں قبول نہیں کریں گے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ پلان ملتوی کر دیا جائے بلکہ رد ہی کر دیا جائے۔ دیگر کئی لوگ صرف عارضی طور پر ملتوی کرنے کے حق میں تھے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ اکبر خان کراچی کا دورہ کریں اور جنجوعہ سے مشورہ کرنے کے بعد اس بات کا صحیح اندازہ لگائیں کہ کیا اس پلان کی کامیابی کے لیے جتنی فوج درکار ہے اتنی فوج حاصل ہو سکے گی کہ نہیں۔ پلان پر عمل کرنے کی تاریخ اس کے بعد ہی طے کی جائے گی۔ میٹنگ میں پلان کی مخالفت کرنے کے بعد صدیق راجہ نسیم اکبر خان کو ملنے گئے تا کہ اس پر دباؤ ڈالیں کہ وہ اپنے خاوند کو اس کاروائی سے باز رکھ سکیں۔ یہ 27 فروری 1951 کی بات ہے۔ لیکن بد قسمتی سے اکبر خان پہلے ہی کراچی جا چکے تھے۔ اس لیے وہ نسیم سے بات نہ کر پائے۔

اس میں شک نہیں کہ سازش کا پلان بڑی محنت سے بنایا گیا تھا جس میں ہر تفصیل کا واضح طور پر خیال رکھا گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ اس پلان پر عمل کیا جاتا کسی طرح راز فاش ہو گیا اور سازش مکمل ناکام ہو گئی۔

کتابیات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر / پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱)	فیض نامہ	ڈاکٹر ایوب مرزا	کلاسیک۔لاہور	2005	107
۲)	زندگی زنداں دلی کا نام ہے	ظفر اللہ پوشنی	مین ہاٹن انٹرنیشنل۔کراچی	2001	10
۳)	The Rawalpindi Conspiracy,1951	ایوب خان	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔کراچی	1967	05
۴)	Raiders in Kashmir	اکبر خان	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔کراچی	1967	87
۵)	The Rawalpindi Conspiracy,1951	حسن ظہیر	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔کراچی	1998	05
۶)	Raiders in Kashmir	اکبر خان	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔کراچی	1967	46
۷)	زندگی زنداں دلی کا نام ہے	ظفر اللہ پوشنی	مین ہاٹن انٹرنیشنل۔کراچی	2001	25
۵)	The Rawalpindi Conspiracy,1951	حسن ظہیر	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔کراچی	1998	198

☆☆☆☆

۲۔ مقدمے کی کاروائی

راولپنڈی سازش کیس میں جو لوگ گرفتار ہوئے تھے اگر وہ سبھی لوگ فوجی افسران ہوتے تو سب پر کورٹ مارشل کے حوالے سے مقدمہ دائر کیا جاتا لیکن ان میں چار افراد غیر فوجی بھی تھے جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ بیگم نسیم اکبر خان

۲۔ فیض احمد فیض

۳۔ سید سجاد ظہیر

۴۔ محمد حسین عطا

اس لحاظ سے حکومت پاکستان کے لیے ایک پیچیدہ مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ فوجیوں پر Cr.P.C یا کسی سول قانون کے تحت مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا اور غیر فوجیوں پر کورٹ مارشل کی رو سے مقدمہ چلانا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے مروجہ قانون کے تحت دونوں قسم کے گرفتار شدگان پر مقدمہ نہیں دائر ہو سکتا تھا۔ حکومت پاکستان نے اس مسئلے کا یہ حل تلاش کیا کہ اس مقدمے کے لیے ایک علیحدہ قانون مرتب کیا جائے۔ لہٰذا ایک اسپیشل ایکٹ بنایا گیا جس کا نام تھا Rawalpandi Act 1951 Conspiracy Case (Special Tribunal)۔ اس قانون کے ذریعے ایک اسپیشل ٹریبونل قائم کیا گیا جس کی رو سے ان تمام اشخاص پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ اس مقدمے کی کاروائی خفیہ رکھی جائے گی اور جو کوئی مقدمے کی کاروائی کو فاش کرے گا اسے دو سال کی قید بامشقت کی سزا

دی جائے گی۔ یہی سزا اس کے لیے بھی طے کی گئی جو مقدمے کی کاروائی شائع کرے گا۔

اس سازش کے لیے جو اسپیشل ٹربیونل قائم کیا گیا اس کا بل 13 اپریل 1951 کو Constituent Assembly میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ ایکٹ لانے میں حکومت کا منشا یہ تھا کہ ملزمین پر دائر کیے گئے مقدمے کو جلد سے جلد اختتام تک لایا جائے۔ اس منشا کے تحت کڑے سے کڑے دستور کو عمل میں لایا گیا جس کے نتائج کے طور پر ان لوگوں کے بنیادی حقوق کو رد کر دیا گیا۔ مخالفین نے کئی طرح کی ترمیم پیش کی مگر جو پارٹی برسراقتدار تھی اس نے انہیں قبول نہیں ہونے دیا۔ مثال کے طور پر ایکٹ کی ایک دستور یہ بھی تھی کہ اگر کوئی آفیسر تفتیش کے دوران کسی ملزم کا بیان قلمبند کرتا ہے تو وہ یہاں ثبوت کے طور پر ٹربیونل میں پیش کرنا واجب تھا۔ جب مخالف پارٹی نے اس رو کو خارج کرنے کی مانگ کی تو جو وزیر اس معاملے کا انچارج تھا اس نے بڑی بے رخی سے اسمبلی کو بتایا کہ ولایت میں یعنی برطانیہ میں اس ثبوت کو قابل قبول تسلیم کیا جاتا ہے۔ بہر حال یہ ایکٹ مکمل طور پر جمہوریت کے اصولوں کے برعکس تھا مگر حکومت نے اس کی بالکل پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کے خلاف ہر ترمیم اور مشورے کو سرے سے ہی نکال پھینکا۔ اس ایکٹ کے ذریعے سازشین کے وہ حقوق جنہیں انگریزی میں Natural Justice یعنی فطری انصاف کہتے ہیں انہیں بہت بے رحمی سے روندا گیا تھا۔

جیسے جیسے CID کی تفتیش نے زور پکڑا اور بھی کئی لوگ حراست میں لے لیے گئے اور ان سے پوچھ تاچھ کی گئی۔ سید سجاد ظہیر 28 اپریل 1951 کو لاہور میں گرفتار ہوئے۔ ان کی شناخت لاہور سینٹرل جیل میں استغاثہ کے گواہوں نے کی۔ جو جج اسپیشل ٹربیونل کے ممبر منتخب ہوئے ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ صدر: فیڈرل کورٹ کے جج جسٹس عبدالرحمٰن
۲۔ ممبر: پنجاب ہائی کورٹ کے جج جسٹس محمد شریف
۳۔ ممبر: ڈھاکہ ہائی کورٹ کے جج جسٹس امیرالدین

مقدمہ کے دوران صرف ججوں، ملزمین، وکلا، شہادتوں اور متعلقہ عملے کے علاوہ کسی اور شخص کو کچہری میں جانے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ ملزمین کے عزیزوں و دوستوں اور اخبار نویسوں

کو حاضر رہنا قطعاً منع تھا۔ 15 مئی 1951 کو اسپیشل ٹربیونل کے قیام کا اعلان کیا گیا اور یہ بھی کہا گیا کہ ٹربیونل کی کاروائی حیدر آباد سینٹرل جیل میں ہوگی۔ جناب اے۔ کے بروہی جو ایڈوکیٹ جنرل تھے انہیں استغاثہ کی طرف سے کاروائی کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔

اپنی پہلی پیشی کی روداد کیپٹن ظفر اللہ پوشنی نے اپنی کتاب میں بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب سب آپس میں اکٹھے ہو کر گفتگو میں مصروف تھے تو ایک وارڈر نے انہیں اطلاع دی کہ سب لوگ اپنی اپنی کوٹھریوں میں چلے جائیں کیونکہ ٹربیونل کے جج صاحبان ان کو ملنے کے لیے آرہے ہیں۔ لہٰذا سب لوگ اپنی اپنی کوٹھریوں میں جا کر آنے والوں کا انتظار کرنے لگے لیکن آدھے گھنٹے تک کوئی بھی وارد نہیں ہوا۔ جب تقریباً سب لوگ مایوس ہو چکے تھے تو چند خوش پوش اشخاص کا ایک قافلہ وارڈ میں داخل ہوا۔ یہ لوگ باری باری ہر کوٹھری کے باہر رکتے اور ملزم کی شکایت سننے کے بعد آگے بڑھ جاتے۔ اس ہجوم میں ٹربیونل کے صدر سر عبدالرحمٰن، عدالت کے رکن جسٹس محمد شریف، پنجاب کے ایڈوکیٹ جنرل سر عبدالعزیز، جیل کے سپرینڈنٹ اور چند دوسرے لوگ شامل تھے۔ پوشنی کی بات چیت جو ٹربیونل کے صدر سر عبدالرحمٰن سے ہوئی وہ نیچے درج کی جاتی ہے:

> ''سر عبدالرحمٰن نے قریب آتے ہوئے مجھ سے پوچھا'' آپ کی کیا شکایات ہیں؟'' میں نے جواب دیا'' تقریباً وہی جو باقی دوستوں کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ کھانا نہایت برا ہوتا ہے۔ مچھر بے حد ہیں اور اتنی شدید گرمی کے باوجود بجلی کا کوئی پنکھا نہیں دیا گیا۔''
>
> سوال ہوا'' اور کچھ؟''
>
> میں نے کہا'' اور یہ کہ ہر شام ہمیں تقریباً سات بجے ان کوٹھریوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات ایک تو بالکل غیر ضروری ہے اور دوسرے آج کل کے موسم میں سخت اذیت ناک ہے۔''
>
> '' خیر بند کیا جانا تو جیل رولز کے مطابق غالباً ضروری ہے۔'' جج صاحب نے فرمایا'' لیکن ہم باقی حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔''(۱)

میجر یوسف سیٹھی 14 مئی کو گرفتار ہوئے لیکن اسی روز انہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا

گیا جہاں انہوں نے وعدہ معاف گواہ بننے کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی بشرط کہ وہ بالکل سچ کہیں گے اور سچ کے بغیر کچھ نہ کہیں گے۔ وہ دو دن تک مجسٹریٹ کے سامنے اپنا بیان دیتے رہے اور پھر انہیں لاہور سینٹرل جیل میں سازشیوں کی نشاندہی کے لیے بھیج دیا گیا۔ اسی طرح لیفٹیننٹ کرنل صدیق راجہ کو بھی وعدہ معاف گواہ بننے کی رضامندی دے دی گئی۔

اگے روز اٹک اور دیگر مقامات سے بھی ملزم افسران کو راولپنڈی لایا گیا اور انہیں باقاعدہ طور پر حراست میں لے لیا گیا۔ ان کی وردیاں اتاری گئیں اور انہیں عام لوگوں کے پہننے والے کپڑے دیئے گئے۔ سب سے پہلے چھ افسران اٹک سے لائے گئے جن میں لیفٹیننٹ کرنل ضیاالدین، کیپٹن خضر حیات، کیپٹن ظفراللہ پوشنی، بھی شامل تھے۔ انہیں پولیس کی گاڑی میں بٹھا کر لاہور بھیج دیا گیا۔ وہاں ان کی ملاقات میجر محمد اسحاق سے ہوئی جنہیں سیالکوٹ سے گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔ ایر کموڈور محمد خان جنجوعہ جو کراچی میں گرفتار ہوئے تھے انہیں بھی لاہور لایا گیا۔ ان سب لوگون کو اسی شام جسٹس عبدالرحمٰن جو اسپیشل ٹربیونل کے صدر مقرر کیے گئے تھے کے سامنے پیش کیا گیا۔ صدر کے بنگلے میں ہی ایک کچہری قائم کی گئی جہاں صدر سر عبدالرحمٰن اور ممبر جسٹس محمد شریف نے کاروائی شروع کی۔ تیسرے جج امیر الدین تب تک وہاں پہنچ نہیں پائے تھے۔ کچھ سرسری تشخیص کے بعد کورٹ نے اعلان کیا کہ تمام مجرموں کو 14 دنوں کے لیے ریمانڈ کیا گیا ہے اور تب تک وہ سینٹرل جیل لاہور میں ہی رہیں گے۔ صرف ایر کموڈور جنجوعہ کو لاہور کی بورسٹل جیل میں رکھا جائے گا۔ چودہ روز ریمانڈ ختم ہونے سے ایک دن پیشتر تمام ملزموں کو ایک بار پھر سے ٹربیونل کے سامنے لایا گیا۔ وہیں جیل کے دروازے پر ہی ان کی ملاقات سید سجاد ظہیر سے ہوئی۔ اس ملاقات کی روداد بھی پوشنی صاحب نے بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''بند گاڑی کا پچھلا دروازہ یکا یک کھل گیا۔ ایک شخص اندر داخل ہوا اور ہمارے پاس ہی بیٹھ گیا۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ سجاد ظہیر ہیں۔ کامریڈ سجاد ظہیر نے ململ کا باریک کرتا، لٹھے کی شلوار اور جناح کیپ پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں چپلیں تھیں جو خاصی بوسیدہ حالت میں تھیں۔ داڑھی مونچھ تقریباً صاف تھی لیکن چہرا کچھ اترا ہوا اور صحت خراب نظر آ رہی تھی۔ میں نے جب انہیں پہلی بار

دیکھا تھا اس وقت کہیں زیادہ تنومند تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ جیل میں ان کے ساتھ مناسب سلوک نہیں کیا گیا۔ انہوں نے ہم سب سے ہاتھ ملایا۔ بریگیڈیر صدیق نے گولڈ فلیک کا ڈبہ پیش کیا۔ ''شکریہ'' سجاد ظہیر نے ایک سگریٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''آج کل مجھے شاذ و نادر ہی سگریٹ پینے کو ملتا ہے۔ جیل والوں کا جی چاہے تو چوتھے پانچویں دن ایک آدھ پیکٹ بھیج دیتے ہیں ورنہ اس کے بغیر ہی گزارا کرنا پڑتا ہے۔'' وہ مسکرائے۔ ''شکایت کرو تو جواب ملتا ہے کہ یہ جیل خانہ ہے۔''(۲)

سید سجاد ظہیر سے ملاقات بہت سے اشخاص کے لیے دلچسپی کا باعث بنی رہی۔ میجر محمد اسحاق جو باقی فوجی افسروں کے ساتھ راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے تھے وہ سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کے ساتھ لاہور جیل میں قید تھے۔ فیض صاحب نے جیل میں جو شاعری تخلیق کی اس انتخاب کو 'زنداں نامہ' کے نام سے شائع کیا گیا۔ اس میں ایک مضمون بہ عنوان رودادِ قفس میجر محمد اسحاق نے لکھا ہے۔ اس مضمون میں وہ ایک لطیفہ بیان کرتے ہیں جس کا واسطہ سجاد ظہیر سے پہلی ملاقات سے ہے۔ اسی لطیفے کا حوالہ عبدالرؤف ملک نے بھی اپنی کتاب 'سید سجاد ظہیر۔ مارکسی دانشور اور کمیونسٹ رہنما' میں بھی دیا ہے۔ میجر محمد اسحاق لکھتے ہیں:

> ''لاہور ہی کا ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک دن ہمیں ریمانڈ کے لیے عدالت لے جایا جانا تھا۔ اطلاع ملی تھی کہ سجاد ظہیر بھی ساتھ جائیں گے۔ جیل کے بڑے دروازے کے اندر پولیس کی قیدی ڈھونے والی گاڑی کھڑی تھی۔ ہم وہاں رک گئے اور سید صاحب کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں پھانسی کی کوٹھریوں کی طرف سے سفید شلوار کرتے میں ملبوس سر پر جناح کیپ جمائے ایک بھاری بھرکم، زندگی سے مطمئن شخص دکھائی دیا۔ ہمارے درمیان چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ کیا یہ سجاد ظہیر ہو سکتا ہے۔ ہم میں سے ان کے ساتھ کسی کی بھی پہچان نہیں تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کمیونسٹ لوگ نہایت قبیح صورت، درندہ سیرت انسان ہوتے ہیں۔ دائیں بائیں پستول لگاتے ہیں۔ پیٹ پر پیش قبض باندھتے ہیں۔ بڑی بڑی مونچھیں اور خونخوار آنکھیں رکھتے ہیں اور ان کا موضوع محض قتل و غارت

کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سید سجاد ظہیر چونکہ پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری تھے اس لیے ان لوگوں کے خیال میں ان کے منہ سے ہر سانس میں آگ نکلنی تھی اور ان کو اس قسم کا کائیاں انسان ہونا تھا کہ ڈبکی لگائے تو جیل سے باہر چلا جائے۔ یہ شخص جو نرم چال، پاکیزہ خدوخال اور ایک عدد عالمانہ توند لیے ہوئے تھا سجاد ظہیر کیسے ہوسکتا ہے۔ ہمارے یہ ساتھی اپنی رائے پر اس شدت سے مصر تھے گویا یہ ان کا جز وایمان ہے۔ چنانچہ ہم سب نے تسلیم کرلیا کہ یہ سجاد ظہیر نہیں ہو سکتے۔ کشمیری بازار کے شیخ ہوں گے یا پولیس کے خضر صورت ایجنٹ۔ چنانچہ عدالت تک کے تمام سفر میں ہم گم صم بیٹھے ان کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے رہے۔ عدالت میں جب وہ کھڑے ہوکر گرجے کہ 'جناب والا' پندرہ دن ہو گئے ہیں اور مجھے ابھی تک نہیں بتایا گیا کہ میں کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہوں۔ یہ بالکل لغو (Preposterons) بات ہے'' تو ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ سجاد ظہیر ہیں۔ ریمانڈ کے لیے ہمیں جج صاحب کی کوٹھی میں لے جایا گیا تھا۔ وہاں پولیس گارڈوں اور گاڑیوں کی اتنی گہما گہمی تھی کہ کوٹھی کی اوپر کی منزل میں بہت سے لوگ تماشہ دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔'' (۳)

سجاد ظہیر نے جسٹس عبدالرحمٰن کے سامنے پیش ہوتے ہوئے ان کو بتایا کہ وہ تقریباً ایک مہینہ پہلے سیفٹی ایکٹ میں گرفتار ہوئے تھے اور تب سے وہ سینٹرل جیل لاہور میں نظر بند ہیں جہاں انہیں دوسرے نظر بندوں سے علیحدہ قید تنہائی میں رکھا گیا ہے۔ وہاں کی خوراک بے حد خراب ہے اور یہ بھی کہا کہ جیل والے ان سے مناسب سلوک نہیں کرتے۔ انہوں نے جسٹس عبدالرحمٰن سے پوچھا کہ انہیں یہ تو بتایا جائے کہ انہیں صدر کے روبرو کیوں لایا گیا ہے۔ اس پر جسٹس محمد شریف نے کہا وہ آج سے سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند نہیں بلکہ حکومت پاکستان کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں گرفتار ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ تمام افسران جو یہاں موجود ہیں ان سب پر ایک خصوصی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ انہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ اس عدالت کے تین ممبروں میں سے ایک ہیں۔

اس ابتدائی کاروائی سے فارغ ہو کر جب سب لوگ قیدیوں کی گاڑی میں بند ہو کر جیل پہنچے تو سجاد ظہیر کو ڈیوڑھی پر ہی الگ کر دیا گیا اور وہ اکیلے اپنے وارڈ کی جانب روانہ ہو گئے۔ لیکن جاتے جاتے انہوں نے ان سے درخواست کی کہ اگر ہو سکے تو سگریٹوں کا ایک ڈبہ انہیں بھجوا دیں۔ پوشنی صاحب افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ سجاد ظہیر کی یہ خواہش وہ پوری نہ کر سکے۔

اب تک جو ٹریبونل نے کاروائی کی تھی وہ صرف صدر کے بنگلے میں ہی عمل میں لائی گئی تھی لیکن 15 جون 1951 سے ٹریبونل نے حیدر آباد سینٹرل جیل سے راولپنڈی سازش کیس کے ملزمین کے خلاف باقاعدگی سے سنوائی شروع کر دی۔ اس روز صبح سے ہی حیدر آباد سینٹرل جیل میں بہت گہما گہمی تھی۔ جیل کے چاروں طرف پولیس کا کڑا پہرہ تھا۔ سب سے پہلے آنے والوں میں کچھ ملکی اور غیر ملکی اخبار نویس تھے۔ اس کے بعد ایچ ایس سہراوردی جو لطیف خان کی طرف سے مقدمے کی پیروی کر رہے تھے اپنے وکٹوریہ سے نکل کر جیل کی عمارت میں داخل ہوئے۔ ان کے بعد استغاثہ کے چیف وکیل جناب اے۔ کے بروہی نمودار ہوئے۔ تقریباً آٹھ بجے صبح ٹریبونل کے رجسٹرار آئے۔ ٹریبونل کے تین ممبران کے لیے بڑا دروازہ کھولا گیا جہاں سے ان کی تین بڑی گاڑیاں پرچم لگائے ہوئے وارد ہوئیں۔ اس کے بعد جیل کے دروازے بند کر دیے گئے۔

سازش کے قانون کے تحت ملزموں کو یہ حق دیا گیا کہ اگر کوئی ملزم اپنے دفاع کے لیے وکیل مہیا کرنے کی حالت میں نہ ہو تو وہ عدالت سے گزارش کر سکتا ہے کہ حکومت کے خرچے پر اس کے لیے وکیل مقرر کیا جائے۔ شروع میں ضیا الدین، مرزا حسن، اسحاق محمد، خضر حیات اور سجاد ظہیر نے سرکاری وکیل کے لیے درخواست دائر کی اور باقی نو ملزمین نے خود ہی اپنی جانب سے اپنے خرچے پر وکیلوں کا انتظام کیا۔ لیکن چونکہ مقدمے نے طوالت پکڑ لی تھی اس لیے فیض احمد فیض، صادق خان اور ایر کموڈور جنجوعہ بھی وکیلوں کا خرچہ برداشت نہیں کر پائے اور اپنے اپنے وکیلوں کی خدمات سے سبکدوش ہو گئے۔ البتہ ایر کموڈور جنجوعہ نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے مقدمے کی پیروی خود ہی کریں گے۔ اکبر خان، نسیم خان، لطیف خان، نظیر احمد، کرنل ارباب اور ظفر اللہ پوشنی نے مقدمے کے آخری لمحوں تک اپنے وکیلوں کی خدمات برقرار رکھیں۔ لطیف خان کی طرف سے سہراوردی اور اکبر خان کی طرف سے زیڈ۔ ایچ۔ لاری مقدمہ کی پیروی کر رہے تھے۔ یعنی بہت سے مشہور اور قابل وکیل جو مقدمے

کے شروع میں موجود تھے رفتہ رفتہ الگ ہو گئے کیوں کہ ان کی آسامیاں اپنے وکیلوں کی فیس ادا کرنے میں نااہل تھیں۔

سازش کیس کے تمام ملزمین کو حیدرآباد جیل میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ وہاں کی جیل میں نو قیدیوں کو 'بی' کلاس کے وارڈ میں ڈال دیا گیا اور سجاد ظہیر، ایر کموڈور جنجوعہ، جنرل نظیر احمد اور بریگیڈیر لطیف خان کو 'اے' کلاس عطا ہوئی۔ اسی 'اے' کلاس کی بیرک میں ایک طرف دیوار کھینچ کر ایک کمرے کو باقی وارڈ سے الگ کر کے بیگم نسیم اکبر خان کو دیا گیا۔ بیگم نسیم کو ایک روز پہلے ہی بذریعہ ہوائی جہاز لایا گیا تھا اور انہیں زنانہ وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ یعنی 14 ملزمین کو جیل کے مختلف وارڈوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جن میں نو کو 'بی' کلاس ملی تھی۔ چار کو 'اے' کلاس اور اسی وارڈ کے ایک زنانہ کمرے میں بیگم نسیم اکبر کو رکھا گیا تھا۔

حیدرآباد پہنچنے کے دوسرے دن سینئر جیلر نے اپنے کمرے میں بلا کر اکبر خان اور بیگم اکبر خان کو ملاقات کا موقع دیا جو بہت غنیمت تھا۔ کچھ دنوں کے بعد دن کے وقت 'اے' کلاس اور 'بی' کلاس کے قیدیوں کو ایک دوسرے کے وارڈ میں آنے جانے کی اجازت بھی مل گئی اور بیگم نسیم اکبر کو بھی یہ سہولیت دے دی گئی کہ وہ دن میں تھوڑے وقفے کے لیے 'بی' کلاس میں جا سکتی ہیں۔

ظفر اللہ پوشنی کے مقدمے کی پیروی ان کی والدہ کے ماموں حاجی محمد حسین بار ایٹ لا کر رہے تھے۔ جب کرنل ضیاالدین نے سرکاری وکیل کی خدمات حاصل کرنے کی درخواست دی تو حکومت نے حاجی محمد حسین کو ان کا بھی وکیل مقرر کر دیا۔ یعنی حاجی صاحب پوشنی اور ضیاالدین دونوں کے وکیل مقرر ہو گئے اور جو 25 روپے روزانہ الاؤنس انہیں ملتا تھا اسی پر قناعت کر لیتے تھے اور پوشنی سے کچھ نہیں لیتے تھے۔ مقدمے کی شنوائی کے پہلے دن وکیلوں کی خوب ریل پیل تھی۔ بریگیڈیر لطیف کی طرف سے سہراوردی اور جنرل اکبر خان کی طرف سے زیڈ۔ ایچ۔ لاری مقدمہ لڑ رہے تھے۔ دوسرے نامور وکلا میں ملک فیض محمد، خواجہ عبدالرحیم، صاحبزادہ نوازش علی اور قاضی اسلم کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ کافی سارے اور وکیل بھی تھے۔ اگرچہ بعد میں کئی وکیل اپنے موکلوں کی مالی بدحالی کی وجہ سے انہیں چھوڑ گئے لیکن مسٹر سہراوردی کی داد دینی پڑتی ہے کہ آخری دم تک انہوں نے اپنے موکل کا ساتھ نہ چھوڑا۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے روپے پیسے کی بالکل پرواہ نہ کی اور پوری مدت

ملزمین کی طرف سے پیش ہوتے رہے۔

مقدمے کی کاروائی 15 جون 1951 سے 5 جنوری 1953 تک جاری رہی جب اس کا فیصلہ سنایا گیا۔ کاروائی چونکہ خفیہ تھی اور اسے افشا کرنے والے کو دو سال قید بامشقت کی سزا دی جاسکتی تھی اس لیے کاروائی کی تفصیل کسی نے بیان نہیں کی لیکن سازشیوں کے معمولات کے مطابق کاروائی کچھ اس قسم کی تھی۔

صبح ساڑھے چھ بجے	۔	بستر سے اٹھنا اور نہادھو کر تیار ہونا
صبح ساڑھے سات بجے	۔	ناشتہ (ٹوسٹ، مکھن اور انڈا)
آٹھ سے دس بجے تک	۔	عدالت کا پہلا سیشن
دس سے ساڑھے دس بجے	۔	وقفہ
ساڑھے دس سے ساڑھے بارہ بجے	۔	عدالت کا دوسرا سیشن
ڈھائی سے چار بجے	۔	قیلولہ
سوا چار سے ساڑھے چار بجے	۔	چائے
شام ساڑھے چار سے چھ بجے	۔	ورزش اور کھیل
چھ سے سات بجے	۔	غسل اور تبدیلی لباس
ساڑھے سات بجے	۔	رات کا کھانا
آٹھ سے دس بجے رات	۔	تاش، مطالعہ، ریڈیو، چہل قدمی وغیرہ
ساڑھے دس سے گیارہ بجے رات	۔	سونے کے لیے بستر پر دراز ہونا

مندرجہ بالا پروگرام سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیدرآباد جیل میں قیدیوں کی زندگی کافی آرام دہ تھی۔ ان کے پاس کئی طرح کے مشاغل موجود تھے جن کی وجہ سے وقت بڑی آسانی سے کٹ جاتا تھا، شاید جیل کے حکام کو حکومت کی طرف سے ہدایت بھی دی گئی تھیں کہ ان سیاسی ملزموں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے تاکہ یہ لوگ مقدمے کے دوران کوئی غل غپاڑہ نہ کریں اور امن سے رہیں۔

یہ بات پہلے ہی بتائی جاچکی ہے کہ سازش کا پندرھواں ملزم محمد حسین عطا گرفتار ہونے سے پہلے فرار ہو گیا تھا۔ عدالت کی عارضی کاروائی کے دوران یعنی عدالت کی باقاعدہ کاروائی سے کوئی ایک

مہینہ پہلے کا ذکر ہے کہ سلطانی گواہ صدیق راجہ اپنا بیان دے چکے تو دوسرے سلطانی گواہ یوسف سیٹھی نے اپنا بیان شروع کیا۔ جب وہ اپنا بیان دے کر رخصت ہوئے تو استغاثہ کے وکیل اے کے بروہی نے کھڑے ہو کر عدالت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ انہیں ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ملزمین کا پندرہواں ساتھی محمد حسین عطا جو اب تک فرار تھا، مشرقی پاکستان میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔

اپنی گرفتاری کی روداد محمد حسین عطا نے جو جیل میں دوسرے ساتھیوں کو سنائی اس کے مطابق وہ 5 مئی 1951 کو اروونڈا نام کے ایک جہاز میں کسی فرضی نام سے مشرقی پاکستان کے لیے روانہ ہوئے لیکن ان کا جہاز ایک بندرگاہ تک پہنچنے سے پہلے ہی روک دیا گیا۔ دراصل جہاز کے کپتان کو بذریعہ ریڈیو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ جہاز کو ساحل کے قریب نہ لے جائے۔ عطا نے ایک کشتی والے سے بھی درخواست کی کہ اسے ساحل تک پہنچا دے لیکن وہ نہ مانا۔ دو تین دن کولمبو میں رکنے کے بعد جہاز چٹاگانگ کے لیے چل پڑا۔ وہاں بھی جہاز کو ساحل سے بہت پہلے روک دیا گیا۔ اب عطا کو یقین ہو گیا کہ اس کی گرفتاری کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک موٹر لانچ جہاز کے قریب آئی جس میں مسلح پولیس کے کئی سپاہی تھے۔ ان کے ساتھ پنجاب سی آئی ڈی کے عبدالمجید باجوا بھی تھے۔ یہی انسپکٹر باجوا لاہور میں بھی انہی کی نگرانی قریب ایک مہینہ کرتے رہے تھے۔ اس لیے عطا باجوا کو پہلے سے جانتے تھے اور اسی لیے فوراً ہی پہنچان گئے۔ اس کے برعکس باجوا عطا کو ایک دم نہ پہنچان سکے۔ لیکن تھوڑی دیر پوچھ تاچھ کرنے کے بعد عطا پہنچان لیے گئے اور باجوا نے انہیں بنگال سیفٹی ایکٹ کے تحت حراست میں لے لیا۔ ایک رات عطا کو چٹاگانگ کی جیل میں رکھا گیا۔ دوسرے دن انہیں ڈھاکہ لے جایا گیا جہاں سے 15 جولائی 1951 کو وہ کراچی لائے گئے۔ وہاں سے پولیس والے انہیں حیدرآباد سے کچھ دور نارا جیل میں لے گئے جہاں ان کی شناخت کروائی گئی۔ شناخت کرنے والے صدیق راجہ اور میجر یوسف سیٹھی ہی تھے۔ اس دن پولیس نے عطا کے لیے سات دن کا ریمانڈ مانگا جو بڑی آسانی سے مل گیا اور پھر انہیں حیدرآباد سینٹرل جیل بھیجا گیا۔

استغاثہ کی Statement پانچ حصوں میں تھی اور 14 صفحات پر مشتمل تھی۔ پہلے حصے میں مختصر طور پر ان حالات کا ذکر تھا جن کے ذریعے سازش کی کاروائی حکومت کی نظر میں آئی اور یہ کہ اکبر خان کا اس سازش میں کیا کردار تھا۔ دوسرے حصے میں ان چار میٹنگوں کی کاروائی کی تفصیل تھی جو

اکبر خان نے منعقد کی تھیں تا کہ حکومت کا تختہ الٹ سکے۔ تیسرے حصے میں ابتدائی ملاقاتوں کا ذکر تھا جو سازش سے پہلے ہوتی تھیں اور جن کا مدعا تھا کہ سازش کی کامیابی کے لیے ضروری اقدام طے کر لیے جائیں۔ استغاثہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ 1949 سے لے کر 1951 تک اکبر خان نے دیگر سازشیوں سے کوئی 22 بار خفیہ ملاقات کی۔ چوتھے حصے میں ان دستاویزات میں سے محض چار کا ذکر تھا جو اکبر خان کے بنگلے کی تلاشی کے دوران ملے تھے۔ پانچویں حصے میں ان اشخاص کے نام تھے جن پر قانون کی مختلف دفعات کے تحت الزام عائد کیے گئے تھے۔

مقدمے کی کاروائی 15 جون 1951 کو صبح آٹھ بجے ٹریبونل کے مقابل شروع ہوئی۔ سب سے پہلے استغاثہ کے وکیل کا بیان تھا جس میں اس نے سازش سے متعلق استغاثہ کے بیان کی تائید کی تھی۔ یہ تقریر پورے دو دن ہوتی رہی۔ اس نے اکبر خان کے کردار پر بغور جرح کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کہ سازش کا پلان اس پر عمل درآمد کرنے سے متعلقہ اقدام کا چناؤ وغیرہ سب کچھ اکبر خان کی ہی رہنمائی میں ہوا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا اکبر خان جب 1949 سے 1950 تک کوئی آٹھ مہینے انگلینڈ میں مقیم تھا تو اس کا میل جول کئی کمیونسٹ تنظیموں سے بھی تھا۔ ہر ملزم سے اس کے وکیل کی حاضری میں یہ پوچھا گیا کہ کیا وہ الزام قبول کرتا ہے یا نہیں۔ لیکن ہر ایک نے ان الزامات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے بیان درج کرنے کے بعد ٹریبونل نے استغاثہ کے گواہوں کو طلب کیا۔ سب سے پہلا گواہ پولیس کا ایک سب انسپکٹر تھا جس نے شہادت دی کہ محمد حسین عطا فرار ہے اور لاپتہ ہے۔ اس لیے وہ اس کے وارنٹ گرفتاری پر عمل نہیں کر سکا۔ عدالت نے اس بیان کو مانتے ہوئے حکم دیا کہ مقدمے کی کاروائی عطا کے بغیر ہی جاری رکھی جائے۔

استغاثہ کا دوسرا گواہ محمد محی الدین صدیق راجہ تھے جس سے کئی سوال کیے گئے اور جس سے ملزموں کے وکلا نے بھی سوال جواب کیے۔ یہ معاملہ 16 جولائی تک جاری رہا۔ اس دوران اے کے بروہی جو استغاثہ کے چیف وکیل تھے انہوں نے اعلان کیا کہ مفرور محمد حسین عطا 13 جولائی 1951 کو چٹاگانگ میں گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ ٹریبونل نے عطا کو ریمانڈ دے کر عدالت کو 26 جولائی تک ملتوی کر دیا۔ وہ تمام دستاویزات جو دوسرے ملزموں کو دی گئی تھیں وہ عطا کو بھی دے دی گئیں۔ اس روز آدھے دن تک عطا کو ان پر لگے الزام پڑھ کر سنائے گئے جنہیں عطا نے قبول کرنے

سے انکار کر دیا۔

تیسرا بڑا گواہ میجر یوسف سیٹھی تھا۔ ان پر جرح کئی دن تک جاری رہ کر 7 اگست کو اختتام تک پہنچی۔ اس کے بعد دیگر گواہوں کی شہادت درج کی گئی۔ بروہی صاحب نے شہادت کی کاروائی کو 7 مارچ 1952 تک مکمل کر لیا تھا۔ دفاع کی جانب سے کوئی گواہ پیش نہیں کیا گیا۔ ملزموں کے ذاتی بیانات بھی کئی دنوں تک درج ہوتے رہے۔ جناب سہراوردی جو بریگیڈیر لطیف کی طرف سے مقدمے کی پیروی کر رہے تھے انہوں نے 2 جون کو اپنی صفائی شروع کی اور اسے 13 اگست تک برقرار رکھا۔ انہوں نے ٹریبونل کو بتایا کہ وہ 15 نومبر تک اپنی جرح مکمل کریں گے لیکن عدالت نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنی دلیلیں لکھ کر عدالت کو دے دیں تاکہ کاروائی جلد ختم کی جا سکے۔ آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ سہراوردی کو (15) دن کا وقفہ دیا جائے گا۔ اور انہیں کہا گیا کہ وہ 10 اکتوبر تک اپنا بیان مکمل کر لیں۔ منظور قادر نے دس دن ہی مانگے تھے جو اسے دے دیئے گئے۔ مقدمے کی دلیلیں پہلی نومبر 1952 کو ختم ہوئیں۔

ٹریبونل کی کاروائی تو مکمل ہو گئی اور بعد میں 5 جنوری 1953 کو مجرموں کو جو سزائیں دی گئیں ان کا اعلان بھی کر دیا گیا لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہا کہ کیا سجاد ظہیر اور کمیونسٹ پارٹی کا اس سازش میں کوئی ہاتھ تھا یا نہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ایوب مرزا کو پورا یقین ہے کہ سجاد ظہیر، فیض اور عطا اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ اس سازش میں شامل ہوئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اس کو نظر انداز نہیں کرنا کہ سجاد ظہیر کمیونسٹ پارٹی میں ایک اعلیٰ درجے کا عہدیدار ہے اور استغاثہ کے گواہوں کے مطابق وہ جون 1948 میں روپوش ہو گیا تھا کیونکہ پبلک سیفٹی آرڈیننس کے تحت گورنمنٹ نے اس کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کیا تھا۔ اور وہی شخص اس کانفرنس میں شامل ہونے کو آیا ہوا تھا۔ اگرچہ اوائل فروری 1951 میں وہ پہلے بھی یہاں آیا تھا اور مسٹر ریاض احمد کے گھر ٹھہرا تھا۔ ریاض سے اس کا تعارف مولانا کے نام سے کرایا گیا تھا۔
> یہ ملاقات غالباً اس بات کی تائید میں تھی کہ اکبر خان نے یہ اسکیم پہلے سے تیار کر رکھی تھی --------

کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری جنرل سجاد ظہیر کا اس کانفرنس میں حصہ لینا جس میں معروف مدیر ممتاز انگریزی روزنامہ لاہور (پاکستان ٹائمز) بھی شریک ہے جس پر الزام ہے کہ وہ پرانا کمیونسٹ ہے، کے مدِ نظر معاملہ کی اہمیت یہ ہے کہ اکبر خان نے محسوس کیا ہوگا کہ ایسے ہم خیال لوگوں کی حمایت نہ صرف گورنمنٹ کا تختہ الٹنے میں کامیابی کی دلیل ہے بلکہ اس کے پلان کو بڑھاوا دینے میں بیرونی امداد بھی اقتصادی اور آئینی وفد روس بھیج کر حاصل کی جا سکے گی۔

کمیونسٹ لوگ فوج کے ساتھ اتحاد کرنے کو تیار تھے تاکہ موجودہ حکومت کو برخاست کر کے ملک میں بحران پیدا کیا جائے۔ دکھائی دیتا ہے کہ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ اپنا مقصد حاصل کریں۔ جس کے لیے وہ لگاتار کوششیں کرتے چلے آئے تھے۔ اشتراکیت بذات خود پاکستان میں جرم نہیں ہے۔ مگر اشتراکیوں نے ہر اس ملک کے رائج نظام میں بحران پیدا کرنے کی لگاتار کوششیں کی ہیں جہاں جہاں اشتراکی نظام نہیں ہے۔" (۴)

سجاد ظہیر جن دنوں روپوش تھے ایک شخص سردار شوکت علی جو صوبائی پارٹی کے سیکریٹری تھے سبط حسن سے ملنے آئے۔ تب سبط حسن پارٹی کے نشر و اشاعت اور ادبی محاذ کے نگران تھے۔ شوکت علی نے انہیں بتایا کہ کچھ فوجی افسر سجاد ظہیر سے کسی سیاسی کام کے سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس وقت وہ لاہور میں نہیں تھے۔ کچھ دنوں بعد راولپنڈی سے بھی کچھ فوجی افسر آئے اور انہوں نے بھی اسی سلسلے میں بنّے بھائی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ بعد میں جب سجاد ظہیر لاہور لوٹے تو انہوں نے پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا ایک اجلاس بلایا لیکن اس کے ایجنڈے کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ بہر حال یہ اجلاس منعقد ہوا اور سجاد ظہیر نے پہلی بار فوجیوں کے منصوبے کا اظہار کیا۔ اجلاس کے دوران بات چیت سے معلوم ہوا کہ وہ پہلے سے ہی اکبر خان اور بیگم اکبر خان سے ملاقات کر چکے ہیں۔ سبط حسن کہتے ہیں کہ فوجیوں کے منصوبے پر دو تین دن تک بحث ہوتی رہی اور تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ سب نے اس کی مخالفت کی۔ اس سلسلے میں سبط حسن لکھتے ہیں:

"ہمارا کہنا تھا کہ سماجی انقلاب مٹھی بھر فوجیوں کی سازش سے نہیں آتا۔ بلکہ اس

کے لیے مزدوروں، کسانوں اور درمیانہ طبقے کے ترقی پسند لوگوں کی اکثریت کی عملی حمایت بہت ضروری ہوتی ہے اور اس انقلاب کی قیادت انقلابی جماعت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہ جو مٹھی بھر فوجی افسر ہیں، ہمیں نہ تو ان کے سیاسی رجحانات کا علم ہے اور نہ ہم یہ جانتے ہیں کہ سوشلزم اور کمیونزم سے ان کا کتنا لگاؤ ہے۔ ہمارے وہ ساتھی جو انتہا پسندی کا شکار تھے وہ بار بار ملایا، برما، تلنگانہ کی مسلح جدوجہد کا ذکر کرتے۔ غالباً غیر شعوری طور پر وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہاں بھی اگر کوئی پھُلجھڑی چھوڑی تو یہ چیزیں خود بخود بڑھ کر سماجی انقلاب میں بدل جائیں گی۔ دو دن کی مسلسل بحث کے بعد آخر یہ طے پایا کہ فوجیوں سے مزید تفصیلات معلوم کی جائیں۔ ان کے مقاصد کیا ہیں، وہ ملک میں کس قسم کا معاشرتی نظام چاہتے ہیں، آیا ان کے ساتھ کچھ غیر فوجی عناصر بھی ہیں یا نہیں اور وہ اپنے منصوبے کو عملی شکل کیسے دیں گے۔ تفصیلات معلوم کرنے کی ذمہ داری سجاد ظہیر کے سپرد ہوئی۔ کوئی دو یا تین ہفتے کے بعد مرکزی کمیٹی کا اجلاس پھر ہوا۔ اور بنے بھائی نے فوجیوں سے مل کر جو تفصیلات حاصل کی تھیں وہ ہمارے سامنے رکھ دیں۔ ان تفصیلات سے پتہ چلا کہ فوجیوں کا منصوبہ واقعی شیخ چلی کا منصوبہ تھا۔ ان کو نہ تو یہ معلوم تھا کے وہ کن خطوط پر پاکستانی معشیت اور سیاست کو آگے بڑھائیں گے۔ عوام کے جمہوری حقوق کس طرح فروغ پائیں گے۔ حکومت کا ڈھانچہ کیا ہوگا اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ کمیونسٹ پارٹی سے وہ کیا توقعات رکھتے ہیں۔ ان کے بعد ہم کو فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ فوجیوں کے اس منصوبے کو رد کیا جائے اور ان کو سمجھایا جائے کہ وہ ان طفلانہ حرکتوں سے باز آجائیں۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ سجاد ظہیر کے ساتھ میں بھی پنڈی جاؤں اور فوجیوں کو پارٹی کے فیصلے سے مطلع کر دیا جائے۔ دوسرے یا تیسرے دن ہم لوگ پنڈی پہنچے لیکن فوجی افسروں کے یکجا ہونے میں تاخیر ہوئی تو میں نے بنے بھائی کو کہا کہ الیکشن کا زمانہ ہے اور مجھے فلاں

فلاں جگہوں کا دورہ کرنا ہے اس لیے مجھے آپ اجازت دیں۔ چنانچہ میں پنڈی سے لاہور لوٹ آیا۔ دو تین دن کے بعد بنّے بھائی بھی لوٹ آئے اور انہوں نے بتایا کہ فوجی ہماری بات مان گئے ہیں اور انہوں نے فوجی انقلاب کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔"(۵)

سبط حسن نے اپنے مندرجہ بالا بیان میں یہ ثابت کرنے کی نمایاں کوشش کی ہے کہ راولپنڈی سازش میں سجاد ظہیر نہ تو بذاتِ خود شامل تھے اور نہ ہی کمیونسٹ پارٹی اس میں ملوث تھی۔ دراصل ان کی اکبر خان اور نسیم اکبر خان سے کوئی ذاتی جان پہنچان نہیں تھی۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ فیض صاحب سے رابطے کی وجہ سے انہوں نے اکبر خان سے ملنے کی رضامندی دی ہو کیونکہ اکبر خان اور فیض کا کافی گہرا دوستانہ تھا۔ لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ فیض نے بنّے بھائی کو اکبر خان کی میٹنگوں میں شمولیت کی ترغیب دی ہو۔ تمام حالات کا جائزہ لینے سے یہ جان پڑتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی پاکستان میں حکومت کی برطرفی کے حق میں نہیں تھی۔ سجاد ظہیر بھی اپنے بل بوتے پر سازش کے متعلق کوئی بھی فیصلہ لینے کے اہل نہیں تھے کیونکہ جب وہ پاکستان پارٹی کے جنرل سیکریٹری چنے گئے تو کئی کامریڈان کے خلاف تھے۔ ان کے مخالفوں میں سپرائن کا نام سرفہرست تھا۔ سپرائین کے خیال میں سجاد ظہیر کو پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کا بنیادی علم بھی نہیں تھا کیونکہ سجاد ظہیر کسی بھی معاملے میں الجھ جانے کا نام کمیونزم سمجھتے تھے۔ ہندوستانی حلقوں میں بھی سجاد ظہیر کی قابلیت کو شک کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن خفیہ ایجنسیوں نے یہ رپورٹ دی تھی کہ اگرچہ پاکستان میں اب اچھے کامریڈ باقی نہیں رہ گئے تھے اور پارٹی کے مالی حالات بھی اچھے نہیں تھے تاہم سجاد ظہیر نے صرف تین ہی سالوں میں پارٹی کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا اور اب پارٹی کا بجٹ مسلم لیگ کے بجٹ سے معمولی کم تھا۔ یعنی کچھ لوگ اگر سجاد ظہیر کے حق میں نہیں تھے تو کچھ دوسرے لوگوں کو ان کی قابلیت کا یقین بھی تھا۔ دراصل پاکستان کمیونسٹ پارٹی میں اس کے قیام سے ہی تفرقات پیدا ہو گئے تھے۔ سن 1947 میں ایرک سپرائن پنجاب کی صوبائی کمیٹی کے ممبر تھے۔ سپرائن اس اصول کے حامی تھے کہ پارٹی ابھی نئی نئی عمل میں آئی ہے اس لیے سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا جائے لیکن سجاد ظہیر بالکل اس کے حق میں نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پارٹی کو زوردار رویہ اختیار کرنا۔ عطا ایک عوامی جدوجہد کے حق میں تھے لیکن سپرائن

سمجھتے تھے کہ اس جدوجہد کے لیے پارٹی تب تک اہل نہیں تھی۔ 1948 میں عطا نے بھی سجاد ظہیر کو سپرائن کے خلاف خط لکھا جس میں دونوں کے درمیان تفرقات کو واضح کیا گیا تھا۔ عطا نے اپنی پارٹی کے قدآور رہنماؤں سے سجاد ظہیر کے متعلق تاثرات کا ذکر بھی کیا اور انہیں بتایا کہ پارٹی کے لوگوں کو سجاد ظہیر سے سخت شکایت ہے۔ یہ حالات اشارہ کرتے ہیں کہ چونکہ سجاد ظہیر جنرل سیکریٹری ہو کر بھی خودمختار نہیں تھے اس لیے وہ کسی طور پر یہ فیصلہ کرنے قابل نہیں تھے کہ پارٹی کو فوجیوں کے منصوبے میں حصہ لینا۔ بار بار یہی بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ سجاد ظہیر کا رابطہ سازش کے ساتھ صرف فیض کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ شروع میں سازش کے تین کردار تھے۔ فیض احمد فیض، لطیف افغانی اور نسیم اکبر خان۔ اکبر خان فیض کو کئی سالوں سے جانتے تھے۔ فیض ان کے گھر ایک باعزت مہمان کی طرح آتے جاتے تھے۔ کشمیر میں جب قبائلیوں نے حملہ کیا تو اس وقت فیض پروگریسیو پیپرز کے چیف مدیر تھے جس میں پاکستان ٹائمز بھی شامل تھا۔ اس حیثیت سے اکبر خان کئی بار انہیں سرحدی مورچوں پر بھی لے گئے جہاں ان کو مہمان کے طور پر اپنے کیمپ میں رکھا۔ فیض اکبر خان کی فوجی تربیت سے بہت متاثر تھے اور اکبر خان بھی فیض کی ادبی خوبیوں کے دلدادہ تھے۔ جو لوگ اکبر خان کے یہاں جاتے تھے وہ اکثر فیض کو بھی وہاں دیکھتے تھے۔ اگرچہ فیض خود کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں تھے لیکن وہ سجاد ظہیر کے قریبی دوست تھے اور انہی کی وجہ سے انجمن ترقی پسند تحریک میں شامل ہوئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس لمبے عرصے تک سازش کی تیاریاں ہوتی رہیں اس دوران اکبر خان اور نسیم اکبر خان نے فیض سے اس موضوع پر ضرور گفتگو کی ہوگی اور فیض نے کمیونسٹ لیڈروں کو بھی اس سے آگاہ کیا ہوگا۔ اکبر خان نے صرف اس غرض سے کمیونسٹ پارٹی سے رابطہ قائم کیا ہوا تھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس سازش میں کمیونسٹ ان کے کام آئیں گے ورنہ انہیں کمیونزم میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیفٹیننٹ کرنل خداداد نے اسپیشل ٹربیونل کے سامنے اپنی شہادت میں کہا تھا کہ سیالکوٹ میں اپنی بریگیڈ کی کمان سنبھالنے کے فوراً بعد اکبر خان نے اپنی بٹالین کی ایک میٹنگ بلائی تھی اور اس سے دریافت کیا تھا کہ ان کے بیچ کہیں کوئی کمیونسٹ عناصر تو نہیں گھس آئے۔ فوراً بعد کیپٹن منکو خان کو سری بھیجا گیا کہ وہ 'کمیونزم اور اس کے خطرات' پر ایک کورس میں شامل ہوں۔ بعد میں انہوں نے ایسا ہی ایک کورس سیالکوٹ میں بھی افسروں کے فائدے لیے منعقد کیا۔ کورس ختم ہونے کے بعد اکبر خان نے

اپنے افسروں کو مخاطب کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ کیا پاکستان کو روس اور کمیونزم سے فوری طور پر کوئی خطرہ ہے۔ ان سب باتوں کالب لباب یہ ہے کہ اکبر خان کو کمیونزم سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔

ایرک سپرائن کہتے ہیں کہ 1950 میں ملتان میں ایک صوبائی میٹنگ ہوئی جس میں ان کے علاوہ مرزا ابراہیم، سی آر اسلم، امین اللہ جھانیاں، سردار شوکت اور سجاد ظہیر بھی حاضر تھے۔ اس میں اس بات پر بحث ہوئی تھی کہ چند فوجی افسروں نے پارٹی کے لیڈروں سے دریافت کیا ہے کہ کیا حکومت کی برطرفی کی اسکیم میں پارٹی ان کا ساتھ دے گی اور اگر ہاں تو وہ کس قسم کی امداد مہیا کرے گی۔ سپرائن نے کہا کہ انہوں نے اس سازش کے ساتھ کوئی بھی واسطہ رکھنے کی مخالفت کی۔ سی آر اسلم نے کہا کہ 1950 میں جنرل نظیر احمد سبط حسن سے ملے اور کشمیر فتح کرنے میں پارٹی کی امداد کی درخواست کی۔ پارٹی کی مرکزی کمیٹی میں اس معاملے میں بحث ہوئی اور یہ فیصلہ ہوا کہ فیض احمد فیض جنرل اکبر خان سے ملاقات کریں اور پلان کی تفصیل حاصل کریں۔ فیض نے تمام تفصیل حاصل کر کے سینٹرل کمیٹی کے مقابل رکھی جن پر پھر سے طویل مباحثہ ہوا اور یہ فیصلہ ہوا کہ 23 فروری 1951 کی میٹنگ میں جو جنرل اکبر خان کے گھر پہ ہونے والی تھی اس میں سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض پارٹی کی طرف سے حصہ لیں۔

سازش میں پارٹی کی شمولیت کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ 1951 میں عبداللہ ملک جو لاہور ڈسٹرکٹ کمیٹی کے ممبر تھے وہ جنوری 1951 میں سبط حسن سے ملے اور انہیں بتایا کہ فیض فوراً سجاد ظہیر سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس وقت سجاد ظہیر لاہور میں نہیں تھے۔ اگلے دن سبط حسن فیض سے ملے اور فیض نے انہیں بتایا کہ فوج کے کچھ افسر حکومت کو برطرف کرنے کی سازش کر رہے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ فیض یہ دریافت کریں کہ آیا کمیونسٹ پارٹی اس سازش میں شامل ہوگی یا نہیں۔ سجاد ظہیر جب لاہور لوٹے تو سبط حسن نے انہیں تمام بات بتائی۔ ظاہری طور پر سجاد ظہیر اس سازش سے پہلے سے ہی واقف تھے اور اشفاق بیگ سے اس موضوع پر گفتگو کر چکے تھے۔ لیکن اب انہوں نے اس فوجی منصوبے پر سبط حسن، سی آر اسلم اور محمد افضل کے ساتھ بحث کی جنہوں نے منصوبے کی کامیابی پر شک کا اظہار کیا اور مشورہ دیا کہ پارٹی کو اس سازش میں شریک نہیں ہونا۔ سجاد ظہیر نے صلاح دی کہ انہیں راولپنڈی جا کر موقع پر تمام حالات کا جائزہ لینے کی اجازت دی جائے۔ اس پر یہ فیصلہ ہوا

کہ سجاد ظہیر راولپنڈی جائیں لیکن پارٹی کی طرف سے کچھ بھی عہد کرنے سے پہلے وہ پارٹی کی مرکزی سیکریٹریٹ کو رپورٹ پیش کریں۔ تاہم اگرچہ پارٹی نے سجاد ظہیر کو اکیلے جانے کے لیے کہا تھا لیکن پارٹی کے فیصلے کے خلاف وہ فیض کو بھی ساتھ لے گئے۔ راولپنڈی سے واپسی پر سجاد ظہیر نے پارٹی سیکریٹریٹ کی میٹنگ بلائی جس میں شوکت علی جو پنجاب کمیٹی کے سیکریٹری تھے وہ بھی حاضر تھے۔ یہ میٹنگ نواب زادہ امتیاز علی خان کی رہائش گاہ پر ہوئی تھی۔ سبط حسن پہلے سے ہی وہاں رہ رہے تھے۔ شوکت علی اور محمد افضل بالکل اس کے حق میں نہیں تھے کہ پارٹی اس فوجی سازش کے ساتھ کوئی بھی واسطہ رکھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے کچھ بھی فائدہ پہنچنے کی بجائے صرف نقصان ہی ہونے والا ہے۔ لیکن سجاد ظہیر اور پارٹی کے دو دیگر ممبران سازش سے ہمدردی کے حق میں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔ پارٹی میں اختلاف کا ذکر سجاد ظہیر نے اپنے ایک خط میں بھی کیا ہے جو اس نے 14 فروری 1951 کو اشفاق بیگ کو لکھا تھا۔ اس خط میں سجاد ظہیر نے اپنے راولپنڈی کے دورے کے متعلق مختصر طور پر اشفاق بیگ کو آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ اس نے سازش کے بارے بڑی سنجیدگی سے غور کیا ہے۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ تمام ممبران کو بلا کر ان سے مشورہ کیا جائے لیکن چونکہ وقت بہت کم تھا اور اکثریت (تین میں سے دو ممبران) نے اس کے حق میں فیصلہ کیا تھا لہٰذا ہم نے اس بارے میں فیصلہ کرنے کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

مندرجہ بالا حالات کی تائید سبط حسن اور عبدالرؤف ملک نے بھی کی ہے۔ اس لحاظ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ راولپنڈی سازش کیس میں کمیونسٹ پارٹی اپنے طور پر ملوث نہیں تھی لیکن سجاد ظہیر نے اس سے متعلقہ میٹنگوں میں اپنی ذمہ داری پر اور ذاتی فیصلے کے مطابق شرکت کی۔

جب سازش کا 9 مارچ کو انکشاف ہوا تو کمیونسٹ پارٹی میں تھل تھلی مچ گئی۔ پارٹی کے ممبران کو یہ سن کر سخت حیرت ہوئی کہ سازش میں کمیونسٹ پارٹی بھی شامل ہے۔ اس کے فوراً بعد پارٹی نے ایک بیان میں اس بات کو رد کیا اور کہا کہ ان کا سازش سے کچھ بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہ بیان روزنامہ 'اپنا وطن' میں شائع ہوا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ پارٹی تشدد میں یقین نہیں رکھتی اور خون خرابے کی مذمت کرتی ہے۔ وہ پاکستان میں فوجی حکومت قائم کرنے کے سخت خلاف ہے اور

صرف جمہوری طریقے سے قائم کردہ حکومت کے حق میں ہے۔لیکن جلد ہی یہ بات واضح ہوگئی کہ پارٹی کے بڑے لیڈر اس میں ملوث ہیں۔ پارٹی ورکروں کو سجاد ظہیر نے ہدایات جاری کیں کہ وہ نہایت سوجھ بوجھ سے اپنے خفیہ مقامات کا انتخاب کریں اور اپنے روزمرہ کے کاموں میں بڑی احتیاط برتیں کیونکہ سی آئی ڈی ان کی نقل وحرکت پر سخت گیر نظر رکھے ہوئے ہے۔اب تک حکومت کو یقین ہوگیا تھا کہ اس سازش سے کمیونسٹ پارٹی کی سازشیوں کے ساتھ سازگانٹھ ہے۔ چنانچہ لیاقت علی خان کے 9 مارچ کے ریڈیو پر اعلان کے بعد کمیونسٹوں کی پکڑ دھکڑ بڑے پیمانے پر شروع ہوگئی۔

9 مارچ 1951 کو سبط حسن کو گرفتار کرلیا گیا۔اس کے اگلے ہی دن حسن عابدی جو سجاد ظہیر کے ذاتی پیغامبر تھے اور ان کے نائب کے طور پر ان سے جڑے ہوئے تھے حراست میں لے لیے گئے۔اس وقت وہ سجاد ظہیر کی طرف سے ان کا ایک خط شوکت علی کے لیے لے جا رہے تھے۔ سجاد ظہیر 28 اپریل کو پکڑے گئے۔ساتھ ہی کمیونسٹ پارٹی اور اس کے دیگر اداروں سے وابستہ افراد کے ملک گیر گرفتاری کا حکم بھی صادر کیا گیا۔ 11 مئی کو یہ اعلان کیا گیا کہ 13 اور کمیونسٹ گرفتار کرلیے گئے ہیں جن میں سات لاہور سے تھے، تین کراچی سے اور تین سندھ سے۔لیکن یہ گرفتاریاں سیفٹی ایکٹ کے تحت عمل میں لائی گئیں تھیں۔ان کے اوپر کوئی جرم عائد نہیں تھا۔صرف حفظان قوم کے نظریے سے گرفتار ہوئے تھے۔یہ گرفتاریاں پہلے چھ مہینے کے لیے تھیں لیکن بعد میں یہ میعاد بڑھتی چلی گئی۔گرفتاری کی وجہ امن وامان کو خطرہ بتائی گئی۔

محمد حسین عطا بھیس بدل بدل کر راولپنڈی، لاہور، منٹگمری اور حیدرآباد سے ہوتا ہوا کراچی پہنچا جہاں ایک دوست کے وسیلے سے انہیں گورنمنٹ کوارٹر میں ٹھہرایا گیا۔ایرک سپرائن اپنے چند ورکروں کے ساتھ پہلے ہی وہاں رہ رہے تھے۔انہوں نے وہاں اشفاق بیگ سے میٹنگ کی جس میں حسن نظیر اور کچھ پارٹی کارکن موجود تھے۔اشفاق بیگ یہ چاہتے تھے کہ سجاد ظہیر کو بھی کراچی بلالیا جائے اور ان کے ٹھہرنے کا انتظام کسی محفوظ جگہ پر کیا جائے۔اپریل 1951 کے ابتدائی دنوں میں ایک اور میٹنگ اس مقام پر ہوئی جہاں اشفاق بیگ ٹھہرے ہوئے تھے۔اشفاق بیگ نے اس میٹنگ میں کہا کہ سجاد ظہیر اور عطا نے راولپنڈی کی میٹنگ جو 23 فروری 1951 کو اکبر خان کی رہائش گاہ پر ہوئی تھی، اس میں شامل ہوکر پارٹی کے لیے بہت پریشان کن مشکلات کھڑی کردی ہیں۔

اس لیے انہوں نے اس خطرے پر تشویش ظاہر کی کہ پولیس اب بہت بڑے پیمانے پر کمیونسٹوں کو گرفتار کرے گی۔ اس میٹنگ میں مخالف گروپ کھڑے ہو گئے۔ اشفاق بیگ نے مشورہ دیا کہ تمام ممبروں سے صلاح مشورہ کیا جائے تا کہ سازش میں شامل ہونے کے ردعمل کا خاطر خواہ حل نکالا جا سکے۔ ایرک سپرائن اور محمد نظیر نے اس مشورے کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ سازش کی ساری ذمہ داری پارٹی لیڈروں کو قبول کرنی۔ اس کے بعد ایک اور میٹنگ حسن نظیر کے گھر ہوئی جس میں ایرک سپرائن، اشفاق بیگ، حسن نظیر اور عبدالغفور شامل تھے۔ اس میٹنگ میں تمام وہی باتیں دہرائی گئیں جو پہلی میٹنگوں میں زیر بحث آ چکی تھیں۔ البتہ سپرائن اور غفور نے اس بات کی سخت مذمت کی سجاد ظہیر نے بہت سے ضروری واقعات پارٹی ورکروں سے چھپا کر رکھے۔ انہوں نے سجاد ظہیر پر پارٹی کے ساتھ دغا کرنے کا الزام بھی لگایا۔

مئی کے مہینے میں سی آر اسلم، شوکت علی، لال خان اور شمیم اشرف نے ایک میٹنگ منعقد کی جس میں سجاد ظہیر کے دفاع کے معاملے میں بحث ہوئی۔ لال خان کو شیخ محمد رفیق سے ملنے کو کہا گیا تا کہ وہ سجاد ظہیر کے لیے کسی وکیل کا انتظام کریں۔ محمد رفیق آزاد پاکستان پارٹی کے وکیل تھے۔ لیکن لال خان 5 جون کو گرفتار ہو گئے اور اگلے ہی دن شمیم اشرف بھی دھر لیے گئے۔ 18 جون کو ایک اور میٹنگ ہوئی جس میں ایرک سپرائن، محمد حسین عطا، شوکت علی، حسن نظیر، عبدالغفور اور دو دوسرے ممبر جو دعوت نامے کے ذریعے بلائے گئے تھے، شامل ہوئے۔ شوکت علی نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ کبھی بھی سازش میں پارٹی کی شمولیت کے حق میں نہیں تھا۔ یہ بھی کہا کہ سجاد ظہیر کے غلط فیصلے کی وجہ سے پارٹی پر مصیبتیں نازل ہونے والی ہیں ان کی وجہ سے پارٹی برقرار نہیں رہ پائی گی اس لیے پارٹی کو بند کر دینا۔ محمد حسین عطا نے بھی سازش کے بارے میں کسی بھی علم سے انکار کیا اور کہا کہ انہیں سجاد ظہیر نے راولپنڈی طلب کیا تھا جہاں انہوں نے عطا کو بتایا کہ 23 فروری کی میٹنگ میں شامل ہونے کا فیصلہ پارٹی ممبران کی اکثریت سے لیا تھا۔ سجاد ظہیر نے یہ بھی کہا کہ بذات خود وہ اس میٹنگ میں حصہ نہیں لینا چاہتے تھے لیکن ان پر بیگم نسیم اکبر خان کا دباؤ تھا۔ ایرک سپرائن نے پارٹی ممبروں کی نکتہ چینی کرتے ہوئے افسوس ظاہر کیا کہ ورکروں نے سینہ سپر ہو کر سجاد ظہیر کی مخالفت نہیں کی ورنہ پارٹی سازش میں شامل ہونے کے الزام سے بچ جاتی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ سجاد ظہیر کو پارٹی سے بے دخل

کر دینا۔ آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ (۱) پارٹی کا ایک ٹربیونل قائم کیا جائے جو سجاد ظہیر اور عطا پر لگائے گئے الزامات کی تفتیش کریں (۲) پارٹی کو فسخ نہ کیا جائے (۳) ایرک سپرائن کو پارٹی کا جنرل سیکریٹری بنایا جائے۔ شوکت علی اور عبدالغفور پنجاب میں کام کریں، ایرک سندھ میں اور یامن اور حسن نظیر کراچی میں (۵) عطا کو یہ اجازت دی جائے کہ وہ مشرقی پاکستان کے راستے ہندوستان جائیں۔ لیکن اس میٹنگ کے ایک مہینے کے اندر ہی اندر یہ تمام لیڈر گرفتار ہو گئے۔ شوکت علی 30 جون کو حافظ آباد میں گرفتار ہوئے۔ محمد حسین عطا 13 جولائی کو چٹاگانگ (ایسٹ پاکستان) میں اور سپرائن اور یامن 8 جولائی کو لانڈھی میں پکڑے گئے۔ حسن نصیر 15 جولائی کو گرفتار ہوئے۔ سی آر اسلم کافی مدت تک روپوش رہے لیکن آخر کار 4 اپریل 1952 کو وہ بھی پولیس کی گرفت میں آ گئے۔

راولپنڈی سازش میں ملوث ہونے کی پارٹی کو بڑی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ پارٹی کے لیڈروں اور عام ورکروں کی بڑے پیمانے پر گرفتاری نے پارٹی کو نہایت پست حوصلہ کر دیا۔ صوبائی کمیٹیاں ٹوٹنے لگیں اور ٹریڈ یونین کی سرگرمیاں رک گئیں۔ پارٹی پر ملک سے بغاوت کا کالا دھبہ لگ گیا اور عوام اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگی۔ یہ نظریہ نہ صرف لوگوں کا تھا بلکہ بہت سے پارٹی ورکز بھی یہی محسوس کرنے لگے تھے۔ سجاد ظہیر کے قبضے سے پولیس نے جو کاغذات برآمد کیے اس سے پارٹی کی تمام سرگرمیوں کا راز کھل گیا اور اس پر ایرک سپرائن نے سجاد ظہیر کو ہی اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ حوالات کے دوران بہت سے پارٹی ورکر علیحدہ ہو گئے اور ایک نئی پارٹی تشکیل کرنے کی بھی کوشش کی۔ سن 1952 تک سوائے سبط حسن اور حسن نصیر کے پارٹی کے تمام ورکز رہا کر دیئے گئے تھے لیکن رہائی سے پہلے حکومت نے تمام ورکروں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف شک کے عناصر پیدا کر دیئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رہائی کے بعد یہ تمام ورکز ایک دوسرے پر الزام لگانے لگے کہ انہوں نے ہی پولیس کو ان کی گرفتاری عمل میں لانے میں مدد کی ہے۔ کارکن کھلے عام ایک دوسرے کو شک کے نظریے سے دیکھنے لگے۔ اس لیے پارٹی کو از سر نو تشکیل کرنے میں کسی کو کوئی کامیابی نہ مل سکی۔ حتیٰ کے 1954 میں کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی قرار دے کر اس پر پابندی لگا دی گئی۔

فوجی افسروں کی سازش کا حکومت برطانیہ کو بہت پہلے سے پتہ تھا۔ لاہور میں جو برطانیہ کا ڈپٹی ہائی کمشنر تھا اس نے کامن ویلتھ ریلیشن آفس کو 11 مارچ کو ایک رپورٹ پیش کی جس میں کہا

گیا کہ فوجی اور سویلین حکام دو سالوں سے اکبر خان، ان کی بیگم اور فیض احمد فیض پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اور اس کام کے لیے ایک ڈپٹی انسپکٹر جنرل کو مقرر کیا گیا تھا۔ اکبر خان جب انگلینڈ میں ٹریننگ لے رہے تھے اس وقت وہاں کی خفیہ ایجنسی نے انہیں مشکوک نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس رپورٹ میں ڈپٹی ہائی کمشنر نے لکھا تھا:

''اکبر خان ہمیشہ ایک امریکن ادیب اینڈ ریو روتھ کی صحبت میں پائے جاتے تھے۔ اس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کی بیوی کا نامناسب اثر کمیونسٹوں کی بہبودی کے کام نہیں آئے گا۔ لیکن بعد میں جو کاغذات خفیہ ایجنسیوں کے ہاتھ لگے ان سے جان پڑا کہ اکبر خان کی بیوی نے انہیں اس حد تک زیر اثر کر رکھا ہے کہ وہ حکومت کا تختہ الٹنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ وہ عورت ہوشیار بھی ہے اور خطرناک بھی۔ اکبر کی اقتدار میں آنے کی خواہش کی آگ کو ان کی بیوی اور فیض احمد فیض نے خوب بھڑکایا ہے۔ ان کاغذات نے یہ ثابت کر دیا کہ جیل کے باہر پاکستان کے لیے سب سے خطرناک شخص فیض ہی ہے۔ پی ایم اے کا کل جو بریگیڈیر انگل کے نائب تھے انہوں نے مجھے بتایا کہ فیض نے فوج میں کمیونسٹ لٹریچر کی بنیاد رکھ دی ہے۔'' (۶)

راولپنڈی سازش کیس کو ایک اور زاویے سے بھی دیکھنے کی چنداں ضرورت ہے خاص کر اس لیے کہ شاید اکبر خان اور کمیونسٹ پارٹی کو سوویٹ روس کی امداد حاصل تھی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ سازش کے مقدمے کی کاروائی خفیہ تھی اور اس کا کسی طرح سے بھی انکشاف کرنے والے کو دو سال کی قید کی سزا دی جا سکتی تھی۔ لیکن بے نظیر بھٹو کے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کے بعد مقدمے سے جڑے ہوئے کاغذات پر سے یہ پابندی اٹھالی گئی تھی اور ہر کسی کو مقدمے کے متعلقہ کاغذات تک رسائی حاصل ہو چکی تھی۔ ان کاغذات کے مطالعہ سے کچھ ایسے حالات سامنے آتے ہیں جن کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ جان پڑتا ہے کہ پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے مئی 1949 میں روس کا دورہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ روس نے اس دورے کی تاریخ 15 اگست تجویز کی تھی جو پاکستان کو قبول نہیں تھی کیونکہ 14 اگست ان کا یوم آزادی ہوتا ہے اور صرف اگلے ہی دن روس نہیں پہنچ سکتے

تھے۔روس نے وزیراعظم کی مجبوری کے مدنظر 7 نومبر کی تاریخ تجویز کی لیکن بعد میں اس تاریخ کو بھی ملتوی کر دیا۔ اگر چہ لیاقت علی ہر تاریخ کو منظور کر رہے تھے لیکن روس بار باران کے دورے کی تاریخ کو بدلتا رہتا تھا۔روس نے یہ بھی شرط رکھی تھی کہ وزیراعظم کے دورے سے پہلے دونوں ممالک اپنے اپنے سفیر بھیجیں تا کہ دورے کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے۔لیاقت علی خان نے ہر طرح سے اس دورے کو عملی جامہ پہنانے کی پوری پوری کوشش کی مگر دورے کا پروگرام انجام تک نہ پہنچ سکا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نہرو نے نومبر 1949 کے پہلے ہفتے میں امریکہ کا دورہ کیا تھا اور روس چاہتا تھا کہ پہلے نہرو کو روس آنے کی دعوت دی جائے۔لہٰذا روس کے سفیر نے 5 مئی 1950 کی تاریخ مقرر کی جو لیاقت علی کو منظور نہیں تھی۔اس کے بعد روس نے کوئی بھی تاریخ مکمل طور پر طے نہیں کی۔اسی دور میں یعنی اکتوبر۔نومبر 1949 میں اکبر خان سازش کی تیاری میں پوری طرح لگے ہوئے تھے کیونکہ دسمبر میں لیاقت علی خان صوبہ سرحد کا دورہ کرنے والے تھے۔اسی اثنا میں دسمبر 1949 کو اکبر خان نے فوجی روایت کے خلاف روسی پروگریسیو رائٹرز کے ڈیلیگیشن کا خیر مقدم کیا اور ان کے ایک جلسے میں شمولیت بھی اختیار کی جو معمول کے خلاف تھی۔یہ کہا جاتا ہے کہ فتح جنگ میں 21 دسمبر کو ایک میٹنگ ہوئی تھی جس میں اکبر خان نے صدیق راجہ اور صادق خان کو ہدایت کی تھی کہ وہ پارٹی سے پیسے بچا کر بیگم نسیم کے حوالے کر دیں کیونکہ ان دنوں وہ کمیونسٹ لٹریچر کو خفیہ طور پر فوجیوں میں تقسیم کر رہی تھیں۔ظاہر ہے کہ اکبر خان اور نسیم نے کمیونسٹ پارٹی سے رابطہ قائم کر لیا تھا اور انہیں اس سازش کے پلان سے بھی آگاہ کیا تھا۔ان معاملات سے یہ شک گزرتا ہے کہ حکومت کی برطرفی کی سازش کا سوویٹ روس کو علم ہو چکا تھا۔اگر یہ سچ ہے تو لیاقت علی کے اس دورے سے روسی حکومت کو ایک خاص طرح کی پیچیدگی میں مبتلا ہونا پڑ سکتا تھا۔ہوسکتا ہے کہ روس نے جو دعوت دینے کے بعد لیاقت علی کا دورہ بار بار ملتوی کیا اس کی یہی وجہ ہو۔

اس سوال پر کہ کیا سجاد ظہیر سازش میں ملوث تھے یا نہیں، ڈاکٹر جی ادھیکاری نے کھل کر بحث کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ جب سجاد ظہیر کو پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی رہنمائی سونپی گئی اس وقت وہ ایک خودمختار پاکستان کے حق میں مہم چلا رہے تھے اور فیض احمد فیض اپنے اخبار میں ان کے حق میں مضامین چھاپ رہے تھے۔اس زمانے میں پاکستان کے تمام ادیب اپنے ادبی کارناموں کے

ذریعے پاکستان کی امریکہ نواز پالیسی پر زبردست حملے کر رہے تھے۔ ادھیکاری کہتے ہیں کہ لیاقت علی خان کو ادیبوں کے اس رویے میں سازش کی بُو آنے لگی تھی اور انہوں نے نام نہاد راولپنڈی سازش کیس مرتب کیا جس میں سجاد ظہیر، سبط حسن اور فیض پر یہ الزام لگایا کہ ان لوگوں نے جنرل اکبر خان اور کئی دوسرے فوجی افسروں کے ساتھ مل کر جمہوری طریقے سے چنی ہوئی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کا پلان بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک دہشت پسندانہ مقدمے کا ساں باندھا گیا۔ اس کا قطعی ثبوت یہ ہے کہ وزیراعظم پاکستان نے پبلک تائید حاصل کرنے کے لیے کچھ خطوط پڑھ کر سنائے جن کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ ان کے بعض دوستوں نے لکھے ہیں اور یہ مطالبہ کیا ہے کہ ملزموں کو بغیر کسی مقدمے یا تفتیش کے گولی مار دی جائے۔ مقدمے کی کاروائی کو خفیہ رکھ کر اور بیرونی طاقتوں کی چالوں کی طرف ڈھکے چھپے اشارے کر کے یہ کوشش کی گئی کہ پاکستان کے پریس کے جنوبی حلقوں کو ملزموں کے خلاف برافروختہ کر دیا جائے لیکن اصلی صورت حال ایک اپیل نے بالکل صحیح صحیح بے نقاب کر دی۔ یہ اپیل ہندوستانی ادیبوں اور فنکاروں نے جاری کی تھی اور اس میں مطالبہ کیا تھا کہ ملزموں کو اپنی صفائی پیش کرنے اور اپنی رہائی حاصل کرنے کے لیے پوری سہولتیں دی جائیں۔ اس میں کہا گیا کہ گرفتاریاں سامراجی سازشوں کے پس منظر میں ہوئی ہیں۔ لیاقت حکومت کے ذریعے سامراجیت پاکستانی فوجوں کو کوریا بھیجنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پاکستان کی سرزمین پر اہم جنگی اڈے قائم کرنے کے لیے گفت و شنید ہو رہی تھی۔ پاکستان کی مسلح افواج میں ان سوالوں پر اور کشمیر کے سوال پر اختلاف پیدا ہوئے تھے جن کو بہانہ بنا کر ان افسروں پر سازش کیس چلا دیا جو حکمراں طبقے کی پالیسیوں کی مخالفت کرتے تھے اور کیس اس طرح تیار کیا گیا کہ اس میں حزب مخالف کے عناصر کو خاص طور پر پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کو بھی ماخوذ کر لیا جائے۔

اس اپیل پر بائیں بازو کے ممتاز ادیبوں اور فنکاروں نے دستخط کیے

جیسے کہ ڈاکٹر ملک راج آنند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، آر کے کرنجیا، رمیش تھاپر، ساحر لدھیانوی، سردار جعفری، کیفی اعظمی، ضیا سرحدی، وغیرہ۔"(۷)

سجاد ظہیر، فیض اور سبط حسن کی رہائی کے لیے جو مہم چلائی گئی اس میں حصہ لیتے ہوئے ملک راج آنند نے کہا کہ انہیں یقین ہے کہ سجاد ظہیر کو اگر صفائی کا موقع دیا جائے تو وہ اپنے اوپر الزام عائد کرنے والوں کی تردید اسی طرح کریں گے جیسے کے برلن میں رائش تاغ کی آتشزدگی کے مقدمے کے ہیرو نے عام شرم وحیا کے ان تباہ کاروں اور ان کے پٹھوؤں کو جھوٹا ثابت کر دیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ترقی کے اس عظیم الشان نظام کو تباہ نہیں کر سکتے جس کی علامت سجاد ظہیر ہیں۔

ڈاکٹر ادھیکاری کے مطابق سجاد ظہیر پر جھوٹا الزام لگایا گیا تھا اور حقیقت میں انہوں نے کسی سازش میں حصہ نہیں لیا تھا۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ سازش کے مقدمے کے دوران فیض احمد فیض نے پوری طرح انکار کیا کہ راولپنڈی میں کسی بھی موقع پر سجاد ظہیر ان کے ساتھ تھے۔ فیض نے خود تو اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ 23 فروری والی میٹنگ جو اکبر خان کی رہائش گاہ پر ہوئی تھی اس میں شریک تھے مگر اس بات سے صاف انکار کر دیا کہ سجاد ظہیر بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ شاید انہوں نے اس لیے کیا کہ سجاد ظہیر سے ان کا گہرا دوستانہ تھا اور وہ انہیں کسی بھی مشکل میں مبتلا نہیں ہونے دینا چاہتے تھے ورنہ بیان کردہ حالات یہ ثابت کرتے ہیں کہ پارٹی کی مخالفت کے باوجود سجاد ظہیر اس میں شریک ہوئے اور اکبر خان کے پلان کی حمایت بھی کی۔

آخر اس رپورٹ کا حوالہ دینا بھی ضروری ہے جو میاں انور علی نے لکھی ہے۔ میاں انور علی سی آئی ڈی میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل تھے اور کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی سرگرمیوں کی تفتیش سے جڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے چھ جلدوں پر مشتمل یہ رپوررٹ مرتب کی جو خفیہ تھی لیکن بھٹو کے زمانے میں حکومت نے لوگوں کو اس تک رسائی دے دی۔ اس کا ایک چھوٹا سا اقتباس عبدالرؤف ملک نے اپنی کتاب 'سید سجاد ظہیر۔ مارکسی دانشور اور کمیونسٹ رہنما' میں درج کیا ہے۔ اپنی رپورٹ میں میاں انور علی پارٹی کے متعلق اور سجاد ظہیر کے سازش میں ملوث ہونے کے متعلق کیا کہتے ہیں اس کا ذکر اس اقتباس میں مختصر طور پر کیا گیا ہے۔ وہ اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"تقسیم کے بعد پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی نہ صرف دیرینہ اور منجھے ہوئے کارکنوں سے محروم ہوگئی تھی بلکہ مالی ذرائع سے بھی تہی دست تھی۔ لیکن اس کے باوجود صرف تین سالوں میں ایک مضبوط پارٹی کا ڈھانچہ کھڑا ہوگیا تھا۔ پارٹی کا بجٹ مسلم لیگ کے بعد دوسرے نمبر پر تھا۔ کسی اور سیاسی جماعت کے برعکس اس کے کارکنوں کو زیادہ معاوضہ ملتا تھا۔ پارٹی نے کام کے لیے نئے رابطے قائم کر لیے تھے اور طالب علموں، فیکٹری کارکنوں اور عام مزدوروں کسانوں، لکھاریوں بشمول صحافیوں میں کام منظم کرلیا تھا۔ پارٹی نے پنجاب اسمبلی کے انتخابات میں (1951) میں اپنے دو امیدوار بھی کھڑے کیے۔ لاتعداد ہڑتالیں، جلوس اور مظاہرے کیے۔ طبقاتی شعور کو جو اس خطے میں ناپید تھا، اجاگر کیا اور برطانوی حکومت کے چھوڑے ہوئے نظام کے خلاف بھرپور بداعتمادی پیدا کی گئی۔ سجاد ظہیر کو اپنی پارٹی کی قوت پہ اتنا یقین تھا کہ اس نے راولپنڈی میں فروری 1951 میں کی جانے والی سازش میں کودنے سے بھی گریز نہ کیا۔" (۸)

مندرجہ بالا تحریر وہی کچھ ثابت کرنے کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کا ذکر سپرائن، محمد حسین عطا وغیرہ نے کیا ہے یعنی کمیونسٹ پارٹی کا راولپنڈی سازش سے کوئی واسطہ نہیں تھا اور یہ کہ سجاد ظہیر نے اگر اس میں حصہ لیا تو وہ ذاتی طور پر تھا نہ کہ پارٹی کی طرف سے۔ یہاں تک کہ پارٹی کے چند ذمہ دار رہنماؤں نے یہ واضح طور پر کہا کہ سازش کے لیے ذمے دار لوگوں کو اپنی شمولیت کا مکمل طور پر اعتراف کرلینا اور اس کے نتائج بھی خود ہی بھگتنا چاہئیں۔

☆☆☆☆☆☆

کتابیات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر/پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱)	زندگی زنداں دلی کا نام ہے	ظفراللہ پوشنی	مین ہاٹن انٹرنیشنل۔ کراچی	2001	64
۲)	زندگی زنداں دلی کا نام ہے	ظفراللہ پوشنی	مین ہاٹن انٹرنیشنل۔ کراچی	2001	77
۳)	کلامِ فیض	فیض احمد فیض	ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ	1990	178
۴)	فیض نامہ	ڈاکٹر ایوب مرزا	کلاسیک۔ لاہور	2005	193
۵)	مغنی آتش نفس سجاد ظہیر	سبط حسن	مکتبہ دانیال۔ کراچی	2005	48
۶)	The Rawalpindi Conspiracy,1951	حسن ظہیر	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ کراچی	1998	224
۷)	سجاد ظہیر۔ شخصیت اور فکر	سید جعفر احمد	مکتبہ دانیال۔ کراچی	2005	159
۲)	سجاد ظہیر۔ مارکسی دانشور اور کمیونسٹ رہنما	عبدالرؤف ملک	پیپلز پبلشنگ ہاؤس۔ لاہور	2008	133

☆☆☆☆

۳۔ فیصلہ اور سزائیں

ٹربیونل کے صدر جسٹس عبدالرحمن نے مقدمے کا فیصلہ لکھا جو 852 صفحات پر مشتمل تھا۔ 41 ضمیمہ جات اس کے علاوہ تھے۔ ٹربیونل کے ایک ممبر نے صدر کے فیصلے سے پوری طرح سے اتفاق کیا۔ دوسرے ممبر جسٹس محمد شریف نے بھی اتفاق تو کیا لیکن اپنا ایک الگ نوٹ بھی اس فیصلے میں شامل کیا۔

ملزمین پر جو بنیادی جرم لگایا گیا تھا وہ ایک ہی تھا یعنی انہوں نے حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی ہے۔ دوسرے تمام الزامات اس بنیادی الزام سے ہی ملحقہ تھے۔ لہٰذا فیصلہ اس نظریے سے کیا گیا تھا کہ کیا جو ثبوت پیش کیے گئے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ سازش عمل میں لائی گئی ہے اور اگر ایسا ہے تو اس سازش میں کون کون شامل ہے۔

عدالت میں دو طرح کے دستاویزات پیش کیے گئے تھے۔ ایک تو وہ جو میجر جنرل اکبر خان کے گھر سے ان کے اپنے اور ان کی بیگم کے طفیل برآمد ہوئے تھے جب ان کے گھر کی تلاشی 9 ' 11 اور 12 مارچ 1951 کو ہوئی تھی۔ دوسری طرح کے دستاویزات وہ تھے جو گواہوں کی زبانی شہادت کو ثابت کرتے تھے جیسا کہ کاروں وغیرہ کی لاگ بکس، ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤس کے ریکارڈ۔ لیکن جو ثبوت پہلی قسم کے دستاویزات سے ملے ان سے ملزموں کا جرم مکمل طور پر ثابت ہو گیا۔

جو دستاویزات اکبر خان کے گھر اور دفتر سے یا ان کی بیگم کے کپڑوں سے برآمد ہوئے اور انہیں ضبط کر لیا گیا ان کی تعداد کوئی 56 تھی لیکن استغاثہ نے دعویٰ کیا کہ ان میں سے گیارہ

دستاویزات اکبر خان نے خود اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں۔ان کی نشان دہی اکبر خان کے ساتھی افسروں نے،ان کے نائب کارکنوں نے اوران کے کلرکوں نے کی۔یہ وہ لوگ تھے جنہیں اکبر خان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا یا کسی اور طریقے سے وہ ان کی خوشخطی سے واقف تھے۔جن لوگوں نے اس بات کی شہادت دی کہ وہ دستاویزات اکبر خان کے ہی ہاتھ سے لکھے ہوئے ہیں ان میں ایک میجر جنرل، دو بریگیڈیر، تین جمعدار، ایک اکبر خان کا پرسنل اسسٹنٹ اور ایک ہینڈ رائیٹنگ ایکسپرٹ شامل تھے۔لیکن عدالت نے ایکسپرٹ کی شہادت کو قابل قبول نہیں سمجھا۔اگر چہ 11 دستاویزات اکبر خان کے لکھے ہوئے تھے تاہم فیصلوں کی بنیاد صرف چار دستاویزوں پر ہی رکھی گئی۔شروع میں اکبر خان کے وکیل نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی وہ کاغذات اکبر خان کے ہاتھ سے نہیں لکھے گئے لیکن اپنے 18 مارچ 1952 کے بیان میں اکبر خان نے خود ہی قبول کیا کہ وہ ان کے ہی ہاتھ سے لکھے ہوئے ہیں۔البتہ انہوں نے ان کاغذات کے مواد کا مطلب الگ طرح سے بیان کیا۔

پہلی دستاویز جس پر بحث ہوئی اس میں سازش کا منشور درج تھا۔اس میں اکبر خان نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ملک کی بدحالی کا صرف یہی حل ہے کہ اس کے معاشرتی اور سیاسی ڈھانچے کو انقلابی طریقے سے ڈھا دیا جائے کیونکہ پاکستان کی تمام مشکلات صرف غلط لوگوں کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار ہونے کی وجہ سے ہیں۔اکبر خان نے اس دستاویز میں ملک کے بااقتدار طبقے کو خود پرست اور نااہل قرار دیا تھا۔اس میں یہ بھی کہا گیا کہ انگریز جو کرسیاں چھوڑ گئے ہیں ان پر ایسے ہی نااہل لوگوں نے قبضہ کرلیا ہے ورنہ ملک کے ڈھانچے میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی۔ملک میں پیدا شدہ تبدیلی کی وضاحت کرنے کے بعد اکبر خان نے اس دستاویز میں سوال اٹھایا کہ ہمیں ملک میں کس قسم کے نظام کی ضرورت ہے۔پھر انہوں نے نئے نظام کی تفصیل بیان کی اور آخر میں کہا کہ ایسے نظام کے حصول کے لیے کئی غیر قانونی قدم اٹھانے کی اشد ضرورت ہے۔

اپنے بیان میں اکبر خان نے عدالت کو بتایا کہ اس دستاویز کا کوئی خاص مطلب نہیں کیونکہ ان کی یہ عادت ہے کہ وہ جس کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں اس کے اہم اقتباسات درج کر لیتے ہیں۔لیکن وہ کسی بھی ایسی کتاب کا حوالہ نہ دے سکے جس سے وہ اقتباسات لیے گئے تھے۔عدالت نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دستاویز اکبر خان کا ذہنی رجحان ظاہر کرتی ہے جس میں اکبر خان اس

فوجی سازش کو جائز سمجھتے ہیں جو حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے تھی اور جس کی رہنمائی وہ خود کر رہے تھے۔
زیادہ سے زیادہ فوجی افسروں اور عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان کے مقاصد کا خاص خیال رکھا جائے۔ لہٰذا اکبر خان نے سازش میں ان افسروں کو ساتھ لیا جو یا تو خود کشمیری تھے یا کشمیر میں فوج کی طرف سے لڑائی میں شامل ہوئے تھے کیونکہ کافی تعداد میں ان فوجیوں کو یہ شکایت تھی کہ جب کشمیر میں فتح عنقریب تھی اس وقت لیاقت علی حکومت نے جنگ بندی کا اعلان کر دیا تھا۔ اس سازش میں فوجی افسران کے بیچ اتحاد کی یہ بہت بڑی وجہ تھی۔ باقی کے تین دستاویزات کی صرف اتنی ہی اہمیت تھی کہ ان میں سازش کو سرانجام دینے کے قوائد پر بحث کی گئی تھی۔
عدالت نے بھی ان کو اتنی ہی اہمیت دی۔ ان میں ہر افسر کو جو ذمہ داری سونپی گئی تھی اس کا ذکر تھا۔
مثال کے طور پر گل کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ عمل کو حرکت میں لانے والے دن رات دس بجے اپنی پوزیشن سنبھالیں گے۔ ایک پیچیدہ پلان بھی ترتیب کیا گیا تا کہ سازش خفیہ رہے اور وقت سے پہلے کسی کو بھی اس کا علم نہ ہونے پائے۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں لانے کے لیے اور اکبر خان کو ہر اطلاع بہم پہنچانے کے لیے ضروری اقدامات کا تعین کیا گیا جس سے عدالت نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سازش محض خیالی پلاؤ نہیں تھا بلکہ ایک تلخ حقیقت تھی۔ اکبر خان نے جو بیان دیا وہ 130 صفحات پر مشتمل تھا۔ انہوں نے اس بیان میں ایک نقطے پر زور دیا کہ ان کاغذات میں صرف ان کا خیالی پلان ہی درج ہے جس کو عمل میں لانا ان کا مدعا بالکل نہ تھا۔ اکبر خان نے اپنے دفاع میں کہا کہ ان تمام کاغذات کو اگر اس نظریے سے پڑھا جائے کہ اس کی تمام کارکردگی کا مقصد کشمیر کو آزاد کرانے سے متعلقہ ہے تو اس میں جرم کا پہلو کہیں نظر نہیں آتا۔ اکبر خان کے وکیل نے اس بات پر زور دیا کہ استغاثہ یہ ثابت کرے کہ وہ تمام دستاویزات کشمیر کی آزادی کے متعلقہ نہیں تھے۔ عدالت نے اس دلیل کو خارج کر دیا کیونکہ اس سلسلے میں اکبر خان کا دفاع بہت کمزور پڑ گیا تھا۔ وہ تینوں دستاویزات جن کا ذکر اوپر آچکا ہے ان میں کیا لکھا تھا اور اس کی وضاحت میں اکبر خان نے کیا کیا اس پر بحث کرنا قدرے ضروری ہے۔ چنانچہ ان تینوں میں سے پہلے وہ کاغذ لیا جاتا ہے جو عدالت میں بطورِ Ex.PW 15/3 درج ہوا ہے۔ اس میں وہ اوقات نامہ (Time Table) تھا جس کے مطابق کشمیر کے محاذ پر چند کارہائے نمایاں واقع ہونے تھے۔ اس سلسلے میں یہ سوال اٹھا کہ اکبر خان

کیسے جانتے تھے کہ فلاں تاریخ کو فلاں واقعہ ہونے والا ہے۔ کسی کے لیے یہ جاننا ناممکن تھا کہ کسی دن کیا حادثہ کشمیر کی سرحد پر نازل ہونے والا ہے۔ تمام غور و غوض کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ کاغذ کشمیر سے بالکل وابستہ نہیں بلکہ اس کا تعلق بظاہر و بہ باطن اکبر خان کی طے شدہ سازش سے ہے۔

دوسرے دستاویز کا عدالت کے ریکارڈ میں Ex.PW 15/2 کے طور پر اندراج ہے۔ اس میں ان افسران کے نام ہیں جن کے سپرد خاص خاص ذمہ داری کی گئی تھی۔ اس کے متعلق اکبر خان نے بیان دیا کہ وہ نام ان لوگوں کے ہیں جو کشمیر کے محاذ پر جنگ میں حصہ لینے کی رضامندی دے چکے ہیں یا راضی کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس دستاویز میں جو خفیہ الفاظ لکھے ہوئے تھے ان کا کوئی قابل اعتبار ثبوت اکبر خان نہ دے سکے۔ لہٰذا عدالت نے اکبر خان کی صفائی کو قابل قبول نہیں سمجھا۔ مختصر یہ کہ اکبر خان کا دفاع کہ وہ تمام کاغذات محض کشمیر کو آزاد کرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا سازش سے کوئی واسطہ نہیں، عدالت نے سرے سے ہی خارج کر دیا۔ عدالت کے صدر جسٹس عبدالرحمٰن نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سارے ثبوت اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ ضبط شدہ کاغذات فوجی سازش کے سلسلے میں ہی تیار کیے گئے تھے اور یہ کہ اکبر خان کی صفائی محض فرضی ہے۔ ان چاروں دستاویزوں کے بارے میں اکبر خان کے دفاع کو خارج کرتے ہوئے عدالت نے اپنے فیصلے میں کہا:

> ''ان چاروں کاغذات پر گہرے طور پر غور کرنے کے بعد اور اس کہانی کو فرضی مانتے ہوئے کہ قیوم نے کشمیر کی آزادی کے لیے پلان ترتیب کیا جو غلام عباس کے ساتھ گفتگو کے بعد حکومت کی منظوری کے لیے پیش کیا جانا تھا، عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ جس شخص نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے جن کا ذکر Ex.PW 15/11 میں آتا ہے وہ کشمیر کے لیے نہیں بلکہ حکومت پاکستان کا تختہ الٹنے کے لیے اس سازش کو تعمیر کر رہا تھا جس کی تفصیل Ex.PW 15/1-2 میں ملتی ہے۔''(۱)

استغاثہ نے 351 گواہوں کے نام دیئے تھے لیکن ٹریبونل نے صرف 17 گواہ ہی منتخب کیے جن میں دو سلطانی گواہ بھی شامل تھے۔ ان پر عدالت میں بحث ہوئی۔ ان 15 گواہوں نے

دونوں وعدہ معاف گواہوں کے بیان کی تصدیق کی۔شاید ان کے انتخاب کی بنیادی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ وعدہ معاف گواہوں کا ساتھ دیں گے۔بہر حال تمام حالات کے مدِ نظر اور ان تمام میٹنگوں پر غور کرتے ہوئے جو سازشیوں نے لمبے عرصے تک کیں ،جسٹس عبدالرحمٰن اور جسٹس محمد شریف نے اپنا فیصلہ الگ الگ درج کیا جس میں ملزموں کی سرگرمیوں اور ان کے خلاف جرموں کی تفصیل بھی دی جو درج کی جاتی ہے۔

۱۔میجر جنرل اکبر خان :جسٹس عبدالرحمٰن نے لکھا کہ وہ اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے سخت مجبور ہیں کہ اکبر خان اس سازش کے سرغنہ تھے اور انہوں نے جو کچھ بھی کیا وہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کیا۔انہوں نے فوجی افسروں کو اس سازش میں شمولیت کے لیے راضی کرنے کے مقصد سے انہیں ایسے ایسے سبز باغ دکھائے جو انہیں پسند آنے والے تھے۔اس فیصلے میں اکبر خان کی اس دلیل کو نامنظور کر دیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ ان کے خلاف مقدمہ انگریزی حکومت کی چال ہے۔

۲۔ایر کموڈور ایم کے جنجوعہ: جس روز سازش کا انکشاف ہوا جنجوعہ سے یہ سوال پوچھا گیا کہ وہ اکبر خان سے راولپنڈی میں کس روز ملے۔اس کے جواب میں جنجوعہ نے کہا وہ 9 فروری کو راولپنڈی سے لاہور گئے جہاں انہوں نے اکبر خان سے ان کے دفتر میں ملاقات کی اور کچھ سرکاری کاموں پر ان سے تبادلہ خیال کیا۔بعد میں دوپہر کا کھانا انہوں نے اکبر خان اور ان کی بیگم کے ساتھ ان کی رہائش گاہ پہ کھایا۔استغاثہ نے کہا کہ ایر کموڈور جنجوعہ فروری کے آخری ہفتے ماوری پور گئے جہاں انہوں نے ہتھیار بند دستے ،فلائنگ اسکواڈ وغیرہ سے پوچھ تاچھ بھی کی اور یہ سب کچھ ایک پلان کے تحت کیا گیا۔ جنجوعہ نے اپنے حفظان میں کہا کہ تمام اطلاع وہ موجودہ ریکارڈ سے حاصل کر سکتے تھے اس لیے انہیں وہاں جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔جنجوعہ نے اپنے خلاف اس مقدمہ کا ذمہ دار سکندر مرزا کو ٹھہرایا کیونکہ وہ ان کے خلاف تھے۔دونوں ججوں نے اس بیان کو رد کرتے ہوئے کہا کہ جنجوعہ اس سازش میں مجرم ہیں۔

۳۔میجر جنرل نظیر احمد: ان کے خلاف اس لیے مقدمہ دائر کیا گیا تھا کہ انہوں نے اٹک کے ریسٹ ہاؤس میں 4 دسمبر 1949 کی میٹنگ میں شرکت کی تھی۔انہوں نے اپنی صفائی میں کہا کہ اس میٹنگ میں حکومت کا تختہ الٹنے کے بارے میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی نہ ہی انہوں نے سازش میں

شامل ہونے کی رضامندی دی تھی۔ انہوں نے عدالت کو بتایا کہ وہ محض کھانے کے لیے مدعو کیے گئے جو 4 دسمبر کو ہونا تھا۔ وہاں کچھ اور افسر بھی موجود تھے۔ اکبر خان نے کہا تھا کسی نہ کسی کو فوجیوں کے ضروری مسائل کو لیاقت علی کے علم میں لانا لیکن نظیر احمد نے اس بات سے صاف انکار کیا اور کہا کہ وہ شخص جس کی طرف اکبر خان نے اشارہ کیا تھا وہ نہیں تھے۔ تاہم صدیق راجہ نے جو بیان دیا اس میں کہا کہ نظیر احمد رات کے 9 بجے ریسٹ ہاؤس میں پہنچے اور صادق خان نے انہیں سازش کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ نظیر احمد نے پورے طور پر اس بحث میں حصہ لیا اور جو ذمہ داری انہیں سونپی گئی اسے نبھانے کا وعدہ بھی کیا۔ تمام ثبوتوں کی بنا پر جسٹس عبدالرحمٰن اس نتیجے پر پہنچے کہ اگرچہ نظیر احمد کو 4 دسمبر 1949 کے دن سازش کے بارے میں علم ہو گیا تھا تاہم ان کا قصور صرف اتنا ہے کہ انہوں نے اس سازش کی اطلاع حکومت کو نہیں دی ورنہ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس سازش میں خود بھی ملوث تھے۔ لہٰذا انہیں سازش کے جرم سے بری کر دیا گیا۔

۴۔ برگیڈیر صادق خان: سازش سے متعلقہ ان کے خلاف ابتدائی ثبوت صدیق راجہ کا وہ بیان تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ایبٹ آباد سے لوٹنے کے بعد اکتوبر 1949 میں اکبر خان سے اپنی ملاقات کے بارے میں انہوں نے برگیڈیر صادق خان کو آگاہ کیا تھا اور حکوت کی برطرفی کی بات بھی کی تھی۔ ان دنوں صادق خان راولپنڈی میں 7 ڈویژن کے جی آئی تھے۔ نومبر 1949 میں میجر اسحاق محمد نے اپنے بیان میں کہا کہ اکبر خان نے انہیں لاہور بھیجا کہ میں ان کا پیغام لطیف خان کو پہنچادوں جس میں کہا تھا کہ اکبر خان اور صادق خان 19 نومبر کو لاہور پہنچیں اور لطیف افغانی اپنے دوستوں کے ہمراہ بیگم شاہنواز کے گھر تشریف لا کر صادق خان کو یقین دلائیں کے اس سازش کو عوام کی ہمدردی حاصل ہے۔ صدیق راجہ کا یہ بھی کہنا تھا کہ وہ اور صادق خان پشاور سے راولپنڈی اکبر خان کی کار میں گئے اور سفر کے دوران اکبر خان نے سازش کے پلان کا انکشاف کیا جبکہ صدیق راجہ اور صادق خان بھی موجود تھے۔ اور بھی کئی طرح کے ثبوت پیش کیے گئے جن سے یہ واضح کرنا تھا کہ صادق خان بھی سازش کا ایک حصہ تھے۔ تاہم جسٹس محمد شریف نے یہ فیصلہ لکھا کہ سوائے اس کے کہ 4 دسمبر 1949 کی میٹنگ میں صادق خان موجود تھے، اور کسی بات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صادق خان اس سازش میں شامل تھے۔

۵۔ بریگیڈیر لطیف خان: سازش پر عمل کرنے کا جو پلان طے ہوا تھا اس کے مطابق لطیف خان اپنی بٹالین کی دو کمپنیوں کے ساتھ اکبر خان کے ساتھ کوہاٹ سے پشاور تک اکٹھا سفر کرنے والے تھے جہاں وزیر اعظم کو گرفتار کیا جانا تھا۔ اس سلسلے میں عدالت نے حبیب اللہ کے بیان کے اس حصے کو قابل اعتبار سمجھا جس میں کہا گیا تھا کہ لطیف خان نے اس سازش کے انعقاد اور اسے آگے بڑھانے میں بیحد دلچسپی لی تھی۔ لیکن دفاع نے اپنے بچاؤ میں یہ دلیل پیش کی کہ ان کے خلاف مقدمہ کمانڈر ان چیف کی ایما پر درج کیا گیا ہے جن سے کوئٹہ میں ان کی کافی گرما گرمی ہوئی تھی۔ عدالت کے صدر نے اپنے فیصلے میں یہ لکھا کہ جنرل اکبر خان کے ہاں سے جو دستاویزات دستیاب ہوئے ہیں جو ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں ان سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ لطیف خان اس سازش میں شامل تھے۔ لیکن جسٹس شریف نے اس فیصلے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے لکھا کہ اگر چہ لطیف خان 4 دسمبر کو سازش کا حصہ بنے لیکن کوئی حالات یہ ثابت نہیں کرتے کہ اس کے بعد بھی وہ سازش میں ملوث رہے۔

۶۔ لیفٹیننٹ کرنل ضیاالدین: ان کے خلاف جرم ثابت کرنے کے لیے استغاثہ نے مندرجہ ذیل وجوہات پر اپنی دلیلیں پیش کیں۔

(۱) اکبر خان کے ساتھ ان کی ملاقاتیں

(۲) کوہوٹا میں فوجیوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ان کا دورہ

(۳) 23 فروری کی میٹنگ میں ان کی شرکت اور اکبر خان کے کاغذات میں ان کے نام کا اندراج، اور

(۴) سازش کی اسکیم میں ان کی سپرد کی گئیں ذمے داریاں

ان وجوہات سے جسٹس عبدالرحمن نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ لیفٹیننٹ کرنل ضیاالدین حکومت کو برطرف کرنے کی سازش میں پورطرح ملوث تھے۔

۷۔ لیفٹیننٹ کرنل نیاز محمد ارباب: ان کے خلاف جو پہلا ثبوت پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ ارباب بہت پہلے سے میجر جنرل اکبر خان سے وابستہ تھے۔ دوسرا ثبوت ان کی 23 فروری کی میٹنگ میں شرکت جہاں ان کو سازش سے جڑی ہوئی عملی ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں۔ علاوہ ازیں ان کا اکبر خان پر یہ بات ظاہر کرنا کہ سازش کا راز فاش ہو گیا۔ آخر میں یہ ثبوت بھی پیش کیا گیا کہ کرنل ارباب کا نام اکبر خان کی تیار کردہ دستاویزات میں بھی موجود تھا۔ جسٹس عبدالرحمن نے ان تمام ثبوتوں اور ان سے متعلقہ

تمام حالات پر بڑی سنجیدگی سے غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ارباب کا جرم ہر طرح سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس سازش میں حصہ دار تھے۔

۸۔ کیپٹن خضر حیات: ان کے خلاف بھی وہی ثبوت تھے جو نیاز محمد ارباب کے خلاف پیش کیے گئے تھے جن میں اکبر خان کے کاغذات جس میں انہیں جو ذمہ داری دی گئی تھی وہ بھی شامل تھا۔ صدر عدالت نے فیصلہ دیا کہ خضر حیات کے خلاف جرم ثابت ہو جاتا ہے اور اس لیے انہیں سازش کا حصہ تسلیم کیا۔ جسٹس شریف نے صدر کے فیصلے سے اتفاق کیا۔

۹۔ میجر حسن خان: جو ثبوت پیش کیے گئے ان سے حسن خان کی 23 فروری کی میٹنگ میں شمولیت ثابت کر دی گئی اور یہ بھی کہ سازش کے پلان میں ان کا اہم کردار تھا جس میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ کاہوٹا سے کیپٹن نور حسین کی معرفت فوجی دستے مہیا کریں گے۔ جسٹس عبدالرحمٰن نے انہیں بھی سازش میں مجرم ٹھہرایا۔

۱۰۔ میجر اسحاق محمد: ان کے خلاف بنیادی ثبوت صدیق راجہ کا بیان تھا جس میں انہوں نے کہا کہ ان کی ملاقات میجر اسحاق محمد سے 26 جنوری 1951 میں اکبر خان کی رہائش گاہ پر ہوئی تھی جہاں انہوں نے چند کاغذات دیکھے جن پر سازش کا نقشہ بنایا گیا تھا جو میجر اسحاق کے حوالے کیے گئے تھے۔ وہاں جنرل اکبر خان نے حاضرین کو میجر اسحاق محمد کے سپرد کی گئی ذمے داری کی تفصیل بھی بیان کی۔ ثبوت کے طور پر وہ ٹیلی گرام بھی پیش کی گئی جو اکبر خان نے انہیں بھیجی تھی جس میں انہیں تلقین کی گئی تھی کہ وہ 23 فروری کی میٹنگ کے لیے ضرور حاضر رہیں۔ ثبوت کے طور پر عدالت کو یہ بھی بتایا گیا کہ اکبر خان کی تیار کردہ لسٹ میں ان کا بھی نام تھا۔

ان سب ثبوتوں کی بنا پر میجر اسحاق پر لگائے گئے جرم ثابت ہوئے۔ لیکن جسٹس محمد شریف نے چند ایک دلیلوں کی بنا پر جسٹس عبدالرحمٰن کے فیصلے سے اتفاق کرنے سے انکار کرتے ہوئے اپنے فیصلے میں لکھا کہ میجر اسحاق کے کیس کی صداقت میں شبہ کی کافی گنجائش ہے۔

۱۱۔ کیپٹن ظفر اللہ پوشنی: ان کے خلاف یہ ثبوت دیا گیا کہ ان کے اکبر خان اور ان کی بیگم نسیم خان کے ساتھ بڑے پرانے تعلقات تھے۔ وہ 23 فروری کی میٹنگ میں حاضر تھے اور سازش کی اسکیم میں ان کے ذمہ کام بھی لگایا گیا تھا جسے انہوں نے قبول کیا تھا جس کا ذکر اکبر خان کے کاغذات میں ملتا ہے۔

لہٰذا اپوشنی کا جرم بھی تسلیم کیا گیا۔
۱۲۔محترمہ نسیم اکبرخان: استغاثہ کے بڑے وکیل اے کے بروہی نے تسلیم کیا کہ نسیم کے خلاف سازش میں ملوث ہونے کا کوئی سیدھا ثبوت نہیں ملتا لیکن کئی دیگر قرائنی (Circumtsantial) شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے خاوند کو سازش پر آمادہ کرنے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔کئی لوگوں نے اس بات کی گواہی دی تھی کہ وہ اکثر حکومت کے خلاف بیان دیتی رہتی تھیں اور نوجوان فوجی افسروں میں ترقی پسندی کی وبا پھیلانے میں پیش پیش رہتی تھیں۔ان کے خلاف یہ الزام بھی تھا کہ انہوں لاہور جا کر کمیونسٹوں سے رابطہ قائم کیا اور فیض احمد فیض کو سازش کو تقویت دینے کے لیے راولپنڈی لے کر آئیں جہاں انہوں نے فیض اور سجاد ظہیر کی رہائش کا انتظام بھی کیا جب وہ 23 فروری کی میٹنگ میں شامل ہونے کے لیے آئے تھے۔ان پر یہ بھی الزام تھا کہ جو دستاویزات اکبر خان کے گھر سے ضبط کیے گئے اور جو اکبر خان نے خود اپنے ہاتھوں سے لکھے تھے انہیں چھپانے کی کوشش کی تھی۔

جسٹس عبدالرحمن اس نتیجے پر پہنچے کہ حالانکہ بیگم نسیم اکبر خان بھی سازش کے پلان سے بخوبی واقف تھیں لیکن جو ثبوت ان کے خلاف پیش کیے گئے وہ ثابت نہیں کرتے کہ وہ سازش میں ملوث تھیں۔اس لیے انہوں نے محترمہ کو شک کا فائدہ دیتے ہوئے بری کر دیا۔ان کے اس فیصلے سے جسٹس شریف نے بھی اتفاق کیا۔

۱۳۔فیض احمد فیض: ان کے خلاف مقدمہ چلانے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کا تعلق میجر جنرل اکبر خان اور ایر کموڈور ایم کے جنجوعہ سے تھا۔دوسرا یہ کہ وہ راولپنڈی گئے اور 23 فروری کی میٹنگ میں شمولیت بھی کی۔ان کا نام بھی اس لسٹ میں شامل تھا جو اکبر خان نے مرتب کی تھی جس میں مختلف اشخاص کو حسب قابلیت ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں۔میجر ضیاءاللہ اور مقصود احمد نے بھی ان کے خلاف شہادت دی۔مقصود احمد نے عدالت کو بتایا کہ انہوں نے اکبر خان اور صدیق راجہ کو اس وقت دیکھا جب وہ ان کے دفتر لاہور 10 نومبر 1949 کو گیا تھا۔اپنے دفاع میں فیض احمد فیض نے کہا ان کے خلاف مقدمہ بے بنیاد ہے اور اس مقدمے کی وجہ محض ان کی پنجاب پولیس سے دشمنی ہے۔یہ ثابت کرنے کے لیے انہوں نے کئی ایک واقعات کا ذکر کیا۔تاہم جسٹس عبدالرحمن نے فیض صاحب کی تمام دلیلوں کو رد کرتے ہوئے یہ فیصلہ سنایا کہ فیض صاحب کا سازش میں شامل ہونا پوری طرح ثابت ہوتا

ہے۔ جسٹس محمد شریف نے بھی یہی فیصلہ کیا۔

۱۴۔سید سجاد ظہیر: ان پر اور فیض احمد فیض دونوں پر ایک الزام تو مشترکہ تھا وہ یہ کہ دونوں کے خلاف پکا ثبوت تھا کہ انہوں نے سازش کو بڑھاوا دینے کے لیے 23 فروری کی راولپنڈی میں ہوئی میٹنگ میں حصہ لیا۔ فیض احمد فیض کی شخصیت اور نام سے تو سب لوگ واقف تھے کیونکہ وہ پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر تھے لیکن سید سجاد ظہیر اور محمد حسین عطا کے اصلی ناموں کا بہت کم لوگوں کو علم تھا کیونکہ انہوں نے فرضی ناموں سے ہی اپنا تعارف کرایا تھا۔ جب انہوں نے 23 فروری کی میٹنگ میں شرکت کی یا بیگم نسیم کی معرفت مہمان رہے، ان دونوں اوقات میں انہوں نے اپنے اصلی نام کسی کو نہیں بتائے تھے۔ اس لیے عدالت نے ان گواہوں کی شہادت پر اعتماد کیا جنہوں نے راولپنڈی کی میٹنگ میں انہیں اکبر خان کے گھر میں دیکھا تھا۔ ان کی شناخت کے لیے ایک پریڈ کا اہتمام کیا گیا تھا جو ایک مجسٹریٹ کے سامنے 30 اپریل 1951 میں ہوئی۔ اس پریڈ میں خدیجہ بیگم کے ڈرائیور نے سجاد ظہیر کی شناخت کی اور کہا کہ سجاد ظہیر کو وہ بمعہ بیگم نسیم اور دیگر دو اشخاص کے 20 فروری کی رات میاں ریاض کے گھر سے یوسف سیٹھی کے گھر لے گئے تھے۔ اس کے بعد ایک اور پریڈ ہوئی لیکن وہ کوئی اہم پریڈ نہیں تھی۔ شناخت کی تیسری پریڈ 14 مئی کو ہوئی جس میں صدیق راجہ نے سجاد ظہیر کی پہنچان کی اور یہ بھی کہا وہ ان سے 23 فروری کی میٹنگ میں اکبر خان کے گھر پر ملے تھے۔ چوتھی شناختی پریڈ میں میاں ریاض احمد نے سجاد ظہیر کی شناخت کی۔ شناخت میں ریاض احمد نے کہا سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض دو راتوں کے لیے 10 فروری کے آس پاس اس کے ہاں مہمان رہے تھے۔ اس نے کہا کہ سجاد ظہیر وہی شخص ہیں جو مختصر وقفے کے لیے 20 فروری کو ان کے گھر آئے تھے اور جنہیں بعد میں وہ اکبر خان کے گھر پر ملے تھے۔ سجاد ظہیر کی شناخت کی پانچویں پریڈ 16 مئی کو ہوئی تھی جس میں یوسف سیٹھی نے انہیں پہچانا تھا کیونکہ وہ ان تین اشخاص میں سے ایک تھے جنہیں نسیم بیگم اپنے ہمراہ ان کے گھر مہمان ٹھہرانے کے لیے 20 فروری کو لائی تھیں۔ ان شہادتوں نے ثابت کر دیا کہ سجاد ظہیر 23 فروری 1951 کی راولپنڈی والی میٹنگ میں حاضر تھے۔

چودھری محمد اصغر ڈی ایس پی CID نے اپنے بیان میں کہا کہ جون 1948 سے سجاد ظہیر روپوش تھے اور انہیں 28 اپریل کو نمبر ا بیت الظہور عمارت، پونچ روڈ لاہور سے گرفتار کیا گیا تھا۔ لیکن

سجاد ظہیر نے اس بات سے انکار کیا کہ وہ 23 فروری کی میٹنگ میں حاضر تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کوئی بھی پکا کمیونسٹ فوجی بغاوت کے حق میں نہیں ہوسکتا۔ بہر حال نہ تو جسٹس عبدالرحمٰن نے اور نہ ہی جسٹس محمد شریف نے ان کی دلیلوں کو قابل قبول سمجھا اور یہ فیصلہ کیا کہ سازش کا جرم ان پر مکمل طور پر ثابت ہوتا ہے۔

۱۵۔ محمد حسین عطا: ان کے متعلق استغاثہ نے کہا کہ وہ راولپنڈی سازش کی میٹنگ میں حصہ لینے کے لیے 22 فروری کو پہنچے تھے اور یہ وہ تیسرے شخص تھے جو سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کے ساتھ لاہور سے آئے تھے اور 23 تاریخ کی میٹنگ میں شامل ہونے کے بعد اگلی صبح کو سلام الدین ڈرائیور کے ساتھ ٹیکسلا گئے تھے۔ کئی گواہوں نے ان کی شناخت کی اور عدالت کو بتایا کہ عطا وہی شخص ہیں جنہوں نے راولپنڈی والی میٹنگ میں شمولیت اختیار کی تھی۔

ڈی ایس پی CID نے بھی اپنے بیان میں کہا کہ عطا نومبر 1949 سے خفیہ طریقے سے اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے اور 13 جولائی کو چٹاگانگ میں گرفتار ہوئے۔ ان کی شناخت کے لیے سینٹرل جیل حیدر آباد میں ایک نمائش کی گئی جس میں یوسف سیٹھی اور صدیق راجہ نے ان کی شناخت کی۔ میاں ریاض احمد شروع میں عطا کو پہنچان نہ سکے لیکن بعد ازاں ان کو شناخت کرلیا۔ ان تمام ثبوتوں کے مدِ نظر جسٹس عبدالرحمٰن اور جسٹس محمد شریف متفقہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے کہ عطا کا جرم پوری طرح ثابت ہوتا ہے۔

تمام ثبوتوں اور شہادتوں کی بنا پر گرفتار شدگان پر سازش کا جرم تو عدالت نے ثابت کردیا لیکن ابھی یہ کام باقی تھا کہ انہیں کیا سزا دی جائے۔ جسٹس عبدالرحمٰن اس حق میں بالکل نہیں تھے کہ مجرموں کے ساتھ نرمی برتی جائے۔ دفاع نے سازش کی جو وجوہات بتائی تھیں وہ بہت بے بنیاد تھیں۔ لیکن جسٹس شریف قدرے آزاد خیال کے شخص تھے۔ مجرموں کے تئیں ان کا رویہ کچھ نرم رہا۔

چنانچہ الگ الگ قانون کی رو سے جو سزائیں مجرموں کو دی گئیں وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

۱۔ میجر جنرل اکبر خان ۔ بارہ برس قید سخت ۲

۲۔ ایر کموڈور محمد خان جنجوعہ ۔ ۷ برس قید بامشقت اور ۵۰۰ روپے جرمانہ۔ عدم ادئیگی کی صورت میں مزید ایک برس قید بامشقت اور

ملازمت سے برطرفی

۳۔ بریگیڈیر محمد صدیق خان - ۷ برس قید بامشقت اور ۵۰۰ روپے جرمانہ۔ عدم ادائیگی کی صورت میں مزید ایک برس قید بامشقت اور ملازمت سے برطرفی

۴۔ لیفٹیننٹ کرنل ضیاالدین - ۵ برس قید بامشقت اور ۵۰۰ روپے جرمانہ۔ عدم ادئیگی کی صورت میں مزید ایک برس قید بامشقت اور ملازمت سے برطرفی

۵۔ فیض احمد فیض - ۴ برس قید بامشقت اور ۵۰۰ روپے جرمانہ۔ عدم ادئیگی کی صورت میں مزید ایک برس قید بامشقت۔

۶۔ میجر حسن خان - ۴ برس قید بامشقت اور ۲۵۰ روپے جرمانہ۔ عدم ادئیگی کی صورت میں مزید ۶ مہینے قید بامشقت اور ملازمت سے برطرفی

۷۔ میجر اسحاق محمد - ۴ برس قید بامشقت اور ۲۵۰ روپے جرمانہ۔ عدم ادئیگی کی صورت میں مزید ۶ مہینے قید بامشقت اور ملازمت سے برطرفی

۸۔ کیپٹن خضر حیات خان۔ ۴ برس قید بامشقت اور ۲۵۰ روپے جرمانہ۔ عدم ادئیگی کی صورت میں مزید ۶ مہینے قید بامشقت اور ملازمت سے برطرفی

۹۔ سید سجاد ظہیر - ۴ برس قید بامشقت اور ۵۰۰ روپے جرمانہ۔ عدم ادئیگی کی صورت میں مزید ایک سال قید بامشقت۔

۱۰۔ محمد حسین عطا - ۴ برس قید بامشقت اور ۵۰۰ روپے جرمانہ۔ عدم ادئیگی کی صورت میں مزید ایک سال قید بامُشقت۔

۱۱۔ کیپٹن ظفر اللہ پوشنی ۔ ۴ برس قید بامشقت اور ۲۵۰ روپے جرمانہ۔ عدم ادئیگی کی صورت میں مزید ۶ مہینے قید بامشقت اور ملازمت سے برطرفی

۱۲۔ میجر جنرل نذیر احمد۔ قید تابرخاست عدالت اور ملازمت سے برطرفی

۱۳۔ لیفٹیننٹ کرنل نیاز ارباب۔ ۵ برس قید بامشقت اور ۲۵۰ روپے جرمانہ۔ عدم ادئیگی کی

صورت میں مزید ۶ مہینے قید با مشقت

۱۴۔ بریگیڈیر لطیف خان۔ ۵ برس قید با مشقت اور ۵۰۰ روپے جرمانہ۔ عدم ادئیگی کی صورت میں مزید ایک برس قید با مشقت

۱۵۔ بیگم نسیم اکبر - بری

جن دنوں عدالت کی کاروائی اختتام کو پہنچنے والی تھی اور سب قیدی فیصلے کا انتظار کر رہے تھے تب تمام ملزمین حیدرآباد سینٹرل جیل میں مقید تھے۔ اس جیل کا سپریٹنڈنٹ ایک شخص اللہ بخش تھا جو قیدیوں میں بالکل مقبول نہیں تھا۔ لیکن 'بی' کلاس کے وارڈ کا انچارج جیلر فقیر محمد الٰہی بخش شیخ تھا جس کے ساتھ قیدیوں کے دوستانہ تعلقات تھے۔ فیصلے کے روز تمام قیدیوں کو عدالت کے احاطے میں لایا گیا۔ ظفر اللہ پوشنی اس منظر کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''ہم سب لوگ کرسیوں پر بیٹھ کر اپنے بلاوے کا انتظار کرنے لگے۔ چودہ مرد اور ایک عورت جن کی آئندہ چند سال کی زندگیوں کا فیصلہ اگلے چند منٹ میں ہونے والا تھا۔ بیشتر دوست امید و بیم کی حالت میں سگریٹ پھونک رہے تھے۔ میں نے کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر سب دوستوں پر نظر ڈالی۔ جنجوعہ چست سوٹ اور نیلی نائی، بیگم نسیم کی گلابی شلوار قمیض اور دوپٹہ، سجاد ظہیر کی سلیٹی پتلون اور ڈھیلا ڈھالا براؤن کوٹ، خضر حیات کا پُر امید چہرا، ویٹنگ روم کا وہ منظر مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے سوچا ڈیڑھ برس جیل میں رہنے کے بعد آج ہمیں یہ بتایا جائے گا کہ اونچی دیواریں اور فولادی سلاخوں کے سائے میں ہمیں اپنی زندگی کے اور کتنے دن گزارنے ہوں گے۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ سزا ملنے والی ہے۔

انسپکٹر باجوہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا ''جنرل اکبر خان میرے ساتھ آئیے۔'' اکبر خان اٹھ کر انسپکٹر کے ساتھ روانہ ہو گئے۔۔۔۔ انسپکٹر باجوہ نے کمرے میں سر گھسیڑ کر پھر ہانک لگائی ''ایر کموڈور جنجوعہ'' جنجوعہ فوراً انسپکٹر کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ جنجوعہ کے بعد جنرل نذیر کی باری تھی۔۔۔

بعد میں معلوم ہوا کہ انہیں تا برخاست عدالت کی سزا کا حکم سنایا گیا۔۔۔اس کے بعد بریگیڈیر صدیق کو عدالت میں پیش کیا گیا۔۔۔صدیق کے بعد لطیف اور، لطیف کے بعد ضیا الدین اور ارباب، خضر اور حسن۔۔۔ویٹنگ روم رفتہ رفتہ خالی ہوتا چلا گیا۔ اور پھر اسحاق بھی چلے گئے۔ اسحاق کے بعد میری باری تھی۔ میرے علاوہ کمرے میں اب فیض، سجاد ظہیر اور نسیم باقی رہ گئے تھے۔ میں نے جاتے وقت نسیم سے ہاتھ ملایا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ رہا ہونے والی ہیں۔۔۔میں انسپکٹر باجوا کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

عدالت کے کمرے کا دروازہ کھول کر میں اندر داخل ہوا۔ وہی پرانی جگہ تھی جہاں بیٹھ کر ہم نے ڈیڑھ برس تک گواہوں کے قصے اور وکلا کی بحثیں سنی تھیں۔ اب یہ جگہ خالی پڑی تھی، تمام کرسیاں اٹھالی گئی تھیں۔ عدالت کے کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ یہاں تک کہ ججوں کے چہرے بھی بالکل صاف نظر نہ آتے تھے۔ عدالت کے اندر دیواروں کے ساتھ پولیس کے سپاہی کھڑے تھے۔ جہاں پہلے وکلا بیٹھتے تھے وہاں اب سپرڈینٹ پولیس ملک حبیب اللہ گلے میں پستول لگائے ایک کرسی پر براجمان تھے۔۔۔میں جونہی کمرے میں داخل ہوا جسٹس عبدالرحمٰن نے کاغذ سے کوئی عبارت بہ عجلت تمام پڑھنی شروع کی۔ یہ بات تو صراحت سے سمجھ میں نہ آسکی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں کیونکہ ان کی زبان بجلی کی طرح کوندرہی تھی لیکن اتنا ضرور معلوم ہوا کہ انہوں نے تعزیرات کی دفعہ ۱۲۱ کے تحت مجھے مجرم قرار دے کر چار برس کی قید بامشقت اور ۲۵۰ جرمانہ یا عدم ادائیگی کی صورت میں مزید چھ ماہ کی سزا عطا فرمائی۔ فیصلہ سننے کے بعد میں نے سر جھکا کر عدالت کو سلام کیا اور الٹے پاؤں کورٹ روم سے باہر نکل آیا۔" (۲)

فیصلے والے روز یعنی 5 جنوری 1953 کا تمام دن سزا یافتہ اشخاص نے اس امر پر بحث و مباحثے میں صرف کیا کہ اب ان کا مستقبل کیا ہوگا۔ سب نے ہر طرح کی کوشش کی کہ کسی کے چہرے پر ملال نظر نہ آئے۔ لہٰذا سب نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور رشتے داروں کو حوصلہ افزا خطوط بھیجے

تا کہ ان کی ڈھارس بندھی رہے لیکن اسی دن دوپہر کے 12 بجے مجرموں کی سزا کی خبر ریڈیو پر نشر ہو گئی اور تمام پاکستان فیصلے سے واقف ہو گیا۔

پوشنی لکھتے ہیں کہ ایک دن چیف جیلر جناب شیخ ان کے وارڈ میں آئے اور کہا کہ سب لوگ اپنا اپنا سامان باندھنا شروع کر دیں کیونکہ چند دنوں میں ہی ان کو دیگر جیلوں میں بھیج دیا جائے گا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جنرل اکبر خان، ظفر اللہ پوشنی اور محمد عطا صرف تین مجرم حیدرآباد جیل میں ہی رہیں گے۔ فیض تو پہلے ہی کراچی جیل میں تبدیل کر دیئے گئے تھے۔ اب باقی کے لوگ بھی روانہ ہو گئے لیکن کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ انہیں کہاں بھیجا گیا تھا۔ شام کو بڑے جیلر مسٹر شیخ پھر سے تشریف لائے تو عطا نے ان سے کہا اب جب کہ ان کے سبھی دوست رخصت ہو چکے ہیں تو شیخ صاحب انہیں اتنا تو بتائیں کہ کون کہاں گیا ہے۔ شیخ صاحب کو اس کی لاچاری پر رحم آ گیا اور انہوں نے دبی دبی آواز میں انہیں بتایا کہ سجاد ظہیر اور بریگیڈیر صدیق مچھ جیل بلوچستان، اسحاق اور خضر منٹگمری، ارباب اور جنجوعہ لاہور، لطیف خان، حسن اور ضیاالدین ملتان کی جیلوں میں بھیج دیئے گئے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ علاج کے بعد فیض منٹگمری جیل جائیں گے۔ اب خانقاہ اپنے مکینوں سے خالی ہو گئی تھی اس لیے حیدرآباد کے تینوں مجرموں کو جواب تک 'بی' کلاس میں رہ رہے تھے انہیں اب خانقاہ میں یعنی 'اے' کلاس وارڈ میں میں منتقل کر دیا گیا جہاں وہ اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے کیونکہ اب جبکہ حیدرآباد جیل میں صرف تین سازشی ہی باقی رہ گئے تھے تو ان پر عائد کی گئی پابندی رفتہ رفتہ از خود ڈھیلی ہوتی چلی گئی اور اب وہ دوسرے قیدیوں سے بلا روک ٹوک مل سکتے تھے۔ جنرل اکبر خان حیدرآباد جیل میں رہنا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے وہ ایک عرصے سے بیگم شاہنواز کے توسط سے تبدیلی کی کوشش کر رہے تھے لیکن باقی کے دونوں قیدی حیدرآباد کی سینٹرل جیل میں خوش تھے اور وہاں کی فضا سے بہت مانوس بھی تھے۔ آخر یکم جون 1954 کو جیل کے سپریڈنٹ نے اکبر خان کو یہ اطلاع دی کہ انہیں اگلے روز صبح لاہور جیل بھیج دیا جائے گا۔ اب صرف عطا اور پوشنی ہی حیدرآباد جیل میں باقی رہ گئے تھے۔

اسپیشل ٹریبونل کی ایک قرارداد کی رو سے سازش کے مجرموں سے فیصلے کے خلاف اپیل کرنے کا حق چھین لیا گیا تھا۔ پھر بھی وہ فیصلے کے تین دنوں کے اندر گورنر جنرل کے روبرو معافی کی گزارش پیش کر سکتے تھے جس میں معافی کے علاوہ سزا کم کرنے یا رد کرنے کی گنجائش بھی رکھی گئی تھی۔

اس قرارداد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تمام مجرموں نے گورنر جنرل کے آگے اس قسم کی گزارداشت پیش کیں جو ڈیڑھ سال بعد رد کردی گئیں۔

اب یہ ہوا کہ لاہور ہائی کورٹ نے 1944 کے قانون کے تحت مندرجہ بالا اشخاص کی گرفتاری کو غیر قانونی ٹھہرایا اور مجرموں کی ضمانت منظور کرلی اور یہ بھی فیصلہ سنایا کہ یہ لوگ تب تک ضمانت پر رہا رہیں گے جب تک نئی قانون ساز اسمبلی اس کا فیصلہ نہیں کرلیتی۔ آخرکار معاملہ نئی قانون ساز اسمبلی کے سامنے لایا گیا جس نے ایکٹ کو تو قانونی طور پر واجب قرار دیا لیکن حکومت کو حکم دیا کہ جب تک ان کی قید کی سزا ختم نہیں ہوجاتی وہ ضمانت پر رہا ہی رہیں گے۔ یعنی ان کے باقی کے قید کے دن ختم کردیئے گئے۔ سب کے ساتھ سجاد ظہیر بھی رہا کردیئے گئے لیکن رہائی کے فوراً بعد سجاد ظہیر کو پاکستان چھوڑنے پر مجبور کردیا گیا اور وہ ہندوستان لوٹ آئے۔

کچھ ادیبوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ سجاد ظہیر رہائی کے بعد پاکستان چھوڑ کر ہندوستان کیوں چلے گئے، پاکستان میں ہی کیوں نہیں رہے۔ اس سلسلے میں حمید اختر یہ کہتے ہیں:

''اس ضمن میں بہت کم لوگ ان کی واپسی کے متعلق حقائق سے آگاہ ہیں۔
جب وہ جیل سے رہا ہوکر لاہور پہنچے تو انہوں نے میاں افتخار الدین (مرحوم) کے گھر سے فون پر اپنے گھر والوں سے رابطہ کیا۔ انہیں بتایا گیا کہ ان کی والدہ بہت بیمار ہیں اور انہیں دیکھنے اور ان سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ سکندر مرزا ان دنوں غالباً وزیر خارجہ تھے۔ بنّے بھائی کے کہنے پر انہیں فون کرکے پاسپورٹ کے حصول کی کوشش کی گئی۔ وزارت داخلہ کی طرف سے یقین دلایا گیا کہ پاسپورٹ کے اجرا کے لیے ہدایات جاری کی جارہی ہیں اور چند ہی روز میں پاسپورٹ مل جائے گا جس کے بعد وہ ہندوستان جاسکیں گے۔ اور تین روز کے بعد وزیر داخلہ کا ایک نمائندہ میری موجودگی میں ایک مراسلہ لے کر آیا۔ جو مجھ سمیت وہاں موجود کئی لوگوں نے پڑھا۔ اس میں ہدایت کی گئی تھی کہ امیگریشن کے حکام بارڈر کراس کرنے میں سید سجاد ظہیر کی ہر ممکن مدد کریں۔ گویا انہیں ملک چھوڑنے کا پروانہ دیا گیا تھا جس میں واپسی کی گنجائش نہیں تھی۔ اس

کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ پاکستان کے امیگریشن حکام تو انہیں سرحد عبور کرادیں گے مگر ہندوستان کے حکام کے لیے تو یہ خط کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ وہ تو انہیں ہندوستان میں قبول نہ کریں گے۔ ایسی صورت میں نہ تو وہ آگے جاسکیں گے اور نہ لوٹ کر پاکستان آپائیں گے۔ اس مراسلے کے ذریعے انہیں صرف ایک دفعہ سرحد عبور کرنے کا مجاز قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ کافی بحث کے بعد فون پر ہندوستان میں متعلقہ افراد سے رابطہ قائم کیا گیا۔ پھر غالباً اس وقت کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی ذاتی مداخلت پر ہندوستانی امیگریشن حکام کو ہدایات جاری کی گئیں کہ وہ سجاد ظہیر کو ہندستان آنے دیں۔ اس کے بعد انہیں یہاں سے رخصت کیا گیا۔''(۳)

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ سجاد ظہیر نے پاکستانی پاسپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جس کا مطلب ہے کہ وہ پاکستان کے شہری بن کر وہیں رہنا چاہتے تھے۔ حالانکہ ہندوستان اور پاکستان کے مابین پاسپورٹ کی روایت نہیں تھی پھر بھی حکومت پاکستان نے انہیں ملک بدر ہونے کے احکامات جاری کردیئے تاکہ وہ لوٹ کر پاکستان واپس نہ آسکیں۔ وہ تو صرف چند روز کے لیے اپنی بیمار ماں کو ملنے اور ان کی عیادت کے لیے ہندوستان جانا چاہتے تھے لیکن حکومت پاکستان نے انہیں اپنا شہری تسلیم نہ کیا۔

اب دیکھتے ہیں ہندوستان لوٹنے پر ان کی اپنی پارٹی نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ہمیں یاد ہے کہ جب سجاد ظہیر پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری بن کر لاہور پہنچے تو وہاں ان کی پارٹی کے لیڈر کچھ خوش نہیں تھے۔ ایرک سپرائن جو پارٹی کے اہم لیڈروں میں سے تھے انہوں نے کھلم کھلا ان کی مخالفت کی اور کہا کہ وہ اس پوزیشن کے لیے اہل نہیں ہیں۔ بلکہ جب سجاد ظہیر راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے اور پولیس نے ان کے یہاں سے نہایت خفیہ اور اہم دستاویزات برآمد کیے تو سپرائن سمیت کئی اہلکاروں نے سجاد ظہیر کو ہی اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ چند لوگوں کے علاوہ کوئی بھی اس حق میں نہیں تھا کہ پارٹی حکومت کو گرانے میں سازش کا حصہ بنے۔ یہاں تک کہ محمد حسین عطا نے خود سجاد ظہیر سے کہا کہ وہ اس بارے میں سب پارٹی رہنماؤں سے

اتفاق کرتے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بھی پارٹی کے لیڈران ان سے ناخوش تھے۔ان دنوں ای ایم ایس نمبو دری پد پارٹی کے جنرل سیکریٹری تھے لیکن انہوں نے بنّے بھائی کے ساتھ مناسب سلوک نہیں کیا۔ایک شخص سید محمد مہدی جن کا ان دنوں کمیونسٹ پارٹی سے تعلق تھا اور وہ 2005 میں سیمینار میں شرکت کے لیے ہندوستان آئے تھے انہوں نے وہاں اپنا مضمون 'بنّے بھائی عرف سجاد ظہیر' پڑھا تھا جس میں علاوہ اور کئی حالات کے بنّے بھائی کے ہندوستان لوٹنے کا ذکر بھی کیا تھا۔اس بارے میں انہوں نے کہا:

> ''بنّے بھائی پاکستان سے رہا ہو کر ہندوستان واپس لوٹ آئے اور اس چشم گنہگار نے ایک منظر وہ بھی دیکھا جس نے میرے دل میں ایک کسک چھوڑ دی ہے جو آج تک باقی ہے اور آج میں عمر کی جس منزل میں ہوں تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے بیان کروں۔
>
> بنّے بھائی ظاہر ہے کہ سب سے پہلے لکھنؤ اپنے بیوی بچوں کے پاس گئے۔ میں ان کی رہائی پر انہیں خط لکھ چکا تھا اور انہیں معلوم تھا کہ میں پارٹی ہیڈ کوارٹر سے متعلق ہوں۔تب تک پارٹی کا ہیڈ کوارٹر دہلی منتقل ہو چکا تھا۔لکھنؤ سے ان کا خط میرے نام آیا کہ میں فلاں گاڑی سے دہلی پہنچ رہا ہوں۔ مجھے اسٹیشن پر ملو۔ ہندوستان کمیونسٹ پارٹی کی سینٹرل کمیٹی کے سابق ممبر پاکستان میں قید و بند کی زندگی گزارنے کے بعد دہلی آرہے تھے۔ میں نے سوچا کہ کمیونسٹ پارٹی کی سینٹرل کمیٹی کے کسی نمائندے یا نمائندوں کو ان کے خیر مقدم کرنے کے لیے ضرور بھیجنا چاہیے۔ چنانچہ میں اس وقت ایکٹنگ جنرل سیکریٹری ای ایم ایس نمبو دری پد کے پاس پہنچا۔ساری باتیں بتائیں اور تجویز پیش کی کہ اگر آپ خود نہ جاسکیں تو کسی کو اس کام کے لیے متعین کر دیجئے۔ انہوں نے دوسرے ممبروں سے مشورہ کیا اور آخر مجھے بلا کر یہ فیصلہ سنا دیا کہ اور کوئی جائے نہ جائے صرف تم چلے جاؤ۔
>
> اس دن دہلی ریلوے اسٹیشن پر بنّے بھائی کو لینے صرف میں ہی موجود

تھا اور بس۔ سینٹرل کمیٹی کا کوئی ممبر وہاں نہیں تھا۔ پارٹی کا کوئی سرکاری نمائندہ بھی وہاں نہیں تھا۔'' (۴)

یہ خیال عام تھا کہ راولپنڈی سازش حکومت کے اس رویے کا ردعمل تھا جس کے تحت وہ کشمیر پر فوجی طاقت کے ذریعے قبضہ کرنے میں ناکام رہی۔ اس شکست کی ذمہ داری فوجی افسران حکومت پر لادتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر حکومت بروقت ان پٹھان باغیوں کو امداد مہیا کرتی تو جموں کشمیر پر قبضہ کر کے اسے پاکستان سے منسلک کرنا عین ممکن تھا۔ اس سے فوجی افسران میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے میجرل جنرل اکبر خان کی سرکردگی میں اپنی نااہل حکومت کو برطرف کرنے کی سازش کی اسکیم بنائی۔ لیکن کشمیر میں ناکامی اس اسکیم کی واحد وجہ نہیں تھی۔ عوام حکومت کی روزمرہ کی کارکردگی سے بھی ناخوش تھے۔ بہت لوگوں کا خیال تھا کہ کمیونزم ہی اس کا حل ہے۔ اس بات کا یہ کامل ثبوت ہے کہ سازشیوں میں چار سویلین لوگ شامل تھے یعنی سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، محمد حسین عطا اور نسیم اکبر خان جو سب کے سب کمیونسٹ تھے یا کمیونسٹ نظریے کے تھے۔ یہ لوگ کشمیر کے سلسلے میں سازش میں شامل نہیں ہوئے تھے بلکہ اس لیے شامل ہوئے تھے کیونکہ وہ ان لوگوں کی پالیسی سے اتفاق رکھتے تھے جن کی معرفت انہوں نے سازش کا حصہ بننا قبول کیا تھا۔ کشمیر میں حکومت کی ناکامی تو محض ایک بہانہ تھی۔ اس لیے کشمیر کے مسئلے کو زیادہ اہمیت دینا مناسب نہیں۔ لیکن یہ سوال پھر بھی برقرار رہتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کو اس سازش میں شامل ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر اس وقت کے پارٹی کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ یہ فیصلہ سجاد ظہیر نے ذاتی طور پر لیا تھا جس میں پارٹی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کی رضامندی نہ ملنے کے باوجود سجاد ظہیر راولپنڈی سازش میں اپنے ہی فیصلے سے شریک ہوئے۔ پارٹی لیڈروں کی ناراضگی اس بات کا ثبوت ہے۔ ہندوستان لوٹنے پر بھی پارٹی نے ان کا بالکل خیر مقدم نہیں کیا اور صرف ایک شخص ہی ان کو لینے دہلی ریلوے اسٹیشن پر حاضر تھا۔ مختصر یہ کہ سازش میں شامل ہونے کا فیصلہ ان کا ذاتی فیصلہ تھا اس لیے پاکستان میں بند و سلاسل کی صعوبتوں کی ذمہ داری بھی ان پر ذاتی طور پر عائد ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

کتابیات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر/پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱)	The Rawalpindi Conspiracy,1951	حسن ظہیر	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔کراچی	1998	264
۲)	زندگی زنداں دلی کا نام ہے	ظفراللہ پوشنی	مین ہاٹن انٹرنیشنل۔کراچی	2001	199
۳)	آشنائیاں کیا کیا	حمید اختر	بک ہوم۔لاہور	2008	31
۴)	سجاد ظہیر۔ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک	گوپی چند نارنگ	ساہتیہ اکادمی۔دہلی	2007	221

☆☆☆☆

چھٹا باب

دوسرا دورِ اسیری اور جیلوں کے حالات

۱۔ لاہور سینٹرل جیل

۲۔ سینٹرل جیل حیدر آباد (سندھ)

۳۔ مچھ سینٹرل جیل۔ بلوچستان

۴۔ رہائی، واپسی اور وفات

ا۔ لاہور سینٹرل جیل

راولپنڈی سازش کا راز جب افشا ہوا تو ملک گیر گرفتاریاں عمل میں آئیں اور مختلف جگہوں سے لوگوں کو حراست میں لے لیا گیا۔ اس سازش کے سرغنہ میجر جنرل اکبر خان تھے جنہیں اس سازش میں قصوروار پایا گیا اور 12 سال قید بامشقت کی سزا کا حکم دیا گیا۔ جنرل اکبر خان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کی گئیں اور انہیں سازش میں ملوث ٹھہرایا گیا۔ عدالت سے متعلقہ اسپیشل ٹریبونل کے سامنے بھی طرح طرح کی دلیلیں پیش کی گئیں۔ قید کی میعاد پورا ہونے کے بعد جب اکبر خان رہا ہوئے تو کچھ عرصے بعد انہوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام Raiders in Kashmir رکھا۔ اس کتاب میں انہوں نے راولپنڈی سازش کی حقیقت بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ اس سلسلے میں چند میٹنگیں ضرور ہوئی تھیں لیکن آخر کار سازش کی تجویز کو خارج کر دیا گیا تھا۔

اس کتاب میں جنرل اکبر خان نے یہ بالکل نہیں کہا کہ بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے صرف اتنا کہا کہ 23 فروری 1951 کی میٹنگ میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ ان کی تجویز پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ ظفراللہ پوشنی نے بھی یہی بات کہی ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ سازش ہوئی تھی یا نہیں تو انہوں نے صاف جواب دیا تھا کہ جہاں تک سازش کا الزام ہے وہ تو ہوئی تھی لیکن جس کی تمام مجرموں کو سزا دی گئی تو وہ تمام الزام غلط تھے۔ اگر سازش ہوئی تھی تو یہ بات قابل غور ہے کہ کیا وہ اشخاص جن پر مقدمہ چلایا گیا اور سزائیں دی گئیں کیا وہ سزا کے مستحق تھے۔ 23 فروری 1951 کی

میٹنگ میں اور اس سے پہلے اس موضوع پر ان لوگوں نے حکومت کو برطرف کرنے کا پلان ضرور بنایا تھا مگر آخری میٹنگ میں اسے مسترد کر دیا تھا۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ تجویز کے ختم ہو جانے کے بعد معاملے کو ختم تسلیم کیا جانا تھا۔ لوگ کئی بار کوئی غیر اخلاقی تدابیروں پر عمل کرنے کی ترکیب تیار کرتے ہیں لیکن بالآخر اسے ناکارہ قرار دے کر ترک کر دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا ان کے خلاف قانونی کاروائی جائز یا مناسب تھی؟ موجودہ معاملے میں بھی یہی کچھ ہوا تھا مگر سیاسی مجبوریوں کے پس پردہ لیاقت علی اور ایوب خان نے انہیں کئی سال حوالات میں رکھا۔ یہ محض ایک سیاسی قدم تھا جو لیاقت علی نے اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے اُٹھایا تھا۔

سازشیوں میں ایک بریگیڈیر اے آر صدیقی بھی شامل تھے جنہوں نے اسی موضوع پر ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا Of Coups Conspiracies & Showdowns۔ یہ مضمون اسلام آباد سے شائع کردہ 20 نومبر 1995 کے 'دی نیشن' روزنامے میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے سازش اور بغاوت کے تاثرات کو واضح کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''سن 1951 اور 1955 کے درمیان چھ سازشیں عمل میں آئیں جو بری طرح ناکام رہیں اور تین فوجی انقلاب بھی ہوئے جو پوری طرح کامیاب رہے۔ چاہے اسے کسی بھی زاویے سے دیکھا جائے جو سازش کمانڈر ان چیف کرتے ہیں اور جو چھوٹے درجے پر ہوتی ہیں، ان میں امتیاز پیدا کرنا بالکل نامناسب ہے۔ حکومت کو زور بازو سے برطرف کرنا سازش کی محض بالآخر کامیابی کا نام ہے۔ ان دونوں میں کسی ایک کو عزت کی نگاہ سے دیکھنا نامناسب ہے۔ اگر دیکھا جائے تو آرمی چیف کی طرف سے کی گئی سازش اور بھی خطرناک ہے کیونکہ اس عمل سے وہ ایسا کام کرواتے ہیں جو فوج کے لیے نامناسب ہی نہیں بلکہ غیر قانونی بھی ہے۔ اس لیے فوجی طاقت سے حکومت کا تختہ پلٹنا ملک کے ساتھ سب سے زیادہ شرمناک غداری ہے۔''(۱)

یہ بریگیڈیر صدیقی کا ذاتی خیال ہے جس پر بحث کرنے کا یہ مقام نہیں۔ لیکن یہ بات کسی بھی باشعور انسان کو قبول نہیں ہو سکتی کہ اگر تجویز ترک کر دی جائے اور اس پر سرے سے ہی عمل نہ کیا گیا ہو

تو بھی منسلک لوگوں کو قانونی طور پر قصوروار ٹھہرایا جائے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ جب اکبر خان کو ترقی دے کر میجر جنرل بنا دیا گیا تو انہوں نے جنرل ایوب خان جو اُن دنوں کمانڈر ان چیف مقرر ہونے والے تھے ان سے اس بات کا صاف صاف اعتراف کیا کہ کشمیر کے سوال پر ان کے حکومت سے اختلافات ہیں جو پہلے سے ہی سب پر واضح ہیں۔ اس لیے انہوں نے ایوب خان سے گزارش کی کہ فی الحال انہیں ترقی دے کر نہ تو میجر جنرل کے رتبے سے نوازا جائے اور نہ ہی ان کا تقرر چیف آف جنرل اسٹاف کے طور پر کیا جائے۔ لیکن جب جنرل ایوب خان نے انہیں بتایا تھا کہ انہوں نے خود ہی حکومت سے اکبر خان کو مانگا ہے اور اس لیے انہیں یہ تقرر قبول کر لینا چاہیے تو وہ انکار نہ کر سکے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر خان نے جو بھی اپنے ساتھیوں سے بات چیت کی وہ اس قدر خفیہ بھی نہیں تھی۔ جنرل ایوب خان نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ بھی اس الجھن میں تھے کہ انہیں اکبر خان کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے۔ ایوب خان نے بھی ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام ہے Friends Not Masters۔ اس سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے:

> ''میں کچھ عرصے تک اس بات پر غور کرتا رہا کہ ان (اکبر خان) کے ساتھ مجھے کیا کرنا۔ بالآخر میں نے انہیں جنرل ہیڈ کوارٹر میں چیف آف جنرل اسٹاف مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ میں نے اس لیے کیا تا کہ وہ ہمہ وقت میری نظروں کے سامنے رہیں اور ساتھ ہی فوجوں کے دستوں کی براہ راست کمان بھی ان کے ہاتھ میں نہ رہے۔'' (۲)

اب اس بات میں مطلق شک باقی نہیں رہ جاتا کہ جنرل ایوب خان کو اکبر خان کی سرگرمیوں کا پورا پورا علم تھا۔ اس لیے 9 مارچ 1951 کو کوئی ایسی نئی بات پیدا نہیں ہوئی تھی جس کی بنا پر اتنے بڑے پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں لائی جاتیں۔ خود ایوب خان نے اس کے بعد جن کاروائیوں پر عمل کیا اس کے مقابلے میں اکبر خان کی نام نہاد سازش بالکل بے ضرر معلوم ہوتی ہے۔ جنرل ایوب خان نے دو بار آئین منسوخ کیا، دو بار مارشل لا نافذ کیا اور دو ہی بار ملک میں ڈکٹیٹرشپ نازل کی۔ اس کے برعکس اکبر خان کی تجویز میں ان تمام باتوں کو کوئی دخل حاصل نہیں تھا۔ آگے چل کر اکبر خان نے یہ بھی کہا ہے کہ جس روز گرفتاریاں ہونے والی تھیں لیفٹیننٹ کرنل صدیق راجہ ان کے

یہاں آئے اور انہیں بتایا کہ ان کے خلاف کاروائی کیے جانے کی زوردار افواہ ہے۔ یہ اطلاع ملنے کے بعد اکبر خان اپنی گزشتہ میٹنگوں سے متعلقہ تمام کاغذات زائل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ صدیق رلجہ سے کہا کہ وہ اپنے اعمال کی تمام ذمہ داری قبول کریں گے اور اس کے نتائج کا بھی سامنا کریں گے۔ تاہم انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ان کے خلاف جو بھی کاروائی کی جائے گی وہ قانون کے مطابق ہی ہوگی۔ اس لیے وہ اس کاروائی کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔

جیل کا ماحول باہر کے ماحول سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور نو وارد قیدی آسانی سے نئے ماحول میں ڈھل نہیں پاتے۔ اگرچہ سجاد ظہیر کو گرفتار کر کے سیدھا لاہور سینٹرل جیل ہی لے جایا گیا لیکن چند لوگوں کو پہلے شاہی قلعہ میں نظر بند رکھا جہاں انہیں بے حد دردناک اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں۔ ان میں ایک حسن عابدی بھی تھے جو تقریباً سات دن پولیس کی ہتھکنڈے کھاتے رہے لیکن سجاد ظہیر کا پتہ ٹھکانا واضح نہیں کیا۔ اس کے علاوہ بھی کئی لوگوں کو شاہی قلعے کی کربناک تنہائی کا سامنا کرنا پڑا اور پولیس کی سختیاں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ فیض احمد فیض کو بھی گرفتاری کے بعد تین مہینے لائلپور جیل میں رکھا گیا تھا جس کا کسی کو علم نہیں تھا۔ یہ قید تنہائی بالکل غیر قانونی تھی کیونکہ مروجہ قانون کے تحت ایک مقررہ مدت سے زیادہ کسی کو بھی قید تنہائی میں رکھنا غیر قانونی تھا۔ لائلپور جیل میں قیدیوں کو انسانوں سے ملاقات اور خط و کتابت کی قطعاً اجازت نہیں تھی۔ فیض کہتے ہیں کہ جیل میں اسیروں کی سب سے بڑی خواہش باہر بسنے والے اپنے پیاروں سے باہم ملنے کی ہوتی ہے اور جیل کے اندر سب سے خوبصورت دن ملاقات کا ہوتا ہے۔ جن لوگون کو جیل کی زندگی کا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ جیل کے در و دیوار عجیب بے رونقی کا شکار ہوتے ہیں اور تنہائی کی کربناک اداسی پر یہ بے رونقی بہت بوجھل اور گراں ہوتی ہے۔ ہر روز دن بھر وہی بے رونقی، وہی ماحول، وہی بے چینی اور ناامیدی انسان کو نڈھال کر دیتی ہے۔ مگر جب اسیران حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں تو ذہنی طور سے جیسی آزادی جیل خانے میں ملتی ہے وہ باہر نہیں ملتی۔ وجہ یہ کہ باہر روزمرہ کی الجھن اور جھنجھٹ وغیرہ میں آدمی الجھا رہتا ہے کہ 'پورے کینوس' کو دیکھنے کی فراغت نہیں ملتی۔ اس کے برعکس جیل خانے میں انسان کو ایک وسیع سوچ دستیاب ہوتی ہے جو باہر نہیں ہوتی۔ جیل میں رہ کر ہی کچھ لوگوں نے ایسے ایسے ادبی کارنامے تخلیق کیے جو یادگار بن کر رہ گئے۔ سجاد ظہیر نے اپنی دو مایہ ناز تحریریں 'روشنائی' اور 'ذکر حافظ' مرتب

کیس جو ادب میں بہت بلند مقام رکھتی ہیں۔ اس طرح فیض احمد فیض نے بھی قید کی لمبی سزا کے دوران نہایت اعلیٰ پایہ کی شاعری تخلیق کی۔ اگر وہ جیل نہ جاتے تو شاید اتنی عمدہ شاعری نہ کر پاتے۔ فیض صاحب کے اپنے الفاظ میں:

> ''یہ ٹھیک ہے کہ جیل خانہ میری شاعری کا زرخیز دور تھا کیونکہ جیل خانے میں اور کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ کوئی اپائنٹمنٹ نہیں ہوتی تھی۔ جیل کا زمانہ ایسا ہی ہے جیسا پھر سے عشق کر لیا جائے، جیسے عشق میں خواہ مخواہ شعر بنتے چلے جاتے ہیں، انسان جذبات کی رو میں بہہ کر شعر کہتا ہی چلا جاتا ہے۔ جیل خانے میں بھی ایسا ہی ہے جیسا آپ نے دوبارہ عشق کر لیا ہو۔''(۳)

مندرجہ بالا تحریر سے یہ نتیجہ نکالنا مناسب نہ ہوگا کہ جیل کی زندگی پھولوں کا بستر ہے۔ لہٰذا اگرچہ صدر ٹریبونل نے یہ فیصلہ سنایا تھا کہ راولپنڈی سازش کیس کے قیدیوں کو 'اے' کلاس کی سہولیات مہیا کی جائیں گی تاہم انہیں جو رہائش گاہ الاٹ ہوئی وہ انتہائی حقیر اور تکلیف دہ تھی۔ جو کوٹھری ہر ایک کو رہنے کے لیے دی گئی تھی وہ دس فٹ لمبی اور سات فٹ چوڑی تھی جس میں کھڑکی و روشن دان ندارد تھے۔ اس لیے اس میں بلا کی گرمی تھی۔ ہر کوٹھری میں ایک عدد لوہے کی چارپائی اور ایک کمبل کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ تمام کوٹھریوں کے گروپ کے آگے ایک صحن تھا جس میں ایک بینچ رکھی تھی اور اردگرد چند اسٹول پڑے ہوئے تھے۔ قیدیوں کا کھانا اسی بینچ پر چنا جاتا تھا۔ کھانے کا یہ حال تھا کہ تانبے کی تھالی میں سوکھی ہوئی ٹھنڈی روٹیوں کا ڈھیر لگا دیا جاتا تھا۔ دو رکابیوں میں دال ہوتی تھی جس کی تہہ میں ہی چند دانے دال کے ہوتے تھے۔ مجبوراً ان قیدیوں کو یہی کھانا زہر مار کر کے اللہ کا شکر ادا کرنا پڑتا تھا۔ کھانے کے بعد سب لوگ اپنی اپنی کوٹھریوں میں گھس جاتے تھے اور ایک سپاہی ہر کوٹھری کے دروازے پر ایک مضبوط تالا ڈال دیتا تھا۔ ظفر اللہ پوشنی نے اپنے تاثرات ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اول تو لوہے کی چارپائی جس میں چھ چھ انچ کے فاصلے پر لوہے کی پٹیاں جڑی ہوئی تھیں اور اس کی تنگی کو کم کرنے کے لیے ایک کمبل قطعاً ناکافی تھا، دوسرے مچھروں کا دل بہ دل جس نے ہاتھ پاؤں اور چہرے پر خوفناک یلغار شروع

کردی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے غوطہ مار جنگی طیارے کسی کھلے امن پسند شہر کو ملیامٹ کرنے میں مصروف ہوں۔ میں اس یلغار سے گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ جرابیں پھر سے پہن لیں۔ قمیض کی آستینوں کو جو اوپر چڑھالی تھیں، نیچے سرکایا جیب سے رومال نکال کر چہرہ ڈھانپا اور پیٹھ کے بل لیٹ کر دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں گھسیڑ لیے تاکہ بدن کا کوئی حصہ ننگا نہ رہ جائے۔ لیکن جلد ہی اندازہ ہوا کہ یہ قرینہ انتہائی تکلیف دہ ہے۔ پھر بھی گرمی اتنی شدید تھی کہ قمیض پسینے سے تر ہو کر بدن کے ساتھ چپکنے لگی اور کمرے کے بھیانک حبس میں سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ کوئی آدھ پون گھنٹے تک میں نیند کو بے سود بلاتا رہا پھر یہ سوچا کہ ہٹاؤ بھی۔ اگر نیند نہیں آئی تو نہ سہی کیوں نہ ذرا دیر سگریٹ سے شغل کیا جائے۔ جیب سے گولڈ فلیک کا پاکٹ نکالا۔ ایک سگریٹ ہونٹوں میں دبایا پھر معاً یاد آیا کہ ماچس تو ضبط ہو چکی ہے۔'' (۴)

ظاہر ہے جو کوٹھریاں سازش کے قیدیوں کو دی گئی تھیں وہ انسانوں کے رہنے کے لائق ہرگز نہیں تھیں۔ ان لوگوں کو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ جیل کے اندر بھی کئی طرح کی الگ الگ جیلیں ہوتی ہیں جن کے نام بھی الگ الگ ہوتے ہیں جن سے ان کے مکینوں کی حیثیت کا اندازہ لگانے میں سہولیت رہتی ہے جیسے کہ 'شاہی احاطہ' 'پھانسی گارڈ' دیوانی گھر' وغیرہ۔ جس وارڈ میں ان قیدیوں کو تبدیل کر کے رکھا گیا اس کا نام بم بیرک تھا۔ جیل کے افسران سے معلوم ہوا کہ اسے بم بیرک اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس میں شہید بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو رکھا گیا تھا۔ یہ نئی کوٹھریاں مقابلتاً صاف، پختہ اور ہوادار تھیں۔ ہر کوٹھری کے سامنے ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ قیدی قدرے کھلی ہوا میں بیٹھ سکیں۔ بم بیرک کی چاردیواری بہت اونچی تھی جس کی وجہ سے اس کے احاطے کے باہر بالکل کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ پھر بھی نئی کوٹھریاں پرانی کوٹھریوں سے کچھ حد تک بہتر تھیں اگرچہ وہ بھی پنجرہ نما ہی تھیں۔ ہر کوٹھری میں لوہے کی ایک چارپائی، ایک میز، ایک کرسی، ایک چھوٹی سی الماری اور ایک اسٹول دھرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ہر ایک قیدی کو دو عدد کمبل بھی مہیا کیے گئے تھے لیکن وہاں بھی پنکھے نہیں تھے اور گرمی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہاں بھی شام کے سات بجے قیدیوں کو کوٹھریوں

میں بند کر کے تالہ لگا دیا جاتا تھا۔

لاہور سینٹرل جیل میں سب سے پہلے میجر اسحاق کے کچھ رشتے دار ان سے ملاقات کے لیے آئے اور اپنے ساتھ پھل، شربت کی بوتلیں، فروٹ کے ڈبے، گھی کاٹن وغیرہ سمیت بہت سارا سامان لائے۔ اس کے بعد باری باری سبھی لوگوں کے رشتے دار ملاقات کے لیے آنے لگے۔ اسحاق کی اپنے رشتے داروں سے ملاقات کے دو دن بعد پوشنی کی والدہ، ان کی چار بہنیں، ان کے ابا کے ہمراہ ان سے ملنے کے لیے پہنچ گئیں اور ساتھ ہی گھی کا ڈبہ، چینی کا پیکٹ اور پھلوں کی ٹوکری بھی لائے۔

جو پندرہ آدمی راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے تھے ان میں ایک میجر محمد اسحاق بھی تھے جنہوں نے فیض کے مجموعۂ شاعری 'زنداں نامہ' کے لیے ایک مضمون روداد قفس کے نام سے لکھا تھا۔ اس مضمون میں وہ بھی لاہور جیل کے ایک واقعہ کو اپنے اچھوتے انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''لاہور جیل کا ایک واقعہ یاد کرتا ہوں تو اب بھی ہنسی آجاتی ہے۔ وہاں ہمیں بم کیس وارڈ میں رکھا گیا تھا (یہ وارڈ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کے لیے خاص طور پر تعمیر کیا گیا تھا)۔ اس کے صحن میں ایک بارہ دری سی تھی جس کے دروازوں پر لوہے کی مضبوط جالی لگی ہوئی تھی۔ رات کو ہم یہیں سویا کرتے تھے۔ ایک دن سونے کی تیاری میں مصروف تھے کہ ایک بوڑھا سنتری جالی سے لگ کر اندر جھانکنے لگا۔ خضر حیات نے پوچھا بابا ہم تمہیں قیدی دکھائی دیتے ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں جناب۔ خضر حیات بولا لیکن بابا ہمیں تو تم قید میں نظر آتے ہو۔ اس پر بوڑھا سنتری بوکھلا سا گیا۔ پھر اس زور سے ہنسنے لگا کہ ہم بھی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ایک نشہ تھا جس میں سب مگن تھے۔'' (۵)

پچھلی مرتبہ سازش کے قیدیوں کو خصوصی عدالت کے صدر جسٹس عبدالرحمٰن کے روبرو پہلی بار پیش کیا گیا تھا جب ان سب کو چودہ دن کا ریمانڈ ملا تھا۔ چونکہ قانون کے مطابق مقدمہ شروع ہونے سے پہلے ملزم کو دو ہفتے کے بعد عدالت میں پیش کرنا ضروری ہوتا ہے اس لیے ان کی دوسری پیشی عدالت کے ممبر جسٹس محمد شریف کے سامنے ان کے بنگلے پر ہوئی۔ بنگلے کے چاروں طرف زبردست پہرہ تھا اور مقدمے کی سنوائی کا بندوبست بنگلے کے ایک کشادہ لان میں کیا گیا تھا۔ جب یہ لوگ وہاں

پہنچے تو جسٹس شریف کاغذوں کے ایک پلندے پر دستخط کرنے میں مصروف تھے۔ وہ جب اس مصروفیت سے فارغ ہوئے تو ان کو مخاطب کر کے کہنے لگے "کوئی سوال پوچھنا ہو تو پوچھیئے۔" سجاد ظہیر سب سے پہلے کھڑے ہوئے اور کہا:

"اول تو مجھے علم نہیں کہ یہ کونسی جگہ ہے۔ یہ سب لوگ یہاں کیوں جمع ہوئے ہیں اور آپ کون صاحب ہیں؟ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مجھے تقریباً ایک ماہ پہلے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ تب سے لاہور سینٹرل جیل میں بند ہوں۔ مجھے دوسرے نظر بندوں سے الگ قید تنہائی میں رکھا گیا ہے۔ خوراک بہت خراب ہے۔ میں اپنے خرچ پر سگریٹ تک حاصل نہیں کر سکتا۔ مختصر یہ کہ جیل والے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ آج مجھے پکڑ کر آپ کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔ مجھے علم نہیں کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ اگر آپ کوئی بڑے افسر ہیں تو میں درخواست کرتا ہوں کہ مہربانی فرما کر میری تکالیف کے ازالے کی کوشش کیجئے۔ نیز آپ کی نوازش ہوگی اگر مجھے یہ بتائیں کہ میں یہاں آپ کے روبرو کیوں لایا گیا ہوں۔"(٦)

اس کے جواب میں جسٹس محمد شریف نے فرمایا "مسٹر سجاد ظہیر! آج سے آپ سیفٹی ایکٹ میں نہیں بلکہ حکومت پاکستان کے خلاف سازش کے الزام میں اپنے آپ کو گرفتار سمجھیں۔ آپ پر اور ان تمام حضرات پر جو یہاں بیٹھے ہیں ایک خصوصی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ میں اسی عدالت کے تین ممبروں میں سے ایک ہوں۔ دوسرے دونوں جج صاحبان آج موجود نہیں ہیں۔ جہاں تک مقدمے کا تعلق ہے آپ کو وکیل کی امداد حاصل کرنے اور اس سے ملنے کی اجازت دی جائے گی۔ اگر آپ میں خود وکیل کرنے کی توفیق نہیں تو اس عدالت کی طرف سے خدمات مہیا کی جائیں گی۔ اس کے لیے آپ عدالت کو درخواست دے سکتے ہیں۔ آپ کے خلاف الزامات کی فہرست یعنی چارج شیٹ کل یا پرسوں تک آپ کو پہنچا دی جائے گی۔ باقی رہا جیل کے اندر خوراک اور رہائش وغیرہ کا بندوبست تو اس کا براہ راست تعلق مجھ سے نہیں تاہم میں یہ کوشش کروں گا کہ آپ کی تکالیف دور کی جائیں۔"

جسٹس شریف نے انہیں یہ بھی بتایا کہ جب وہ وکیل سے گفتگو کریں گے اس وقت کوئی

تیسرا آدمی وہاں موجود نہ ہو لیکن اس مقدمے کے متعلق جو ایکٹ پاس ہوا ہے اس کے تحت مقدمے کی کاروائی بند کمرے میں ہوگی اور عدالت کی تمام کاروائی خفیہ رکھی جائے گی۔ کچھ دنوں بعد سازش کیس کے پندرہ ملزموں کے حوالے مقدمے کی چارج شیٹ کر دی گئی۔ ان پر فوجی ایکٹ اور تعزیرات پاکستان کی جو دفعات ان پر عائد کی گئیں ان میں دفعہ 302 بھی شامل تھی جس کا تعلق قتل سے ہوتا ہے۔ قتل کا الزام دیکھ کر یہ چارج شیٹ انہیں بہت مضحکہ آمیز لگی۔ ان پر سب نے طرح طرح کے طنز کیے گویا ان الزامات کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ ماحول کی سختی کو کم کرنے کے لیے انہوں نے اپنے وارڈ کے احاطے میں ایک ٹینس (Tennis) کورٹ کا قیام کرلیا تھا اور ہر روز سہ پہر کو ڈیک سیشن کے ہنگامہ خیز مقابلے ہونے لگے تھے۔ پوشنی کہتے ہیں کہ اس مشغلے سے سب کو بہت فائدہ ہوا کیونکہ تمام دن بے کار لیٹے رہنے سے طبیعت پر اضمحلال سا طاری رہتا تھا جو اس کھیل کود سے رفع ہو جاتا تھا۔ اس ذرا سی تبدیلی کا قیدیوں پر جو اثر پڑا وہ پوشنی کے الفاظ میں ذیل میں بیان کیا جاتا ہے:

> ''ہمیں شام بڑے ہال کمرے میں بند ضرور کیا جاتا تھا لیکن یکجا ہونے کی بنا پر ہم اس روحانی کوفت سے یکسر محفوظ تھے جو تنہا بند ہونے میں محسوس ہوتی ہے۔ انسان بنیادی طور پر ایک مجلسی جانور ہے اور میرے خیال میں کسی انسان کے لیے سب سے زیادہ اذیت ناک سزا یہی ہے کہ اسے قید تنہائی میں رکھا جائے۔ غذا اور رہائش کی خرابیاں اور دوسری جسمانی تکلیفیں آسانی سے برداشت کی جاسکتی ہیں لیکن دوسرے انسانوں کی رفاقت سے محرومی اور تنہائی ایسی اذیت نہیں جسے ہنس کر برداشت کرلیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ جو لوگ انفرادیت کے فلسفے پر یقین رکھتے ہیں اگر انہیں کچھ عرصے کے لیے قید تنہائی میں رکھا جائے تو غالباً جلد ہی وہ بھی اجتماعیت کی خوبیوں پر ایمان لے آئیں گے۔'' (۷)

لاہور جیل میں مختلف وارڈوں کے الگ الگ نام تھے۔ ان میں ایک وارڈ کا نام سیاست خانہ تھا۔ حمید اختر جب گرفتار ہوئے تو انہیں اس وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ ویسے حمید اختر راولپنڈی سازش کیس میں شرکت کے الزام میں گرفتار نہیں ہوئے تھے بلکہ سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کیے گئے تھے۔ تاہم قید تو وہ بھی لاہور سینٹرل جیل میں ہی تھے جہاں سجاد ظہیر کو بند کیا گیا تھا۔ جیل کے اس حصے میں

جن میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار شدگان کو رکھا گیا تھا اور جسے سیاست خانہ کا نام عطا ہوا تھا اس کا ماحول بیان کرتے ہوئے حمید اختر کہتے ہیں کہ انہیں اور ان کے ساتھیوں کو سیاست خانہ کے سات نمبر بلاک میں جگہ الاٹ ہوئی۔ اس بلاک میں پچیس کوٹھریاں تھیں جن میں سے چند کوٹھریاں ہی سلامت تھیں۔ باقی کوٹھریاں یا تو گر چکی تھیں یا نہایت خستہ حالت میں تھیں۔ وہ لوگ ابھی اپنی اقامت گاہ کا جائزہ ہی لے رہے تھے کہ حسن عابدی نمودار ہوا۔ حسن عابدی کا ذکر پہلے بھی کئی بار آ چکا ہے۔ حسن عابدی چونکہ کئی روز پہلے سے وہاں رہ رہے تھے اس لیے اسے وہاں کے بارے میں کافی واقفیت تھی۔ اس نے انہیں بتایا کہ جیل کی اصطلاح میں کوٹھری کو کوٹھی کہتے ہیں اور بعض لوگ کوٹھی کی بجائے اسے چکی بھی کہتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ چند سال پہلے ہر کوٹھری میں آٹا پیسنے کی ایک چکی ہوتی تھی اور جیل کے مجرموں کو پندرہ سیر اناج پیسنے کی سزا ہوتی تھی۔ لیکن اب یہ دستور نابلد ہے۔ اس وارڈ میں اب چھ ساتھی اکٹھا ہو گئے تھے اور باہمی رفاقت نے جیل کی صعوبتوں کو قدرے نرم کر دیا تھا۔ اس نئے ماحول کا ایک مختصر ساذکر حمید اختر نے کیا ہے:

> ''ہم سب کمبل پر ایک دوسرے سے جُو بیٹھے تھے۔ زندگی کی اس نئی اور اجنبی منزل پر رفاقت کا مضبوط احساس اب بیدار ہو رہا تھا گویا ہم سب ایک ہی ہیں۔ اس سنگلاخ منزل پر پہنچ کر سارے دوست، جو اپنی خواہشیں، محبتیں اور حسرتیں اس اونچی بھوری دیوار کے باہر چھوڑ آئے تھے، ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے تھے گویا ہم صدیوں سے اکٹھے ہیں، ہمیں دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔ جیل میں آ کر آج پہلی بار مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ باہر سے جیل کا جو تصور ذہن میں تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ اس ایک جیل میں کئی جیلیں ہیں۔ ایک اونچی دیوار ہمیں باہر کی عظیم، حسین، حرکت کرتی ہوئی زندگی سے جدا کر رہی ہے تو دوسری دیوار ہمیں جیل کی اندر کی زندگی سے بھی جدا کر رہی ہے۔ اس احاطے کی دیوار نے ہمیں جیل کے قیدیوں سے بھی علیحدہ کر دیا تھا۔ زندگی دیواروں میں تبدیل ہو گئی تھی۔''(۸)

حسن عابدی کے لاہور کے شاہی قلعے میں نظر بند ہونے کے چند دن بعد یعنی 21 اپریل

1951 کو سبط حسن بھی پکڑے گئے اور انہیں بھی لاہور کے قلعے میں بھیج دیا گیا تھا۔ سبط حسن عابدی کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس وقت ان کی عمر کوئی 22 یا 23 برس کی تھی۔ جسم کے دبلے پتلے اور قد تقریباً ساڑھے چار فٹ تھا۔ نہایت کم گو اور منکسر مزاج شخص تھے لیکن کردار کے غازی اور بڑی سے بڑی اذیت کو خوشی خوشی برداشت کرتے تھے۔ سبط حسن لکھتے ہیں کہ عابدی کی کوٹھری قلعے میں ان کی کوٹھری کے بالکل اوپر تھی اس لیے عابدی پر جو بھی گزرتی تھی اس کا انہیں پورا علم ہوتا تھا۔ عابدی پر رات بھر مار پڑتی تھی لیکن وہ منہ سے اُف تک نہیں کرتا تھا۔ پولیس ان سے یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ سجاد ظہیر کس جگہ روپوش ہیں۔ حسن عابدی کے بیان اور سجاد ظہیر کی گرفتاری کا ذکر سبط حسن اس طرح کرتے ہیں:

> ''تقریباً آٹھ دن تک لگاتار پیٹتے رہے تب ایک پرانے سی آئی ڈی انسپکٹر نے ایک ترکیب چلی۔ یہ شخص زبان کا بڑا میٹھا اور بڑا شائستہ آدمی تھا۔ بیس پچیس سال سے یعنی تقسیم سے بہت پہلے سے کمیونسٹوں کی نگرانی پر معمور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انڈر گراؤنڈ تحریک کے اصول اور آداب کیا ہیں اور روپوشی کے عالم میں کمیونسٹوں کا رہنے سہنے اور کام کرنے کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔ اس نے حسن عابدی کو کمرے میں بلایا اور بڑے اخلاق سے پیش آیا اور کہنے لگا کہ آپ تو روپوشی کے اصول سے واقف ہیں پھر آپ خواہ مخواہ کیوں اذیت برداشت کر رہے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ سجاد ظہیر کو آپ کی گرفتاری کا علم ہو چکا ہوگا اس لیے کہ آپ ان کے ساتھ رہتے تھے اور جب آپ واپس نہیں پہنچے ہونگے تو وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ آپ پکڑ لیے گئے ہیں۔ ایسی صورت میں کمیونسٹوں کا طریقہ کار آپ کو بھی اور مجھے بھی معلوم ہے۔ وہ یہ کہ فوراً اپنی قیام گاہ بدل لی جائے۔ یہ سو فی صدی سچی بات تھی۔ حسن عابدی کو یقین آ گیا کہ آٹھ دن کی غیر حاضری کے بعد بنے بھائی یقیناً کسی دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے بھی بنے بھائی کی قیام گاہ کا پتہ بتا دیا۔'' (۹)

سینٹرل جیل لاہور میں سجاد ظہیر کے حالات جاننے کے صرف دو ہی ذرائع ہیں۔ ایک تو کیپٹن ظفر اللہ پوشنی کی کتاب 'زندگی زنداں دلی کا نام ہے' اور دوسرا میجر محمد اسحاق کا مضمون 'رودادِ قفس' جو فیض احمد فیض کی شاعری کے مجموعہ 'زنداں نامہ' کے لیے لکھا گیا تھا۔ ان کے

علاوہ کہیں سے بھی دیگر کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ ویسے بھی سجاد ظہیر ایک مہینے سے کم عرصہ ہی لاہور جیل میں رہے تھے کیونکہ وہ 28 اپریل 1951 کو گرفتار ہوئے تھے اور مئی 1951 میں انہیں سینٹرل جیل حیدر آباد میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ یعنی انہیں ایک مہینے سے بھی کم لاہور میں رکھا گیا تھا۔ چونکہ لاہور جیل میں قیدیوں کو صرف ایک خط فی ہفتہ لکھنے کی اجازت تھی اس لیے سجاد ظہیر نے وہاں سے صرف دو یا تین خط ہی لکھے ہوں گے۔ بہر حال ان خطوں کا سرغ ابھی نہیں مل سکا۔ راقم الحروف نے سجاد ظہیر کی بڑی بیٹی نجمہ علی باقر سے اور ان کی دوسری بیٹی نادرہ ببر سے بھی دریافت کیا لیکن کسی کے پاس ایسا کوئی خط موجود نہیں۔ فیض صاحب کی بیٹی سلیمہ ہاشمی نے بھی اپنے تمام کاغذات کی چھان بین کی لیکن انہیں ان کے والد کے نام سجاد ظہیر کا کوئی خط لاہور جیل سے لکھا ہوا نہیں ملا۔ فیض احمد فیض تو لاہور جیل میں کبھی رہے ہی نہیں تھے کیونکہ گرفتاری کے تین مہینے تک وہ لائل پور میں قید تنہائی کاٹ کر سیدھے حیدر آباد ہی لائے گئے تھے۔ اس لیے فیض صاحب کے خطوط میں بھی لاہور جیل کے بارے کوئی اطلاع نہیں مل سکتی۔

سازش کیس کے مقدمے کی سماعت حیدر آباد جیل میں 15 جون 1951 کو شروع ہوئی تھی۔ ظفر اللہ پوشنی اس سے تقریباً ایک مہینہ پہلے یعنی 15 مئی کے آس پاس کے دنوں کا ذکر کرتے ہیں جب انہیں عدالت کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اس سے یہ اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ 15 مئی سے پہلے سجاد ظہیر لاہور جیل چھوڑ کر حیدر آباد آچکے تھے۔ لہٰذا لاہور میں ان کا قیام کوئی دو ہفتے سے زیادہ نہیں تھا۔ ابتدا میں رسمی کارگزاری کے بعد ان کے پاس کوئی وقت نہ بچا ہوگا کہ وہ کسی رشتے دار یا احباب کو خط لکھتے۔ اس لیے لاہور جیل کے حالات کچھ حد تک حمید اختر کی کتاب 'کال کوٹھری' سے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ چاہے جیل کوئی بھی ہو مچھروں کا عذاب ہر جگہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس کا تذکرہ کئی لوگوں نے کیا ہے۔ حمید اختر کو بھی اس عذاب سے دو چار ہونا پڑا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''تھوڑی ہی دیر میں مکمل اندھیرا ہو گیا۔ کوٹھری میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی میری کوٹھری کے چاروں کونوں سے ایک عجیب سی جھنجھناہٹ کی آواز آنے لگی۔ آہستہ آہستہ یہ مدھم آواز ایک گونج میں تبدیل ہو گئی۔ یہ مچھروں کی آواز تھی جو لاکھوں کی تعداد میں ہر کوٹھری میں موجود تھے۔ کوٹھری میں

لوہے کے دروازے کے علاوہ کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا اور مئی کی اس تپتی
ہوئی سیاہ اور سنگین رات میں ہم سب کے سب مچھروں کے رحم و کرم پر تھے۔
کسی نے کوئی مداخلت نہیں کی کیونکہ یہ منزل ہی ایسی تھی جہاں مداخلت کسی کام
نہیں آتی۔"(۱۰)

لاہور جیل میں مچھروں کی صعوبت کا ذکر حمید اختر نے اپنی کتاب میں کیا ہے جس کا احوال پہلے آچکا ہے۔اب دیکھتے ہیں کہ پوشنی صاحب اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں:

"میں واپس ہوا اور چارپائی پر بیٹھ کر سگریٹ کے زوردار کش لگانے لگا۔ذرا ہی
دیر میں تین چار سگریٹ پی لیے۔مچھر اس دوران کاٹتے رہے۔پسینہ یوں بہہ
رہا تھا جیسے بدن کا ہر مسام پرنالہ بن گیا ہو۔میں نے سوچا کہ اس کوٹھری میں
رہنے کے لیے ہر روز کم از کم پانچ گرین کونین یا پیلوڈرین کھانی لازمی ہوگی۔
بہر حال ذرا دیر بعد دوبارہ پلنگ پر دراز ہو گیا اور رومال کو چہرے پر پھیلا کر
سونے کی کوشش کرنے لگا۔وہ جو کہتے ہیں نا کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے تو شاید
ٹھیک ہی کہتے ہیں۔حبس، پسینے اور مچھروں کی یلغار کے باوجود رفتہ رفتہ مجھ پر
غنودگی طاری ہونے لگی۔بارہ ایک بجے کے درمیان میں نیند کی پرکیف وادیوں
میں کھو چکا تھا۔"(۱۱)

28 مئی کو ان قیدیوں کو دوبارہ عدالت کے سامنے پیش ہونے کا حکم صادر ہوا تھا۔جس گاڑی میں انہیں لے کر جانا تھا وہ ڈیوڑھی کے پاس رکی اور ان سب لوگوں نے دیکھا کہ ایک شخص گاڑی کے اندر داخل ہوا جسے غور سے دیکھنے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ وہ سید سجاد ظہیر ہیں۔ان کے چہرے سے لگتا تھا کہ جیل میں ان کے ساتھ مناسب سلوک نہیں کیا گیا تھا۔کئی لوگوں نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا لہٰذا پہچان نہیں پائے تھے۔بریگیڈیر صدیق نے انہیں سگریٹ کا ڈبہ پیش کیا جس میں سے سجاد ظہیر نے ایک سگریٹ لیا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ان دنوں ان کو شاذونادر ہی سگریٹ پینے کو ملتا ہے۔انہوں نے جب پیشی کے دوران گرج کر جسٹس محمد شریف سے عرض کی تو معلوم ہوا کہ سجاد ظہیر تقریباً ایک ماہ سے اسی جیل میں رہ رہے تھے مگر کسی کو ان کے وارڈ یا کوٹھری کے بارے کوئی علم

نہیں تھا۔ جسٹس محمد شریف کے بنگلے سے رخصت ہو کر جب سب لوگ واپس پہنچے تو سجاد ظہیر کو ڈیوڑھی پر ہی سب سے الگ کر دیا گیا تھا اور وہ اپنے وارڈ کی جانب روانہ ہو گئے تھے۔ تاہم پھر بھی ان کے وارڈ کا علم کسی کو نہ ہوا تھا۔ جیل میں قیدی کی کیفیت کیا ہوتی ہے اس پر فیض صاحب نے ذاتی تجربے کی بنا پر تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہمارا جیل خانہ تو کسی اور دنیا کا گوشہ معلوم ہوتا ہے جہاں نہ حادثاتِ زمانہ کا گزر ہے اور نہ زندگی کے خطرات کی آزمائش۔ یہاں نہ زندگی کا وجود ہے نہ موت کا اور جیتے جاگتے انسان جو ہنستے ہیں، روتے ہیں، پیار کرتے ہیں اور لڑتے جھگڑتے ہیں، سب کسی گرانڈیل افسانوی کتاب کے کردار معلوم ہوتے ہیں جو ابھی تصنیف نہیں ہوئی۔'' (۱۲)

فیض صاحب کہتے ہیں کہ جیل خانے میں کوئی بھی بات پوری طرح صحیح نہیں ہوتی۔ جہاں اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم زندگی اور موت سے پرے کسی غیر مادی دنیا میں قیام پذیر ہیں وہاں زندگی سے اپنی یگانگت اور وحدتِ وجود کا احساس بھی بڑی شدت سے ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اور باتوں کے علاوہ اکثر غلیظ اور زرد دیواریں، دھول اور مٹی، زنجیریں، چہرے، وردیاں پہنے ہوئے حکام اور ان سب لعنتی چیزوں پر بھی نظریں پڑتی ہے جسے جیل خانہ کہتے ہیں، ان چیزوں کو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے اور اپنے اندر سے بیزاری کا ایسا سیلاب اٹھتا ہے جس میں انسان کی ذات اور ہر ذاتی چیز غرق ہو جاتی ہے۔ جیل صرف محرومیات کا مرکز ہے اور اس میں ہنسنے اور پیار کرنے کے اسباب نہ ہونے کے مصداق ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

﴿کتابیات﴾

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر/پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱)	The Rawalpindi Conspiracy,195	حسن ظہیر	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔کراچی	1998	XXIX
۲)	زندگی زنداں دلی کا نام ہے	ظفراللہ پوشنی	مین ہاٹن انٹرنیشنل۔کراچی	2001	18
۳)	فیض نامہ	ڈاکٹر ایوب مرزا	کلاسیک۔لاہور	2005	552
۴)	زندگی زنداں دلی کا نام ہے	ظفراللہ پوشنی	مین ہاٹن انٹرنیشنل۔کراچی	2001	45
۵)	کلامِ فیض	فیض احمد فیض	ایجوکیشنل بک ہاؤس۔علی گڑھ	1990	177
۶)	زندگی زنداں دلی کا نام ہے	ظفراللہ پوشنی	مین ہاٹن انٹرنیشنل۔کراچی	2001	79
۷)	زندگی زنداں دلی کا نام ہے	ظفراللہ پوشنی	مین ہاٹن انٹرنیشنل۔کراچی	2001	89
۸)	کال کوٹھری	حمید اختر	بک ہوم۔لاہور	2009	29
۹)	مغنیِ آتشِ نفس سجاد ظہیر	سبط حسن	مکتبہ دانیال۔کراچی	2005	50
۱۰)	کال کوٹھری	حمید اختر	بک ہوم۔لاہور	2009	46
۱۱)	زندگی زنداں دلی کا نام ہے	ظفراللہ پوشنی	مین ہاٹن انٹرنیشنل۔کراچی	2001	46
۱۲)	صلیبیں میرے دریچے میں	فیض احمد فیض	بک ہوم۔لاہور	1984	155

☆☆☆

۲۔ سینٹرل جیل حیدر آباد (سندھ)

راولپنڈی سازش کیس کے ملزموں کی سنوائی کا انتظام سینٹرل جیل حیدر آباد میں کیا گیا تھا جس کے لیے اسی جیل میں کیس کی سماعت کے لیے اسپیشل ٹریبونل کی خصوصی عدالت نے کام کرنا تھا۔ اس لیے تمام جیلوں سے قیدیوں کو بھی وہیں منتقل کرنا ضروری تھا۔ زیادہ تر قیدی لاہور سینٹرل جیل میں تھے جہاں سے انہیں بذریعہ ریل گاڑی حیدر آباد لانے کی کاروائی طے کی گئی تھی۔ اس وقت وہاں سات قیدی تھے جنہیں دو دو کے تین گروپوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ باقی صرف ظفر اللہ پوشنی بچ گئے تھے جن کا ایک ہی آدمی کا گروپ بنا دیا گیا تھا۔ ایک ایک کر کے یکے بعد دیگرے دو دو تین گروپوں کو پہلے لے جایا گیا اور آخر میں ظفر اللہ پوشنی کو۔ جب ان کی وین جیل کی ڈیوڑھی کے پاس پہنچی تو میجر جنرل اکبر خان بھی اس میں آ کر بیٹھ گئے۔ ان کی وین لاہور ریلوے اسٹیشن کے ایک ایسے پلیٹ فارم پر رکی جہاں عام طور پر مال گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ لیکن مال گاڑیوں کی بجائے وہاں ایک صاف ستھری، چمکیلی سی مسافر گاڑی کھڑی تھی۔ جنرل اکبر خان کو وہاں کے ایک فرسٹ کلاس ڈبے میں اسلحہ بند پولیس کی نگرانی میں لے جایا گیا۔ لیکن ظفر اللہ پوشنی کا انتظام سیکنڈ کلاس میں کیا گیا۔ ان کی ٹرین کوئی صبح پانچ بجے 4 جون 1951 کو حیدر آباد کے اسٹیشن پر پہنچی۔

ظفر اللہ پوشنی کو ایک بس میں بٹھا دیا گیا جو انہیں سینٹرل جیل لے جانے والی تھی۔ تھوڑی دیر میں خضر حیات بھی آ پہنچے۔ پھر فیض احمد فیض بھی وارد ہوئے۔ اس قافلے میں کل ملا کر 12 سازشی تھے جو ٹرین کے الگ الگ ڈبوں سے اتر کر بسوں میں بٹھا دیئے گئے تھے۔ ان میں صرف تین اشخاص

نہیں تھے کیونکہ بریگیڈیر لطیف خان پہلے ہی حیدر آباد جیل میں تھے۔ بیگم نسیم اکبر خان کو حیدر آباد بذریعہ ہوائی جہاز پہنچایا گیا تھا اور محمد حسین عطا تب تک مفرور تھے۔ باقی کے تمام لوگ جنرل نذیر سے لے کر سجاد ظہیر تک سب وہیں تھے اور سپریڈنٹ کے دفتر کے باہر گیلری میں اکٹھے ہو گئے تھے۔

حیدر آباد جیل میں یہ لوگ بہت خوش تھے۔ انہیں کئی طرح کی سہولیات مہیا تھیں جن میں ایک یہ بھی تھی کہ 'اے' کلاس کے قیدیوں کو 'بی' کلاس میں دن کے وقت جانے کی اجازت دی گئی تھی تا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے میل جول قائم رکھ سکیں۔ بیگم نسیم کو بھی دن کے وقت کچھ دیر تک 'بی' کلاس میں رہنے کی اجازت دی گئی تھی۔

جیل کی صعوبتیں برداشت کرتے کرتے بیگم نسیم کا برا حال ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں، چہرہ اتر گیا تھا، ہونٹ خشک اور بال پریشان تھے جیسے وہ مدت سے بیمار ہوں۔ وزن بھی کافی گھٹ گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جو لوگ 9 مارچ کو گرفتار ہوئے تھے جن میں نسیم بھی شامل تھیں ان سب کو بالکل تنہا رکھا گیا تھا اور اس قید تنہائی نے ہر ایک کی صحت کو اثر انداز کیا تھا۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ پچھلی پیشی میں خصوصی عدالت کے صدر سر عبدالرحمٰن نے قیدیوں کو بتایا تھا کہ جو لوگ اپنے لیے وکیلوں کا خرچہ برداشت کرنے کی توفیق نہیں رکھتے انہیں قانونی مشیر کی سہولت حکومت کی طرف سے فراہم کی جائے گی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے جن لوگوں نے حکومت کو درخواست پیش کی وہ یہ شخص تھے: کرنل ضیاالدین، میجر حسن خان، میجر اسحاق، کیپٹن خضر اور سید سجاد ظہیر۔ یہاں بھی یہ امر واضح ہوتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی نے سجاد ظہیر کے دفاع کے لیے کوئی کارگر قدم نہیں اٹھایا تھا ورنہ سجاد ظہیر حکومت کو اس قسم کی درخواست نہ دیتے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پارٹی کے چند رہنماؤں نے پارٹی کی سازش میں شمولیت پر جو اعتراض کیا تھا وہ درست تھا اور یہ بھی درست تھا کہ انہوں نے ان تمام نتائج کا ذمہ دار سجاد ظہیر کو ہی ٹھہرایا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ابتدا میں حکومت سے قانونی امداد طلب کی تھی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا کئی اور لوگوں نے بھی یہ مدد مانگ لی۔ ان میں فیض احمد فیض، بریگیڈیر صدیق اور ایر کموڈور جنجوعہ بھی شامل ہو گئے۔ بعد میں جب محمد حسین عطا پکڑے گئے تو انہوں نے بھی جیل میں آتے ہی درخواست پیش کر دی اور عدالت کے حکم سے انہیں بھی ایک سرکاری وکیل مل گیا۔ جن لوگوں نے مقدمے کے دوران آخر تک وکیلوں کا خرچہ

برداشت کیا وہ تھے میجر جنرل اکبر خان، ان کی بیوی نسیم، بریگیڈیر لطیف، جنرل نذیر اور کرنل ارباب۔ ظفر اللہ پوشنی کی طرف سے ان کی والدہ کے ماموں حاجی محمد حسین بار ایٹ لا وکیل صفائی کے طور پر پیش ہوتے رہے اور اس کام کا کوئی معاوضہ انہوں نے نہیں لیا۔

حیدر آباد جیل میں مقدمے کی کاروائی 15 جون 1951 کو صبح آٹھ بجے شروع ہوئی۔ پہلے دن وکلا کی امید سے زیادہ بھیڑ بھاڑ تھی۔ بریگیڈیر لطیف کی قانونی پیروی کے لیے حسن شہید سہروردی پیش ہوئے اور فیض کی جانب سے ایچ زیڈ لاری۔ اس روز وکیلوں کی تعداد جو ڈیفنس اور استغاثہ دونوں کی جانب سے پیروی کرر ہے تھے کافی زیادہ تھی لیکن جوں جوں ان کے موکلوں کی مالی حالت خراب ہوتی گئی وہ انہیں چھوڑ کر علیحدہ ہوگئے۔ بعد میں فیض احمد فیض نے بھی اپنا مقدمہ سہروردی کے سپرد کردیا۔ فیض کے بیوی بچے جب بھی ان سے ملاقات کے لیے آتے تھے سہروردی کے یہاں ہی ٹھہرتے تھے۔ فیض نے سب سے پہلا خط جو حیدر آباد جیل سے لکھا وہ 7 جون کو اپنی بیوی ایلس کے نام تھا جس میں انہوں نے بتایا کہ لائلپور میں قید تنہائی اور تین چار دن جو انہوں نے لاہور جیل میں گزارے وہ سب سے زیادہ اذیت ناک تھے کیونکہ وہاں انہیں انسانوں کی صحبت سے محروم رکھا گیا تھا اور خط وکتابت پر بھی سخت پابندی عائد تھی۔ اس لحاظ سے حیدر آباد جیل میں ان کی بڑے مزے سے گزر رہی تھی۔ ظفر اللہ پوشنی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''حیدر آباد جیل میں زندگی بڑی گہما گہمی میں گزرتی تھی۔ مقدمے کی تیاری، عدالت کی روزمرہ کی کاروائی، گپ شپ، گانا بجانا اور کھیل کود غرض کہ ان مشاغل میں ہم اتنے مصروف رہتے کہ وقت نہایت آسانی سے کٹ جاتا تھا۔ جیل کے حکام کو حکوت کی جانب سے غالباً اس مفہوم کی ہدایت بھی ملی تھیں کہ 'ملزموں' سے اچھا سلوک کیا جائے تاکہ مقدمے کی سماعت جب تک جاری رہے کوئی ہنگامہ برپا نہ ہو۔ حکام کی یہ پالیسی نفسیاتی اعتبار سے دانش مندانہ تھی۔ اسے یوں سمجھیئے کہ لاہور جیل کے دوران قیام میں جب ہمیں خوراک اور رہائش کی سخت تکلیف اور تنگی لاحق تھی، ہمارے دل ان دنوں تمام وقت انتقام کی آگ میں سلگتے رہتے تھے۔ دنگا فساد، عدم تعاون اور بھوک ہڑتال جیسی نازیبا حرکتوں کا خیال

بیشتر اوقات ذہن میں گردش کرتا رہتا تھا۔لیکن حیدرآباد جیل میں آنے کے بعد
جب آرام کی زندگی میسر آئی تو تمام باغیانہ خیالات ذہن سے کافور ہو گئے اور
دل میں چھپے ہوئے عناداور غصے کی شدت بھی کم ہو گئی۔'' (۱)

حیدر آباد جیل میں اسیروں کو بہترین رہائش اور خوراک مہیا کی گئی تھی اور جیل کے گراں بار اور تکلیف دہ دباؤ کا کوئی احساس اب ان کے دل میں باقی نہیں تھا۔اس لیے اور چاہے جو کچھ بھی ہو یا نہ ہو لیکن انہیں قید تنہائی کا سامنا اب نہیں تھا نہ ہی پولیس کی بے جا پوچھ گچھ کا ڈر تھا۔قیدیوں کو یقین ہو چلا تھا کہ وہاں ان کی جان اور ناموس دونوں سلامت ہیں اور وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ زندگی چاہے اور جو کچھ بھی دکھائے پھر بھی بہت حسین اور دلکش ہے۔

جیل میں راولپنڈی سازش کیس کے ملزموں کو رات کے وقت کوٹھریوں میں جیل کے حکام بند کر دیتے تھے لیکن حیدر آباد جیل میں آنے کے تین مہینے بعد ایسا حکم منسوخ کر دیا گیا۔اب عدالت نے ہی یہ حکم عائد کیا کہ ان قیدیوں کو صحن میں سونے دیا جائے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی نگرانی کے لیے پہریداروں کی تین صفیں لگا دی گئی تھیں جو ہر وقت ان پر نظر رکھتے تھے۔پہلی گارڈ وارڈ کے اندر ہی رہتی تھی جو ایک حولدار، ایک نائیک اور بارہ سپاہیوں پر مشتمل تھی۔وارڈ کے باہر پنجاب پولیس کے مسلح سپاہی موجود رہتے تھے۔ان دو صفوں کے علاوہ جیل کی بیرونی چار دیواری کے باہر سی آئی ڈی کے لوگ ڈیوٹی پر رہتے تھے۔اس زبردست احتیاط کے باوجود ان اسیروں کے آنے کے بعد جیل کی بیرونی دیوار تقریباً چھ فٹ مزید بلند کر دی گئی تھی۔

جس 'اے' کلاس وارڈ میں سید سجاد ظہیر، ایر کموڈور محمد خان جنجوعہ، جنرل نذیر احمد اور بریگیڈیر لطیف رکھے گئے تھے اب ان کی تفصیل سرسری طور پر بیان کی جاتی ہے۔'اے' کلاس وارڈ کے کمرے 'بی' کلاس کی کوٹھریوں سے سائز میں تقریباً دگنے اور قدرے زیادہ آرام دہ تھے۔گرمیوں میں 'بی' کلاس کی کوٹھریاں بھٹیوں کی طرح گرم ہو جاتی تھیں جبکہ 'اے' کلاس کے کمروں کی ایسی حالت نہیں تھی۔اس لیے انہوں نے بی کلاس وارڈ کا نام 'سرائے' اور اے کلاس کا 'خانقاہ' رکھ دیا تھا۔'خانقاہ' سے سجاد ظہیر وغیرہ اور خصوصی وارڈ سے بیگم نسیم 'سرائے' میں چلے جاتے تھے جہاں وہ سب لوگ والی بال اور بیڈ منٹن کھیلتے تھے۔ شام کے چھ ساڑھے چھ بجے جب کھیل ختم ہوتا تھا تو 'خانقاہ' کے مقیم واپس لوٹ جاتے تھے مگر ایر کموڈور

جنجوعہ اور سید سجاد ظہیر وہیں رک جاتے تھے اور غسل کے بعد کپڑے بھی وہیں تبدیل کرتے تھے۔ ساڑھے سات بجے کھانا چن دیا جاتا تھا۔ کھانے کے دوران پاکستان ریڈیو سے خبریں نشر ہوتی تھیں۔ بہر حال کھانے سے فارغ ہو کر یار لوگ شطرنج و تاش وغیرہ کھیلتے تھے۔ کچھ لوگ محض چہل قدمی کرتے رہتے تھے یا ریڈیو کی موسیقی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ پوشنی کہتے ہیں کہ اچھی موسیقی کے لیے ہندوستانی ریڈیو اسٹیشن ڈھونڈنے پڑتے تھے کیونکہ پاکستانی ریڈیو سے اچھی کلاسیکی موسیقی شاذ و نادر ہی سننے کو ملتی تھی۔ کہتے ہیں وہ اور سجاد ظہیر دو ہی افراد ایسے تھے کہ جنہیں رات کے کھانے کے بعد کھیلوں میں مطلق دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دونوں سگریٹ سلگا کر ریڈیو کے قریب کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے اور 'استادی' گانوں کے زیر و بم پر دیر تک سر دھنتے تھے۔ شروع میں صرف سجاد ظہیر اور ظفر اللہ پوشنی ہی ہندوستانی موسیقی کے دلدادہ تھے جس کی وجہ سے ان پر پھبتیاں بھی کسی جاتی تھیں لیکن رفتہ رفتہ کئی دوسرے لوگوں پر بھی ان کا اثر جمنے لگا اور اکبر خان، ارباب، عطا، اسحاق اور جنجوعہ بھی ہندوستانی موسیقی کار بڑے غلام علی خان، گنگو بائی وغیرہ کو سننے کے لیے بے تاب رہنے لگے تھے۔ البتہ میجر حسن خان آخری دنوں تک کلاسیکی موسیقی کے جانی دشمن بنے رہے تھے۔ پوشنی ان حالات سے وابستہ ایک واقعہ کا بھی ذکر کرتے ہیں:

> ''ادھر کرنل ارباب کو پکے راگوں کا شوق پیدا ہو گیا تھا لیکن راگ کی شد بد بالکل نہ تھی۔ ایک روز رات کے تقریباً پونے نو بجے آپ ریڈیو کا ڈائل گھما کر اچھا سا اسٹیشن تلاش کر رہے تھے کہ دفعتاً رک گئے۔ غالباً دہلی سے اناؤنسر اپنا اعلان ختم کر رہا تھا۔ فیض، اسحاق اور میں ریڈیو سے ذرا دور بیٹھے تھے۔ اس لیے وہ اعلان سن نہ سکے۔
>
> فیض نے ارباب سے پوچھا ''کیا اعلان تھا؟''
>
> ارباب نے کہا ''ابھی مس شنکرا گانا سنائے گی۔''
>
> ہم لوگ متوجہ ہو گئے۔ جب گانے والی نے الاپ شروع کیا تو پتہ چلا کہ پدما دیوی خیال شنکرا پیش کر رہی ہیں۔ اس دن کے بعد ہم نے ارباب کا نام مس شنکرا رکھ دیا۔''(۲)

جس دن عدالت کی کاروائی بند ہوتی جو اکثر اتوار کا روز ہوتا تھا اس روز 'بی' کلاس کے لوگ

سرائے سے خانقاہ چلے جاتے تھے جہاں سجاد ظہیر کے کمرے میں محفل جمتی تھی۔ خانقاہ میں جنرل نذیر اکثر سر اور پیروں کے تلوؤں میں مہندی لگائے نظر آتے تھے۔ ایر کموڈور جنجوعہ ڈریسنگ گاؤن پہن کر گھوم رہے ہوتے تھے اور بریگیڈیر لطیف بیشتر وقت عبادت یا ریاضت میں مصروف رہتے تھے لیکن سجاد ظہیر اپنے ہی کمرے میں گھسے رہتے تھے۔ ان کے پاس کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ اتنا ہی بڑا ذخیرہ فیض احمد فیض کے پاس بھی تھا جو ان دونوں کو مصرورف رکھنے کے لیے کافی تھا۔

چھٹی کے روز جب سب لوگ خانقاہ میں سجاد ظہیر کے کمرے میں اکٹھے ہوتے تو ان کا خیر مقدم شربت یا چائے کافی سے ہوتا تھا۔ سجاد ظہیر اور کموڈور جنجوعہ کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان ہمیشہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ لیکن جنرل نذیر اس معاملے میں خاصے بے نیاز تھے۔ وہ مہمان نوازی سے گریز کرتے تھے جس کی وجہ سے دیگر ساتھی کافی دلگیر تھے۔ سجاد ظہیر کی مہمان نوازی سے فارغ ہو کر سب لوگ شاعری، موسیقی اور قوالی میں مشغول ہو جاتے تھے۔ قوالی اور شعر خوانی کی محفل کا لیڈر اکثر پوشنی کو ہی منتخب کیا جاتا تھا۔ ان محفلوں میں فیض احمد فیض کا وہ ترانہ جو انہوں نے اپنے ساتھیوں کی فرمائش پر حیدر آباد جیل میں ہی لکھا تھا، بے حد مقبول ہوا تھا۔ اس ترانے کے کچھ بند ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

دربار وطن میں جب ایک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اے خاک نشینوں اٹھ بیٹھوں وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھیں ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل پہ ہی ڈالے جائیں گے
اب ظلم کے ماتو لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اٹھے گا کچھ دور تو نالے جائیں گے

(کلامِ فیض۔117)

حیدر آباد میں فیض کی موجودگی کی وجہ سے وہاں کا ماحول شاعرانہ قسم کا بن گیا تھا۔فیض اپنے زمانے میں ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں چوٹی کے شاعر تھے۔انہوں نے اپنی بہترین شاعری قید میں ہی تخلیق کی تھی۔دراصل ان کے جو شعری انتخابات 'زنداں نامہ' اور 'دست صبا' نام سے شائع ہوئے ہیں ان کی زیادہ تر شاعری حیدر آباد جیل میں لکھی گئی تھی۔فیض جب کوئی نظم یا غزل لکھتے تھے تو چپکے سے ساتھیوں سے کہہ دیتے تھے کہ اگر کچھ سننا ہے تو ان کے کمرے میں آجائیں اور تمام ساتھی ان کے کمرے کی طرف دوڑ پڑتے تھے۔فیض صاحب بہت نرم آواز میں آہستہ آہستہ اپنا کلام سناتے تھے اور سامعین ہر شعر پر جی کھول کر داد دیتے تھے۔ایک دن فیض صاحب نے تجویز پیش کی کہ بجائے اس کے کہ وہ تنہا ہی اپنا کلام سنائیں بہتر ہوگا کہ ایک محفل مشاعرہ منعقد کی جائے جس میں علاوہ فیض کے دیگر افراد بھی کسی خاص طرح مصرع پر طبع آزمائی کریں۔چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ اگلا مشاعرہ طرح مصرع پہ ہوگا اور اس مشاعرے کے سیکریٹری ظفر اللہ پوشنی ہوں گے۔یہ طے ہو پانے کے بعد سینٹرل جیل حیدر آباد میں سازشیوں کے دوران قیام کوئی دس گیارہ مشاعرے منعقد ہوئے تھے۔ہر مشاعرے کی تفصیل تو کسی کو یاد نہیں لیکن ظفر اللہ پوشنی نے ایسے دو مشاعروں کی روداد قلمبند کی ہے۔ایک مشاعرہ 9 اگست 1952 کو ہوا تھا اور دوسرا مشاعرہ مقدمے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد 3 مئی 1953 کو ہوا تھا۔پہلے مشاعرے میں صرف چھ شاعروں نے اپنا کلام سنایا تھا۔اس مشاعرے میں طرح کے طور پر ذیل کے دو مصرعے انتخاب کیے گئے تھے:

۱۔بہت وسعت ہے میری داستاں میں

۲۔آج کیوں مشہور ہے ہر ایک دیوانے کا نام

جیل میں مقید تمام 14 اسیروں کو مشاعرے میں شرکت کی ہدایت دی گئی تھی۔چونکہ فیض کے علاوہ دیگر تمام لوگ نوسکھے شاعر تھے لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ تین آدمیوں کی ایک سب کمیٹی بنائی جائے جو ہر شخص کو اس کی خصوصیات کے مدِ نظر ایک عدد تخلص عطا کرے۔سب کمیٹی نے کافی تگ و دو کے بعد ہر شخص کے لیے ایک تخلص چنا جو کثرت رائے سے منظور کر لیا گیا۔یہ تخلصات کافی دلچسپ نوعیت کے ہیں اس لیے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

نمبر	نام	تخلص
۱۔	میجر جنرل اکبر خان	فتوری
۲۔	میجرل جنرل نذیر احمد	سارس
۳۔	ایر کموڈور محمد خان جنجوعہ	پٹاخہ
۴۔	بریگیڈیر صدیق خان	مصدق
۵۔	بریگیڈیر لطیف خان	خبطی
۶۔	لیفٹیننٹ کرنل نیاز احمد ارباب	خر
۷۔	لیفٹیننٹ کرنل ضیاالدین	گڑبڑ
۸۔	میجر اسحاق محمد	ڈِنگا (ٹیڑھا)
۹۔	میجر حسن خان	جاہل
۱۰۔	کیپٹن ظفراللہ پوشنی	خبیث
۱۱۔	کیپٹن خضر حیات خان	پیٹو
۱۲۔	فیض احمد فیض	کاہل
۱۳۔	سید سجاد ظہیر	لاغر
۱۴۔	محمد حسین	گوسفند

یہ تمام تخلصات اس بات کا ثبوت ہیں کہ جیل میں تمام قیدی کس بے فکری سے زندگی گزار رہے تھے گویا کہ

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

پہلا مشاعرہ جو 19 اگست 1952 کو ہوا تھا اس کی صدارت جنرل نذیر احمد نے کی تھی اور وہ 'سرائے' میں منعقد ہوا تھا۔ بلکہ جب تک جنرل نذیر احمد سب کے ساتھ رہے ہر مشاعرے کی صدارت وہی کرتے تھے۔ پوشنی مستقل طور پر مشاعرے کے سیکریٹری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ جب سازش کیس کے مقدمے کا فیصلہ 5 جنوری 1953 کو ہوا تو جنرل نذیر احمد کو عدالت نے برخاست ہونے تک قید کی سزا دے دی اور وہ جیل سے رہا ہو گئے۔ ان کی روانگی کے بعد صرف دو ہی اور مشاعرے ہوئے تھے اور ان کی صدارت فیض صاحب نے کی تھی۔ حیدر آباد جیل کا پہلا مشاعرہ

بہت دلچسپ تھا۔اس مشاعرے کی روداد ظفر اللہ پوشنی نے رقم کی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے:

''سب لوگ جب اپنی جگہ بیٹھ گئے تو جنرل نذیر احمد نے جیب سے عینک نکال کر آنکھوں پر سجائی۔اچٹتی ہوئی ایک نگاہ حاضرین محفل پر ڈالی اور کھانس کر گلا صاف کیا۔میں نے بطور سیکریٹری شعرا کے ناموں کی فہرست ان کے سامنے پیش کر دی اور فہرست پر نشان لگا دیئے کہ آج کون کون سے افراد غزل لکھ کر لائے ہیں اور کون سے یوں ہی خالی ہاتھ چلے آئے ہیں۔لیکن جنرل صاحب نے ان تمام حضرات کے نام پکارے جن کے ناموں کے آگے نشان نہ تھے یعنی وہ لوگ جو کچھ لکھ کر نہیں لائے تھے۔ان لوگوں نے باری باری صدر سے معذرت طلب کی اور جنرل نذیر نے ایک ایک کو اس کی لاپرواہی پر ڈانٹا اور ان کے غیر ذمہ دارانہ رویے کی سخت مذمت کی۔بعد میں جب معلوم ہوا کہ صاحب صدر خود بھی کچھ لکھ کر نہیں لائے تو محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔خیر یہ طوفان بدتمیزی جب تھم گیا تو جنرل نذیر احمد نے میجر حسن خان سے درخواست کی وہ اپنا کلام سنائیں۔''(۳)

میجر حسن خان نے جو غزل پڑھی اس کا ایک شعر یہ تھا

چھوڑ دینا ہم سے سیکھو عین مستی میں شراب
بھول کر بھی اب نہیں لیتے ہیں میخانے کا نام

اس شعر کی سجاد ظہیر نے خوب داد دی اور کہا'' واقعی آپ ہی کی ہمت ہے۔''اس کے بعد کرنل ضیاالدین کی باری آئی اور صاحب صدر نے انہیں کلام سنانے کے لیے پکارا۔کہتے ہیں کہ کرنل ضیا کو شاعری سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی پھر بھی وہ اپنی غزل لکھ کر لائے تھے۔انکی غزل کا ایک شعر یہ تھا

پلا دی شیخ کو بھی آج ہم نے
عجب تاثیر ہے میری زباں میں

مقطع میں کرنل ضیا نے بجائے تخلص کے کرنل کا لفظ استعمال کیا تھا جس کی ترکیب بندی کی خوب داد دی گئی تھی اور سجاد ظہیر نے کہا تھا'' کیا خوب کرنل باندھا ہے۔پوری اردو شاعری میں رینک

کے استعمال کی ایسی مثال نہیں مل سکتی۔ واہ واہ۔ نہ پوچھو حال تم کرنل ضیا کا، جزاک اللہ۔''

اس کے بعد کرنل ارباب نے اپنا کلام پیش کیا۔ چونکہ کے استغاثہ کے وکیل اے کے بروہی کی ایک آنکھ میں کچھ نقص تھا اس لیے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارباب نے اپنی غزل کا مطلع کچھ اس طرح باندھا تھا:

کون لیتا ہے جہاں میں آج فرزانے کا نام
اب تو بس مشہور ہے بھینگے کا اور کانے کا نام

خضر نے اس شعر کی ایک فلک شگاف نعرے سے داد دی اور کہا ''بھینگے اور کانے کا نام۔ سبحان اللہ۔ کیا مصرعہ کہا ہے۔''

اب محمد حسن عطا کو کلام سنانے کے لیے مدعو کیا گیا۔ عطا نے حاضرین سے کہا کہ انہوں نے طرح مصرع پر غزل کہنے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ اس لیے وہ ایک غیر طرحی نظم لکھ کر لائے ہیں۔ نظم تمام کی تمام بہت اچھی تھی بلکہ اس کا آخری شعر تو دل کو چھو لینے والا تھا۔

خلش ہے انتظارِ آفتاب نو کی ساعت کی
کہ شوقِ آشیاں بندی دلوں میں جاودانی ہے

اس نظم پر عطا کو بہت داد ملی بلکہ جنرل نذیر نے تو یہاں تک کہا انہیں معلوم نہ تھا کہ عطا اتنے اچھے شعر کہہ سکتے ہیں۔

اب ظفر اللہ پوشنی کی باری تھی جنہیں خبیث تخلص سے نوازا گیا تھا۔ انہوں نے ایک شوخ سی غزل کہنے کی اجازت مانگی جس پر فیض صاحب نے یہ فقرہ کسا۔ ''ہاں صاحب داغ کے بعد ایسی غزلیں کہنا آپ ہی کا حصہ ہے۔'' پوشنی نے اپنی غزل ترنم سے سنائی اور آواز بھی کافی بلند تھی۔ ساری غزل بجی ہوئی تھی جس پر سجاد ظہیر نے خوب داد دی۔ اس کا ایک شعر خاص طور پر سب کو پسند آیا اور سب نے بار بار سننے کی فرمائش کی۔ شعر کچھ یوں سا تھا:

سامنے غیروں کے تم ہم سے کرو بے شک حجاب
پر اکیلے میں نہ لیجو دوست شرمانے کا نام

پوشنی صاحب نے مطلع سنا کر اپنی غزل کا اختتام کیا۔ ان کے بعد فیض صاحب کو دعوت دی

گئی۔فیض صاحب مشاعرے کے آخری شاعر تھے۔انہوں نے جب اپنی معرکتہ الآرہ غزل اپنی نرم آواز میں پڑھی تو سب نے ان کے ایک ایک شعر پر دل کھول کر داد دی۔غزل کا مطلع تو آج تک سامعین کی زبان پر رنگِ تغزل کے طور پر بنا ہوا ہے۔اس غزل کے چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

۲۔ دوستو اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستان کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام

۳۔ ہم سے کہتے ہیں چمن والے غریبانِ چمن
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

۴۔ فیضؔ ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا

حیدرآباد جیل میں یہ تمام لوگ تقریباً دو سال اکٹھے رہے تھے۔وہاں کی زندگی کا ذکر میجر محمد اسحاق نے بھی اپنے دیباچے 'روداد قفس' میں کیا ہے۔انہوں نے لکھا ہے:

''حیدرآباد میں دوران مقدمہ کے دن عجیب دن تھے۔تین مہینے میں ٹوڈی قسم کے لوگ اخباروں، اشتہاروں، جلوسوں میں ہمیں گولی کا نشانہ بنانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔بعض اخباروں نے غدار نمبر نکال دیئے تھے۔کچھ اس قسم کا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ ملک میں ہر مرد آزاد یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کو بھی سازش میں دھر لیا جائے گا۔چاروں طرف ایک دہشت اور سراسمگی کی فضا تھی اور ہمارے رشتہ دار اور دوست ہماری جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔لیکن جیل کے اندر ہماری اپنی یہ حالت تھی کہ گویا پکنک پر آئے ہوئے ہیں۔سب طرف ہنسی مذاق تھا، قہقہے تھے، امید تھی، حوصلہ تھا۔قوالیاں ہوتی تھیں، سوانگ بھرے جاتے تھے۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ بہت بڑے خطرے کے سامنے آدمی دو

ہی راستے اختیار کرتا ہے۔ یا تو الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوتا ہے یا مقابلے کی
ٹھان لیتا ہے۔ موخر الذکر کے آگے بھی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہم میں
بعض ایسے بھی ہوں گے جو مصائب کی ہولنا کیوں کے روبرو لرزلرز کر ہنس رہے
تھے اور کچھ ایسے بھی تھے کہ

عشرت قتل گہِ اہل تمنا مت پوچھ عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا۔"(۴)

جیل کے پہلے مشاعرے کا ذکر پوشنی صاحب نے بڑی تفصیل سے کیا ہے لیکن تعجب کی بات ہے کہ انہوں نے سجاد ظہیر کے کلام کا بالکل کوئی ذکر نہیں کیا۔ سجاد ظہیر ایک شاعر تھے اور ان کے کلام کا مجموعہ 'پگھلا نیلم' کے نام سے شائع بھی ہوا تھا۔ یہ ممکن نہیں کہ انہوں نے اس مشاعرے میں اپنا کلام پیش نہ کیا ہو۔ بلکہ جو لوگ کچھ بھی لکھ کر نہیں لائے تھے اور جن کے نام صدرِ محفل نذیر احمد نے باری باری لیے تھے ان میں سجاد ظہیر کا نام نہیں تھا۔ یقیناً انہوں نے اس مشاعرے میں پنا کلام پڑھا ہوگا مگر نہ پوشنی صاحب اور نہ ہی میجر اسحاق نے وہ کلام اپنی اپنی تصنیف میں کہیں درج کیا ہے۔
بہر حال دوسرا مشاعرہ جس کی روداد پوشنی نے لکھی ہے وہ 3 مئی 1953 کو ہوا تھا۔ حالانکہ ان دو مشاعروں کے بیچ کوئی نو یا دس مشاعرے بھی ہوئے تھے لیکن ان کے بارے میں کسی کو کچھ یاد نہیں۔
یہ مشاعرہ ان اسیران جیل حیدر آباد کا آخری مشاعرہ تھا۔ یہ آخری مشاعرہ 'خانقاہ' کے باغیچے میں منعقد ہوا تھا۔ یہ باغیچہ اس وارڈ کی پچھلی جانب واقعہ تھا اور مشاعرے کے لیے موزوں بھی تھا۔ محفل مشاعرہ کی صدارت فیض احمد فیض نے کی تھی۔ اس مشاعرے میں کوئی آٹھ حضرات نے اپنا اپنا کلام سنایا لیکن پوشنی صاحب صرف چھ لوگوں کا ہی ریکارڈ سنبھال کر رکھ سکے۔ اس لیے یہاں صرف چھ اشخاص کا ہی ذکر کیا جائے گا۔ خضر حیات اور محمد خان جنجوعہ کا کلام وہ محفوظ نہیں رکھ سکے۔ اس مشاعرے میں ذیل کے طرح مصرے چنے گئے تھے۔

۱۔ وحشت دل سر بازار لیے پھرتی ہے

۲۔ شمشیر ہے وہی کہ جو عریاں ہے ان دنوں

سب سے پہلے میجر حسن خان نے شمع محفل کو اپنے سامنے رکھا اور مسلسل غزل یا نظم کے اشعار پڑھے۔ اس نظم کے صرف تین ہی شعر درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ پھر دل جلوں پر تنگ ہوا عرصۂ حیات
کچھ خستہ خستہ سا رخ تاباں ہے ان دنوں
۲۔ غنچہ دہن کشادہ کرے گر تو گل جھکیں
لب بستہ وہی ہے جو سخنداں ہے ان دنوں
۳۔ اپنے کیے پہ آج بھی نادم نہیں حسن
جو کرسکا نہ اس پہ پشیماں ہے ان دنوں

اس غزل پر کوئی زیادہ فقرہ بازی یا چھیڑ چھاڑ تو نہیں ہوئی لیکن عطا نے کہا کہ اس سے کمیونزم کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس کے بعد اسحاق نے اپنا کلام پڑھا جس کا ایک شعر بہت پسند کیا گیا:

جانے ہم کس لیے بیگانہ بنے بیٹھے ہیں
بوئے گل خاکِ رہِ یار لیے پھرتی ہے

پھر پوشنی کو مدعو کیا گیا اس نے دو غزلیں سنائیں جن کا طرح مصرع ایک ہی تھا۔ سجاد ظہیر کو یہ غزلیں بہت پسند آئیں۔ پوشنی کے بعد سجاد ظہیر کی باری آئی۔ ان سے فرمائش کی گئی کہ وہ اپنے کلام سے محفل کی رونق کو دوبالا کریں۔ انہوں نے بڑے ڈرامائی انداز میں جیب سے کاغذ نکالا، عینک ناک پر درست کی اور بڑے اہتمام سے ذیل کی غزلیں پڑھیں:

۱۔ شعلے لپک رہے ہیں چراغاں ہے ان دنوں
دل کی جراحتوں سے بہاراں ہے ان دنوں
۲۔ صدق و صفا و علم تبہ حال و سرنگوں
کذب و ریا و ظلم نمایاں ہے ان دنوں
۳۔ تخلیق و فن زبون ہے تو محنت ہے خوار خوار
تنقیص و جہل صاحبِ ساماں ہے ان دنوں
۴۔ ملبوسِ زر نگار میں قحبائے زشت رو
لیلائے حسن خاک بداماں ہے ان دنوں
۵۔ منبر پہ کل تلک تو سناتا تھا شیخ وعظ
رندوں کے ساتھ داخلِ زنداں ہے ان دنوں

۶۔ انسان وہ ہے ستم سے پیکار جو لڑے
شمشیر ہے وہی کہ جو عریاں ہے ان دونوں

ظاہر ہے کہ سجاد ظہیر نے کافی مشکل الفاظ استعمال کیے تھے جنہیں سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ لہٰذا خضر حیات نے کہا ''مولانا ذرا کم ثقیل الفاظ استعمال کیجئے گا۔'' لب لباب یہ تھا کہ کوئی بھی اشعار بخوبی سمجھ نہ پایا اس لیے کسی نے کھل کر داد نہ دی۔ آخر صدرِ محفل فیض احمد فیض نے اسٹیج سنبھالی اور خوبصورت غزل شروع کی جس کے چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ جفا کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھی تیری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرم سخن سے پہلے
۲۔ نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے فرد پہ دیوانہ پن سے پہلے
۳۔ غرورِ سرو سمن سے کہدو کہ پھر وہ ہی تاجدار ہونگے
جو خار و خس والیِٔ چمن تھے عروجِ سرو سمن سے پہلے

فیض کے ایک ایک شعر کو سامعین نے کئی کئی بار کہلوایا اور بے حد داد دی۔ یہ آخری مشاعرہ بہت مقبول ہوا اور ایک یادگار بن کر رہ گیا۔

حیدر آباد جیل کا حال، وہاں کا ماحول اور لوگوں کا طرز زندگی ان کے متعلق متعدد لوگوں نے بڑی سنجیدگی سے تفصیلات رقم کی ہیں۔ فیض احمد فیض نے بھی وہاں کے حالات اور اپنے تاثرات ان خطوں میں سموئے ہیں جو انہوں نے حیدر آباد جیل سے اپنی بیوی، دوستوں اور رشتے داروں کو لکھے ہیں۔ جو خطوط انہوں نے اپنی رفیقہ حیات ایلس کو لکھے ہیں ان میں سے 92 خطوط 'صلیبیں میرے دریچے کی' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ خط انگریزی میں لکھے گے تھے جن کا ترجمہ مرزا ظفر الحسن نے اردو میں کیا اور جسے مکتبہ دانیال نے چھاپا۔ یہ خطوط 7 جون 1951 سے 25 جون 1953 تک کے عرصے میں لکھے گئے تھے۔ اپنے 15 اکتوبر 1951 کے خط میں وہ بھی ایلس کو لکھتے ہیں کہ رات کو ان کو ہاں بھی ایک مشاعرہ ہے۔ اس مشاعرے کا پوشنی نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ بنے بھائی کی طرح فیض کے خطوں میں بھی موسم، قدرتی مناظر اور جیل کے درو دیوار کا ذکر انہوں نے بھی خوب کیا

ہے۔قید تنہائی کی اذیت کو سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض نے یکساں محسوس کیا ہے۔30 اکتوبر 1951 کو ان کی شادی کی دسویں سالگرہ تھی، اس روز اپنی بیوی کو لکھتے ہیں:

''آج تمہارا خط ملا، بڑی راحت ہوئی۔آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔دعا ہے کہ تمہیں (بلکہ ہمیں) یہ دن کئی بار دیکھنا نصیب ہو۔ان دس برسوں میں ہم نے بہت سکھ دیکھا ہے اور تھوڑا سا دکھ بھی۔لیکن ہم نے یہ تمام دن دیانت داری اور سکونِ خاطر سے گزارے ہیں اور زندگی میں سب سے اہم بات یہی ہے۔تو آؤ ان بیتے ہوئے دنوں کا شکرانہ ادا کریں۔یہ دس برس ایسی دولت ہے جسے کبھی فنا نہیں اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا۔اگر کسی کا عقبیٰ یا آسمانی احکامات پر ایمان نہ ہو تو نیکی اور اخلاق کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ جو لمحہ حق وصداقت کی پرورش میں گزرے وہ بجائے خود خوشی کا ایک ایسا خزینہ بن جاتا ہے جسے کوئی راہزن لوٹ نہیں سکتا۔نہ کوئی جابر ضبط کرسکتا ہے۔شاید مذہبی اصطلاح میں توشۂ آخرت کے صحیح معنی یہی ہیں۔

تم نے اپنے گھر کی تنہائی کا ذکر کیا ہے۔میں جانتا ہوں کہ یہ تنہائی کتنی کڑی اور جدائی کے یہ لمحے کتنے گراں ہیں۔ان کو دل سے دھویا تو نہیں جا سکتا لیکن ان کا بوجھ اس تصور سے کم ضرور کیا جاسکتا ہے کہ بیتے ہوئے دن ایسے اچھے تھے اور آنے والے دن کتنے بہتر ہوں گے۔میں تو یہی کرتا ہوں۔جب سے جیل خانے کا دروازہ بند ہوا ہے میں کبھی ماضی کے پیرہن کو تار تار کرکے اس کی مختلف صورتوں میں دوبارہ بنتا رہتا ہوں اور کبھی آنے والے دنوں کو دامِ تصور میں مقید کرکے ان سے اپنی مرضی اور پسند کے مختلف مرقعے ترتیب دیتا رہتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔اس نسخے کے طفیل مجھے جیل کی سلاخیں بہت ہی حقیر اور بے حقیقت دکھائی دینے لگی ہیں۔''(۵)

اپنے 2 جنوری 1952 کے یعنی نئے سال کے آغاز کے خط میں ایلس کو جیل کا حال سناتے ہوئے وہی کچھ لکھتے ہیں جو پوشنی اور اسحاق بھی لکھ چکے ہیں۔لکھتے ہیں:

''اب تمہیں یہاں کا حال سنائیں۔ عدالت بند ہونے کے سبب پورا دن اور سارا وقت اپنا تھا۔ جب جی چاہے بستر پہ پڑے رہو جو رئیسوں کی شان ہے۔ (اگرچہ میں نے اس سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا) دن کا آغاز ناشتے کے بعد بیڈمینٹن کی ایک تیز بازی سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے غسل (سختی ہو ٹھنڈے پانی سے)۔ اس کے بعد ہم سب اپنے ہمسایوں کے ہاں کافی اور گپ شپ کے لیے جاتے ہیں۔ ان کی بیرک 'خانقاہ' کہلاتی ہے اس لیے کہ وہاں بریگیڈیر لطیف خان مقیم ہیں جنہیں ہمارے گروہ میں صوفی بزرگ کا مقام حاصل ہے۔ ہماری بیرک 'سرائے' کہلاتی ہے اس لیے کہ یہاں ہر وقت غل غپاڑہ رہتا ہے۔ کافی کے بعد سب دوپہر کے کھانے کے لیے ہماری بیرک میں واپس آجاتے۔ کھانے کے بعد شطرنج کی ایک بازی اور اس کے بعد لوگ سونے یا غور و فکر کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد چائے اور کھیل۔ کھیل کے فوراً بعد میرے دیوان خانے میں شبانہ محفل جمتی ہے۔ پھر کھانے کی گھنٹی بجتی ہے اور کھانے کے بعد لوگ ریڈیو سنتے یا گپ شپ کرتے ہیں۔۔۔

شام کے لیے مشاعرہ پہلے سے طے تھا۔ ایک کوٹھری خاص طور سے مزین کی گئی اور جناب محترم جنرل نذیر صاحب کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ بالکل سچ مچ کا مشاعرہ معلوم ہوتا تھا۔ کل نئے سال کی تہنیت کا ایک محبت بھرا خط بنے کی بیگم سے وصول ہوا جسے پڑھ کر دل بھر آیا۔ اس دنیا میں بہت سی بدی کے باوجود اتنی نیکی اپنے حصے میں آئی ہے کہ جس کا حق ہم کبھی ادا نہیں کر سکتے۔''(٦)

اگر 'نقوشِ زنداں' میں شامل سجاد ظہیر کے خطوط اور 'صلیبیں میرے دریچے کی' میں شامل فیض احمد فیض کے خطوط جو دونوں نے اپنی اپنی بیویوں کو لکھے ہیں، ان کا موازنہ کریں تو ایک بات دونوں میں مشترکہ ہے۔ وہ یہ کہ دونوں نے مسلسل معذرت کی ہے، کبھی وقت پر نہ لکھنے کی، کبھی کسی کی

سالگرہ بھول جانے کی وغیرہ وغیرہ۔ فیض 25 مارچ 1952 کے خط میں ایلس کو لکھتے ہیں کہ اس سے بہت تقویت ہوئی کہ وہ واحد نالائق میاں نہیں ہیں۔ دونوں کے خطوط میں تقریباً ایک جیسے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اگر کچھ فرق ہے تو وہ دونوں کے الفاظ کے انتخاب کا ہے۔ یہ فرق ظاہر کرتا ہے کہ زبان پر جتنا عبور فیض کو حاصل تھا اتنا سجاد ظہیر کو نہیں تھا۔

رضیہ سجاد ظہیر اور ایلس فیض احمد فیض اپنے اپنے رتبے کی ادیبا تھیں۔ دونوں کے خاوند جیل میں تھے اور وہ دونوں جیل کے باہر ادبی سرگرمیوں میں مصروف تھیں، فیض ایک خط میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بنّے اور وہ دونوں اس خیال سے گھبرانے لگے ہیں کہ جیل سے باہر آنے تک ان دونوں کی بیویاں ان سے آگے نہ نکل جائیں۔ لکھتے ہیں کہ کچھ دن ہوئے رضیہ سجاد ظہیر کا خط آیا تھا جو سراسر شعر معلوم ہوتا تھا۔ لکھا تھا ''کسی دن جب آنے والی نسلیں تم لوگوں کی باتیں کریں گی تو نہ جانے انہیں کبھی میرا اور ایلس کا خیال بھی آئے گا۔ ہم نے پورا راستہ تمہارا ساتھ دیا ہے۔ تم ایک قدم آگے اور ہم ایک قدم پیچھے۔ تم مڑ مڑ کر تسلی کے لیے ہماری طرف دیکھتے رہے اور ہم جواب میں تمہاری طرف مسکراتے رہے اگرچہ ہمارے دل درد سے چلا رہے تھے۔''

میجر محمد اسحاق نے 'روداد قفس' میں لکھا ہے کہ فیض کے بڑے بھائی طفیل احمد خان حیدرآباد جیل میں ان سے ملنے آئے تھے اور اپنے روحانی پیشوا کی طرف سے ان کی رہائی کے لیے خوشخبری بھی لائے تھے۔ وہ ابھی حیدرآباد میں ہی تھے کہ 17 جولائی 1952 کو صبح نماز پڑھتے وقت دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئے تھے۔ اسی دن یعنی 17 جولائی 1952 کو فیض نے ایلس کو خط لکھا جس میں طفیل احمد کی موت کا ذکر اس طرح کیا:

> ''آج صبح میرے بھائی کی جگہ موت میری ملاقات کو آئی۔ سب لوگ بہت مہربانی سے پیش آئے۔ یہ لوگ میری زندگی کی عزیز ترین متاع مجھے دکھانے لے گئے۔ وہ متاع جواب خاک ہو چکی ہے اور پھر وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ میں نے اپنے غم کے غرور میں سر اونچا رکھا اور کسی کے سامنے نظر نہیں جھکائی۔ یہ کتنا مشکل، کتنا اذیت ناک تھا صرف میرا دل جانتا ہے۔ اب میں اپنی کوٹھری میں اپنے غم کے ساتھ تنہا ہوں۔ اب مجھے سر اونچا رکھنے کی ضرورت

نہیں۔ یہاں اس غم کے بے پناہ ظلم سے ہار مان لینے میں کوئی تذلیل نہیں ہے۔
میں اس کے بیوی بچوں اور اپنی اماں کے خیال کو دل سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ابھی انہیں کچھ لکھنے کی سکت بھی نہیں ہے۔ لکھ کیا سکتا ہوں۔ میں نے اپنی ماں کی پہلی اولاد ان سے چھین لی ہے۔ ہاں میں نے ہی سب کو اس کی زندگی سے محروم کر دیا ہے۔

اس وقت حواس اتنے پراگندہ ہیں کہ زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ آپ لوگ میرے بارے میں فکرمند نہ ہوں۔ یہ زخم بہت اچانک، بہت بے سبب لگا ہے لیکن اسے سہنے کا بل مجھ میں ہے اور اس کے سامنے بھی میرا سر نہیں جھکے گا۔ صرف یہ جی چاہتا ہے کہ اس وقت میں باہر ہوتا اور ان بے چاروں کو اپنے بازؤں کا سہارا دے سکتا جن کے تن مجھ سے کم طاقت ور اور جن کا دکھ میرے غم سے زیادہ بھاری ہے۔"(۷)

فیض کے بھائی طفیل احمد کی موت پر سجاد ظہیر نے ایک نظم مرثیہ کے طور پر لکھ کر فیض کو بھیجی تھی۔ یہ نظم انہوں نے سینٹرل جیل حیدر آباد میں 20 جولائی 1952 کو لکھی تھی جو اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ راقم الحروف کو یہ نظم جو سجاد ظہیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے فیض احمد فیض کی بڑی صاحبزادی سلیمہ ہاشمی کے وثوق سے دستیاب ہوئی ہے۔ چونکہ یہ مرثیہ ایک نایاب اثاثہ ہے جو صرف سلیمہ ہاشمی کی تحویل میں ہے اور جسے اسکین (Scan) کر کے ایک نقل راقم الحروف کو دی گئی ہے اس لیے اسے تحقیقی مقالے کے ساتویں اور آخری باب میں شامل کر لیا گیا ہے۔

جان پڑتا ہے کہ جب سجاد ظہیر حیدر آباد جیل میں تھے تو رضیہ نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے اپنے موضوع کا خلاصہِ تحقیق داخل کیا تھا جسے منظوری نہیں ملی تھی۔ اس لیے وہ کچھ مایوس تھیں جسے انہوں نے اپنے خط میں ظاہر کیا تھا۔ اس کے جواب میں سجاد ظہیر اپنے 18 ستمبر 1951 کے خط میں لکھتے ہیں کہ اگر اردو ڈپارٹمنٹ کے برسر اقتدار لوگ اس موضوع کو مُخرب اخلاق سمجھتے ہیں تو ڈاکٹریٹ جانے دو۔ ڈگری حاصل کرنے کے مقابل اچھا مصنف اور اچھا استاد بننا سب سے عمدہ بات ہے۔ آخر گورکی، پریم چند کونسے ڈاکٹر تھے۔ اور پھر ڈاکٹر بننے کو تو تمہارے بے شمار شاگرد موجود ہیں۔

اس وقت رضیہ لکھنؤ کے کرامت حسین گرلز کالج میں ٹیچر تھیں۔ اپنے پسندیدہ استاد ڈی۔ پی۔ مکھرجی کی تعریف میں اپنے 20 جنوری 1952 کے خط میں لکھتے ہیں:

''مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تم میرے محبوب استاد ڈی۔ پی۔ مکھرجی سے ملیں اور وہ تم کو بہت اچھے لگے۔ عام طور پر میرے ساتھ کے لڑکے کہتے تھے کہ وہ پڑھاتے کم ہیں اور ادھر ادھر کی باتیں زیادہ کرتے ہیں۔ مجھے ان کی یہ باتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ کبھی موسیقی کی بات کرتے، کبھی مارکس کی، کبھی پینٹنگ کی تو کبھی فاشسزم کی، کبھی لٹریچر کی، کبھی اقتصادیات کی اور ان سب کے درمیان ان کا وسیع علم اور ان کی بڑی دلکش قسم کی حب الوطنی اور انسان دوستی جھلکتی تھی۔ وہ ہم میں علم حاصل کرنے کا بے اختیار جذبہ اور شوق پیدا کر دیتے تھے۔ اور پھر یہ تو اپنی توفیق اور صلاحیت پر مبنی تھا کہ کون اس جذبے سے کتنا فائدہ اٹھاتا ہے۔''(۸)

7 فروری 1952 کے خط میں فیض صاحب کی ایک نظم جو نومبر 1949 میں لکھی گئی تھی اور فیض نے اسے ترقی پسند مصنفین کی کل پاکستان کانفرنس میں پڑھا تھا اس کی کافی تعریف کی ہے۔ شام کو اسی دن مشاعرہ تھا جس میں مخالف لوگوں نے کچھ ہنگامہ بھی کیا تھا۔ لکھا ہے:

''تم نے جگن ناتھ آزاد کے متعلق میری رائے پوچھی ہے تو اس کا وہ حصہ جو فیض کے بارے میں ہے وہ تو تقریباً سب کا سب فیض کا ہی ہے۔ تم نے پڑھی ہے نا:

ٹھہرا اے دل جمال روئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے

اس کا وہ بند تو بہت ہی مشہور ہے:

ذرا صیقل تو ہولے تشنگی بادہ گساروں کی
اٹھا رکھیں گے کب تک جام ومینا ہم بھی دیکھیں گے
دبا رکھیں گے کب تک جوشِ صہبا ہم بھی دیکھیں گے

یہ نظم فیض نے نومبر 1949 میں ترقی پسند مصنفین کل پاکستان کانفرنس میں پڑھی تھی۔ شام کو مشاعرہ تھا اور مشاعرے پر مخالف گروہ کے

لوگوں نے باقاعدہ حملہ کر دیا۔ اندر مشاعرہ ہو رہا تھا اور باہر لوگوں کے سر پھوٹ رہے تھے۔ جب فیض نے پڑھا:

چلے ہیں جان وایماں آزمانے آج دیوانے
وہ لائیں لشکرِ اغیار واعدا ہم بھی دیکھیں گے
وہ آئیں تو سرِ مقتل تماشا ہم بھی دیکھیں گے

تب لوگوں کو اتنا جوش آیا کہ حملہ آور بھاگ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اسی میں اپنی خیریت سمجھی۔ دوسرے دن سارا لاہور یہ نظم گا رہا تھا۔ ہم بھی یہاں کبھی کبھی اس کا ذکر کیا کرتے ہیں۔''(۹)

ٹیپو کے متعلق سجاد ظہیر کی معلومات قابل تعریف تھیں۔ رضیہ نے ٹیپو کے عنوان سے ایک کہانی لکھی تھی جو اس نے سجاد ظہیر کو جیل میں بھیجی تھی۔ اس کہانی پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے 7 مارچ 1952 کے خط میں رضیہ کو لکھا ہے:

''میں نے تمہاری کہانی ٹیپو پڑھی۔ مجھے تمہارا یہ اسکیچ (Sketch) یا کہانی بہت اچھی لگی۔ البتہ اس کے خاتمے کے بارے میں مجھے محسوس ہوا کہ شاید افسانے کے مارل کو بیان کرنے کے لیے اس کی افسانیت کو کس قدر چوٹ پہنچائی گئی۔ کیا بہتر صورت یہ نہ ہوتی کہ ٹیپو کے متعلق جو چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں بس ان کا ہی ذکر کر کے بات ختم کر دی جاتی۔ تاکہ انہیں سے مطلب ومقصد ظاہر ہو جاتا اور تشہیر کی ضرورت نہ پڑتی۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ افسانوں یا خاکوں میں ایک مقصد نہ رکھیں یا مقصد کو گول کر دیں۔ لیکن آرٹ زیادہ مؤثر اسی صورت میں ہوتا ہے جبکہ ہم زندگی، جذبات اور احساسات کا اصلی اور حقیقی نقشہ یوں کھینچیں کہ سچائی کی تصویر آپ ہی آپ ابھر آئے اور پڑھنے والے کے لیے وہی نتیجہ نکالنا ناگریز ہو جو آرٹسٹ چاہتا ہے، وہ اسی طرح متاثر ہو جو کہ آرٹسٹ کا مقصد ہے۔ یہ بھی سوچنا کہ آرٹسٹ جس بات کو کہنا چاہتا ہے اس کے مختلف پہلوؤں اور خارجی وداخلی رشتوں سے آرٹسٹ گہرے طور پر واقف نہیں یا ان

سے مفاہمت نہیں رکھتا تو وہ اوپر بتایا گیا نتیجہ حاصل نہیں کر سکے گا۔"(١٠)

افسانہ نویسی میں سجاد ظہیر کو کتنا عبور حاصل تھا اس کا اندازہ اوپر کے خط کی تحریر سے لگایا جا سکتا ہے۔ رضیہ کو جو پختہ دلیلیں اس امر میں دی ہیں وہ قابل تعریف ہیں۔ سجاد ظہیر بے شک بہترین ادیب اور ادب شناس شخص تھے۔

غلام ربانی تاباں کے ایک شعری مجموعہ 'سازِ لرزاں' پر انہوں نے اپنے 27 مارچ 1952 کے خط میں بڑا اسلجھا ہوا تبصرہ کیا ہے اور رضیہ کے اس الزام کا کہ دانشوروں اور ادیبوں کی جانب انہوں نے بے توجہی برتی ہے، بہت مناسب جواب دیا ہے۔ اس خط میں سجاد ظہیر نے لکھا ہے:

"تم نے 'تاباں' کا مجموعہ 'سازِ لرزاں' جو بھیجا تھا اور اس پر جو میں نے تنقید کی تھی اس تنقید کا جو سخت جواب تم نے لکھا ہے، اسے میں نے اور فیض نے ساتھ بیٹھ کر پڑھا اور کئی بار اس پر بحث کی۔ ہم دونوں پہلے بھی اس مسئلے پر بحث کرتے رہے ہیں۔ یہ بالکل ٹھیک ہے تمہارا کہنا کہ دانشوروں اور ادیبوں کی اہمیت کے مقابلے میں ہماری طرف سے بے توجہی برتی گئی ہے اور سعی انسانی کے معماروں کی مدد کرنا تو درکنار، بہت مرتبہ تو ان کے ساتھ ویسا سلوک بھی نہیں کیا گیا جیسا قلیوں سے کیا جاتا ہے۔ ہم اپنے ان معماروں سے جب تک مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کی تعمیریں صحت بخش، روح افزا اور حسین ہوں، ایسی ہوں جن سے زندگی روشن تر اور تابناک ہو، تو پھر ضرور ہم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ان کے لیے وہ تمام اسباب، وجود، زمین اور ماحول مہیا کریں جس سے وہ اپنی قوتوں کو بروئے کار لا سکیں۔ بات صرف یہ ہے کہ جہاں ذمہ دار لوگوں کے فرائض ہیں وہاں فنکاروں پر بھی ہے کہ وہ مسلسل اپنے اوپر تنقید کریں، اپنی خامیوں کا جائزہ لیں اور کوشش کریں کہ حتی الامکان یہ خامیاں دور ہوں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اپنے علم وفن اور زندگی کے تجربات میں اضافے کی کوشش کرتے رہیں۔ آخر ادیبوں نے تلواروں کے سائے میں اور قید کی زنجیروں کے ساتھ بھی بہترین ادب پیدا کیا ہے۔"(١١)

ظفر اللہ پوشنی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اصلی موسیقی ہندوستانی ریڈیو پر ہی سنائی دیتی تھی۔ لیکن شاید پہلی بار پاکستان ریڈیو پر بھی بلند پایہ کی موسیقی پیش کی گئی تھی جس کا ذکر سجاد ظہیر 19 اپریل 1952 کے خط میں کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''کل ہمارے قید خانے میں اچھی خاصی کلچرل کانفرنس ہوئی۔ اس لیے کہ ریڈیو پر استاد ولایت حسن خان، نارائن راؤ ویاس اور استاد علاؤالدین خان کی موسیقی سنی۔ ولایت حسن خان نے تو ایسا لاجواب ستار بجایا جس کی یاد اور لذت کا احساس عمر بھر رہے گا۔ انہوں نے پیلو کی ٹھمری سنائی اور اس میں ایسے ایسے لطیف گوشے نکالے اور ایسی دلکشی پیدا کی جیسے چاروں طرف چاندنی ہی چاندنی کھلی ہے اور ان میں سے جو خوشبو آرہی ہے اس میں سے یہ نغمے پھوٹ رہے ہیں۔ ایسے میں تم بہت یاد آئیں اور یہ سوچا کہ اگر ہم تمہارے ساتھ اسے سنتے تو ہماری خوشی دوبالا ہو جاتی۔'' (۱۲)

ایک خط میں رضیہ نے استادوں کی تعلیمی خامیوں پر افسوس ظاہر کیا تھا۔ یہ کمی آج بھی مختلف شعبوں میں پائی جاتی ہے۔ بنے بھائی بھی ایسے ہی تاثرات ظاہر کرتے ہوئے اپنے جواب میں 20 اپریل 1952 کو رضیہ کو لکھتے ہیں:

''کتنی خوشی کی بات ہے کہ تم لکھنؤ یونیورسٹی کی اکیڈمک کاؤنسل کی ممبر منتخب ہوگئی ہو۔ تم نے پہلی میٹنگ کے تاثرات میں جو استادوں کی علم دوستی، کا افسوس ناک حال لکھا ہے اسے پڑھ کر مجھے اپنی بیرسٹری کا وہ مختصر سا زمانہ یاد آگیا جب میں وکیلوں اور بیرسٹروں کے جھنڈ میں اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرتا تھا۔ وہاں مشکل سے کوئی ایسا نظر آتا تھا جو علم، سیاست، تہذیب کے کسی شعبے میں تھوڑا بھی لگاؤ رکھتا ہو۔ عام طور پر پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی برائی، اپنی تعریف اور روپے کی لالچ، پھیکے اور گھٹیا قسم کے مذاق، غرض یہ کہ بہر صورت اپنی جہالت کا اظہار۔ میں حیران ہوتا تھا کہ ملک کے یہ سب سے زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کا گروہ آخر کیوں اس قدر غیر دلچسپ ہے اور اس کی حالت کیوں اتنی افسوس ناک ہے۔'' (۱۳)

اگلے خط میں جو 27 مئی 1952 کو لکھا تھا اس میں انہوں نے مہادیوی ورما سے اپنی ملاقات کا چرچا کیا ہے۔ غالباً رضیہ نے اپنے کسی خط میں مہادیوی ورما کا حوالہ دیا ہوگا۔ اس شخصیت کی وہ بہت عزت کرتے تھے اس لیے اس کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے لکھا:

''ہاں میں مہادیوی ورما سے مل چکا ہوں۔ بلکہ 36 اور 37 میں جب میں الہ آباد میں جواہر لال جی کے ساتھ کام کرتا تھا، اکثر مہادیوی جی سے ملاقات ہوتی تھی۔ وہ اس زمانے میں کہیں پڑھاتی تھیں اور شاعری بھی کرتی تھیں۔ ساتھ ساتھ کچھ سیاسی کام بھی کرتی تھیں۔ ان سے بڑی بحثیں رہا کرتی تھیں لیکن اب ان بحثوں کی تفصیلات یاد نہیں۔ شاید دماغ پر زور ڈالوں تو یاد آئیں۔ البتہ ان کی بے ساختہ ہنسی اور ان کی سادگی اور ان کی انسانیت اور اخلاق کا نقش اب تک دل پر ہے۔ ان کی شاعری البتہ ہمارے پلے نہیں پڑی۔ لیکن وہ تو ہماری جہالت تھی کیونکہ اتنی ہندی ہم کو آتی نہیں تھی۔'' (۱۴)

حیدر آباد جیل سے لکھا ہوا جو آخری خط ہمیں دستیاب ہوا ہے وہ 9 جون 1952 کا ہے۔ اس خط میں بنے بھائی نے ادیبوں کی تنظیم پر بحث کی ہے اور اس امر پر مشورہ دیا ہے کہ ادیبوں کے لیے کیسا ماحول سازگار ہے جس میں وہ بہترین کارنامے تخلیق کر سکیں۔ اس خط میں انہوں نے لکھا ہے:

''ادیبوں کی تنظیم کا سوال ہمیشہ سے ایک مشکل مسئلہ ہے لیکن اس سے زیادہ مشکل سوال یہ ہے کہ ادیبوں کے لیے کون سا ماحول سازگار ہے جس میں رہ کر وہ بہترین تخلیق کر سکیں۔ (روٹی کا سوال ان دونوں سے الگ اور سب سوالوں کی بنیاد ہے)۔ وہ کون سی باتیں ہے جن کے ذریعے ادیبوں کی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ اور بہترین طریقے سے ابھارا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں تو سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ انہیں اپنے اردگرد کی زندگی، وطن، قوم اور اس کے افراد اور گروہوں کی زندگی کا، زندگی کے رشتوں اور ان کے الجھاؤ اور تناؤ کا اندازہ اور علم ہو۔ لیکن یہ علم بھی اسی صورت میں صحیح اور مفید ہو سکتا ہے جب کہ ادیبوں کو نوعِ انسانی سے گہری دلچسپی اور محبت ہو اور اپنے طبقے کے غرور اور

جہالت اور خود پرستی کی جگہ ان میں یہ صلاحیت ہو کہ ان طبقات سے عقل اور آدمیت اور تجربہ حاصل کرسکیں جو تمام اقدار کی خالق ہیں۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ ہمارے اکثر ادیب ان دیواروں کو نہیں توڑ سکے ہیں جو ان کے اور معمولی محنت کشوں کے درمیان حائل ہیں۔ بہرحال امید کی جاسکتی ہے کہ زمانے کی گردش اور سماجی تبدیلیوں اور اپنی خامیوں کا ایماندارانہ جائزہ انہیں لامحالہ اس طرف لے جائے گا۔ البتہ ہمارے یہاں بعض ایسے سخت گیر لوگ بھی ہیں (جنھیں جدید کٹھ ملا کہہ سکتے ہیں) جو اس پر بھی ناراض ہوتے ہیں کہ ادیب اور شاعر ریسٹورنٹ اور کافی ہاؤس میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ یہ لوگ ادیب سے اس کا چائے کا پیالہ اور سگریٹ بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔ اچھے کھانے، کپڑے اور مکان سے تو وہ ویسے بھی محروم رہتا ہے۔ لیکن جب تک ادیب اکٹھا ہوکر بات نہ کریں گے، بحث نہ کریں گے، اعتراضات نہ کریں گے اور اس طرح وہ تھوڑا بہت وقت ضائع نہ کریں گے ان کے دماغوں میں جولانی کیسے پیدا ہوگی؟ انہی حالات میں پڑھنے اور پھر لکھنے کا مزہ آتا ہے۔ البتہ ایسے چالاک (میرا مطلب ہے مکر) ادیب بھی موجود ہوتے ہیں جو اپنی ذہانت سے اپنی کم علمی کو چھپانا چاہتے ہیں اور جنہوں نے افسانہ اور شعر لکھنا اس لیے اختیار کیا ہے کہ ان کے نزدیک ادیب کے لیے کچھ بھی پڑھنا غیر ضروری ہے۔ مگر ادیب کے لیے علم کی کمی کوئی دوسری چیز پورا نہیں کرسکتی۔ مگر ادیب کی تو دراصل سب سے بڑی مشکل ہی یہی ہے کہ اسے تو تاریخ، سیاست اور مقاصیت اور نفسیات غرض یہ کہ ہر چیز کا کچھ نہ کچھ علم ہونا ضروری ہو۔" (۱۵)

یہ بات قابل غور ہے کہ سجاد ظہیر نے حیدرآباد جیل سے جتنے بھی خطوط لکھے اور جن میں صرف آٹھ خطوں سے اقتباس اوپر دیا گیا ہے ان سب میں صرف ادب، شاعری، آرٹ اور لٹریچر پر ہی بحث کی ہے۔ کہیں بھی انہوں نے اپنی مشکلات بیان نہیں کیں۔ یہ ان کے کردار کی بنیادی خوبی تھی کہ وہ اپنی کسی بھی تکلیف کا علم دوسروں کو نہیں ہونے دیتے تھے۔ ویسے بھی باقی جیلوں کی نسبت یہ

لوگ حیدرآباد جیل میں مزے سے زندگی گزار رہے تھے۔ اس جیل میں یہ سب قیدی جون 1951 سے جنوری 1953 تک اکٹھے رہے جو دوران کی اسیری کا بہترین دور تھا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا فیض کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ لائلپور جیل میں فیض کو باہر کی دنیا سے رابطہ کی مطلق اجازت نہ تھی۔ لہٰذا نہ کوئی خط و کتابت ہوتی تھی نہ ہی کوئی ملاقاتی آتا تھا۔ لیکن حیدرآباد جیل میں ایسا نہ تھا۔ ایوب مرزا لکھتے ہیں کہ جب 'یارانِ اسیر' مل بیٹھتے تو ہنسی مذاق اور خوش گپیوں میں اشتغال غباڑہ ہوتا کہ بقول فیض یکسوئی سے غور وفکر کرنا دشوار ہو جاتا تھا اور اس پر طرہ یہ کہ متضاد مقدمے کی تیاری میں بھی مصروفیت کا بہت بڑا حصہ رہتا تھا۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ حیدرآباد جیل میں زیادہ ملاقاتوں کی بھی اجازت مل جاتی تھی لیکن بدقسمتی سے سجاد ظہیر اس کا فائدہ اٹھا نہیں پاتے تھے کیونکہ پاکستان میں ان کا کوئی بھی رشتے دار موجود نہیں تھا جو اُن سے ملاقات کے لیے آتا۔

سجاد ظہیر کے ایک بہت عزیز دوست تھے میاں افتخار الدین۔ وہ انہیں جیل میں رسائل و جرائد کا ایک بڑا ذخیرہ مہیا کرتے تھے جس سے ان کی ادبی تشنگی ہوتی رہتی تھی۔ وہاں انہوں نے فیض کو فرانسیسی پڑھانے کی ذمہ داری بھی سنبھال لی تھی اور کچھ عرصے میں فیض کو کافی فرانسیسی لکھنا پڑھنا آ گیا تھا۔ فیض نے اپنے ایک خط میں اپنی بیگم ایلس کو لکھا بھی تھا کہ سجاد ظہیر نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیں فرانسیسی پڑھائیں گے۔ اپنے جیل کے ساتھیوں کے بارے میں جس میں سجاد ظہیر بھی شامل تھے اور بعد میں گرفتار ہو کر محمد حسین عطا بھی آ ملے تھے، فیض اپنے ایک خط میں ایلس کو لکھتے ہیں:

> "اب ہمارے یہاں عجیب وغریب طائفہ جمع ہے جس میں پٹھان (ارباب وعطا)، کشمیری (ضیاالدین)، سوشلسٹ، کمیونسٹ، ایک عدد قادیانی (جنرل نذیر) اور بالکل غیر سیاسی لوگ شامل ہیں۔ میرا شمار نہ جانے کس زمرے میں ہے۔ یہ بہت ہی خوش دل مجمع ہے اور سب ہی بہت اچھے لوگ ہیں ۔۔۔ اپنے یہاں مجھے اس بات پر ہنسی آتی ہے کہ ہمارے نوجوان ساتھی ہم سے بالکل اس طرح پیش آتے ہیں جیسے ہم کوئی بوڑھے سفید ریش بزرگ ہیں۔ خاص طور پر نوعمر کپتان (سابق کپتان خضر حیات) نے جسے ہم قرآن کا درس دیتے ہیں بالکل پیر بنا رکھا ہے۔ ہماری برادری میں فوجی عہدیداروں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اور ہر کسی کو

اپنا کام خود کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ہمیں یہاں بھی یہ رعایت حاصل ہے کہ پانی کا گلاس یا سگریٹ کی ڈبیہ اٹھانے کے لیے خود بستر سے اٹھنے کی زحمت نہیں کرنی پڑتی۔ کوئی نہ کوئی بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ لائلپور جیل میں جتنی اچھی عادتیں سیکھی تھیں اب چھوٹتی جارہی ہیں اور اپنی فطری کاہلی واپس آرہی ہے۔" (۱۶)

رضیہ کے علاوہ جن دیگر اصحاب کو سجاد ظہیر نے خط لکھے تھے ان میں سے صرف ایک ہی خط کا سراغ مل سکا جو انہوں نے اپنے بھائی علن میاں یعنی علی ظہیر کو لکھا تھا۔ اس وقت ان کے بھائی انڈونیشیا میں ہندوستان کے سفیر تھے۔ یہ خط 19 جون 1951 کو سینٹرل جیل حیدرآباد سے لکھا گیا تھا اور علی باقر کی کتاب میں شامل ہے۔ اس کا اردو ترجمہ راقم السطور نے خود ہی کیا ہے جو ذیل میں درج ہے:

"پیارے علن بھیا۔

ابھی ابھی مجھے تمہارا خط اور بوبو کا پہلی جون کا دونوں خط موصول ہوئے۔ تقریباً تین سال تم سے جدا رہنے کے بعد اس سے بے حد مسرت حاصل ہوئی چاہے یہ بڑے ناخوشگوار حالات اور اوقات ہیں۔

شاید آپ کو اس بات کا علم ہوگا کہ جس مقدمے میں مجھے ملوث کیا گیا ہے اس کی کارروائی ایک اسپیشل ٹریبونل کرے گا جس کے صدر سر عبدالرحمٰن ہیں۔ یہ کارروائی بالکل خفیہ ہوگی جس کو عمل میں لانے کے لیے پاکستان کی قانون ساز اسمبلی نے ایک خاص قانون پاس کیا ہے۔ یہ ایکٹ پاکستان حکومت کے ایک گیزٹ میں شائع ہوا ہے (کراچی 22 اپریل 1951)۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس سے زیادہ آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا کہ مجھ پر کیا الزام ہے کیونکہ اس قانون کے تحت یہ سب کچھ خفیہ ہے۔ لیکن لیاقت علی خان کی تقریروں سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ ان الزامات کی نوعیت کیا ہے۔ جہاں تک میرے دفاع کا سوال ہے تو ملزموں کو اجازت ہے کہ وہ اپنے اپنے وکیل مقرر کریں۔ لیکن اس کے لیے ٹریبونل کی منظوری ضروری ہے اور ملزم کو اپنے وکیل کا خرچ بھی خود ہی برداشت کرنا ہوگا۔ میرے پاس کوئی چھ سو روپے تھے جو سی آئی ڈی نے ضبط

کر لیے ہیں۔ میں نے حکومت کی طرف سے وکیل مقرر کرنے کی درخواست دی ہے لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ میرے لیے وکیل کی خدمات کی منظوری دے دی گئی ہے۔ ابھی تک میں اس وکیل سے نہیں مل سکا۔ شاید کل یا پرسوں جب مقدمہ کی سنوائی شروع ہوئی تو وکیل سے میری ملاقات ہو سکے۔

مجھے معلوم نہیں کہ بوبو کی درخواست پر جس میں انہوں نے کہا ہے کہ جناب نورالدین کو میرا مقدمہ لڑنے کی اجازت دی جائے، ٹربیونل کا کیا جواب ہوگا۔

یہاں مجھے سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ میرا کوئی بھی رشتہ دار جیسے بھائی، ماں، بیوی وغیرہ یہاں نہیں۔ میرے وکیل کے علاوہ صرف رشتہ دار لوگ ہی ہیں جن سے میں ملاقات کرسکتا ہوں۔ میرے یہاں کئی دوست ہیں لیکن میں ان کا نام نہیں بتانا چاہتا کیونکہ پاکستان گورنمنٹ کی پالیسی یہ ہے کہ پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے تمام کارکنوں، ان کے دوستوں اور ہمدردی رکھنے والوں کو حراست میں لے لیا جائے۔ ایسی حالت میں پارٹی کے جنرل سیکریٹری کے دوست، احباب اور ہمدرد خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے دوستوں وغیرہ کو ہم سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔

ان حالات میں مناسب یہی ہوگا کہ حسین ظہیر کچھ دنوں کے لیے یہاں آجائیں۔ اگر وہ ہندوستانی اور پاکستانی احکام کو دہلی میں ملیں اور حالات کی نزاکت کا اظہار کریں تو شاید انہیں یہاں آنے کی اجازت مل جائے۔

یہاں کے حالات میں انسان جیسا ٹھیک رہ سکتا ہے میں بھی ویسا ہی ٹھیک ہوں۔ جہاں تک میری ذہنی اور اخلاقی حالت کا تعلق ہے تو آپ تسلی رکھیں کہ وہ ایک دم ٹھیک ہے۔ یہ بات کہ میں بے قصور ہوں اور جو الزامات انہوں نے مجھ پر لگائے ہیں وہ اس کے بالکل برعکس ہیں جس کے حصول کے لیے میں نے زندگی کے بیس سال صرف کردیئے ہیں، تو وہ بات میرے جذبے

کو مضبوط بناتی ہے اور مجھے روحانی طاقت بخشتی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ تم پریشان اور فکرمند ہوں گے۔ وہ اس لیے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ شاید انسان کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ وہ درد و الم کی شدت کو برداشت کرنے کے بعد ہی سچائی اور انصاف کے بلند مقاصد کو حاصل کر پائے گا۔

سجاد ظہیر" (۱۷)

اس خط میں پہلی بار سجاد ظہیر نے اپنی مایوسی اور لاچارگی کا دبے الفاظ میں اظہار کیا ہے۔ پاکستان میں ان کا کوئی بھی رشتے دار یا خیر خواہ موجود نہیں تھا جو اس مقدمے میں دفاع کا انتظام کرتا۔ سب سے افسوس ناک امر یہ ہے کہ اس کی اپنی پارٹی نے بھی اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور بے چارے سجاد ظہیر کو وقت اور حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

☆☆☆☆

کتابیات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر/پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱)	زندگی زنداں دلی کا نام ہے	ظفراللہ پوشنی	مین ہاٹن انٹرنیشنل۔کراچی	2001	109
۲)	زندگی زنداں دلی کا نام ہے	ظفراللہ پوشنی	مین ہاٹن انٹرنیشنل۔کراچی	2001	156
۳)	زندگی زنداں دلی کا نام ہے	ظفراللہ پوشنی	مین ہاٹن انٹرنیشنل۔کراچی	2001	161
۴)	کلامِ فیض	فیض احمد فیض	کلاسیک۔لاہور	2005	174
۵)	صلیبیں میرے دریچے میں	فیض احمد فیض	کلاسیک۔لاہور	1986	47
۶)	صلیبیں میرے دریچے میں	فیض احمد فیض	کلاسیک۔لاہور	1986	58
۷)	صلیبیں میرے دریچے میں	فیض احمد فیض	کلاسیک۔لاہور	1986	105
۸)	ترقی پسند تحریک اور سجاد ظہیر	شکیل صدیقی	وانی پرکاشن۔نئی دہلی	2006	74
۹)	ترقی پسند تحریک اور سجاد ظہیر	شکیل صدیقی	وانی پرکاشن۔نئی دہلی	2006	74
۱۰)	ترقی پسند تحریک اور سجاد ظہیر	شکیل صدیقی	وانی پرکاشن۔نئی دہلی	2006	75
۱۱)	ترقی پسند تحریک اور سجاد ظہیر	شکیل صدیقی	وانی پرکاشن۔نئی دہلی	2006	76
۱۲)	ترقی پسند تحریک اور سجاد ظہیر	شکیل صدیقی	وانی پرکاشن۔نئی دہلی	2006	76
۱۳)	ترقی پسند تحریک اور سجاد ظہیر	شکیل صدیقی	وانی پرکاشن۔نئی دہلی	2006	76
۱۴)	ترقی پسند تحریک اور سجاد ظہیر	شکیل صدیقی	وانی پرکاشن۔نئی دہلی	2006	77
۱۵)	ترقی پسند تحریک اور سجاد ظہیر	شکیل صدیقی	وانی پرکاشن۔نئی دہلی	2006	77
۱۶)	ترقی پسند تحریک اور سجاد ظہیر	شکیل صدیقی	وانی پرکاشن۔نئی دہلی	2006	77
۱۷)	فیض نامہ	ڈاکٹر ایوب مرزا	کلاسیک۔لاہور	2005	139
۱۸)	Sajjad Zaheer the Pen & Vision	علی باقر	سیما پبلیکیشنز۔نئی دہلی	1987	84

☆☆☆☆

۳۔ مچھ سینٹرل جیل۔ بلوچستان

جس زمانے میں سجاد ظہیر کو مچھ جیل بھیجا گیا تھا تب بلوچستان کا وہ علاقہ خدا غارت جگہ تھی۔ وہاں گرد، گرما، گدا و گورستان کے علاوہ کوئی بھی ایسی چیز نہ تھی جو قابل ذکر ہو۔ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا ریگستان تھا جو لگاتار مٹی اڑاتا رہتا تھا۔ کچھ جھیلیں بھی تھیں لیکن وہ شمالی بلوچستان میں واقع تھیں۔ مچھ بلوچستان کے جنوب مشرق میں واقع ہے جو کوئٹہ سے نیچے ہے اور اس وقت کے تجارتی راستے سے جو کوئٹہ اور نشکی کے درمیان ہے اس سے ہٹ کے ہے۔ کہتے ہیں کہ حکومت جس قیدی کو سخت اذیت پہنچانا چاہتی تھی اسے مچھ جیل میں رکھتی تھی۔

راولپنڈی سازش میں جو لوگ ملوث تھے ان میں ایک میجر حسن خان بھی تھے جنہیں 4 برس قید بامشقت اور 250 روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی تھی۔ ان میجر صاحب نے رہائی کے بعد اپنی سوانح حیات 'شمشیر سے زنجیر تک' کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے ایک باب راولپنڈی سازش کیس کے متعلق بھی شامل کیا ہے جس میں انہوں نے یاران قفس یعنی اپنے ساتھیوں کا مختصر تعارف بھی کرایا ہے۔ سجاد ظہیر کی مچھ جیل میں اسیری کا ذکر کرتے ہوئے میجر حسن نے لکھا ہے:

> '' ان کے کمیونسٹ عقائد کے قطع نظر سجاد ظہیر بلاشبہ ایک عظیم انسان تھے۔ غریبوں سے حقیقی ہمدردی ان کے رگ و پے میں اس طرح سمو گئی تھی جس طرح ہمارے قابل اور محترم دوست فیض احمد فیض میں یعنی اپنی تن آسانیوں کا خیال پہلے باقی سب کچھ بعد میں۔ سجاد ظہیر مرتد ہونے کے باوجود میرے بے تکلف دوست

تھے اور جیل کے دور کی غزلوں کی اصلاح فرمایا کرتے تھے۔ باوجود اس بڑے تن و توش کے جو قدرت نے آپ کو فروانی سے عطا فرمایا تھا لاغر تخلص رکھتے تھے۔

مارچ 1951 میں جب ہم سب بلا کشان زنداں ٹولہ ٹولہ ملک کے طول و عرض میں مختلف زندانوں میں منتشر کر دیئے گئے تو بد قسمت سجاد ظہیر تن تنہا مچھ جیل بھیج دیئے گئے جو اپنی تنہائی، اداسی اور ویرانی کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس رابن سن کروزو کو یہ اذیت اس لیے دی گئی تھی کہ شاید وہاں انہیں خدا یاد آ جائے یا شیطان کی سدا رفاقت رہے۔''(۱)

اصغر ندیم سید پاکستانی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہیں۔ جب دسمبر 2005 میں سجاد ظہیر کی ادبی خدمات پر ساہتیہ اکیڈمی کے زیر اہتمام دو روزہ انٹرنیشنل سیمینار کا انعقاد کیا گیا تھا تو یہ حضرت بھی اس سیمینار میں شمولیت کے لیے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ وہاں انہوں نے 'یادیں' کے نام سے ایک مقالہ پڑھا تھا جو گوپی چند نارنگ نے اپنی ترتیب کردہ کتاب 'سجاد ظہیر۔ ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک' میں شامل کیا ہے۔ اس مضمون میں اصغر ندیم نے مچھ جیل کا مختصر ساذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں نے سجاد ظہیر کا نام اس وقت سنا جب میں آٹھویں میں پڑھتا تھا۔ میرے شہر میں ایک سوشلسٹ لیڈر تھے مستور گردیزی۔ بڑے جاگیردار تھے۔ ان کے ہاں سجاد ظہیر، فیض، سبط حسن بھی آتے تھے۔ کسی نے مجھے بتایا کہ یہ مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کے لیڈر ہیں تو میں پریشان ہوا۔ یہ تو امیر آدمی ہے ان کو کیا تکلیف ہے تو کسی نے بتایا کہ سجاد ظہیر بھی ایسے ہی لیڈر ہیں جو امیر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب سجاد ظہیر تو اس وقت پاکستان چھوڑ کے جا چکے تھے۔ البتہ جب کالج میں پہنچے تو ایک تحریر نظر سے گزری جس میں بلوچستان کی مچھ جیل میں سجاد ظہیر پر توڑے گئے مظالم کا ذکر تھا۔ مظالم کیا تھے خود جیل ہی ظلم کا نشان تھی۔ ایک زمانہ بعد میں بلوچستان جیل میں سیریل بنا رہا تھا تو میں نے مچھ جیل کو صرف اس وجہ سے Visit کیا کہ یہاں سجاد ظہیر کو قید کیا گیا تھا۔''(۲)

اصغر ندیم سید کے راقم الحروف کے خاص دوست نارنگ ساقی سے اچھے تعلقات ہیں۔

نارنگ صاحب کی معرفت اصغر صاحب سے رابطہ قائم کیا تو معلوم ہوا کہ ان کے پاس مندرجہ بالا تحریر کی کوئی نقل اب موجود نہیں۔ البتہ انہوں نے مچھ جیل کے بارے میں بتایا کہ پورے پاکستان میں نہ اس سے بدتر کوئی علاقہ ہے اور نہ ہی اس سے گھٹیا کوئی جیل ہے۔ انہوں نے کہا کہ اب بھی ان تمام قیدیوں کو وہاں بھیجا جاتا ہے جن پر طرح طرح کا ظلم ڈھانا مقصود ہو۔

جس انٹرنیشنل سیمینار کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس میں پڑھے گئے تمام مضامین گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب میں اکٹھے کر دیئے ہیں۔ ایک جناب محمد حسن نے بھی ایک مضمون 'سجاد ظہیر کی یادیں' کے عنوان سے وہاں پڑھا تھا جس میں انہوں نے سجاد ظہیر کے کاہلی پن کا ذکر کرتے ہوئے راولپنڈی سازش کیس کے بارے میں سرسری طور پر یاد دہانی کرائی ہے۔ انہوں نے کہا کہ کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری کامریڈ پی سی جوشی فرنٹیر میل کی رفتار سے بولتے تھے اور بہت بولتے تھے لیکن بنے بھائی پارسل ٹرین کی رفتار سے بھی کم رفتار میں بولتے تھے۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"خیر یہ ذکر تو محض برائے تذکرہ آ گیا مگر گفتگو کی اس احتیاط والی رفتار سے نہ جانے کتنی باتیں ادھوری رہ گئیں۔ ان میں ایک تاریخی گفتگو بھی تھی۔ ہوا یوں کہ علی گڑھ میں سردار صاحب نے شعبہ اردو کی جدیدیت والے سیمینار میں دہلی سے جن لوگوں کو مدعو کیا تھا ان میں بنے بھائی، خواجہ احمد فاروقی، امریکی ڈپلومیٹ ڈیمیلو اور ہم سب تھے۔ یعنی قمر قدوائی اور میں۔ خورجہ کا اسٹیشن گزرنے والا تھا کہ اچانک راولپنڈی سازش مقدمے کا خیال آیا کہ بنے بھائی تو اس سے ماخوذ تھے۔ ان سے کچھ حال چال کیوں نہ پوچھا جائے۔ چنانچہ ذکر چھیڑ دیا راولپنڈی سازش مقدمے کا اور بنے بھائی نے بڑی صفائی اور کسی قدر تفصیل سے سارا واقعہ بیان کیا کہ ہمارے ایک عزیز یا عزیزہ راولپنڈی میں رہتی تھیں۔ ان کے ہاں اچانک ایک دن کھانے پر ملاقات ہوئی اکبر خان سے جو کشمیر میں پاکستانی جنگجوؤں کی شکست سے نہایت دل گرفتہ تھے۔ ایک تو بنے بھائی کے بیان کی آرام طلبی بلکہ سست بیانی اور دوسری طرف فرنٹیر میل کی تیز گامی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سازش تک پہنچنے سے پہلے ہی علی گڑھ آ گیا اور گفتگو وعدہ فردا پہ ٹل گئی۔ البتہ ذہن میں اس

گفتگو کے ادھورے نقش آج بھی اسی طرح جمے ہوئے ہیں۔" (۳)

مچھ کے مقام کے متعلق یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ مچھ بلوچستان کے ضلع بولان کی یونین کونسل میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہ کوئٹہ سے کوئی پچاس کلومیٹر جنوب مشرق میں واقع ہے۔ ایک زمانے میں ہندوؤں کی کافی تعداد وہاں قیام کرتی تھی۔ وہاں کے ایک مندر میں کوئی عجیب طرح کا کرشمہ ہوا تھا جسے دیکھنے کے لیے جنوب سے بڑی تعداد میں لوگ زیارت کے لیے آئے تھے۔ ستمبر 1998 میں سینٹرل جیل مچھ میں ایک بم پھٹا تھا جس کے لیے حکومت نے انکوائری کمیٹی بٹھائی تھی۔ اس میں ایک شخص کی موت ہوئی تھی اور ایک سخت زخمی ہوا تھا۔ جیل کے قیدیوں سے 100 موبائل فون برآمد ہوئے تھے اور کافی مقدار میں اسلحہ اور نشیلی اشیا بھی ملی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ قیدیوں کے ایک گروہ نے جیل سے فرار ہونے کے سازش میں بم دھماکہ کیا تھا۔ ان کا پلان یہ تھا کہ صد سالہ پرانی جیل کی ایک دیوار میں شگاف کر کے بھاگ نکلا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ سازش کامیاب نہ ہو سکی۔

بے حد کوشش کے باوجود بھی مچھ جیل کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خطوط پر بھی سخت پابندی تھی اس لیے سجاد ظہیر نے وہاں سے اپنے خاص دوست فیض احمد فیض کو بھی کوئی زیادہ خطوط نہیں لکھے۔ راولپنڈی سازش مقدمے کا فیصلہ 5 جنوری 1953 کو سنایا گیا تھا۔ اس کے کچھ ماہ بعد ہی سجاد ظہیر مچھ جیل میں منتقل ہو گئے اور فیض منٹگمری جیل میں۔ 'صلیبیں میرے دریچے میں' میں منٹگمری جیل سے لکھے گئے 35 خطوط بھی شامل ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک میں بھی بنے بھائی کا ذکر نہیں ہے۔ اگر فیض صاحب کو سجاد ظہیر کا کوئی خط موصول ہوا ہوتا تو وہ اس کا ذکر ایلس کے نام اپنے کسی نہ کسی خط میں ضرور کرتے۔

علاج کے سلسلے میں جب فیض صاحب کو کراچی جیل اور جناح اسپتال میں بھیجا گیا تو وہاں سے بھی انہوں نے آٹھ خطوط ایلس کو لکھے لیکن تعجب ہے کہ ان میں سے ایک خط میں بھی سجاد ظہیر کا تذکرہ نہیں ہے۔ یقیناً انہیں سجاد ظہیر کا کوئی خط مچھ جیل سے نہیں ملا ہوگا۔ بلکہ اپنے پہلے خط میں جو 25 جون 1953 کو لکھا اس میں اپنی تنہائی کا شکوہ کیا اور لکھا کہ وہاں جس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے وہ حیدرآباد کے دوستوں کی صحبت ہے۔ حیدرآباد جیل میں سجاد ظہیر بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان کی کمی بھی فیض صاحب کو محسوس ہو رہی ہوگی کیونکہ دونوں بہت قریبی دوست تھے۔ اگر سجاد ظہیر کا کوئی خط انہیں

ملا ہوتا تو انہیں بہت مسرت ہوتی اور وہ ایلس کو بتائے بغیر نہ رہتے۔

فیض نے منٹگمری جیل سے کل 35 خط ایلس کو لکھے۔ راقم السطور نے ان خطوں کا ایک ایک لفظ بغور پڑھا تا کہ کہیں سجاد ظہیر کا ذکر یا حوالہ مل جائے لیکن اسے کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ اگر اس جیل میں صرف ایک خط فی ہفتہ لکھنے کی اجازت تھی تو مچھ جیل میں بھی ضرور ایسی ہی پابندی عائد ہوگی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سجاد ظہیر نے وہاں سے رضیہ کے علاوہ دیگر بہت ہی کم اور چنندہ لوگوں کو ہی خطوط لکھے تھے۔ فیض نے کراچی اور منٹگمری جیلوں سے 43 خط ایلس کو لکھے تھے لیکن کسی ایک میں بھی سجاد ظہیر کے حالات کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔ یہ بہت تعجب کی بات ہے کہ دونوں اتنے قریبی دوست ہونے کے باوجود سالوں سال ایک دوسرے کے حالات سے ناشناس رہے۔

بہرحال سب سے پہلا خط جو دستیاب ہوسکا وہ مچھ جیل سے 15 اکتوبر 1953 کو سجاد ظہیر نے رضیہ کو لکھا تھا۔ یہ خط عبدالرؤف ملک نے اپنی کتاب 'سجاد ظہیر۔ مارکسی دانشور اور کمیونسٹ رہنما' میں شائع کیا ہے۔ یہ خط پرگتی شیل وسودھا کے اکتوبر دسمبر 2005 کے خصوصی شمارے میں بھی ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے کسی آخری خط کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن وہ کہیں سے حاصل نہیں ہوسکا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ نجمہ کے پاس ہو لیکن وہ کچھ بھی مدد دینے سے انکار کرتی ہیں۔ یہ خط خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ 15 اکتوبر 1953 کو جب یہ خط لکھا گیا تو ان کی سزا کو پورے آٹھ مہینے ہو چکے تھے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں رضیہ کی ادبی کاوشوں کا ذکر ہے اور ساتھ ہی مچھ جیل کی صعوبتوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی خط میں انہوں نے 'افکار' کے ایک شمارے کا بھی ذکر کیا ہے جس میں مجتبیٰ حسین کا مضمون چھپا تھا۔ انہوں نے میجر اسحاق کا خط موصول ہونے کی بھی بات کی ہے جس کے ساتھ فیض کی ایک غزل بھی بھیجی گئی تھی۔ وہ پوری کی پوری غزل انہوں نے اس خط میں رضیہ کو لکھ بھیجی تھی۔ یہ خط پورے کا پورا ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

''سینٹرل جیل مچھ۔ بلوچستان

15 اکتوبر 1953

میری پیاری

18 ستمبر کے بعد سے ابھی تک مجھے تمہارا کوئی خط نہیں ملا ہے۔ یعنی تین ہفتے

سے امید کر رہا ہوں کہ اس ہفتے تمہارا خط ملے۔ جیسا کہ میں نے تم کو اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ اب تم خط براہ راست سینٹرل جیل مچھ کے پتے پر بھیجو۔ سرکار کا حکم اب یہ ہے کہ ہمارے خط اب لاہور کی بجائے کوئٹہ میں سنسر ہوں گے۔ اس طرح خط پہلے کے مقابلے میں جلد ہی مل جائیں گے۔ کم از کم ہمیں امید یہی ہے۔

گذشتہ ہفتے ہمیں 'شاہراہ' کا افسانہ نمبر ملا۔ اس میں تمہارا ترجمہ کیا ہوا افسانہ بھی تھا جو ظاہر ہے کہ میں نے سب سے پہلے پڑھا۔ تمہارے ترجمے کی تعریف کرنا فضول ہے اس لیے کہ اس فن کی ماہر تو تم کو سبھی تسلیم کر چکے ہیں۔ افسانے کو پڑھ کر ہم اپنے بارے میں سوچتے رہے۔ مدتوں اور برسوں کی جدائی کے بعد تم ملیں گے تو عمر اور فکر اور رنج کی بنائی ہوئی بہت سی لکیریں ہمارے چہرے پر ہوں گی۔ بہت غیر مانوس اور عجیب عادتیں ہوں گی اور پتہ نہیں کیا کیا عجائب و غرائب ہوں گے۔ معلوم نہیں ہم تمہیں کیسے لگیں گے۔ بہر حال اس 'واپسی' کا خیال کرتے ہیں تو دل کافی دھڑکتا ہے اور تب احساسات سے زیادہ ہی جذبہ ہوتا ہے کہ واپسی جلدی ہو۔ آج 15 اکتوبر کو ہماری سزا کے پورے آٹھ مہینے ہو گئے۔ اگر وہ مدت جو ہم نے دوران مقدمہ جیل میں کاٹی ہے سزا کی قید میں شامل کر لی جائے اور اگر ہمیں ہر سال میں چار مہینے کی معافی ملے تو اس حساب سے دو سال آٹھ مہینے میں رہا ہونا۔ لیکن مجھے اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ اس لیے شاید ابھی دو سال تو جیل میں اور ہی رہنا پڑے اور اگر بلوچستان کی جیل میں رہے تو اس سے بھی زیادہ۔ اس لیے کہ یہاں سنتے ہیں کہ پاکستان کے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں معافی بھی کم ملتی ہے اور شاید منجملہ اور باتوں کے ہمارے یہاں بھیجے جانے کا منشا بھی یہی ہے۔ البتہ وقتاً فوقتاً خوشگوار قسم کی افواہیں سنتے رہتے ہیں۔ بہر حال امید کا چراغ ہمیشہ دل میں جلتا رہے کہ شاید رات کی سحر ہو جائے۔

پرسوں کراچی کے 'افکار' کے پانچ نمبر یکایک آ گئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ بھوپال والے صہبا صاحب (جو لکھنوی ہیں) اتنا اچھا پرچہ باقاعدگی سے نکال رہے ہیں۔ اس میں مجتبیٰ حسین کا ایک بڑا لمبا چوڑا مضمون ہے۔ 'چو ذوقِ نغمہ کمیابی' جس میں بڑی محنت سے انہوں نے آج کے چند ادیبوں اور شاعروں پر تنقید کی ہے اور بعض جگہوں پر مشاعروں اور افسانہ نگاروں پر ان کی رائے ذاتی پسند پر مبنی معلوم ہوتی ہیں اور ٹھوس دلیلوں پر نہیں۔ پھر بھی فی الجملہ ان کی تنقید مفید ہے۔ ممتاز حسین کی تنقید نگاری کی تنقید بہت دلچسپ ہے۔ یہ بات تو مجھے بھی کھٹکتی تھی کہ نظریاتی اعتبار سے بہت مضبوط اور صحیح ہونے کے باوجود جب اپنی پسند اور ناپسند کے شعرا اور نظموں کا ذکر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شعرا کی اصل روح کو چھو نہیں سکے۔ پھر ان کا طرز کافی الجھا ہوا ہوتا ہے۔ کاش کہ وہ اردو سلیس عبارت میں لکھتے۔ تم نے اگر افکار والوں کو خط لکھا تو ان کا میری طرف سے شکریہ ادا کر دینا کہ انہوں نے مجھے رسالہ بھیجنا شروع کر دیا ہے۔ امید ہے کہ برابر جاری رہے گا۔

'تہذیب' حیدر آباد سے آنے کے بعد بلکہ جون سے مجھے نہیں ملا۔ 'افکار' بھی ابھی تک نہیں ملا اور نہ ہی 'ہمارا ادب'۔ پتہ نہیں اس کا نیا نمبر نکلا یا نہیں۔ اب میں اپنی کتاب کا دسواں باب لکھ رہا ہوں۔ بہت ساری رکاوٹوں اور کتابوں کی کمی کے باوجود سوچتا ہوں کہ جیسے تیسے اسے جلدی ختم کر لوں۔ کاش کہ تم اسے پڑھ کر رائے دے سکتیں۔ تمہاری ہی ترغیب اور رائے سے میں نے اسے لکھنا شروع کیا تھا اور اب جبکہ اس کا خاتمہ نظروں کے سامنے آ گیا ہے (کوئی ساڑھے تین سو صفحوں کی کتاب ہوگی) تو کافی متوحش ہوں اور پتہ نہیں کہ کیسی کتاب ہوگی۔ اگر فیض کا ساتھ ہوتا پھر بھی غنیمت تھا۔ ان کی رائے تو معلوم ہو جاتی اور لکھنے کے دوران میں مشورہ اور بحث بھی کر لیتے۔

اس ہفتہ میرے پاس منٹگمری سے ہمارے ایک 'مجرم' ساتھی میجر اسحاق

محمد کا خط آیا۔ اب فیض بھی وہاں پہنچ گئے ہیں۔ خط کے ساتھ فیض کی ایک نئی غزل بھی تھی جو انہوں نے کراچی جیل میں کہی تھی۔ اس سے بہتر تحفہ میرے لیے اور کیا ہو سکتا ہے۔ مطلع ہے:

رہِ خزاں میں بہار تلاش کرتے رہے
شبِ سیہ سے طلب حسن یار کرتے رہے

اور ہم اسیروں کے 'روزگار' کے بارے میں کیسی سچی بات فیض نے کہی ہے۔

خیالِ یار کبھی ذکر یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے
چراغِ بزم جہاں بار بار ماند ہوئے
حدیثِ شعلہ رخاں بار بار کرتے رہے

اور دیکھو یہ شعر کتنا زوردار ہے۔

ہم اپنے راز پہ نازاں تھے، شرمسار نہ تھے
ہر اک سے ہم سخن راز دار کرتے رہے

'سخن رازدار' کی ترکیب کتنی اچھی اور چونکا دینے والی اور نئی ہے۔ اور آخری شعر ہے۔

انہی کے فیض سے بازار عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

بھئی فیض نے دیکھو کس طرح مجاز سے حقیقت کے پہلو نکالے ہیں۔

اگلے ہفتے ہم تم کو اور بو بو کو خط نہ لکھیں گے۔ معاف کرنا اسحاق کے خط کا جواب دینا ضروری ہے۔ اس نے فیض کی غزل بھیج کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ اسحاق محمد نے یہ بھی لکھا ہے کہ تم کو ان کی طرف سے سلام لکھ دوں۔

گذشتہ ہفتے میں نے نجمہ بی بی اور نسیم بیٹی کو خط لکھا ہے۔ امید ہے انہیں مل گیا ہوگا۔ میری تینوں پریاں کیسی ہیں۔ بہت دنوں سے ان کے بارے میں مفصل نہیں لکھا۔ اب ان کی باتیں لکھو، ان کے کھیل، ان کی شرارتیں اور

چھوٹی کو میری یاد دلاؤ کہ اپنے ان دیکھے ابا کو بھولیں مت اور وہ بھی اے۔بی۔سی۔ڈی وغیرہ جو جانتی ہوں اب مجھے لکھیں۔

تمہارا سجاد ظہیر"(۴)

مچھ جیل بلوچستان سے ہی 21 فروری 1954 کو سجاد ظہیر نے ایک خط میجر اسحاق محمد کو منٹگمری جیل میں بھیجا تھا۔ یہ خط بھی کافی طویل ہے اور اس میں فیض کی غزل کی رسیدگی کی تصدیق بھی کی گئی ہے۔ یہ خط میجر اسحاق محمد نے اپنے دیباچے 'روداد قفس' کے آخر میں شامل کیا ہے۔ اس خط کو بھی بنا کوئی ترمیم یا کٹوتی کے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"سینٹرل جیل

مچھ بلوچستان۔ 21 فروری 1954

۔۔۔۔۔۔۔ آئندہ میں زیادہ باقاعدگی سے تمہارے خطوں کا جواب دوں گا۔ اس میں صرف اخلاقی فرض کا تقاضا نہیں بلکہ میری خود غرضی بھی شامل ہے۔ تمہارے خطوں سے دوستی اور التفات کی لطیف مہک آتی ہے جس سے رنجور دل کو بے انتہا ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ اس طرح ہم تنہائی میں گفتگو کر لیتے ہیں۔ تھوڑی بہت فلسفیانہ اور ادبی موشگافیاں کر لیتے ہیں اور آہنی دیواروں میں کس قدر رخنہ ڈال کر جیسے نکلتے ہوئے سورج کی کرنوں سے ذرا دیر کے لیے دل و دماغ کے منور کر لیتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ تم فیض کے کلام کے تحفے بھی بھیجتے ہو اور اب کی تو تم نے اس کے انبار لگا دیئے ہیں۔ اس کے لیے فیض اور تمہارا بہت بہت شکریہ۔ یہ تو ایسا عطیہ ہے جس کا عوض کبھی مجھ سے ادا ہی نہیں ہو سکتا۔

فیض صاحب کی نظم 'ملاقات' مجھے پسند آئی۔ اس میں علائم کی مرصع نگاری اپنے کمال کو پہنچ گئی ہے اور پہلے مصرعے سے شروع ہو کر (یہ رات اس درد کا شجر ہے) نظم کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں کے جیسے نازک پھول چاروں طرف کھلتے چلے گئے ہیں۔ جن میں ہر ایک ایسا ہے جو اپنی جداگانہ خوشبو اور رنگ بھی رکھتا ہے اور دوسروں کے ساتھ ہم آہنگ

اور متوازن بھی ہے۔ پھر نظم کا بنیادی خیال پورے تخیل کے ساتھ بڑی کامیابی سے ملایا گیا ہے، جیسے ایک حسین اور نازک جسم میں دردمند، حساس اور لطیف روح ہو۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ محن، غمنا کی، شدت درد اور ان سب کے باوجود، بلکہ ان کے وسیلے سے نمودار ہونے والی 'نئی سحر' کے تصور کو گرفت میں لانے کے بعد شاعر نے اسے نظم کا جامہ پہنایا ہے بلکہ یہاں پر یہ بلند ہمت اور خیال اور تصور جیسے شاعرانہ تخیل کا ثمر ہے اور پوری نظم کے گلدستے سے دل آویز اور روح افزا رنگینیوں اور نکہتوں کے ساتھ جھک پڑا ہے۔ تیسرے بند کے شروع کے چار مصرع، جہاں سے گریز کیا گیا ہے، اپنی فصاحت، روانی اور زورِ کلام کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ انہیں ایک بار پڑھ لو تو دل پر نقش ہو جاتے ہیں اور پھر بھولتے نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اتوار کی صبح کو کسی کلیسا کی گھنٹیاں لہک لہک کر بج رہی ہوں اور ان کی مسلسل آواز صرف سامعہ میں نہیں بلکہ سارے جسم کے پوروں میں سرایت کر رہی ہو۔ فیض کی شاعری کا 'رنگ' لوگ جس بات کو کہتے ہیں، اس میں لہجے کی درناگی اور فضا کی نرمی ایک چیز ہے۔ مجھے اس کی خوشی ہے کہ ان مصرعوں میں وہ رنگ نہیں ہے۔ اچھے اور بڑے شاعر اپنا رنگ ضرورت اور موقع کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں گو وہ اپنی فطرت نہیں بدل سکتے۔

تم نے گزشتہ خط میں اس طرف اشارہ کیا تھا کہ ہمت کر کے ایک جست لگائی تا کہ ان کی شاعری میں خوشبوؤں اور گل بیزیوں کے علاوہ خلقِ خدا کے اس مبارک پسینے اور خون کی حرارت کی آمیزش بھی ہو جس سے فی الحقیقت زندگی بنتی بدلتی ہے اور سنورتی ہے۔ میں اس خیال سے بالکل متفق ہوں۔ البتہ میں انہیں ایسا کرنے کے لیے دھکا نہیں دینا چاہتا۔ ان امید افزا اعلامت کے سبب جو حالیہ نظموں اور غزلوں میں خود ہی نظر آ رہی ہیں جو کہ صحیح جمہوری سمت کا پتہ دیتی ہیں۔

میرے خیال میں وہ خود اس نکتہ کو سمجھتے ہیں۔ پنجاب کی سرزمین

صدیوں پہلے بابا فرید، وارث شاہ، بلھے شاہ کی ذاتوں میں، دوسرے حالات اور دوسرے ماحول میں ایسی جمہوری شاعری پیدا کر چکی ہے۔ ہمارے یہاں کبیر، تلسی، سورداس ہو چکے ہیں۔ایسے نغمے پھر کیوں نہیں چھیڑے جا سکتے۔

ان نئی غزلوں پر ان کو مبارکباد دینا، گو یہ صحیح ہے کہ داد مرزا جعفر علی خان سے ہی لینا، میں تو برائے نام لکھنؤ کا رہ گیا ہوں۔ چھ سال پنجاب میں پنجابیوں کے ساتھ رہ کر اللہ ہی جانتا ہے کہ زبان کتنی بگڑ گئی ہے۔شاید چونکہ موسم بہار کا ہے اس لیے ہمیں ''گلوں میں رنگ بھرنے بادِ نو بہار چلے'' والی غزل سب سے اچھی لگی۔اس شعر کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے

جس غزل کو تم نے واسوخت کا عنوان دیا ہے وہ بھی اپنے رنگ میں خوب ہے۔ایک ایک شعر نشتر ہے۔کس کس کی تعریف کریں۔خاص طور پر یہ شعر:

گر فکرِ زخم کی تو خطاکار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیِ تیغِ ادا نہ تھے

اس کی داد تو فیض مرزا نوشہ سے بھی لے لیتے۔جعفر علی خان اثر تو الگ رہے۔

تمہارا سجاد ظہیر''(۵)

اس خط سے ظاہر ہے کہ سجاد ظہیر کی ادبی تنقید کتنے بلند پائے کی تھی۔ ہر لفظ دل کو چھو لیتا ہے۔ایک اور بات جس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ مچھ جیل میں قیام کتنا بھی تلخ ترین کیوں نہ ہو، سجاد ظہیر کی ادبی صلاحیتوں پر اثر انداز نہیں ہو سکا۔اسی جیل میں انہوں نے اپنی دور کی بہترین کتابیں 'روشنائی' اور 'ذکر حافظ' تخلیق کیں جن کا اردو ادب میں ایک خاص مقام ہے۔حالات جیسے بھی تھے جیل میں سجاد ظہیر کو ایسی سہولیات میسر تھیں جس سے وہ اپنے ادبی ذوق کو نہ صرف برقرار رکھ سکے بلکہ اس کی ترقی و ترویج کے مواقع بھی میسر تھے۔سجاد ظہیر خود بھی بطور دانشور اور تنقید نگار کے

ایک واحد اور منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں نے انہیں اتنا وقت نہیں دیا کہ وہ ادبی فن کو گوشہ تکمیل تک لے جاتے لیکن پھر بھی ان کی عالمانہ نگاہ جس طرف اٹھ گئی پھول بکھر اگئی۔ اس سے پچھلا خط جو انہوں نے اپنی بیوی کو لکھا تھا اس پر مجتبیٰ حسین کی تنقید نگاری پر جو تنقید کی ہے وہ بہت نپچہ اور سلجھی ہوئی ہے۔ ان کی علمی اور تحقیقی کاوش کسی رائے زنی کی محتاج نہیں۔ ان کی ادبی کاوشوں اور صلاحیتوں کی وجہ سے سب لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ جیل میں چونکہ باہر کی دنیا سے ان کا رابطہ کٹ گیا تھا اس لیے خط و کتابت ہی ایک ذریعہ تھا جس سے وہ یہ رابطہ جوڑ سکتے تھے۔ لہٰذا عبدالرؤف ملک ہی ایسے واحد شخص تھے جس کو نہ صرف سجاد ظہیر بلکہ دیگر اسیر ساتھیوں نے بھی جیل سے اکثر خطوط لکھے۔ وہ اس طرح کی خط و کتابت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ نہ صرف بنے بھائی بلکہ دیگر بہت سے احباب اور رفقا نے اپنے اسیری میں ان سے خط کتابت کی۔ ان کے مطابق ان کی ذات اور ان کا ادارہ پیپلز پبلشنگ ہاؤس اسیر رفقاء کے لیے باہر کی دنیا سے رابطے کا محفوظ ذریعہ تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اسیروں کے گھر والوں کو اور دوسرے غیر سیاسی دوستوں کو جیل سے خط لکھنے میں اس بات کا اندیشہ ہوتا تھا کہ سی آئی ڈی والے انہیں پریشان کریں گے۔ لہٰذا انہیں جاننے والے تمام احباب ملک کو ہی خط لکھتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ شاید ہی کوئی رفیق ہو جس نے انہیں جیل سے خط نہ لکھا ہو۔ لیکن انہیں افسوس ہے کہ انکے قابل احترام رفیقوں کے خطوط پولیس کے چھاپوں یا نامساعد حالات میں جو وہ اپنا مقام اور رہائش بار بار تبدیل کرتے رہتے تھے اس وجہ سے وہ سب خطوط تلف ہو گئے۔ راقم السطور کی جوان سے ٹیلیفون پر اس بارے میں گفتگو ہوئی اس میں بھی انہوں نے انہی خیالات کا اظہار کیا۔ رؤف ملک 1953 کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں اور سجاد ظہیر کے ایک خط کا حوالہ بھی دیتے ہیں جو مچھ جیل سے ہی لکھا گیا ہوگا کیونکہ 1953 میں وہ مچھ جیل میں منتقل ہو چکے تھے۔ لکھتے ہیں:

> ''یہ غالباً 1953 کے اوائل کا واقعہ ہے۔ میں فیض کے دوسرے مجموعہ کلام 'دست صبا' کی اشاعت کے بعد معمول کے کاموں میں مصروف تھا۔ یاد رہے کہ فیض کا دوسرا مجموعہ کلام 'دست صبا' جسے ان کی شاعری میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے آج سے 56 برس پہلے فیض کے زمانہ اسیری میں اس ناچیز کی کوششوں سے

ہی منصۂ شہود پر آیا تھا۔ اسی زمانے میں سجاد ظہیر کا ایک خط موصول ہوا جس میں انہوں نے لکھا کہ ان کے ساتھی ظفر اللہ پوشنی کی کتاب کا مسودہ مجھے بھجوایا جا رہا ہے۔ اسے پڑھو اور اس کی اشاعت کا بندوبست کرو۔ نیز یہ بھی لکھا کہ کتاب کی مندرجات سے وہ مطمئن ہیں لہٰذا اس کا دیباچہ بھی تحریر کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں پارٹی سیکریٹری کا میرے لیے آرڈر آیا تھا کہ یہ کتاب شائع کی جائے۔ اسی مراسلے کے چند روز بعد ایک بزرگ تشریف لائے۔ انہوں نے اپنا تعارف ظفر اللہ پوشنی کے والد کی حیثیت سے کرایا اور فرمایا کہ ظفر اللہ نے یہ مسودہ آپ کے لیے بھجوایا ہے۔ اس ضمن میں اس نے خود یا اس کے کسی ساتھی نے لکھا بھی ہوگا۔ میں نے کہا ہاں مجھے خط موصول ہو گئے ہیں۔ میں کتاب شائع کر دوں گا۔

میں نے مسودہ پڑھا اور اسے دلچسپ پایا۔ یہ تاریخی مادیت کے اصولوں کی روشنی میں دنیا کی ابتدا اور ارتقا کی داستان تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ سجاد ظہیر کے دیئے گئے لیکچروں کے نوٹس کو بنیاد بنا کر لکھی گئی تھی۔"(٦)

اس واقعے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مچھ جیل میں سجاد ظہیر کی ادبی مصروفیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ مچھ جیل میں دو کتابیں انہوں نے تالیف کیں ان میں 'روشنائی' جو ترقی پسند تحریک کی سوانح ہے انہوں نے حافظے سے قلمبند کی تھی۔ دوسری کتاب 'ذکر حافظ' کی تخلیق انہوں نے ظ۔ انصاری کے ایک مضمون 'غزل یا شاعری' اور ممتاز حسین کے ایک مقالہ سے متاثر ہو کر کی تھی۔ 'ذکر حافظ' کی تالیف میں انہیں کئی ایک رسالوں اور کتابوں کے مطالعے کی ضرورت محسوس ہوئی جو انہوں نے عبدالرؤف ملک کو خط لکھ کر ان سے طلب کیں۔ چند کتابیں تو ایسی تھی جن کا کسی نے نام تک نہیں سنا تھا۔ مثال کے طور پر علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش کی کتاب 'کشف المحجوب' بھیجنے کی انہوں نے فرمائش کی جس کا ملک کو تو بالکل علم نہیں تھا۔ بنّے بھائی نے نظام الدین اولیا کے ملفوظات اور فوائد الفوائد مرتبہ خواجہ حسن سجزی اور اس نوع کی کچھ اور کتابوں کی بھی فرمائش کی جن کے بارے میں شاید ہی کوئی جانتا تھا۔ اس سے جان پڑتا ہے کہ سجاد ظہیر کا مطالعہ کتنا وسیع اور زرخیز تھا۔

ایک اور خط جو انہوں نے نومبر 1954 میں مچھ جیل سے رضیہ بیگم کو لکھا اس کا اقتباس

ایک رسالے میں جس کا نام 'ترقی پسند تحریک اور سجاد ظہیر' ہے اس میں شائع ہوا تھا۔ یہ رسالہ 2006 میں وانی پرکاشن نے دہلی سے چھاپا تھا۔ اس میں بنے بھائی نے ایک مشاعرے کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے ریڈیو پر سنا تھا۔ اس میں ان کا شاعرانہ تخیل پورے عروج پر ہے۔ لکھا ہے:

> ''کل حسن اتفاق سے ریڈیو پر ایک مشاعرہ سنا۔ جوش صاحب اور بعض ہمارے قدیم شعرا آخر جوانی اور اس کی والہانہ سرخوشیوں کے گزرنے کا اتنا ماتم کیوں کرتے ہیں؟ ہر چیز گزرتی ہے اور بدلتی ہے لیکن یہ تو ضروری نہیں کہ ایک خاص عمر اور ایک خاص حالت کے گزر جانے کے بعد انسان کی زندگی خالی ہو جائے۔ نئے قسم اور نئے طور کی مسرتیں اور آسودگیاں، پہلی شگفتگی اور پھولوں کی بے ساختہ ہنسی دل آویز ہے تو ثمر دار شاخون کی لچک اور رسیدہ میووں کی چاشنی، اور اس کی مہک بھی دلنواز اور حیات آفریں ہے۔ گزشتہ سرور کی یاد اپنے ساتھ غمگینی بھی لاتی ہے لیکن اگر یہ غمگینی موجودہ کیفیتوں کو کجلا دے تو اسکے یہی معنے ہو سکتے ہیں کہ موجودہ زندگی کی روانی اور دوانی کی رفتار دھیمی ہے اور اگر اس کا دھیما ہونا فطرت کا تقاضا ہے تو تشنہ لبی اور تہی جامی تو اس کا تقاضا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ اشجار ایسے ہیں جن میں پھول اور کلیاں تو لگتے تھے مگر پھل نہیں لگے خزاں محروم ثمر رہ گئی۔'' (۷)

فیض احمد فیض نے منٹگمری سینٹرل جیل اور لاہور جیل میں قیام کے دوران جو نظمیں لکھیں وہ 'زنداں نامہ' کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ اس مجموعے کا 'سر آغاز' سجاد ظہیر نے لکھا تھا جو 13 جنوری 1956 کا ہے یعنی انہوں نے جیل سے رہائی کے بعد کہیں اسے لکھا ہوگا۔ یہ نظمیں جولائی 1953 اور مارچ 1955 کے وقفے میں لکھی گئیں۔ سجاد ظہیر نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ اس دوران فیض اور وہ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے کیونکہ دونوں کو چار سال قید با مشقت سزا دینے کے بعد اہل اقتدار نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ انہیں ایک ساتھ جیل میں نہ رکھا جائے۔ چنانچہ حیدر آباد سندھ جیل سے فیض کو منٹگمری جیل میں اور سجاد ظہیر کو مچھ جیل میں بھیج دیا گیا۔ وہ ایک دوسرے کو خط تک نہ لکھ سکتے تھے۔ 'سر آغاز' سے ایک مختصر سا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے کیونکہ جہاں اس میں فیض کی شاعری کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے وہاں پاکستانی جیلوں کی صعوبتوں کو بھی گردانا گیا ہے:

''اب کے حالاتِ زندگی میرے لیے کافی خوشگوار ہیں اور میں آزاد فضا میں سانس لے سکتا ہوں۔ اس کے باوجود جب میں ان ذہنی، جذباتی اور روحانی کیفیات کا خیال کرتا ہوں جو مجھ پر اس وقت طاری تھیں جب اپنے اس محبوب ترین دوست اور ہمدم کا کلام پڑھتا تھا تو اس کا اظہار مشکل معلوم ہوتا ہے۔ شاید بے لاگ تنقید کے لیے یہ اچھا بھی نہیں ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ چونکہ ہمارے بہت سے تجربے، زندگی اور اپنے وطن کو ثمر بار اور حسین بنانے کے متعلق ہمارے جواب، ہمارا درد، ہماری رغبتیں اور بحثیں، مشترک تھیں۔ اس لیے فیض کے ان اشعار سے میں غیر معمولی طور پر متأثر ہوتا تھا۔ اگر میرا دل کبھی خون کے آنسو روتا تھا کہ قید و بند کے مصائب اور صعوبتیں اس کا حصہ کیوں ہیں جو اپنی حسن کاری سے سب کی زندگی کو اتنی فیاضی سے مرصع کر دیتا تھا اور اپنی نغمگی سے ہم سب کی رگوں میں سرور کی نہریں بہا دیتا ہے، تو کبھی میرا ذہن اس کی تخیل کی ان شاداں اور فرحاں گل کاریوں سے کسب شعور کرتا جہاں جدید جدلیاتی علم کی ضیا پاشیاں، انسانیت کے شریف ترین جذبات سے اس طرح مل گئی ہیں جیسے شعاعِ مہر سے تمازت۔''(۸)

'دست صبا' کی اشاعت کے موقعے پر یہ سب لوگ حیدرآباد جیل میں تھے۔ سجاد ظہیر کہتے ہیں کہ اس اشاعت سے ان تمام قیدیوں کو جو ادب سے مَس رکھتے تھے بہت زیادہ مسرت ملی اور انہوں نے جیل کے احکام سے اجازت لیکر ایک پارٹی کی جس میں فیض کو 'دست صبا' کی اشاعت پر مبارکباد دی گئی۔ اس موقع پر سجاد ظہیر نے کہا تھا کہ بہت عرصہ گزر جانے کے بعد جب لوگ راولپنڈی سازش کے مقدمے کو بھول جائیں گے اور پاکستان کا مورخ 1952 کے اہم واقعات پر نظر ڈالے گا تو غالباً اس سال کا سب سے تاریخی واقعہ نظموں کی اس چھوٹی سی کتاب کی اشاعت کو ہی قرار دیا جائے گا۔

سجاد ظہیر کے اس بیان سے منجملہ اور باتوں کے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فیض کے ساتھ ان کے تعلقات کتنے گہرے تھے کیونکہ وہ فیض کو اپنا محبوب ترین دوست اور ہمدم سمجھتے تھے۔ فیض خود بھی ان سے ایسا ہی پیار کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ فیض نے کلی طور پر یہ ماننے سے انکار کیا تھا کہ راولپنڈی

سازش کیس کے کسی بھی موقع پر سجاد ظہیر ان کے ساتھ تھے اور یہ بھی کہ انہوں نے اکبر خان کے گھر 23 فروری 1951 والی میٹنگ میں حصہ لیا تھا۔ فیض سے ان کی پہلی ملاقات 1936 میں امرتسر میں محمود الظفر کے گھر ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے جیل سے رہائی تک یعنی 1955 میں ان کی دوستی 19 سال کا طویل راستہ طے کر چکی تھی۔ یہ دوستی سجاد ظہیر کی وفات تک قائم رہی بلکہ الما تا سے فیض ہی ان کی لاش کے ساتھ دہلی آئے تھے اور اپنا معرکتہ الآرا مرثیہ بھی لکھا تھا۔ سجاد ظہیر کی موت پر فیض نے انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

''بنے بھائی ان ہستیوں میں سے تھے جن کی موت کا ماتم نہیں زندگی کا جشن منایا جاتا ہے۔ آج وہ ہم میں نہیں رہے۔ لیکن ان کی تخلیقات زندہ رہیں گی۔ ساری دنیا کی ترقی پسند عوام کے لیے سرچشمہ وجدان اور مشعل راہ بنی رہیں گی۔''(۹)

رضیہ کے نام سجاد ظہیر کے ایک خط کا حوالہ قمر رئیس نے اپنی کتاب 'سجاد ظہیر۔ حیات اور ادبی خدمات' میں دیا ہے۔ اس خط کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

''ارے لو، وہ سب سے خوشی کی بات تو میں کہنا ہی بھول گیا یعنی وہ حافظ والا مضمون ایک چھوٹی سی کتاب بن گیا ہے۔ تو اب گویا میرا جیل کے پروگرام کے مطابق جو میں نے اس دن بنایا تھا جب مجھے چار سال کی سزا کا حکم سنایا گیا تھا کہ تین کتابیں لکھوں گا، دو کتابیں مکمل ہو گئی ہیں۔ اس کتاب میں نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ خامیاں نہ ہو جو مجھے خود اکثر نقادوں کی تحریروں میں نظر آتی ہیں۔''(۱۰)

یہ خط مچھ جیل سے ہی لکھا گیا تھا کیونکہ سجاد ظہیر نے 'ذکر حافظ' جو حافظ کی شاعری پر تنقید ہے مچھ جیل میں تالیف کی تھی۔ محترمہ مہر النسا نے اپنی کتاب 'سجاد ظہیر۔ حیات اور خدمات' میں ایک اور خط کا بھی ذکر کیا ہے۔ جسے انہوں نے رضیہ کے نام سجاد ظہیر کا مچھ جیل سے آخری خط کہا ہے۔ اس خط کا اقتباس رضیہ نے اپنے مضمون 'وہ زندہ جاوید ہے' میں بنے بھائی کو خراج عقیدت دیتے ہوئے پیش کیا تھا۔ یہ اقتباس حیات کے دسویں سالگرہ کے خصوصی شمارہ سجاد ظہیر نمبر میں نومبر 1973 میں چھپا تھا۔ اس خط میں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام کی طرف اشارہ کیا ہے گویا انہیں پہلے سے الہام ہو گیا تھا کہ ان کی زندگی کی آخری منزل آ پہنچی ہے۔ لکھا ہے:

''تم مجھے غم کے ساتھ یاد نہ کرنا کہ میں خوشی کے ساتھ زندہ رہا تھا۔ میرا قصور بس اتنا تھا کہ میں چاہتا تھا خوشی سب کو ملے۔ تم مجھے آنسوؤں کے ساتھ یاد نہ کرنا میں سب کے چہروں پر مسکراہٹ چاہتا تھا۔ یہی میرا سفر تھا اور یہی میری منزل یہی میرے آخری لمحات تک کی کوشش۔'' (۱۱)

ہو بہو یہی اقتباس شہزاد انجم نے بھی اپنے مقالے 'سجاد ظہیر کے افکار کی عصری معنویت' میں دیا ہے جو مقالہ انہوں نے دو روزہ انٹر نیشنل سمینار میں پڑھا تھا جو دسمبر 2005 میں دہلی میں ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ البتہ کسی نے بھی اس خط کی تاریخ درج نہیں کی۔

مچھ جیل سے ہی سجاد ظہیر نے ایک خط 20 جولائی 1954 کو اپنی بڑی بیٹی نجمہ علی باقر کو لکھا جو باقر نے اپنی کتاب Sajjad Zaheer-the Pen & the Vision میں شامل کیا ہے۔ راقم الحروف نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور وہ یوں ہے:

''میری پیاری بیٹی نجمہ

مجھے تمہارا 12 دسمبر کا طویل اور خوبصورت خط ملا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم، بونا اور شمو تینوں امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہوئی ہو۔ مبارک ہو۔ ذاتی طور پر میں یہ نہیں مانتا کہ اچھے نمبر ہی انسانیت کی قابلیت کا پیمانہ ہیں۔ آپ کو خود اعتمادی اور علمیت تبھی حاصل ہوتی ہے جب تم اسکول کے اندر اور باہر پڑھائی لکھائی کے جائزے سے تعلیم حاصل کرتی ہو۔ میں ایسے کئی لوگوں سے واقف ہوں جنہوں نے امتحان میں تو امتیازی رتبہ حاصل کیا مگر بعد میں اپنے آپ میں الجھے رہے اور ایک اچھے اور نیک انسان نہ بن پائے۔ مجھے یقین ہے کہ اچھے نمبروں کے باوجود تم ان لوگوں جیسی نہیں بنوگی۔

مجھے تمہاری آنکھوں کے بارے میں کافی تشویش ہے۔ تم فوراً ان کا معائنہ کراؤ۔ اور کچھ عرصے تک عینک بھی پہنے رکھو۔ میں جانتا ہوں کہ نوجوان خوبصورت لڑکیاں عینک پہننے سے گریز کرتی ہیں۔ لیکن جب بعد میں تمہاری تکلیف دور ہو جائے تو انہیں چھوڑ دینا۔ تمہیں اس بات کا بھی دھیان رکھنا کہ

تمہاری پڑھائی والا بلب مناسب درجے کا ہے۔تم اس طرح بیٹھا کرو کہ روشنی مناسب فاصلے سے ہی تمہاری کتاب پر پڑے۔ میں یہ سب کچھ تمہیں اس لیے لکھ رہا ہوں کیونکہ تمہاری عمر میں مَیں نے اپنی نظر برباد کرلی تھی۔ وہ اس لیے کہ مجھے کسی نے ایسا مشورہ نہیں دیا تھا۔

مجھے امید ہے کہ چھٹیوں میں تم دہلی جاؤ گی اور تاج محل بھی دیکھو گی کیونکہ آگرہ دہلی سے قریب ہی ہے۔ کیا تم نے لکھنؤ کا میوزیم دیکھا ہے! کبھی کبھی وہاں چلی جایا کرو۔ وہاں قدیم زمانے کی کئی مورتیاں ہیں اور تمہیں اپنی سرزمیں کے آرٹ کے کارناموں کے متعلق معلومات ہونی۔

مجھے خوشی ہے کہ چھٹیوں میں تم سلائی سیکھ رہی ہو۔تمہاری ماں سلائی کی ماہر ہےاوراس طرح تم اپنے ملبوسات خود بنا کر کافی پیسے بچا سکو گی۔ جب ہماری شادی ہوئی تو گھر میں تمہاری ماں کے بنائے ہوئے بہت کپڑے تھے جن پر کشیدہ کاری بھی تھی۔

یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آم کے پیڑوں نے پھل دینا شروع کر دیا ہے اور تم آچار، چٹنی اور شربت تیار کرنے میں لگ گئی ہو۔ میں ان ذائقہ دار اشیا سے اپنے آپ کو محروم پاؤں گا۔تم یہ سب چیزیں بنانے کی ترکیب اپنی ماں سے سیکھ لو لیکن احتیاط رہے کہ بہت زیادہ مت کھانا۔

تو تم نے Conguest of Everest فلم دیکھی ہے۔ میں نے اس فلم کے بارے میں کسی رسالے میں پڑھا تھا۔ یہ انسان کی ہمت کا معرکہ خیز کارنامہ ہے۔تم نے اس فلم کو دیکھنے کے بعد محسوس کیا ہوگا کہ انسان اپنی ذہانت اور تعمیری صلاحیتوں کو استعمال کر کے کیا کچھ نہیں کر سکتا۔جیسا کہ تم جانتی ہو میری رہائی اگست 1955 میں ہونے والی ہے لیکن اس کا کوئی بھروسا نہیں۔ جب تک میری رہائی عمل میں نہیں آجاتی تم اپنی ماں کا پورا پورا خیال رکھنا۔اسے زیادہ پریشان نہ ہونے دینا اور نہ اسے زیادہ کام کرنے دینا۔ مجھے

امید ہے کہ میں جلد لوٹوں گا اور تمہارے پاس ہوں گا۔

ایسے لمبے اور خوبصورت خطوط لکھتی رہا کرو۔ یہ مت سوچو کہ ان سے مجھے کچھ بھی بوریت یا پریشانی ہونے والی ہے۔ آخر تم سے بات چیت کا یہی تو واحد ذریعہ ہے۔

تمہارے ابا'' (۱۲)

علی باقر نے اپنی اسی کتاب میں ایک اور خط کا بھی ذکر کیا ہے جو سجاد ظہیر نے اپنے بھائی علی ظہیر کے نام لکھا تھا جسے وہ علن بھیا کہتے تھے۔ چونکہ وہ مجھ سے نہیں حیدرآباد جیل سے لکھا گیا تھا اس لیے یہاں درج نہیں کیا گیا۔

عصمت چغتائی نے سجاد ظہیر کے بارے 'خوابوں کا شہزادہ' نام سے ایک مضمون لکھا ہے جو علی باقر نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ عصمت نے اس میں لکھا ہے کہ جب اس نے بنّے بھائی سے حیدرآباد سندھ (کراچی) کا ذکر چھیڑا تو کہنے لگے کہ وہاں تو ان کی بڑی خاطر مدارت ہوئی تھی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کچھ مارا پیٹا تو نہیں تو کہا کہ توبہ کرو، بخدا انگلی تک نہیں چھوائی۔ کہتی ہیں کہ بنّے بھائی اپنی ہر تکلیف اس قدر معمولی بنا کر پیش کرتے تھے جیسے انہوں نے زندگی میں کچھ قربانیاں دی ہی نہیں یا اگر دی بھی ہیں تو وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ وہ لکھتی ہیں:

''بارہا میرے ہاں بھی قیام کیا۔ وہی دھیمی دھیمی انداز گفتگو۔ سبھی لوگ جمع ہو جاتے۔ پینے پلانے کا شغل شروع ہو جاتا۔ بنّے بھائی کو مدہوش اور حواس باختہ دیکھنے کا ارمان دل ہی میں رہ گیا۔ کبھی دو منچلے آپس میں سیاسی یا علمی معاملے پر الجھ پڑتے تو نہ جانے ہولے ہولے بنّے بھائی انہیں کیسا ٹھنڈا کر دیتے۔ نہ چہرے پر شکن آتی نہ زبان میں۔ میں نے کبھی انہیں غصے میں نہیں دیکھا۔ بڑے غصے کی بات بھی بڑی نرمی سے کرتے۔ ان میں بے جا انکساری کی عادت نہیں تھی۔ ہمیشہ بادشاہوں کی طرح 'ہم' کہہ کر بات کرتے تھے۔ ان کے بمبئی آجانے سے عجیب سارنگ چھا جاتا۔ جنہیں بمبئی میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے ملنے کی فرصت نہیں ملتی وہ سب ایک ساتھ جمع ہو جاتے۔

شادی اور رشتہ قائم کرنے میں بنے بھائی کے وجود کا بڑا دخل تھا۔ ان کے آنے سے دل کی کدورتیں بھلا دی جاتیں۔ شکایتیں مٹ جاتیں اور سب مل کر ہنس بول لیتے۔ ان کی طبیعت میں حقیقت پسندی اور رومان کا ایک حسین امتزاج تھا۔ ان کی چال ڈھال میں شہزادگی تھی اور چہرے پر پیغمبرانا نور۔ وہ ایک پیارے دوست، مشفق صلاح کار اور مکمل رہنما تھے۔ ان کی آواز انسان کو خود اپنے ضمیر کی آواز لگتی تھی۔'' (۱۳)

اپنی کتاب 'روشنائی' بھی انہوں نے مچھ جیل میں ہی مکمل کی تھی۔ اس کا حرف آخر بھی انہوں نے 17 جنوری 1954 کو وہیں سے لکھا۔ اس سے یہ بالکل محسوس نہیں ہوتا کہ جیل میں انہیں کوئی پریشانی تھی یا ان پر کوئی ظلم ڈھائے گئے تھے۔ ایسا شخص جیل کی سختیوں کے بارے میں کسی کو کیا لکھے گا۔ البتہ فیض احمد فیض نے جو خطوط اپنی بیوی کو لکھے اور جو کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں ان میں کئی جگہ ان زیادتیوں کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ یہ صعوبتیں سب کے لیے مشترکہ تھیں اس لیے فیض کی تحریروں سے چند اقتباسات یہاں بھی درج کیے جاتے ہیں۔ یہی اقتباسات معمولی ترمیم کے ساتھ ڈاکٹر ایوب مرزا نے 'فیض نامہ' میں بھی لکھے ہیں۔ فیض کہتے ہیں کہ جن لوگوں کو جیل کی زندگی کاٹنے کا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ جیل کی در و دیوار عجب بے رونقی کا شکار ہوتے ہیں۔ تنہائی کے اداس اور ملول لمحوں پر یہ بے رونقی ایک عذاب کی طرح بوجھل اور گراں ہوتی ہے۔ آنکھ کھلتے ہی وہی میکانکی ریہرسل، وہی چہرے، وہی پرندے اور وہی چڑھتے سورج کے ساتھ ڈھلتی آرزوؤں کی چھاؤں۔

حیدر آباد جیل میں لوگ بقول فیض سخت شاعر مزاج ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے مطابق جیل خانے میں آدمی بے دست و پا ہو جاتا ہے لیکن اس لاچارگی کی وجہ سے اپنے ہم وطنوں کے دکھ درد کا احساس اور بھی شدید ہو جاتا ہے اور کچھ احساس گناہ بھی کہ ہم ان سے الگ تھلگ بیٹھے ہیں۔ مزید یہ کہ اسیری کے دن مختلف دائروں میں دھیرے دھیرے گردش کرتے ہیں۔ کبھی سکون، کبھی بے حسی، کبھی اکتاہٹ، کبھی درد۔ اور ہر دائرے کی گردش کے بعد شدت کا انتظار پیدا ہوتا ہے کہ اب کوئی آئے یا کوئی نئی بات وارد ہو۔

ایک قیدی کی سیاسی کیفیت کی عکاسی اس بہتر الفاظ میں نہیں ہو سکتی۔ یہ مایوسی اور ناچاری صرف

فیض تک محدود نہیں تھی بلکہ ایسی ہی کیفیت سجاد ظہیر اور دیگر قیدیوں پر بھی طاری رہتی ہوگی۔ اپنے جیل کے ماحول اور قیدی ساتھیوں کے ساتھ خرمستیوں کا ذکر فیض نے بڑے نرالے انداز میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''جیل میں قیدیوں کے لیے نوجوانی کی خرمستیوں کا اگر کوئی بدل یہاں پر ہے تو وہ پھلوں کے صندوقچے پر نصف شب کو ڈاکہ ڈالنا ہے۔ جیل میں بعض کو طبی سفارش پر کچھ فاضل فروٹ ملتا ہے جسے وہ بہ وقت فرصت کسی مناسب موقع پر نوش جان کرنے کے لیے سینت کر رکھتے ہیں۔ لیکن باقی لوگوں نے سب ٹھکانوں پر جاسوس تعینات کر رکھے ہیں جنھیں ہر چھپے خزانے کا پتا رہتا ہے۔ ہر رات گیارہ بارہ بجے سازش مکمل ہوتی ہے اور بہت خاموشی اور نظم وضبط کے ساتھ شب خون کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ میری چارپائی سب سے زیادہ محفوظ اور غیر مشتبہ جگہ ہے۔ اس لیے چوری کے مال کی تقسیم عام طور پر یہیں کی جاتی ہے جس کے نتیجے میں ہمیں رات کو کھانے پینے کی چیزوں کی کبھی قلت نہیں ہوئی۔'' (۱۴)

سجاد ظہیر اور فیض جیسے ادب شناس لوگ یہ سوچتے تھے کہ جیل میں کچھ پڑھ لیا، کچھ لکھ لیا، اس کو کام نہیں کہہ سکتے۔ جیل میں بیشتر وقت کام نہیں بلکہ کام کی آرزو میں گزرتا ہے۔ ایسا ٹھوس طلب، وقت طلب اور محنت طلب کام جس کی تکمیل میں جان وتن کی سب طنابیں کھنچنے لگیں اور ذہن کے رگ وریشے چور ہو کر دُکھنے لگیں، وہ کام جیل میں نہیں ہوسکتا۔ لیکن سجاد ظہیر نے فیض کے اس نظریے کو 'روشنائی' اور 'ذکر حافظ' جیسے بلند پایہ شاہکار کو تعمیر کر کے بالکل غلط ثابت کر دیا۔ اس کی دوسری مثال فیض کی اپنی شاعری کے دو مجموعے بھی ہیں یعنی 'دستِ صبا' اور 'زنداں نامہ'۔ فیض کے اپنے لفظوں میں یہ دونوں کتابیں انہی جیل خانوں کی یادگار ہیں اور بنیادی طور پر یہ تحریریں انہی ذہنی محسوسات اور معمولات سے منسلک ہیں۔ فیض لکھتے ہیں جیل خانہ عاشقی کی طرح خود ایک بنیادی تجربہ ہے جس میں فکر ونظر کا ایک آدھ نیا دریچہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ جیل کی زندگی کا یہ پہلو انہوں نے یوں بیان کیا ہے:

> ''چنانچہ اول تو یہ کہ ابتدائے شباب کی طرح تمام حسیات یعنی Sensatons پھر تیز ہو جاتی ہیں اور صبح کی پو، شام کے دھندلکے، آسمان کی بناوٹ، ہوا کے گداز کے بارے میں وہی پہلا سا تحیر لوٹ آتا ہے۔ دوسرے یوں ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کا

وقت اور فاصلے دونوں باطل ہو جاتے ہیں۔ نزدیک کی چیزیں بھی دور ہو جاتی ہیں اور دور کی نزدیک، اور فرداوری کا تفرقہ کچھ اس طرح سے مٹ جاتا ہے کہ کبھی ایک لمحہ قیامت معلوم ہوتا ہے اور کبھی ایک صدی کل کی بات۔ تیسری بات یہ کہ فراغت ہجراں میں فکر و مطالعہ کے ساتھ عروسِ سخن کے ظاہری بناؤ سنگھار پر توجہ دینے کی مہلت زیادہ ملتی ہے۔" (۱۵)

اگر چہ جیل میں سب کو کئی آزمائشوں سے گزرنا پڑا لیکن اس کے باوجود حیدر آباد میں سب کی زندگی خوش آئند تھی۔ باہر کی دنیا سے لاتعلقی کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ جیل ایک ایسا گوشہ بن گیا تھا جہاں نہ حادثاتِ زمانہ کا گزر تھا اور نہ زندگی کے خطرات کی آزمائش۔ فیض کہتے ہیں:

"جیل میں زندگی کا وجود ہے نا موت کا۔ جیتے جاگتے انسان جو ہنستے ہیں، روتے ہیں، پیار کرتے ہیں اور لڑتے جھگڑتے ہیں، سب کسی گرانڈیل افسانوی کتاب کے کردار معلوم ہوتے ہیں جو ابھی تصنیف بھی نہیں ہوئی۔ یہ محسوس کرنے کے لیے کہ ابھی ہم زندہ ہیں اور ہم بھی زندوں کی برادری میں اور ان کے دکھ درد میں شامل ہیں۔ تخیل پر کافی زور دینا پڑتا ہے لیکن یہ بھی شاید پوری طرح صحیح نہیں ہے کیونکہ جہاں تک جذبات کا تعلق ہے جیل خانے میں کوئی بھی بات پوری طرح صحیح نہیں ہوتی۔۔۔۔ ایسے بھی لمحے آتے ہیں جب زندگی سے اپنی یگانگت اور وحدت وجود کا بہت شدت سے احساس ہوتا ہے۔ محبت اور روشنی اور مسکراہٹ کی تلاش میں لکھوکھا دلوں، ان گنت انسانی جسموں کے درد شجاعت، عالی ظرفی اور کلفت و آلام سے یک جان ہونے کا احساس۔ اور پھر وہ لمحے آتے ہیں جب غلیظ، زرد دیواروں، دھول اور مٹی، زنجیروں، چہروں، وردیوں اور ان سب لعنتی چیزوں پر نظر پڑتی ہے جسے جیل خانہ کہتے ہیں تو یکا یک کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ موج در موج کراہت اور بیزاری کا سیلاب اندر سے اٹھتا ہے جس میں اپنی ذات اور باقی ہر چیز غرق ہو جاتی ہے۔ پھر ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ کوئی ننھا سا بیج سیاہ بوجھل مٹی کو بہت

سلیقے سے ہٹا کر ایک ننھی سی کونپل زمین سے برآمد کرتا ہے اور اسے دیکھ کر بے پناہ اور ناقابل بیان مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے اور تمام وقت دل جانتا ہے کہ اس سبز کونپل کے ننھے ہاتھوں میں حقیقت بھی ہے اور بدایت بھی۔ جیل کی دیواریں اور پہرے دار اور وردیاں سب جھوٹ ہیں، سب غیر حقیقی ہیں۔ اسی صورت سے دل یہ بھی جانتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک لحد میں سو جانے کے بعد بھی جینے والوں کی ملکیت اور ان کے رنج و راحت میں دخیل رہتا ہے۔" (۱٦)

جیل کی زندگی کا یہ تجزیہ جو فیض نے کیا ہے اس سے بہتر تجزیہ عین ناممکن ہے۔ لکھنؤ جیل سے 41-1940 میں سجاد ظہیر نے جو خطوط رضیہ کو لکھے تھے ان میں کہیں کہیں جیل کی زندگی پر تبصرہ کیا ہے لیکن اتنی گہرائی سے نہیں کیا۔ فیض نے جو اپنے تاثرات بیان کیے ہیں وہ بھی قیدیوں کے تاثرات ہیں۔ آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ جیل خانے میں ذہنی کیفیات کے جو دور گزرتے ہیں ان میں سب سے زیادہ ضدی وہ کیفیت ہے جسے طبی زبان میں Prison Coma کہتے ہیں۔ ایک طرح کی خمار آلود نیم بیداری جب ہر چیز کہیں دور چلی جاتی ہے اور سب کچھ غیر اہم اور بے وقعت نظر آتا ہے، جب کوئی درد باقی رہتا ہے اور نہ کوئی راحت اور عرش بریں بے آباد معلوم ہوتا ہے لیکن یہ کیفیت بھی گزر جاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے دیگر سب کچھ گزر جاتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اکتوبر 1954 میں گورنر جنرل غلام محمد نے پاکستان کی دستور سازی اسمبلی کو برخاست کر دیا جس کے نتیجے کے طور پر عدالت نے 1955 میں تمام اسیران راولپنڈی سازش کیس کو بری کر دیا۔

☆☆☆☆

کتابیات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر/پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱)	شمشیر سے زنجیر تک	میجر حسن خان	کے نو گروپ آف پبلیکیشنز۔راولپنڈی	2002	359
۲)	سجاد ظہیر۔ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک	گوپی چند نارنگ	ساہتیہ اکادمی۔نئی دہلی	2007	198
۳)	سجاد ظہیر۔ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک	گوپی چند نارنگ	ساہتیہ اکادمی۔نئی دہلی	2007	209
۴)	سید سجاد ظہیر۔مارکسی دانشور اور کمیونسٹ رہنما	عبدالرؤف ملک	پیپلز پبلشنگ ہاؤس۔لاہور	2009	167
۵)	کلامِ فیض	فیض احمد فیض	ایجوکیشنل بک ہاؤس۔علی گڑھ	1990	209
۶)	سید سجاد ظہیر۔مارکسی دانشور اور کمیونسٹ رہنما	عبدالرؤف ملک	پیپلز پبلشنگ ہاؤس۔لاہور	2009	64
۷)	ترقی پسند تحریک اور سجاد ظہیر	شکیل صدیقی	وانی پرکاشن۔دہلی	2006	78
۸)	کلامِ فیض	فیض احمد فیض	ایجوکیشنل بک ہاؤس۔علی گڑھ	1990	167
۹)	سجاد ظہیر۔حیات وخدمات	زیب النسا	کیشو پرکاشن۔الہ آباد	199	83
۱۰)	سجاد ظہیر۔حیات وخدمات	زیب النسا	کیشو پرکاشن۔الہ آباد	199	85
۱۰)	سجاد ظہیر۔حیات وخدمات	زیب النسا	کیشو پرکاشن۔الہ آباد	199	83
۱۲)	The Pen & The Vision	علی باقر	سیما پبلیکیشنز۔نئی دہلی	1987	84
۱۳)	خوابوں کا شہزادہ۔	عصمت چغتائی	پرگتی شیل وسودھا۔بھوپال	2005	. 97
۱۴)	فیض نامہ	ڈاکٹر ایوب مرزا	کلاسیک۔لاہور	2005	165
۱۵)	کلامِ فیض	فیض احمد فیض	ایجوکیشنل بک ہاؤس۔علی گڑھ	1990	271
۱۶)	فیض نامہ۔	ڈاکٹر ایوب مرزا	کلاسیک۔لاہور	2005	208.

☆☆☆☆

۴۔ رہائی، واپسی اور وفات

سجاد ظہیر کے پاکستان میں آخری ایام کے بارے میں ان کے عزیز دوست عبدالرؤف ملک نے اپنی کتاب میں کافی تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بنے بھائی کا المیہ یہ بھی تھا کہ وہ جتنا عرصہ پاکستان میں رہے یا تو روپوش رہے یا جیل میں قید رہے۔ پاکستان آنے کے سات سال بعد وہ 8 جولائی 1955 کو سینٹرل جیل مچھ (بلوچستان) سے رہا ہوئے۔ کچھ روز بعد غالباً 11 یا 12 جولائی کو لاہور پہنچے۔ ان کے دوستوں نے اسٹیشن پر ہی ان کا پرتپاک استقبال کیا۔ لاہور میں وہ نواب زادہ امتیاز علی خان کی کوٹھی پر رکے لیکن اپنے دوستوں کو وہاں بھی بہت کم ملتے تھے۔ لاہور میں ہی مال روڈ پر ایک مکان تھا جس کا نام نقی بلڈنگ تھا۔ اس بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں عبدالرؤف ملک کے ایک ادارہ 'الجدید' کا دفتر تھا۔ دراصل جب پیپلز پبلشنگ ہاؤس کو حکومت نے غیر قانونی قرار دیا تو ملک نے یہ نیا ادارہ شروع کر دیا تھا۔ اسی دفتر میں سجاد ظہیر اپنے دوستوں سے ملاقات کے لیے آتے تھے۔ ملک وہیں رہتے بھی تھے اور ان کے ساتھ سجاد ظہیر کے ایک اور ساتھی سبط حسن بھی رہائش پذیر تھے۔ انہی دنوں میں سجاد ظہیر کی کتاب 'روشنائی' جو مچھ جیل میں لکھی گئی تھی اس کی اشاعت کا ذکر چھڑا۔ ملک لکھتے ہیں کہ مرزا ادیب کی توسط سے چودھری برکت علی جو مکتبہ اردو لاہور کے مالک تھے انہوں نے اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری اپنے سپرد لی۔ جب کتاب مکمل ہوئی تو اس کی پروف ریڈنگ کا کام عبدالرؤف ملک کو ہی سونپا گیا۔

سجاد ظہیر لاہور زیادہ دن نہیں رہے۔ اس دوران انہوں نے بہت کوشش کی کہ انہیں

پاسپورٹ مل جائے تاکہ وہ پاکستانی شہری کی حیثیت سے ہندوستان جاسکیں۔ ظاہر ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کے بال بچے، بیوی، ماں اور دیگر رشتے دار ہندوستانی شہریت اختیار کر چکے تھے، بنے بھائی پاکستان میں ہی رہنا چاہتے تھے۔ لیکن انہیں پاسپورٹ نہ ملا اور انہیں فوری طور پر پاکستان چھوڑ کر جانے پر مجبور کیا گیا۔ سبط حسن نے اس مراسلے کا ذکر کیا ہے جس میں پاکستان کے احکام کو ہدایت سونپی گئی تھی کہ کسی طرح سجاد ظہیر کو سرحد پار کروا کر ہندوستان پہنچا دیں۔ یہ بڑی عجیب اور غیر عملی ہدایت تھی کیونکہ بنا پاسپورٹ اور دیگر متعلقہ کاغذات کے سرحد پار کرنا غیر قانونی تھا۔ بہرحال سرحد پر انہیں روک دیا گیا اور ہندوستانی احکام نے انہیں ہندوستان آنے سے منع کر دیا کیونکہ نہ تو ان کے پاس پاسپورٹ تھا اور نہ سفری دستاویزات۔ لہٰذا وہ مراسلہ جس میں بنے بھائی کے ملک بدر ہونے کا حکم تھا ہندوستانی احکام نے تسلیم نہ کیا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کا بنے بھائی نے آج تک کسی سے ذکر نہیں کیا۔ لیکن راقم الحروف نے اس موضوع پر ان کی بیٹی نادرہ ببر سے گفتگو کی تو اس نے بتایا کہ جب اس صورت حال کی اطلاع ان تک پہنچی تو ان کی بیوی رضیہ بیگم اپنی چاروں بیٹیوں کو ساتھ لے کر گئیں اور جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند کے دفتر کے باہر دھرنا مار کر بیٹھ گئیں۔ جب پنڈت نہرو کو خبر ہوئی تو بھاگے ہوئے باہر آئے اور رضیہ سے تمام روداد سنی۔ اس کے فوراً بعد ان کی ذاتی مداخلت سے سجاد ظہیر کو ہندوستان آنے کی اجازت مل گئی۔ وہ دو سال تک ہندوستان میں بے وطن شہری کی حیثیت سے زندگی گزارتے رہے۔ پھر 1957 کے آخری دنوں میں انہیں ہندوستانی شہری تسلیم کر لیا گیا اور مکمل طور پر انہیں ہندوستانی قومیت حاصل ہو گئی۔

اس سلسلے میں خواجہ احمد عباس کی ایک تقریر کا اقتباس محترمہ زیب النسا نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے جو خواجہ احمد عباس کے ایک مضمون سے اخذ کیا گیا ہے جس کا عنوان ہے 'ایک پرولتاوی شہزادہ'۔ یہ مضمون عتیق احمد نے اپنی کتاب 'بنے بھائی' میں شامل کیا ہے۔ وہ اقتباس یہ ہے:

> ''جب پاکستانی ملٹری حکومت نے سجاد ظہیر کو سازش کے الزام میں برسوں نظر بند رکھنے کے بعد رہا کیا تو میں پنڈت جی کے پاس گیا اور کہا اب تو سجاد ظہیر کو ہندوستان بلا لیجیے۔ وہ بولے ان کو ہندوستان سے جانے کے لیے کس بیوقوف نے کہا تھا۔ میں نے عرض کی کہ کمیونسٹ لیڈروں کا حکم تھا کہ سجاد ظہیر پاکستان

جا کر وہاں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کریں۔ پنڈت جی بولے بیوقوف ہیں یہ لوگ۔ لکھنؤ کے نازک مزاج سجاد ظہیر پاکستان جا کر وہاں کے پنجابیوں، سندھیوں اور بلوچیوں کی کیا تنظیم کریں گے۔ خیر تم ان کو لکھ دو یا کہلوا دو کہ ہندوستان آنے کے لیے بوریا بستر باندھ رکھیں۔ اگلے مہینے ہی بنّے بھائی ہندوستان آگئے۔ سب سے پہلے پنڈت جی سے ملنے گئے۔ انہوں نے پیار سے گلے لگا لیا اور کہا "بیوقوف کہیں کے"(۱)

سجاد ظہیر کے ہندوستان میں استقبال کے بارے میں الگ الگ نظریے ہیں۔ عبدالرؤف ملک لکھتے ہیں کہ بنّے بھائی 30 جولائی 1955 کو لکھنؤ پہنچے۔ وہاں اسٹیشن پر ان کے بھائی، اہلیہ رضیہ اور ان کے مداحوں اور پارٹی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد ان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں سرخ پرچموں کے ساتھ ایک جلوس کی صورت میں ان کی رہائش گاہ وزیر منزل لے جایا گیا۔

اس کے برعکس سید محمد مہدی لکھتے ہیں بنّے بھائی جب لکھنؤ سے دلی پہنچے تو اسٹیشن پر ان کے استقبال کے لیے صرف وہی موجود تھے۔ دیگر کوئی بھی شخص وہاں نہ تھا۔ محمد مہدی دوروزہ انٹرنیشنل سیمینار میں شمولیت کے لیے 2005 میں دہلی آئے تھے جہاں انہوں نے اپنا مضمون 'بنّے بھائی عرف سجاد ظہیر' پڑھا تھا۔ اسی مضمون میں انہوں نے یہ بیان دیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اوپر کے دونوں اشخاص کی دونوں تحریروں میں کوئی خاص تضاد نہیں ہے۔ رؤف ملک نے سجاد ظہیر کی لکھنؤ آمد کا ذکر کیا ہے اور محمد مہدی نے ان کے دہلی میں آمد کی تفصیل لکھی ہے۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ رؤف ملک چونکہ اس وقت پاکستان میں تھے اور لکھنؤ کے موقعے پر موجود نہیں تھے اس لیے انکے بیان پر اضافت کا شبہ ہوتا ہے۔ لیکن محمد مہدی نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے ذاتی تجربے کی بنا پر ہے اس لیے صحیح مانا جا سکتا ہے۔

پاکستان میں سجاد ظہیر نے بہت صعوبتیں اٹھائیں جو نہایت کربناک تھیں۔ لیکن یہ بات بھی افسوس ناک ہے کہ جب وہ روپوش تھے اور پاکستان کی جاسوسی ایجنسیاں ان کی تلاش میں لگی ہوئی تھیں تو ان کے دوست بھی انہیں اپنے پاس رکھنے سے گریز کرتے تھے۔ روپوشی ان کی مجبوری تھی کیونکہ بائیں بازو کے سرگرم کارکن عام طور پر روپوشی ہی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ حکومت کے

سخت رویے کے علاوہ ملکی پریس بھی ان کے خلاف جتی ہوئی تھی۔ پاکستان میں سجاد ظہیر کی روپوشی کا واقعہ فارغ بخاری اس طرح بیان کرتے ہیں:

''سجاد ظہیر جب انڈر گراؤنڈ تھے تو ایک دن میرے پاس پشاور آ پہنچے۔ عجیب ہیئت کذائی تھی۔ داڑھی چھوڑ رکھی تھی، سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا۔ قصہ خوانی میں میری کتابوں کی دکان پر آئے۔ ان کے ساتھ ہمارا دوست محمد حسین عطا بھی تھا۔ یہ دونوں راولپنڈی سازش کیس میں ملوث تھے اور دونوں کے پیچھے پورے ملک کی پولیس سرگرداں تھی۔ وہ مجھے بڑے تپاک سے گلے ملے لیکن میں انہیں پہنچان نہ سکا۔ پھر خود ہی تعارف کرایا اور بتایا کہ وہ چند دن میرے پاس ٹھہرنے کے لیے آئے ہیں۔ خیر میں انہیں گھر تو لے آیا لیکن بہت پریشان تھا کہ کیا کروں کیونکہ ان دنوں آئے دن میرے گھر پر چھاپے پڑ رہے تھے اور خانہ تلاشی ہو رہی تھی اور یہ سب انہی حضرات کے سلسلے میں تھا۔ لیکن میں انہیں اس موقع پر نہیں بتانا چاہتا تھا کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ میں ڈر گیا ہوں۔ مجھے یہ پریشانی تھی کہ اگر وہ کہیں میرے گھر گرفتار ہو گئے تو میں اپنے ساتھیوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ بہر حال وہ تقریباً ایک مہینہ میرے گھر پر رہے لیکن وہ کچھ ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کرتے تھے کہ مجھے ڈر لگتا تھا کہ انہیں کوئی پہنچان نہ لے۔ وہ پہلے ہی دن ہمارے حجرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہ اتنا اچانک ہوا کہ میں بوکھلا گیا۔ ان کی ہیئت کذائی بھی کچھ اتنی غیر معمولی تھی کہ تمام دوست انہیں بڑے غور اور تعجب سے دیکھنے لگے۔ شک و شبے کی فضا اس لیے بھی پیدا ہوئی کہ وہ دیکھنے میں بالکل غیر ملکی ہی لگتے تھے۔ میں اس حیثیت سے ان کا تعارف ہی کرانے لگا تھا کہ وہ اردو میں باتیں کرنے لگے اور انڈیا سے آئے ہوئے ادیبوں سے اپنا تعارف کرایا۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال میرے لیے بڑی پریشان کن تھی لیکن میں انہیں جانے کے لیے کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ بہر حال یہ دن خاصے کڑے گزرے اور جب وہ بعد از خرابی بسیار چلے گئے تو کہیں جان میں جان آئی۔''(۲)

پاکستان میں حسن عابدی سجاد ظہیر کے سیکریٹری اور کوریئر کا کام کرتے تھے۔ وہ سجاد ظہیر سے پہلے ہی گرفتار ہو گئے تھے۔ انہوں نے بھی ایک طویل مضمون 'جنوں میں جتنی بھی گزری' کے عنوان سے لکھا ہے جس میں اپنی گرفتاری کا بھی حوالہ دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک روز اشفاق بیگ آئے انہوں نے کچھ دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی بتایا کہ ان کے اندازے کے مطابق پولس سیاسی کارکنوں پر سختی کرنے والی ہے۔ ساتھ ہی کہا مجھے "ارشد" کا ڈر ہے (یعنی سبط حسن) کہ وہ بالکل احتیاط نہیں کرتے ہیں۔ پھر وہی ہوا ایک صبح جب میں بنّے بھائی کا خط لے کر سبط حسن کے یہاں پہنچا تو ان کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ میں سڑک پر واپس آیا تو پولس کے سفید پوش کارندوں نے مجھے بھی دبوچ لیا۔ اس سے پہلے 'راولپنڈی سازش کیس' کے سلسلے میں کئی اعلیٰ فوجی افسروں کے ساتھ فیض صاحب بھی گرفتار کیے جا چکے تھے۔ راولپنڈی سازش کیس کے ساتھ ہی ملک بھر میں آزاد خیال اور روشن فکر لوگوں کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں تھی۔ میں آٹھ دن تک پولیس کو اپنی اُلٹی سیدھی باتوں سے الجھاتا رہا اور خاموشی سے مار کھاتا رہا۔ آخر یہ سوچ کر کہ اشفاق بیگ بنّے بھائی کو وہاں سے نکال کر اب تک کسی محفوظ جگہ پہنچا چکے ہوں گے، اس لیے اب اس جگہ کی نشان دہی میں کوئی حرج نہیں، بول پڑا۔ لیکن یہ بولنا بہت مہنگا پڑا۔ بنّے بھائی پکڑے جا چکے تھے، ان کی گرفتاری میرے لیے ایک ایسا کرب ناک سانحہ تھی جس نے میری روح کو بری طرح پامال اور زخموں سے چور کر دیا۔ بنّے بھائی کئی سال مچھ جیل میں رہنے کے بعد جب ایک بار لاہور آئے تو میں بھی جیل سے پونے تین سال کی قید تنہائی سے نکل کر آزاد ہو چکا تھا۔ بنّے بھائی سے مختصر ملاقات رہی، ان کی گاڑی کے پیچھے پولیس کی چار موٹر سائیکل سواروں کا دستہ لگا ہوا تھا، پھر وہ ہندوستان چلے گئے۔" (۳)

فارغ بخاری اور حسن عابدی کو صرف سرسری طور پر یہاں اس لیے پیش کیا گیا کہ ان سے ان کی تمام مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے جو سجاد ظہیر نے پاکستان میں برداشت کیں۔ اس تمام عرصے میں

ان کی بیگم رضیہ سجاد ظہیر بھی مسلسل عذاب سہتی رہیں اور تن تنہا بچوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہیں۔ وزیر منزل میں بھی ان کا قیام اس کی عمارت کے آؤٹ ہاؤس میں تھا جو محض تین خستہ حال کوٹھریوں پر مشتمل تھا۔ اس دوران میں وہ بدستور کرامت حسین گرلز کالج میں پڑھاتی رہیں۔ ساتھ کچھ ٹیوشن بھی لیتی تھیں۔ انہوں نے کئی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا اور بہت سے ناول اور افسانے بھی لکھے۔ اس طرح وہ گھریلو اخراجات کے لیے پیسے مہیا کر کے گزر بسر کرتی رہیں۔

ہندوستان لوٹنے پر سجاد ظہیر لکھنؤ سے دہلی منتقل ہو گئے تھے کیونکہ کمیونسٹ پارٹی کا سینٹرل آفس تب دہلی میں تھا۔ 1965 میں رضیہ بھی اپنے بچوں کے ساتھ وہیں آگئیں۔ 1966 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا تیس سالہ جشن بھی دہلی میں ہوا جس سے یہ تنظیم ایک بار پھر سے حرکت میں آ گئی۔

دہلی میں سجاد ظہیر حوض خاص میں رہتے تھے۔ وہیں پر ان سے ملاقات کا ذکر گوپی چند نارنگ نے بھی کیا ہے۔ انہوں نے اپنے ایک صدارتی خطبے میں جسے انہوں نے 'بنّے بھائی سید سجاد ظہیر' کے نام سے شائع کیا، کہا ہے:

''1971 میں جنوبی دہلی میں آئی آئی ٹی کے قریب سرودو دیہ انکلیو میں مقیم ہوا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ سجاد ظہیر پڑوس میں حوض خاص میں رہتے تھے۔ ایک دن حوض خاص مارکیٹ میں گوشت خریدتے ہوئے مل گئے۔ گرمیوں کے دن، پسینے میں تر ایک شخص ململ کے نفیس لکھنوی کرتے کی آستین چڑھائے ہوئے موجود تھا۔ وہی شگفتہ چہرہ، وہی تبسم ریز نگاہیں۔ برسوں بعد بھی انہوں نے پہچان لیا۔ پوچھا کہاں رہتے ہیں، میں نے مکان کا پتہ دیا۔ اشارے سے بتایا اور ادھر ہی Y-24 حوض خاص میں رہتا ہوں۔ میں نے کہا حاضر ہوں گا۔ کہنے لگے پہلے بتایئے حال ہی میں 'نقوش' کا افسانہ نمبر نکلا ہے آپ کے پاس ہوگا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ آپ کے یہاں پہنچا دوں گا۔ کہنے لگے نہیں میں خود آؤں گا۔ اگلے دن تشریف لائے، جو جو رسالے ان کی ضرورت کے تھے لے گئے۔ اس کے بعد میری ان سے ملاقات اکثر ہونے لگی۔ کبھی کبھی رضیہ آپا سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ بکارڈی اور شیری وہیں ریک میں کتابوں

کے ساتھ رکھی رہتی تھی۔ جب جب دہلی میں ہوتے یاد فرما لیتے۔"(۴)

رہائی کے بعد سجاد ظہیر کتنے دن لاہور میں رہے اس بات کی وضاحت قدرے ضروری ہے۔ حمید اختر نے کہا ہے مچھ جیل سے رہائی کے بعد وہ تقریباً دو ہفتے لاہور میں 49 لارنس روڈ پر نواب زادہ امتیاز علی مرحوم کے گھر پر رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے کئی ساتھیوں کے ہمراہ روزانہ شام کو ان سے ملنے جاتے تھے اور گھنٹوں ان کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کی وجہ سے 49 لارنس روڈ پر پولیس نے باقاعدہ چوکی قائم کردی تھی۔ جب بھی سجاد ظہیر کہیں باہر جاتے تو ان کی گاڑی کے آگے پیچھے پولیس کی گاڑیوں اور جیپوں کا سلسلہ ہوتا تھا۔ حمید اختر نے یہ بھی کہا کہ ایک روز بنے بھائی نے ان کے دونوں بھائیوں سے جنہیں وہ پہلے مل چکے تھے دوبارہ ملنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ انہیں گاڑی میں لے گئے لیکن پولیس کا قافلہ وہاں بھی ان کے پیچھے ہی چلتا رہا۔

اس بیان سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بنے بھائی کافی عرصہ لاہور میں رہے۔ لیکن کچھ لوگ اس سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔ حمید اختر کے بیان کے برعکس عبدالرؤف ملک نے کہا ہے کہ بنے بھائی چند ہی روز لاہور میں رہے جس دوران وہ یہی کوشش کرتے رہے کہ انہیں بطور پاکستانی شہری کے پاسپورٹ مل جائے لیکن حکومت نے انہیں پاسپورٹ دینے کی بجائے فوراً ملک سے باہر چلے جانے کا حکم دے دیا۔ سبط حسن نے بھی اپنی کتاب 'مغنی آتش نفس۔ سجاد ظہیر' میں بھی ایسا ہی کچھ لکھا ہے۔ ان کی کتاب سے ذیل کا اقتباس لکھا جاتا ہے:

> "ان کے پاکستان میں قدم رکھنے سے پیشتر ہی ان کی گرفتاری کا پروانہ جاری ہوگیا تھا۔ وہ جب تک پاکستان میں رہے روپوش رہے یا پھر گرفتار اور جب وہ رہا ہوئے تو انہیں دو دن کے اندر ملک بدر کر دیا گیا۔ اس نیک سلوک کے باوجود سجاد ظہیر جب تک زندہ رہے ان کی برابر یہ کوشش رہی کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان دوستی اور محبت کے رشتے قائم ہو جائیں۔"(۵)

ان تینوں اشخاص کے بیان سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ سجاد ظہیر مچھ جیل سے تو دو تین روز بعد لاہور آئے لیکن لاہور میں بھی حکومت نے انہیں شاید اتنے ہی دن رہنے دیا اور انہیں غیر قانونی طریقے سے ملک سے نکال دیا۔

ہندوستان آنے کے بعد ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ ادیبوں نے انہیں ہندوستان میں اس تحریک کے حالات سے آگاہ کیا اور یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ اس انجمن کی تنظیم کو نئے سرے سے تشکیل کریں۔ اس سلسلے میں مئو (ضلع اعظم گڑھ) میں ترقی پسند ادیبوں کا ایک اجتماع مارچ 1956 میں ہوا جس میں یہ غور کیا گیا کہ کیا ترقی پسند ادبی تحریک کو برقرار رکھا جائے یا اسے کوئی اور موزوں شکل دے دی جائے۔ چونکہ اس اجتماع میں سارے ادیب موجود نہیں تھے اس لیے یہ فیصلہ لیا گیا کہ سید احتشام حسین کو ایک نئی تنظیمی کمیٹی کا کنوینر بنایا جائے جو تمام ادیبوں سے مشورہ کر کے اس مسئلے کو حل کریں۔

1956 میں ہی حیدر آباد میں انجمن کی کل ہند کانفرنس ہوئی جس میں کافی تعداد میں ادیب موجود تھے۔ وہاں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے بحث و مباحثہ ہوا۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر عبد العلیم نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں اس موقع پر یہ مشورہ دوں گا کہ اپنے خیالات و نظریات کی ترویج کے لیے ایسا ادارہ بنانا زیادہ مفید ہوگا جس میں ہر مکتب خیال کے ادیب و شاعر شامل ہوں۔ اسی طرح سے ہم دوسرے گروہوں سے تبادلہ خیال کر کے ان کو متاثر کر سکتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ رجعت پسندی کا مقابلہ الگ رہ کر نہیں کیا جا سکتا اس لیے سب کو متحد کرنا پڑے گا اور اس اتحاد کے بعد ہی ترقی پسند عناصر باقی رہیں گے۔ اس میٹنگ میں تحریک کے بانی سجاد ظہیر بھی موجود تھے۔ انہوں نے بھی اس جلسے میں تقریر کی جس میں انہوں نے کہا:

> '' پہلے میری رائے یہ تھی کہ انجمن کو دوبارہ منظم کرنا۔ مرکز اور شاخوں میں ربط پیدا کر کے اسے باعمل بنانا۔ لیکن اب اس رائے پر قائم نہیں ہوں۔ اس کو بدلنے کے لیے تیار ہوں۔
>
> اس وقت ہمارے سامنے ایسے ہی مسائل ہیں جو نظریاتی اختلافات کے باوجود ہم سب کے کے لیے ایک ہی اہمیت رکھتے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں اور ادیبوں کے باجود ہم سب کے سامنے نئے ہندوستان کی تعمیر و ترقی کا مسئلہ ہے۔ ہمیں وطن کی تہذیب اور ادب کی تعمیر کرنی ہے۔ نئے انسان کی شخصیت کی تعمیر میں جو رکاوٹیں حائل ہوں ان کو دور کرنے کے لیے مل کر جد و جہد کرنی ہے۔ آج ہند کی نئی تعمیر جمہوریت اور اشتراکیت کی بنیادوں پر ہو رہی ہے جس

پر عظیم اکثریت کو اتفاق ہے۔ اس نظام کو قائم کرنے کے لیے سارا ہندوستان کوشاں ہے۔ ترقی پسند مصنفین کی بنیاد یہ تھی کہ ہم آزادی حاصل کریں اور انگریز سامراج کو ہندوستان سے باہر نکالنے کی جدوجہد میں ادبی جنگ کریں۔
آج ہمارے پاس متحد ہونے کے لیے دوسری بنیادی اتحاد موجود ہے۔ ان بنیادوں پر آج تمام لکھنے والوں کو متحد کیا جاسکتا ہے۔

ہماری تنظیم کوئی سیاسی تنظیم نہیں ہوگی۔ ہمارا مقصد ادب کے ذریعہ اپنے خیالات کی ترویج ہے۔ ادیبوں میں خیالات کے اعتبار سے اختلاف ہوسکتا ہے اور ضروری ہے۔ اور یہ اختلاف تنظیم کے اندر رہ کر بھی پیدا ہوسکتے ہیں اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ ان کا اظہار جمہوری طریقے سے ہو۔ ہم اپنے اختلافات کو کم کرنے میں اور مشترکہ باتوں کو لے کر آگے بڑھنا ہے۔ اب اس تنظیم کا نام چاہے کچھ بھی ہو۔''(۶)

ہندوستان میں اپنی شہریت مضبوط کر لینے کے بعد انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کو نئے سرے سے تنظیم کرنے کا کام سنبھال لیا۔ 1949 میں کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری بی۔ٹی۔ رناڈے نے انتہا پسندانہ پالیسی اختیار کی تھی جس کی وجہ سے انجمن ترقی پسند مصنفین کا شیرازہ کافی حد تک بکھر گیا تھا۔ اگرچہ 1942 میں کمیونسٹ پارٹی سے پابندی ہٹالی گئی تھی لیکن سجاد ظہیر کے لیے دونوں تنظیموں کے لیے کام کرنا قدرے مشکل تھا۔ اس وقت کمیونسٹ پارٹی نے اپنے نصب العین میں کئی اہم تبدیلیاں کیں جن کا مقصد یہ تھا کہ ادیبوں اور قلمکاروں کو پارٹی کی پالیسیوں کا ہمنوا بنایا جائے۔ لیکن نتیجہ الٹا نکلا۔ اس سے ترقی پسند تحریک میں انتشار کے آثار پیدا ہوگئے۔ پارٹی کی انتہا پسندی کو اس وقت سجاد ظہیر کی بھی ہمدردی حاصل تھی اگرچہ بعد میں انہوں نے اس غلطی کا اعتراف کیا اور اس کی تلافی کی کوششیں بھی کیں۔ لیکن اب حالات بدل چکے تھے۔ اگرچہ سجاد ظہیر نے ہندوستان آکر ایک بار پھر ایک متحدہ تحریک بنانے کی کوشش کی لیکن اب ادیبوں وشاعروں کی نسل بدل چکی تھی جو نئے رجحانات کی تشخیص کے لیے نئے رہبر اور نئے طرزِ عمل کی تلاش میں تھے۔

سجاد ظہیر نے جو ایفروایشین رائٹرز کی پہلی کانفرنس 1956 میں دہلی میں منعقد کی تھی اسے

جواہر لال نہرو نے بھی خطاب کیا تھا۔ سوویت یونین سے اور پاکستان سے بھی کئی نمائندوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ پاکستان سے دونوں ملکوں کے ہر دل عزیز شاعر فیض احمد فیض اور ان کے ساتھ عبدالمجید سالک نے شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس میں یہ فیصلہ ہوا کہ ایفروایشین رائٹرز کی اگلی کانفرنس 1958 میں تاشقند (روس) میں ہوگی۔ 1958 کی کانفرنس بہت کامیاب رہی تھی۔ اس میں 41 ممالک کے ادیبوں نے حصہ لیا تھا۔ اس کے بعد ایک کانفرنس کولمبو میں 1959 میں ہوئی اور پھر اس کی چوتھی کانفرنس 16 سے 20 نومبر 1970 تک دہلی میں ہوئی۔ سجاد ظہیر نے اس کی طویل روداد قلمبند کی ہے۔ یہ کانفرنس دہلی کے وگیان بھون میں ہوئی تھی۔ اس میں بڑی بھاری تعداد میں 33 ملکوں کے نمائندوں نے شرکت کی تھی اور آٹھ ملکوں کے مشاہد بھی حاضر تھے۔ ان کانفرنسوں کی روداد جو سجاد ظہیر نے خود قلمبند کی ہے اسے ان کے داماد علی باقر نے اپنی کتاب Sajjad Zaheer-Pen & Vision میں شامل کیا ہے۔

انہوں نے مارچ 1968 اور مئی 1973 کے درمیان جو خطوط اپنی بیٹی نجمہ اور اس کے خاوند علی باقر کو لکھے تھے وہ باقر نے اپنے مضمون 'کالی پوت کے لچھے' میں شائع کیے ہیں۔ یہ خط الگ الگ جگہوں سے لکھے گئے تھے جن میں دہلی، حیدرآباد، سری نگر، الجیریا، روم، اور ماسکو کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ باقر نے لکھا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ خط نصف ملاقات ہوتا ہے لیکن بنے بھائی کا خط آدھی ملاقات سے زیادہ ہوتا تھا۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بڑی تفصیل سے لکھتے تھے۔ ان تمام خطوں سے تو یہاں اقتباس نہیں لیا گیا مگر چند خطوں کے ٹکڑے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ 13 مئی 1968 کے خط میں لکھتے ہیں:

> "میں پچھلے دنوں بہت مصروف تھا۔ کارل مارکس کی ڈیڑھ سو سالہ برسی کے موقع پر میں نے سپر ہاؤس میں ایک مقالہ پڑھا" کارل مارکس کا اثر ہندوستانی ادب پر"۔ حالانکہ میں اپنے مقالے سے زیادہ مطمئن نہیں تھا مگر لوگوں نے اسے پسند کیا جس سے میری پست ہوتی ہوئی انا کو سہارا ملا۔" (۷)

12 جون 1968 کے خط میں فرانس میں ہو رہی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے۔ تب وہ جنوبی ہندوستان کے دورے سے لوٹ کر آئے تھے۔ لکھا ہے:

"ان دنوں فرانس میں کس قدر عمدہ تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ کارل مارکس کا کہا سچ ہو رہا ہے اور سرمایہ داری نظام مغرب سے متمول ممالک میں بہت جلد دم توڑ دے گا۔ان دنوں مجھے پیرس کے وہ حصے یاد آتے ہیں جہاں میں نے مہینوں قیام کیا تھا۔اب تو انگلستان میں بھی حد یہ ہے کہ سوتے ہوئے آکسفورڈ میں بھی طلبا نے زور دکھانا شروع کر دیا ہے۔"(۸)

ماسکو اور تاشقند کے دورے کے بارے میں اپنے 30 ستمبر 1968 کے خط میں لکھا ہے کہ پرسوں یعنی 28 ستمبر کی شام کو وہ تاشقند سے ماسکو پہنچے۔وہ دہلی سے سیدھے تاشقند گئے تھے۔ لکھتے ہیں کہ کابل میں تاشقند کا جنازہ نکل چکا تھا اس لیے مجبوراً تین دن انہیں وہیں رکنا پڑا۔اسی خط میں لکھا ہے:

"تم کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میری نظموں کا مجموعہ' پگھلا نیلم' روسی زبان میں چھپ گیا۔کل مجھے اس کی کاپیاں ملیں۔یہاں پہلے اس کا نثری ترجمہ کیا گیا پھر ایک مشہور شاعر نے اسے منظوم کیا۔کل ایک روسی دوست نے دعوت کی تھی۔وہاں ہمارے سفیر کیول سنگھ بھی مدعو تھے۔ماسکو میں غالب کی سو سالہ یوم پیدائش کے جشن کی بڑی زبردست تیاریاں ہو رہی ہیں۔کیول سنگھ خوب آدمی ہیں، نہایت مہذب اور پڑھے لکھے۔ان کے کہنے سے غالب پر میں نے بھی ایک مضمون لکھا ہے۔"(۹)

علی باقر نے کل 24 خطوط کا اقتباس اپنے مضمون میں دیا ہے۔اس میں جو آخری خط لکھا گیا ہے وہ 26 مئی 1973 کا تھا۔اس خط میں سجاد ظہیر نے ایفرو ایشین رائٹرز کی میٹنگ جو ماسکو میں ہونے والی تھی اس کا سرسری طور پر ذکر کیا ہے۔کہا ہے ابھی ابھی مجھے ماسکو سے ایفرو ایشین رائٹرز کی ماسکو والی میٹنگ کی تیاری کے لیے بات چیت کرنے کا دعوت نامہ ملا ہے۔یہ بھی لکھا ہے کہ وہ 5 جون ماسکو کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔اس خط میں یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ ماسکو سے ان کا لندن آنا ابھی ناممکن ہے۔وہاں سے دس دن بعد وہ لندن پہنچے اور ڈھائی مہینے اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ رہے۔علی باقر لکھتے ہیں کہ خطوں کے ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ تحریریں اس انسان کی ہیں جس نے دوستی کے رشتے کو دیگر رشتوں پر ترجیح دی۔

نجمہ اور علی باقر کو جو خطوط سجاد ظہیر نے وقتاً فوقتاً لکھے ان کی کل تعداد ستر ہے۔ ان میں سے 24 خطوں سے اقتباسات' کالی پوت کے لچھے' میں دیئے گئے ہیں۔ ان 24 خطوں سے بھی چند ہی خطوں سے اقتباس یہاں بیان کیا گیا ہے کیونکہ دیگر خطوں میں زیر نظر موضوع سے متعلقہ کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔ اس کے علاوہ جو دوسرے خطوط دستیاب ہوئے ہیں وہ انہوں نے مختلف دوستوں کو لکھے تھے۔ جوالائی 1962 اور نومبر 1965 کے درمیان انہوں نے چھ خط عارف نقوی کو لکھے۔ اگست 1966 اور ستمبر 1967 کے بیچ چار خط وقار صدیقی کو، جنوری 1967 اور دسمبر 1968 کے بیچ پانچ خط اپنے تامل ناڈو کے ساتھی رام ہبرانیم کو لکھے۔ اس کے علاوہ تین اور خط بھی دستیاب ہوئے ہیں جو انہوں نے اختر سعید خان کو لکھے۔ یہ خط 1966 اور 1969 کے عرصے میں لکھے گئے تھے۔ اختر سعید خان کے نام ایک اور خط بھی دستیاب ہوا ہے جو 9 مارچ 1960 کو لکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ دو خط انہوں نے لندن سے جولائی 1973 میں سبط حسن کو لکھے تھے جو سبط حسن نے اپنی کتاب 'مغنی آتش نفس۔ سجاد ظہیر' میں شامل کیے ہیں۔ عبدالرؤف ملک نے بھی ایک خط پورے کا پورا اپنی کتاب' سجاد ظہیر۔ مارکسی دانشور اور کمیونسٹ رہنما' میں درج کیا ہے۔ یہ خط بنے بھائی نے واجدہ تبسم کو لکھا تھا۔ رؤف ملک نے اس خط کی تاریخ نہیں لکھی۔ یہ تمام خطوط مختلف موضوع پر روشنی ڈالتے ہیں جو بنے بھائی کے زیر غور تھے۔ لیکن یہ تمام خطوط اتنے اہم نہیں ہیں کہ ان پر تفصیل سے بحث کی جائے۔ البتہ راقم الحروف ایک خط کا اقتباس درج کرنا چاہے گا جو جگن ناتھ آزاد سے متعلقہ ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے جو تذکرہ کیا ہے وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

> ''سکھر جیل سے بنے بھائی کے خطوط پاکستان کے سنسر کی قینچی سے گزر کر لکھنؤ پہنچتے تھے۔ بعض خط جوں کے توں مل جاتے بعض میں اکثر مصرعوں پر اس طرح سیاہی پھیری ہوتی کہ سارا مفہوم بدل جاتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے میں وزیر منزل پہنچا۔ بنے بھائی کی بیٹی نسیم نے مجھے بنے بھائی کا ایک خط دکھایا جس کے اکثر فقروں پر سیاہی پھیری ہوئی تھی۔ رضیہ بھابی نے کہا ''جگن اس خط نے تم پر اتنا بھی اثر نہیں کیا کہ تم اس پر ایک نظم کہہ سکو'' نہ جانے ان کے الفاظ میں کیسا طلسم

تھا کہ اس سینسر شدہ خط کے بارے میں اسی وقت ایک نظم ہوگئی جو اس طرح ہوئی تھی۔

یہ اک معصوم فقرے پر سیاہی پھیرنے والوں
کسی نے وقت کی پرواز کو روکا بھی ہے اب تک
کسی بلبل کے نغمے تک کوئی صیاد پہنچا ہے
کسی نے گرمیٔ آواز کو روکا بھی ہے اب تک
شکست انجام کوئی ساز ہوجائے تو ہوجائے
کسی نے نغمہ ہائے ساز کو روکا بھی ہے اب تک
کسی نے پھول کی خوشبو کو بھی زنجیر پہنائی
کسی نے گلستاں کے راز کو روکا بھی ہے اب تک
یہ الفاظ محبت باپ نے بیٹی کو لکھے ہیں
ان الفاظِ محبت پر یہ وحشت کس لیے آخر
جو اپنے باپ کا ہر لفظ پڑھ لیتی تو کیا ہوتا
یہ اک معصوم بچّی سے عداوت کس لیے آخر
یہ جن دو چار لفظوں پر سیاہی تم نے پھیری ہے
انہی لفظوں میں پوشیدہ ہے سورج کی درخشانی
مثبت ہے جو ظلمت آج اس ننھے سے فقرے پر
اسی ظلمت پہ بجلی بن کے ٹوٹے گی یہ تابانی
یہی تحریر جس کو تم نے روکا ہے ابھرنے سے
جب ابھرے گی تو بن جائے گی اک سیلاب نورانی
یہ دیکھو فکر انسانی سے ابھری نور کی دنیا
بڑھا دنیائے زنداں سے وہ اک سیلابِ نورانی
خدا حافظ تمہاری ان سیاہی کی لکیروں کا
معاذ اللہ موجِ نور کا اندازِ تغیانی

1973 میں وہ تاشقند گئے تھے جس کے بارے میں انہوں نے نجمہ کوایک خط کے ذریعے اطلاع بہم پہنچائی تھی۔ یہ کانفرنس 11 اور 12 دسمبر کو ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے ادیبوں کے درمیان ہوئی تھی۔اس سے پہلے ماسکو میں ایفروایشیائی ادیبوں کے مستقل بیورو کی ایک میٹنگ بھی ہوئی تھی جس میں بنے بھائی نے شرکت کی تھی۔ بعد میں ان کو تاشقند جانا تھا لیکن ماسکو میں ہی انکی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ان کے خاص اور دیرینہ دوست حمید اختر نے ان کی وفات سے ایک دو برس پہلے ماسکو میں ان سے اپنی آخری ملاقات کا ذکر اپنی کتاب 'آشنائیاں کیا کیا' میں کچھ اس طرح کیا ہے:

''انتقال کے ایک دو برس پہلے ماسکو کے یوکرین ہوٹل کی لابی میں اچانک وہ سامنے سے آتے نظر آئے۔ مجھے یاد ہے میں نے لپک کر گلے ملتے ہوئے بے اختیار ان سے کہا'' بنے بھائی اتنی مدت کے بعد ملاقات ہوئی بھی تو کہاں؟'' کہنے لگے'' بھائی ہماری تمہاری ملاقات یہیں ماسکو میں ہوسکتی ہے۔'' ہمارے پاس ایک شام تھی۔ وہ اگلے روز واپس ہندوستان جا رہے تھے۔ چنانچہ وہ شام بلکہ پوری رات ہوٹل یوکرین میں ان کے کمرے میں گزری۔ بہت سے ہندوستانی اور پاکستانی احباب جمع تھے۔ کچھ روسی دوست بھی تھے۔ وہاں ہم اپنے ماضی کی داستانیں دہراتے رہے، شعر پڑھتے رہے، آنے والے اچھے دنوں کا ذکر کرتے رہے، مشترکہ دوستوں کو یاد کرتے اور پھر مل بیٹھ کر پروگرام بناتے رہے۔اس شام جن دوستوں کی باتیں ہوئیں ان میں سے بیشتر اب ہم میں نہیں۔ یہ آخری ملاقات اب بہت یاد آتی ہے۔''(۱۱)

سبھاش مکھوپادھیائے بنے بھائی کے ساتھیوں میں سے تھے اور ادبی تحریک سے منسلک تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ ماسکو کانفرنس میں حصہ لینے کے لیے گئے تھے۔ سجاد ظہیر کی وفات پر انہوں نے ایک مضمون 'اور بنے بھائی ہم سے بچھڑ گئے' کے نام سے لکھا تھا جو ہفت روزہ 'حیات' نئی دہلی کے سجاد ظہیر نمبر 11 نومبر 1973 میں شائع ہوا تھا۔ وہی مضمون بعد میں ڈاکٹر سید جعفر احمد کی ترتیب کردہ کتاب 'سجاد ظہیر۔ شخصیت اور فکر' میں بھی چھاپا گیا۔ اس میں وہ سجاد ظہیر کی وفات کے کچھ ہی لمحے پہلے کی اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے سجاد ظہیر کو الما آتا کے گراؤنڈ فلور کے ایک

ریستوران میں آخری بار دیکھا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس روز بھی بنّے بھائی وہاں ذرا دیر سے پہنچے لیکن وعدہ کیا کہ وہ کانفرنس کے لیے وقت پر ضرور پہنچ جائیں گے۔ اس لیے مکھو پادھیائے کو کہا کہ وہ پہلے چلے جائیں۔ وہ کہتے ہیں جب کانفرنس شروع ہوئی اور بنّے بھائی نہ پہنچے تو انہیں فکر سرزد ہوئی اس لیے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اس کانفرنس میں ہندوستانی وفد کی طرف سے بنّے بھائی نے رپورٹ پڑھنی تھی۔ یہ رپورٹ انہوں نے پڑھنے سے پہلے اپنے ساتھیوں کو سنائی تھی اور سب نے بہت پسند کی تھی۔

کچھ دیر کے بعد عطر سنگھ اس کانفرنس میں آئے اور انہوں نے سب کو بتایا کہ بنّے بھائی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ نہیں آپائیں گے۔ لہٰذا جو رپورٹ بنّے بھائی پڑھنے والے تھے اس کی ذمہ داری عطر سنگھ کو ہی دی گئی۔ ایک دن پہلے سے ہی ان کی طبیعت قدرے ناساز ہوگئی تھی۔ وہ سب کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے نہیں پہنچے تھے اس لیے سب کو تشویش ہونے لگی تھی۔ کچھ دوست جب ان کے نہ آنے کی وجہ جاننے کے لیے ان کے کمرے میں گئے تو انہیں لیٹا ہوا پایا۔ لیکن انہوں نے سب کو اطمینان دلایا کہ طبیعت تو ٹھیک ہے لیکن ذرا معدے کو آرام دینے کے خیال سے لنچ سے گریز کیا تھا۔ لیکن اگلے ہی دن انہیں اسپتال پہنچا دیا گیا جہاں کسی کو بھی ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس بار جو دل کا دورہ انہیں پڑا تھا وہ بہت سخت تھا۔ ان حالات کا تذکرہ مکھو پادھیائے ذیل کے لفاظ میں کرتے ہیں:

> ''اگلے دن مریم سلگانیک نے بتایا کہ دورہ بہت سخت تھا۔ ہم نے ماسکو میں اپنے سفیر کو ٹیلیفون کیا کہ وہ رضیہ آپا کو اطلاع کردیں اور اس سے کہیں کہ نسیم کو بھیج دیں اس لیے کہ وہ روسی زبان جانتی ہیں۔ ان کے ٹکٹ اور ویزا کا انتظام سوویت ادیبوں نے کیا۔ بنّے بھائی کی دیکھ بھال کے لیے ہم لوگ خود رکنا چاہتے تھے لیکن زبان نہ جاننے کی وجہ سے ہمارا ہونا نہ ہونا بیکار ہوتا۔ ہمارے ساتھ کے نوجوان ترجمان نے چوبیس گھنٹے ان کے پاس رہنے کا ذمہ لیا۔ تیسرے دن ہمیں پتہ چلا کہ ان کا درد کم ہوگیا ہے، انہوں نے کھانا کھایا، سوئے اور ترجمانوں سے بات چیت کی۔ ان سے کانفرنس کے بارے میں پوچھا اور ہم لوگوں کو کہلوایا کہ پریشان نہ ہوں۔ لیکن اس کے بعد والے دن ان کی

حالت پھر بگڑ گئی۔ ماسکو سے دل کے امراض کے ایک ماہر پروفیسر کو مشورے کے لیے الما آتا لایا گیا۔ قزقستان کے وزیر صحت خود ان کے علاج کی نگرانی کر رہے تھے۔ جس طرح کی دیکھ بھال اور علاج بنے بھائی کو الما آتا میں ملا اس کا یہاں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہم لوگ بادل نخواستہ سوویت یونین، ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے ادیبوں کی میٹنگ کے لیے تاشقند چلے گئے اس لیے کہ ہمیں اپنے الما آتا کے دوستوں پر اعتماد تھا کہ وہ بنے بھائی کے دوا علاج میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ اور اس میٹنگ کی کامیابی کے لیے بنے بھائی نے بیمار پڑنے سے پہلے بڑی محنت کی تھی۔ 13 ستمبر کی رات سمرقند پہنچنے کے ذرا ہی دیر بعد ہمیں اطلاع ملی کہ بنے بھائی انتقال کر گئے۔ چاروں ملکوں کے ادیب جو اس وقت موجود تھے سکتے میں رہ گئے۔ بنے بھائی کی بے وقت موت پر ہم سب کو ایک سا رنج تھا۔ ہم سب کے دلوں میں ایک ہی جذبات تھے۔ ہم نے ہوٹل کی لابی میں جلسہ کیا اور ہم نے دیکھا کہ جو نوجوان ہم لوگوں کے ساتھ ترجمانوں کی حیثیت سے کام کر رہے تھے وہ زار و قطار رو رہے تھے۔'' (۱۲)

موت تو سبھی کو آتی ہے لیکن سجاد ظہیر نے ایک شاندار موت پائی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ انہوں نے اس ملک میں وفات پائی جو انہیں بہت عزیز تھا اور ان ادیبوں کی کانفرنس کے دوران جو انہیں بہت عزیز تھے۔ ان عزیزوں نے انہیں بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن ناکام رہے۔

سجاد ظہیر کے ایک اور دوست کنہیا جی تھے۔ انہوں نے بھی سجاد ظہیر سے اپنی آخری ملاقات کا ذکر بڑے درد بھرے لہجے میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''جس حالت میں بنے بھائی اپنی زندگی کا آخری رول ادا کرنے کے لیے ہم سے جدا ہوئے وہ حالت بہت درد بھری تھی۔ الما آتا ہوٹل (قزاقستان) کی آٹھویں منزل کے جس کمرے میں وہ ٹھہرے تھے، وہاں سے ڈاکٹر میری آنکھوں کے سامنے انہیں اسپتال لے گئے تھے۔ جب ہم انہیں اسٹریچر پر لٹا

رہے تھے تب انہوں نے کہا تھا ''اب میں تاشقند نہیں جاؤں گا۔'' اور جب ان کا اسٹریچر ایمبولنس پر رکھا گیا تو انہوں نے آہستگی سے کہا ''کانفرنس کامیاب ہو۔'' اسٹریچر پر لٹائے جانے سے پہلے بنے بھائی نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کے بکسے کے اندر اوپر کی جیب میں ایک لفافہ ہے، اسے میں اپنے پاس رکھ لوں۔ میں نے ان سے پوچھا تھا ''آپ کا کوئی پیغام'' تو انہوں نے کہا تھا ''فکر نہ کیجئے، میں جلدی ہی اچھا ہو جاؤں گا۔'' اور وہ زندگی کی جدوجہد کے بارے میں گہری اور اتھاہ امید کا انتظار کرتے ہوئے ہم سے جدا ہو گئے۔

4 ستمبر کی صبح الما آتا کے ہوٹل میں ملاقات کے دوران بنے بھائی نے بڑی بے تابی کے ساتھ روزنامہ 'جن یگ' کی اشاعت کا حال پوچھا تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ 13 ستمبر سے روزنامہ 'جن یگ' شائع ہونا شروع ہو جائے گا تب انہوں نے خوشی ظاہر کرتے ہوئے فرمایا تھا ''میں اپنے اس انقلابی اخبار میں الما آتا کانفرنس کی رپورٹ لکھوں گا۔'' ان کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے خیالات کا بیان کرنے والے اخبار کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔ وہ خود ایک سلجھے ہوئے ادیب تھے ایک کامیاب اتحاد کردہ اور ایک ملنسار دوست کے علاوہ ایک کامیاب صحافی بھی تھے۔'' (۱۳)

انوار علیم جانوف واحد روسی ادیب تھے جن کا سجاد ظہیر سے آخری بات کرنا مقدور تھا۔ انہوں نے اپنے مضمون 'آخری ملاقات، آخری باتیں' میں لکھا ہے کہ حالات کچھ ایسے تھے کہ وہ دنیا کا پہلا شخص بن گیا جس سے سجاد ظہیر نے آخری بار بات کی تھی۔ یہ 8 ستمبر 1973 کی بات ہے۔ وہ اس وقت اسپتال کے بستر پر تھے اور انہوں نے جانوف سے الفارابی کے متعلق مندرجہ ذیل گفتگو کی تھی:

''مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہے کہ میں کل الفارابی والے اجلاس میں تقریر نہ کر سکوں گا۔ اس عظیم انسان کے بارے میں چند لفظ کہنے کا میرا بڑا جی چاہتا تھا۔ الفارابی ایک بہت بڑا مفکر تھا جس نے روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کی برابری کا خواب دیکھا تھا۔ نوح انسانی کی اخوت کا خواب دیکھا

تھا۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ مجھے بستر سے اٹھنے اور اجلاس میں شرکت کرنے کی اجازت نہیں حالانکہ آج میں اس دیس میں ہوں جہاں اس نے جنم لیا تھا۔۔۔۔ خیر، مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ ہماری ایفروایشیائی ادیبوں کی کانفرنس اتنی اچھی چل رہی ہے۔ تم اپنے پھول ذرا اوپر رکھ دو، ادھر الماری پر تاکہ میں انہیں دیکھ سکوں اور اب تم جاؤ۔ مجھے پتہ ہے کہ تم اس کانفرنس میں کس قدر مصروف ہو۔'' (۱۴)

جانوف نے لکھا ہے کہ یہ سجاد ظہیر کے آخری لفظ تھے کیونکہ اگلے ہی دن وہ بے ہوش ہو گئے تھے جس کے بعد انہیں کوئی بھی نہ مل سکا۔ جانوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ سب سے پہلے بنے بھائی سے ایفروایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں 1958 میں تاشقند میں ملے تھے۔ اس کے بعد ان کی اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں اور وہ ان سے اور ان کی رفیقہ حیات رضیہ سجاد ظہیر سے اچھی طرح مانوس ہو گئے تھے۔ سجاد ظہیر نے سوویت یونین کی قوموں کی ہندوستان سے دوستی کے بلند مقاصد کے لیے بھرپور کوشش کی تھی تاکہ سوویت ادیب ہندوستانی ادیبوں کے قریب آئیں۔ جانوف نے آخر میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کمیونسٹ ادیب کو جو عقائد میں ان کا رفیق تھا، جو وفادار اور مصفا روح رکھنے والا انسان تھا، جو عزم رکھتا تھا، جو کبھی بدی یا ناانصافی کو قبول نہیں رکھتا تھا، سوویت ادیب کبھی نہیں بھول سکتے۔

بھیشم ساہنی بھی بنے بھائی کے رفیق تھے۔ اگرچہ بنے بھائی سے ان کا رابطہ 1955 میں ہندوستانی ادیبوں کے ایک جلسے میں قائم ہوا تاہم تھوڑے ہی عرصے میں وہ ان کے بہت قریب آ گئے تھے۔ دراصل جو ایفروایشیائی ادیبوں کی چوتھی کانفرنس ہوئی تھی اس میں انہیں بنے بھائی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس کے بعد 1958 ایفروایشیائی رائٹرز کی کانفرنس جو تاشقند میں ہوئی تھی اس میں بھی وہ بنے بھائی کے ساتھ تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بھی قدرت کی ہی مرضی تھی کہ بنے بھائی کا انتقال اس کانفرنس کے دوران ہوا جو ان کی آرزوؤں کے بہت قریب تھی۔ وہ اس لیے کہ اس کانفرنس میں دنیا کے 77 ممالک کے ادیب شریک ہوئے تھے جن میں پچیس ایشیائی افریقی ملکوں کے ادیب بھی تھے۔ سجاد ظہیر کی شخصیت اور ان کے حب الوطنی کے جذبے وغیرہ کے بارے میں بھیشم ساہنی لکھتے ہیں:

'' آخر دم تک ان کے شرافت نفس اور اخلاق میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس لیے کہ

ان کا اخلاق جاگیردارانہ خاندان کا ورثہ نہیں تھا بلکہ یہ ان کے مطمح نظر کا نتیجہ تھا جو ترقی پسند، متوازن حقیقتوں سے ہم آہنگ تھا جس سے ان میں بڑی ہمدردی پیدا ہوئی تھی۔ دوسروں کے ساتھ برتاؤ میں انسانیت آئی تھی۔ اپنے دوستوں اور اپنے رفیقوں پر اعتماد کرنا آیا تھا اور یہ مطمح نظر کوئی تجریدی چیز نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی حالات وعقائد کے مطابق بسر کی اور ایسے ایسے کام کیے جنہیں کرنے کی جرأت و ہمت کم ہی لوگوں میں ہوتی ہے۔ ہمارا ملک طرح طرح کی اونچ نیچ سے گزرا اور بہت سے بڑے اچھے اچھے ساتھی برے دنوں کے بوجھ تلے ٹوٹ گئے لیکن بنے بھائی کا عقیدہ واعتماد آخری دم تک مستحکم اور غیر متزلزل رہا۔" (۱۵)

علی سردار جعفری بنے بھائی کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین میں ایک لمبے عرصے تک جُڑے رہے تھے۔ جب بنے بھائی بمبئی چھوڑ کر دہلی چلے گئے تو سردار جعفری ہی انجمن کے سیکریٹری چنے گئے تھے۔ 1954 میں جب سوویت ادیبوں کی دوسری کانفرنس ہوئی تب سجاد ظہیر راولپنڈی سازش کیس میں پاکستان کی جیل میں بند تھے۔ لہٰذا اس کانفرنس میں ہندوستانی ادیبوں کے سربراہ کی حیثیت سے سردار جعفری نے ہی شرکت کی۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ایوان چہل ستون میں انہوں نے تقریر کی اور ہندوستانی ادیبوں کی طرف سے تحفے کے طور پر فیض کی نظموں کا ایک مجموعہ اور سجاد ظہیر کا نام پیش کیا تو کانفرنس کے تمام شرکت کنندگان نے کھڑے ہو کر دیر تک تالیاں بجائیں۔ یہ ہندوستانی اور پاکستانی دانشوروں کو جن کے رہنما سجاد ظہیر اور فیض تھے، سوویت ادیبوں کا خراج عقیدت تھا۔

سجاد ظہیر کنارہ کشی کر کے چلے گئے لیکن اپنے پیچھے ایک کبھی نہ مٹنے والا اثاثہ چھوڑ گئے جو زمانے کو تاابد ان کی یاد دلاتا رہے گا۔ خدا رکھے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔ بنے بھائی کی رفیقہ حیات نے بڑی ہمت کے ساتھ اس صدمے کا سامنا کیا ہے کیونکہ موت بھی زندگی کا ایک حصہ ہے اور اسے ویسے ہی قبول کرنا۔

ان کی ولادت کے 100 سال مکمل ہونے پر جگہ جگہ سیمینار منعقد کیے گئے جن میں ان کے رفیقوں کی طرف سے طرح طرح کے خراجِ عقیدت پیش کیے گئے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کے

جذبات یہاں درج کیے جاتے ہیں:

'' سجاد ظہیر کی یاد منانا در حقیقت ایک ایسے شخص کی یاد منانا ہے جس نے برصغیر کے منجمد سماج کو متحرک کرنے میں بنیادی کام کیا۔ آج معاشرت ہو، معشیت ہو یا ادب ہو ہم کسی نہ کسی طرح سجاد ظہیر کی بینائی اور فہم سے استفادہ حاصل کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس حقیقت کا اعتراف کریں نہ کریں، وہ کسی حد تک ہمارے ذہن کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔''

(ڈاکٹر محمد علی صدیقی)

'' سجاد ظہیر کی علمی و سیاسی زندگی کا ایک سادہ سا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنی جملہ توانائیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ تمام عمر ایک عظیم مقصد کے لیے سرگرداں رہے اور وہ مقصد اپنے ملک، اپنے معاشرے بلکہ ساری ہی دنیا کے انسانوں کے لیے ایک منصفانہ ماحول کے حصول کا مقصد تھا۔ وہ امن و آشتی انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کے ارتقا اور ایک خوبصورت دنیا کے خواب کو تعبیر دینے کے لیے سرگرداں رہے۔ جب تک انسان کی یہ سرگردانی باقی رہے گی سجاد ظہیر کی یادیں بھی زندہ رہے گی۔'' (ڈاکٹر سید احمد جعفر)

'' وہ ہمارے ملک کے سب سے بڑے عظیم سوشلسٹ انسان دوستوں میں تھے۔ مجھے ہر چار طرف ایک خلا کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اب جب میں ان دوستوں سے ملوں گا تو وہ مجھے بے ساختہ اپنی نظم نہ سنائیں گے۔ اس لیے کہ اب میں ان سے مل ہی نہ سکوں گا۔'' (ملک راج آنند)

میری زندگی میں خاص عنصر ان کا انتظار تھا۔ قید سے واپس آنے کا انتظار، ہندوستان میں کہیں سے واپس آنے کا انتظار، دنیا کے کسی گوشے سے واپس آنے کا انتظار۔ وہ انتظار اب تو ختم ہو گیا، لیکن مجھے ان خوابوں کی تعبیر کا انتظار ہے اور آخر وقت تک رہے گا۔'' (رضیہ سجاد ظہیر)

'' بنے بھائی کے کارنامے بیان کرنے کی نہ مجھ میں صلاحیت ہے اور نہ کسی

چھوٹے سے مضمون میں اس کی گنجائش ہے۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک ان کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اردو ادب میں اس کی دوسری کوئی مثال کم سے کم میری نظر میں نہیں ہے۔"
(کیفی اعظمی)

"جس ایک چیز کو میں اس وقت خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے سب سے زیادہ یاد کر رہا ہوں وہ ان کی دوست نوازی ہے۔ دوستی کو وہ ہر چیز سے بالاتر رکھتے تھے۔ بعض اوقات کسی مسئلے کو لے کر ہمارے درمیان اختلاف بھی ہوا ہے مگر اس سے کبھی ہمارے دوستانہ تعلقات میں فرق نہیں آیا۔ دوستی سے بڑی کوئی چیز نہیں جو ایک آدمی دوسرے آدمی کو دے سکتا ہے مگر اکثر دیتا نہیں۔ بنے بھائی دوستی دینا جانتے تھے، اسی لیے وہ سب کے بنے بھائی تھے۔ سب کے دکھ سکھ میں شریک اور اسی لیے ان کے سب دوست آج ان کے لیے سر دھن رہے ہیں اور برسوں دھنتے رہیں گے۔"
(امرت رائے)

"سوویت ادیب سجاد ظہیر کو کبھی نہیں بھول سکتے، اس کمیونسٹ ادیب کو جو عقائد میں ہمارا رفیق تھا، جو وفادار اور مصفا روح رکھنے والا انسان تھا، جو عزم محکم رکھتا تھا، جو کبھی کسی بدی یا ناانصافی کو قبول نہ کر سکتا رکھتا تھا۔" (انوار علیم جانوف)

"پھر ان کی لاش جب آخری دیدار کے لیے ونڈسر پیلس میں رکھی گئی تو میں نے سوچا کہ اب کی بار بنے بھائی کی دلکش مسکراہٹ کو دیکھنے سے محروم رہ جائیں گے۔ مگر جب میں ان کی لاش کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ پھولوں کے ڈھیر میں ان کے ہونٹ تب بھی مسکرا رہے تھے۔ موت نے بنے بھائی کا سب کچھ چھین لیا تھا لیکن مسکراہٹ موت کی زد سے پرے تھی۔"
(مجتبیٰ حسین)

آخر میں بقول فیض احمد فیض سجاد ظہیر کی موت کا سوگ نہیں بلکہ ان کی زندگی کا جشن منانا کیونکہ سجاد ظہیر جیسے لوگ کبھی مر نہیں سکتے۔ ان کے کارہائے نمایاں انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

☆☆☆☆☆☆

﴾کتابیات﴿

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	ناشر/پبلشر	سنہ اشاعت	صفحہ نمبر
۱)	سجاد ظہیر۔حیات وخدمات	زیب النسا	کیشو پرکاشن۔الہ آباد	199	78
۲)	انگارے سے پگھلا نیلم تک	سید مظہر جمیل	اکادمی بازیافت۔کراچی	2005	45
۳)	انگارے سے پگھلا نیلم تک	سید مظہر جمیل	اکادمی بازیافت۔کراچی	2005	48
۴)	سجاد ظہیر۔ادبی خدما تاور ترقی پسند تحریک	گوپی چند نارنگ	ساہتیہ اکادمی۔نئی دہلی	2007	23
۵)	مغنی آتش نفس	سبط حسن	مکتبۂ دانیال۔کراچی	2005	78
۶)	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو۔دہلی	2008	121
۷)	کالی پوت کے لچھے	علی باقر	پرگتی شیل وسودھا۔بھوپال	2005	208
۸)	کالی پوت کے لچھے	علی باقر	پرگتی شیل وسودھا۔بھوپال	2005	208
۹)	کالی پوت کے لچھے	علی باقر	پرگتی شیل وسودھا۔بھوپال	2005	209
۱۰)	بنّے بھائی	جگن ناتھ آزاد	پرگتی شیل وسودھا۔بھوپال –	2005	63
۱۱)	آشنائیاں کیا کیا	حمید اختر	بک ہوم۔لاہور	2008	23
۱۲)	سجاد ظہیر۔شخصیت اور فکر	ڈاکٹر سید جعفر احمد	مکتبۂ دانیال۔کراچی	2005	174
۱۳)	سجاد ظہیر۔ساہتیکار اور سنگھٹن کرتا	کبھیاجی	پرگتی شیل وسودھا۔بھوپال	2005	119
۱۴)	سجاد ظہیر۔شخصیت اور فکر	ڈاکٹر سید جعفر احمد	مکتبۂ دانیال۔کراچی	2005	200
۱۵)	سجاد ظہیر۔شخصیت اور فکر	ڈاکٹر سید جعفر احمد	مکتبۂ دانیال۔کراچی	2005	139

☆☆☆☆

ساتواں باب

متفرق امدادی مواد

 بنّے بھائی میرے چچا — سلیمہ ہاشمی

 سجاد ظہیر کی بیٹیوں سے گفتگو

 محترمہ شوکت کیفی سے ایک گفتگو

سجاد ظہیر کی موت پر مرثیے

حوالہ جاتی کتابیں Bibliography

(ڈاکٹر اندر بھان بھسین کے لیے خصوصی مقالہ)

بنّے بھائی میرے چچا

سلیمہ ہاشمی

۱۱رجنوری ۲۰۱۱ء

میں نے اور میری چھوٹی بہن میزو نے جب سے ہوش سنبھالا تھا ہم سجاد ظہیر کو بنّے چچا کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ ان کا میرے ابّا سے بہت نزدیک کا رشتہ تھا۔ ان کا تعلق بہت دیرینہ تھا، سنا ہی تھا۔ ابّا کے ساتھ بنّے چچا کی ملاقات 1936 میں رشید جہاں اور محمود الظفر کے توسط سے امرتسر میں ہوئی تھی۔ تب ابّا امرتسر کے ایم۔اے۔او کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ ابّا نے بچپن سے ہی کم گو طبیعت پائی تھی اس لیے کسی کے ساتھ بھی بے تکلف نہیں ہوتے تھے۔ 1936 جب وہ انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہوئے تو بنّے چچا کو بھی یہ مشکل پیش آئی تھی۔ لاہور میں ابّا ادیبوں کے ایک بہت بڑے حلقے سے منسلک تھے۔ اس لیے بنّے چچا ان کے ساتھ ہی لاہور گئے تھے تاکہ وہاں کے ادیبوں کو ترقی پسند تحریک میں شامل ہونے کی ترغیب دیں۔ وہاں ابّا نے بنّے چچا کو اختر شیرانی اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم سے اور دیگر کئی ادیبوں سے بھی ملایا تھا۔ اس کے بعد ترقی پسند تحریک کی ہر کانفرنس میں ابّا نے بنّے چچا کے ساتھ باقاعدہ شرکت کی اور اس تحریک کے کئی پہلوؤں کی وضاحت بھی کی۔ شاید 1945 کی بات ہے۔ دہلی کے کارپوریشن ہال میں ایک جلسہ ہوا تھا جس میں ابّا نے بھی تقریر کی تھی۔ بنّے چچا نے ابّا کی تقریر کی بہت تعریف کی تھی اور کہا تھا:

> ’’فیض نے بڑے عالمانہ انداز میں بڑی متانت سے یہ ثابت کر دیا کہ ترقی پسند تحریک ادب میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ سماج میں تبدیلی اور ارتقاء کے ساتھ ساتھ ادب کی تحریک ناگریز ہے البتہ اس کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہنا۔‘‘

انہوں نے کہا فیض کی تقریر کا انداز روایتی طور پہ جوشیلا اور زوردار نہیں بلکہ دھیما مگر رواں

اور متانت بھرا تھا۔ مجمع نے ان کی بات توجہ اور خاموشی سے سنی۔ نہ قہقہے لگے اور نہ تالیاں بجیں۔

ملک کی تقسیم سے جو خون بہا اور جس درندگی نے انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لیا، فیض کے لیے کسی بھونچال سے کم نہ تھا۔ اس کیفیت کو انہوں نے اپنی نظم 'صبح، آزادی 47ء' میں ڈھالا ہے۔ اسی کا حوالہ دیتے ہوئے بنے چچا نے کہا تھا کہ ''فیض کی یہ نظم (یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر) کبھی نہیں بھلائی جاسکتی۔ اس میں جذبات کی شدت کے ساتھ ساتھ جن حقائق کی حسین و نازک مصوری کی گئی ہے وہ 14 اگست 1947 کے بعد سے شروع ہونے والے پورے دور کی ماہیت کا فنکارانہ تعین کرتے ہیں اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے ان کی صداقت اور زیادہ واضح ہوتی جاتی ہے''۔

بنے چچا 1948 میں پاکستان آگئے تھے اور روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس زمانے میں ابا پاکستان ٹائمز اور امروز کے مدیر اعلیٰ تھے۔ اس وقت میں بہت چھوٹی تھی لیکن کچھ کچھ یاد آتا ہے کہ بنے چچا اکثر ملتے رہتے تھے۔ جب ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس لاہور کے اوپن ائیر تھیٹر میں منعقد ہوئی تو بنے چچا کے مشورے سے ابا نے اپنی قوالی 'تماشہ ہم بھی دیکھیں گے' پڑھی تھی جو بہت مقبول ہوئی تھی۔

پھر 9 مارچ 1951 کو حکومت پاکستان نے ابا کو راولپنڈی سازش کیس میں ملوث کر کے جیل میں بند کر دیا۔ کچھ دنوں بعد بنے چچا (جو underground تھے) کو بھی اسی سلسلے میں گرفتار کر لیا گیا۔ ابا کو مسلسل تین ماہ لائلپور جیل میں قیدِ تنہائی میں رکھا گیا تھا جہاں وہ نہ کسی سے مل سکتے تھے نہ خط و کتابت کر سکتے تھے۔ بہر حال جب انہیں تین مہینے بعد حیدر آباد (سندھ) جیل میں منتقل کیا گیا تو وہاں بنے چچا بھی تھے۔ اس جیل میں وہ تقریباً ڈھائی سال اکٹھے رہے۔ اس جیل میں یہ سہولت میسر تھی کہ قیدی زیادہ تر لوگوں سے ملاقات کر سکتے تھے۔ اس لیے امی اور ہم دو بہنیں ابا سے وقتاً فوقتاً سے ملنے جایا کرتی تھیں لیکن بنے چچا سے ملنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس طرح ہم ہی ان کا خاندان تھے۔

بنے چچا کو تھوڑے عرصے کے لیے لاہور جیل میں رکھا گیا تھا لیکن وہ قیدِ تنہائی بہت کٹھن تھی۔ اس کے مقابلے میں حیدر آباد جیل میں سب کو کافی آرام تھا۔ ابا کہتے تھے کہ سب ساتھی مل کر اتنا شور غل کرتے تھے کہ یکسوئی سے غور و فکر کرنا دشوار ہو جاتا تھا۔

راولپنڈی ''سازش'' کی چوتھی میٹنگ جو 23 فروری 1951 کو ہوئی تھی، میں ابا اور بنے چچا نے اکٹھے شرکت کی۔ ابا بنے چچا کو اس حد چاہتے تھے کہ جب ''سازش'' کے اس مقدمے کی

سماعت شروع ہوئی تو ابا نے زور دے کر کہا کہ سجاد ظہیر اس میٹنگ میں نہیں تھا اور نہ کسی طرح وہ راولپنڈی سازش سے وابستہ تھے۔ حالانکہ یہ بات حقیقت سے برعکس تھی۔

ابا کہا کرتے تھے کہ حیدر آباد میں چائے کافی وغیرہ کا انتظام بنے چچا اپنے کمرے میں ہی کیا کرتے تھے۔ ان کے قیام کے دوران سب نے مل کر کوئی دس گیارہ مشاعرے بھی کیے تھے جن میں ابا کو شاعری کی بہت داد ملتی تھی۔ بنے چچا بھی ہر مشاعرے میں شامل ہو کر اپنا کلام سناتے تھے۔ بعد میں جب جنوری 1953 میں مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا اور تمام مجرموں کو سزا دی گئی تو ابا اور بنے چچا کے حصے میں چار سال قید بامشقت اور پانچ سو روپے جرمانہ کی سزا آئی۔ اس کے بعد بنے چچا کو مچھ جیل (بلوچستان) روانہ کر دیا گیا اور ابا کو سینٹرل جیل منٹگمری (ساہیوال) بھیجا گیا۔ مچھ سے بنے چچا کے چند ہی خطوط آئے تھے کیونکہ اس جیل میں خط و کتابت کی اجازت نہیں تھی۔ ہفتے میں صرف ایک خط لکھ سکتے تھے اور وہ اکثر رضیہ چچی کے لیے ہوتا تھا۔ بہر حال جو خط بنے چچا نے ابا کے نام بھیجے تھے وہ کڑی محنت کے بعد بھی کہیں نہیں ملے۔ اگر کہیں مل جاتے تو میں ان کی ایک نقل آپ کو ضرور بھیجتی۔ بہر حال جو ہے اس پر قناعت کرنی پڑے گی۔ فی الحال ابا کے ادبی ذخیرے سے مجھے دو نظمیں دستیاب ہوئی ہیں وہ غیر مطبوعہ ہیں۔ ایک تو بنے چچا کا لکھا ہوا مرثیہ ہے جو انہوں نے ابا کے بڑے بھائی طفیل احمد خان صاحب کی موت پر لکھا تھا اور دوسری ایک نظم ہے جو مخدوم محی الدین کی تخلیق کردہ ہے۔ یہ دونوں دستاویز میں سکین (Scan) کر کے ارسال کر رہی ہوں۔

ابا نے جیل میں جو کلام لکھا تھا وہ 'دست صبا' اور 'زنداں نامہ' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ 'زنداں نامہ' کا سر آغاز بنے چچا ہی نے لکھا ہے۔ 'زنداں نامہ' کی بیشتر منظومات ابا نے لاہور سینٹرل جیل اور منٹگمری جیل میں قیام کے دوران لکھی تھیں۔ بنے چچا نے سر آغاز میں لکھا ہے کہ اگر تہذیبی ارتقاء کا مطلب یہ ہے کہ انسان مادی اور روحانی عسرت سے نجات حاصل کر کے اپنے دلوں میں گداز، اپنی بصیرت میں حق شناسی اور اپنے کردار میں استقامت اور رفعت پیدا کریں اور ہماری زندگی مجموعی اور انفرادی حیثیت سے بیرونی اور اندرونی طور پر مصفا بھی ہو اور معطر بھی، تو فیض کا شعر غالباً ان تمام تہذیبی مقاصد کو چھو لینے کی کوشش کرتا ہے۔ 'دست صبا' کا کلام زیادہ تر حیدر آباد جیل کا پیدا کردہ ہے۔

جیل میں ابا اپنے ہندوستانی دوستوں کو بہت یاد کرتے تھے اور جب بنے چچا ان سے آ ملتے تھے تو

پھر صرف ان لوگوں کی ہی باتیں ہوتی تھیں۔ وہ دونوں جوش ملیح آبادی، فراق گھورکھپوری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور ملک راج آنند کی کمی بری طرح محسوس کرتے تھے۔ میجر محمد اسحٰق نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ حیدر آباد میں انہوں نے ابا کو شاگرد کے رول میں بھی دیکھا ہے جب وہ سجاد ظہیر سے فرانسیسی زبان سیکھا کرتے تھے۔ اس بات کا ذکر انہوں نے اپنے ایک خط میں بھی کیا ہے جو انہوں نے میری امی کے نام لکھا تھا۔

بنّے چچا جب پچھ جیل سے رہا ہو کر آئے تو ابا دوسرے لوگوں کے ساتھ موجود تھے۔ ہم نے دیکھا کہ اگرچہ بنّے چچا کا وزن کم ہوا تھا ان کی صحت اچھی ہو گئی تھی۔ وہیں انہوں نے ابا کو بتایا تھا کہ انہوں نے جیل میں کتاب 'ذکر حافظ' لکھی۔ اس کتاب کا مسودہ ابا کے کاغذات سے برآمد ہوا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ اسے بنّے چچا کی خوبی کہوں یا عیب کہ وہ اپنی تکلیفات کو دوسروں پر کبھی ظاہر نہیں کرتے تھے۔ جن جن لوگوں کو انہوں نے خط لکھے ان میں سے کسی کو بھی یہ نہیں بتایا کہ جیلوں میں خاص کر مچھ جیل میں ان پر کیا کیا صعوبتیں نازل کی گئی تھیں۔ ان کی بیٹی نور ظہیر نے بھی اس بات کا شکوہ اپنی کتاب 'میرے حصّے کی روشنائی' میں کیا ہے۔ ویسے بھی بنّے چچا میرے ابا کی طرح کم گو انسان تھے اور الفاظ ناپ تول کر بیان کرتے تھے۔ پروفیسر احتشام حسین نے بھی اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ سجاد ظہیر اپنی بات کھول کر، طول دے کر بیان نہیں کرتے تھے۔ ہر لفظ ناپ طول کر یا سمجھ بوجھ کر ہی بولتے یا لکھتے تھے۔ ان کے جملے اور فقرے کبھی بیکار نہیں ہوتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''کہیں کہیں وہ صرف چند لفظوں اور جملوں سے وہ ایسی مصوری اور مرقعہ کاشی کر جاتے تھے کہ پڑھنے والا اسکے محاکاتی حسن میں کھو جاتا تھا۔''

بنّے چچا نے جن لوگوں کو جیل سے خطوط لکھے تھے وہ خطوط کئی وجوہات سے زائل ہو گئے تھے۔ عبدالرؤف ملک اور سبط حسن نے تو بڑے افسوس سے اس بات کا اقبال کیا ہے کہ سی آئی ڈی کے لگاتار چھاپوں کی وجہ سے انہیں اپنی رہائش گاہ کئی بار تبدیل کرنی پڑی تھی جس سے وہ ان خطوط کو محفوظ نہ رکھ سکے۔

شکیل صدیقی نے 2006 میں ایک جریدہ نکالا تھا جس کا نام تھا 'ترقی پسند تحریک اور سجاد ظہیر' یہ نئی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے ایک ایسے شخص کا مختصر مقالہ چھاپا تھا جس کا اس میں نام نہیں دیا۔ ان دنوں بنّے چچا 'عوامی دور' کے چیف ایڈیٹر تھے۔ وہ گمنام شخص لکھتا ہے کہ جب ہندوستان کی حکومت نے کیرالہ کمیونسٹ سرکار کو برخاست کیا تو ملک بھر میں اس کے خلاف احتجاجی

جلوس نکالے گئے۔ اس شخص نے دہلی کے ایک جلوس کی روداد لکھ کر 'عوامی دور' میں اشاعت کے لیے بھیج دی جو اس کی سب سے پہلی تخلیق تھی۔ وہ کہتا ہے کہ اس کی رپورٹ کی اشاعت سے اسے اتنی خوشی حاصل نہیں ہوئی جتنی اس خط سے جو بنے چچا نے چیف ایڈیٹر کے ناطے اسے لکھا تھا۔ اس خط کا ذکر اس شخص نے یوں کیا ہے:

''سجاد ظہیر صاحب نے لکھا تھا کہ میری کہانی انہیں اچھی لگی۔ انہیں لگا نہیں کہ یہ کسی نئے قلمکار کا کارنامہ ہے۔ آگے لکھا تھا کہ مجھے لکھتے رہنا چاہیے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی بیٹھکوں میں بھی آنا ۔۔۔۔

آج وہ خط میرے پاس نہیں ہے۔ ایک بار دو مہینے کی چھٹیوں پر گاؤں گیا تو تقریباً دو مہینے تک کمرہ بند رہا۔ لکڑی کی ریک پر رکھے کاغذات کو سینگ لگ گئی اور کئی ضروری کاغذات اور خطوط برباد ہو گئے جن میں سب سے قیمتی شے وہ خط تھا۔ آج بھی کسی خط کو دیکھ کر مجھے اس کی یاد آتی ہے۔ پھر یاد آتی ہے اس خط کے خالق سجاد ظہیر صاحب کی جو اتنے اچھے تھے کہ بالکل نئے ادیبوں کو خط لکھ کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔''

بنے چچا واقعی ایسے تھے۔ بزرگ ہوتے ہوئے بھی چھوٹوں کا احترام کرتے تھے، عالم ہوتے ہوئے بھی بے علم لوگوں کی باتیں دلچسپی سے سنتے تھے۔ وہ بلند پایہ نقاد ہونے کے باوجود نئے لکھنے والے شعرا کا کلام مکمل توجہ سے سنتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔

الما آتا میں بنے چچا کی وفات ہوئی تو ان کے جنازے میں ابا بھی دہلی آئے تھے۔ مجھے وہ تمام تفصیلات تو یاد نہیں لیکن اتنا پورے یقین سے کہہ سکتی ہو کہ ان کی موت سے ابا کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اس وقت ابا بالکل حواس باختہ تھے اور جب تک بنے چچا کو دفن نہیں کیا وہ وہیں موجود رہے۔ چچا کے جنازے کو ونڈ وسر پلیس میں رکھا گیا تھا اور خراج عقیدت کے بعد انہیں جامیہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ ابا نے چچا کی موت پر ایک مرثیہ بھی لکھا تھا، جس کا پہلا مصرع ہے 'نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے'۔

جناب رفعت سروش بھی جون 1973ء کے انڈو سویٹ کلچرل سوسائٹی ایک وفد

(ڈیلیگیشن) کے ساتھ روس گئے تھے جس میں بنّے چچا اور ابا بھی تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ اور پروفیسر یونس رضا ایک کمرے میں ٹھہرے تھے۔ جیسے ہی انہیں ہمارے آنے کی خبر موصول ہوئی فوراً ان سے ملنے چلے آئے۔ ان کا پروگرام تھا کہ کچھ دن بعد وہ اپنی بیٹی نجمہ سے ملنے لندن جائیں گے۔ ستمبر میں ایفروایشیائی رائیٹرز کی کانفرنس جو قزاقستان میں ہونی تھی۔ وہاں بھی وہ شرکت کرنے والے تھے۔

لیکن قزاقستان کے دارالخلافہ الما آتا میں 13 ستمبر کی صبح وہ دل کا دورہ پڑنے سے چل بسے۔ ان کے گزر جانے سے وہاں ایک طرح کا حشر برپا ہو گیا تھا جیسے کوئی کہرام مچ گیا ہو۔

بنّے چچا کے خطوط دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تھے لیکن بدقسمتی سے ان کی بیٹیوں اور بیوی کے علاوہ کہیں اور سے نہیں مل پائے۔ پرگتی شیل وسودھا جریدے کا جب اکتوبر۔ دسمبر 2005 کا شمارہ نکلنے والا تھا تو اس کے ایڈیٹر کملا پرشاد نے کڑی محنت سے ان خطوط کی تلاش کی لیکن متعلقہ لوگوں سے بار بار درخواست کے باوجود بھی کسی سے کچھ دستیاب نہ ہوا۔ اس لیے جو مواد حاصل ہوسکا ہے اسی پر قناعت کرنی ہوگی۔

ابا اکثر کہا کرتے تھے جیل میں انہیں کسی کا خوف اس لیے نہیں تھا کہ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ نہ تو ان سے ایسی کوئی حرکت سرزد ہوئی تھی جسے اخلاقی طور پر گناہ کہا جائے اور نہ ہی کوئی ایسا ارتکاب ہی کیا تھا جسے قانونی طور جرم کہا جائے۔ بنّے چچا ان کی اس بات سے اتفاق رائے رکھتے تھے۔ دونوں دوستوں نے اپنی بیویوں کو جیل سے جو خطوط بھیجے ہیں ان میں اس بات کا ذکر کئی جگہ ملتا ہے۔ ایک خط میں جو ابا نے 24 جون 1951 کو حیدرآباد جیل سے امّی کو لکھا تھا، بعد میں 'صلیبیں میرے دریچے میں' کے مجموعے میں شامل بھی ہوا، اس امر پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

> ''انسانی ذہن بھی عجیب چیز ہے۔ گزشتہ تین ماہ سے خیال ہر وقت اس مقدمے میں الجھا رہتا تھا لیکن اب جو مقدمہ شروع ہوا ہے تو اس کی کاروائی میں ذرا سی بھی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ میں بار بار دل کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ یہ بہت سنگین معاملہ ہے اور اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا۔ لیکن دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت مہمل اور بے حقیقت ناٹک کھیلا جا رہا ہے جو ایک دن ایسے ہی اچانک بے وجہ ختم ہو جائے گا جیسے کہ شروع ہوا

تھا۔ میری گرفتاری اور اسیری کی طرح اس کا بھی نہ کوئی سبب ہے نہ جواز۔''

بنے چچا کے بھی راولپنڈی سازش کیس کے بارے میں بالکل ایسے ہی خیالات رکھتے تھے جو انہوں نے اپنی بیوی پر واضح کیے تھے۔ اس بات کا حوالہ ان کے بھی جیل سے لکھے ہوئے خطوں میں ملتا ہے۔ پاکستان میں اسیری کی دوران جب بنے چچا کو مچھ جیل میں منتقل کر دیا گیا تب بھی انہوں نے ابا کے ساتھ اپنا رابطہ برقرار رکھا۔ میجر محمد اسحٰق جوان کے ساتھ مقدمے میں ملوث تھے اور جنہوں نے ابا کے شعری مجموعہ 'زنداں نامہ' کے لیے اپنا دیباچہ 'روداد قفس' کے نام سے لکھا ہے، وہ ابا کا کلام وقتاً فوقتاً بنے چچا کو بھیجتے رہتے تھے جن پر وہ تبصرہ بھی کرتے تھے۔ ایک خط میں انہوں نے لکھا کہ ان کے مجرم ساتھی میجر اسحٰق محمد کا انہیں ایک خط منٹگمری جیل میں موصول ہوا ہے جس کے ساتھ انہوں نے ابا کی ایک نئی غزل بھی ارسال کی ہے جس کا مطلع یہ ہے:

وہ خزاں میں تلاش بہار کرتے ہیں
شب سیاہ سے طلب حسن یار کرتے ہیں

اس غزل کی انہوں نے بھرپور تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ ابا نے مجاز سے حقیقت کے نئے پہلو نکالے ہیں جو ان کا ہی کا حق ہے۔ دوسرے لوگ بھی ابا کی شاعری کے دلداہ تھے۔ اثر لکھنوی صاحب نے لکھا تھا کہ فیض احمد فیض کی شاعری ترقی کے مدارج طے کر کے اب اس نقطۂ عروج پر ہے جس تک شاید ہی کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کی رسائی ہوئی ہو۔ لکھتے ہیں کہ تخیل نے صناعت کے جوہر دکھائے ہیں اور معصوم جذبات کو حسین پیکر بخشتا ہے۔

بنے چچا نے 'سرِ آغاز' میں جو انہوں نے ابا کے شعری مجموعہ 'زنداں نامہ' کے لیے لکھا ہے اس میں سرسری طور پر جیل کی صعوبتوں کا ذکر کیا ہے۔ ورنہ انہوں نے اور کہیں اپنی تکلیف کو دوسروں پر کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے 'سرآغاز' میں لکھا ہے:

''اگر میرا دل کبھی خون کے آنسو روتا تھا کہ قید و بند کے مصائب اور صعوبتیں اس کا حصہ کیوں ہیں جو اپنی حسن کاری سے سب کی زندگی کو فیاضی سے مرصع کر دیتا ہے، اور نغمگی سے ہم سب کی رگوں میں سرور کی نہریں بہا دیتا ہے، تو کبھی میرا ذہن اس کی تخیل کی ان شاداں اور

فرحاں گل کاریوں سے کسب شعور کرتا جہاں جدید جدلیاتی علم کی ضیا
پاشیاں، انسانیت کے شریف ترین جذبات سے اس طرح مل کر گئی
ہیں جیسے شعاعِ مہر سے تمازت۔''

اپنے دوستوں کی طرف ابا کا رویہ نہایت ہمدردانہ اور بے حد شفیق ہوتا تھا۔ وہ ان کی ہر طرح سے مدد کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ پیپلز پبلشنگ ہاؤس کے مالک عبدلرؤف ملک نے ابا کو جیل میں ایک درد بھرا خط لکھا تھا جس میں انہوں نے اپنی تنگ حالات کا ذکر کرتے ہوئے یہ درخواست بھی کی تھی کہ وہ انہیں اپنی نظمیں اور مضامیں اشاعت کے لیے دیں تا کہ اس سے انہیں کوئی مالی امداد مل جائے۔ ابا نے امّی کو لکھا تھا کہ ان کے لیے اس فرمائش سے انکار کرنا مشکل ہے اور یہ کہ ان کے لیے کچھ ایسا فرق بھی نہیں پڑتا اور آج کل رؤف ملک کی امداد کرنے والے لوگ بھی بہت کم ہیں۔ انہوں نے لکھا تھا کہ انہیں رؤف ملک کی مدد کرنے میں اعتراض نہیں۔

ابا کو کچھ لوگوں کے اس نظریے سے بہت کوفت ہوتی تھی کہ وہ ہر چیز جس کا تعلق ہندوستان سے ہے پاکستان کے حق میں زہرِ ہلاہل ہے۔ وہ ریڈیو پر صرف پاکستانی کلام سُن سُن کر اُکتا جاتے تھے اور اکثر پاکستانی اہلکاروں کی نظر بچا کر ہندوستانی ریڈیو سنا کرتے تھے۔ میجر محمد اسحق نے لکھا ہے کہ جیل میں ابا ظفر اللہ پوشنی کے ساتھ مل کر بنّے چچا سے فرانسیسی سیکھا کرتے تھے۔ چونکہ ابا نہایت کاہل اور کام چور واقعہ ہوئے تھے اس لیے بنّے چچا کی استادانہ گھڑکیاں سہنی پڑتی تھیں جن سے بچنے کے لیے وہ طرح طرح کی بہانہ سازیاں ایجاد کرتے رہے تھے۔

ابا جب تک منٹگمری جیل میں تھے ان کا کلام سننے کے لیے سامعین فراہم کرنا میجر محمد اسحق کی ذمہ داری میں آتا تھا۔ وہ کہتے ہیں اس کام کا ایک ذریعہ یہ تھا کہ ان کا تازہ کلام وہ سجاد ظہیر کو مچھ جیل میں اور پوشنی کو حیدر آباد جیل میں بھیجا کرتے تھے۔ بنّے چچا نے اپنے ایک خط میں جو انہوں نے فروری 1954 میں مچھ جیل سے لکھا تھا اس میں ایک نظم 'ملاقات' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ نظم انہیں اس لیے بہت پسند آئی کیونکہ اس میں علائم کی ترصیع نگاری اپنے کمال کو پہنچ گئی ہے اور نظم کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں کے جیسے نازک پھول چاروں طرف کھلتے چلے گئے ہیں جن میں ہر ایک ایسا ہے جو اپنی جداگانہ خوشبو اور رنگ بھی رکھتا ہے۔

اردو زبان کے حوالے سے بنّے چچا نے اپنی بے حالی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اب برائے نام ہی لکھنؤ والے رہ گئے ہیں۔ کہا کے کہ چھ سال پنجاب میں پنجابیوں کے ساتھ رہ کر زبان ''بگڑ'' گئی ہے۔ باجود اس کے ابا سیالکوٹ کے پنجابی تھے اور بنّے چچا خالص لکھنوی تہذیب میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے، دونوں میں بے پناہ محبت تھی اور بڑا گہرا آپسی لگاؤ تھا۔

ابا کہتے تھے کہ شاعری بڑی عجیب چیز ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سارے کام رکے رہتے ہیں اور آخر کار جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ بیشتر اوقات اتنا تسلی بخش ہوتا ہے کہ اسے ردی کی ٹوکری میں پھینکنا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں بنّے بھائی نے اس کیفیت کو Bloody Perfectionism کا نام دیا ہے۔

جیل میں ان کے ساتھی بنّے چچا کو 'مولانا' کہتے تھے۔ غالباً اس لیے کہ ان کا بیشتر وقت مطالعے میں صرف ہوتا تھا۔ اس وجہ سے وہ بیرک جس میں چچا رہتے تھے 'خانقاہ' کہلاتی تھی۔ ان کے ایک ساتھی بریگیڈیر لطیف بھی تھے جنہیں وہ سب لوگ صوفی بزرگ کے رتبے سے نوازتے تھے کیونکہ وہ زیادہ تر عبادت وصلوٰۃ کا درس دیتے تھے۔

امی کے نام ایک خط میں ایک مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے ابا نے لکھا کہ وہ مشاعرہ جنرل نذیر کی صدارت میں ہوا تھا جو بالکل بچ بچ کا مشاعرہ معلوم ہوتا تھا۔ اسی خط میں انہوں نے رضیہ چچی کے ایک خط کی موصولیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ بنّے چچا اور رضیہ چچی کی خوبیوں کے بارے میں ابا نے لکھا ہے کہ نئے سال کی تہنیت کا ایک بہت ہی محبت بھرا خط بنّے کی بیگم سے موصول ہوا جسے پڑھ کر دل بھر آیا۔ ان کے بارے میں انہوں نے کہا ہے کہ اس دنیا میں بہت سی بدی کے باوجود اتنی نیکی انہیں حاصل ہوئی ہے جس کا حق وہ کبھی ادا نہیں کر سکتے۔

بنّے چچا کی وفات پر اختر سعید خان، جنہوں نے بھوپال میں ترقی پسند ادبی تحریک کی بنیاد ڈالی تھی، نے جن الفاظ سے انہیں خراج عقیدت ادا کیا ہے اس سے بہتر خراج عقیدت شاید ناممکن ہو۔ انہوں نے کہا تھا کہ زبان وادب کے پاسدار آتے رہے ہیں، آتے رہیں گے لیکن ایسا صاحب علم، بالغ نظر جس نے ساری عمر جمالیاتی زندگی کے فروغ میں انتہائی سادگی اور بے نیازی کے ساتھ کاٹ دی ہو شاید ہی کوئی آسکے۔

☆☆☆

سجاد ظہیر کی بیٹیوں سے گفتگو

سید سجاد ظہیر کی تمام اولاد صرف چار بیٹیوں پر ہی مشتمل ہے جن میں سے سب بقید حیات ہیں۔ ان میں سب سے بڑی نجمہ علی باقر ہے جو دہلی میں مقیم ہیں۔ ان سے راقم کی کئی بار ٹیلیفون پر گفتگو ہوئی اور ای میل سے کافی طویل خط و کتابت بھی ہوتی ہے۔ ان کے مشورے پر راقم الحروف نے انہیں ایک سوال نامہ بھی ارسال کیا تھا لیکن اس کی طوالت کی وجہ سے جواب دینے سے معذور ہیں۔ نجمہ اگست 1940 میں پیدا ہوئی تھی جب سجاد ظہیر لکھنؤ سینٹرل جیل میں بند تھے۔ وہ جنگ آزادی کی مہم میں انگریزی سرکار کے خلاف شر انگیز بیانات کی وجہ سے نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ ان دنوں فیض احمد فیض بھی جیل میں تھے۔ بعد میں قلیوں والے معاملے کا سمجھوتہ ہوا جولائی 1940 میں فیض تو رہا ہو گئے مگر سجاد ظہیر مقید ہی رہے۔ انہیں 14 مارچ 1942 حکومت ہند کے حکم نامے سے غیر مشروط طریقے پر رہا کیا گیا۔ گرفتاری سے پہلے وہ بمبئی کے والکیشور روڈ پر سیکری بھون میں رہتے تھے۔ نجمہ کے ذہن میں بمبئی کی کئی یادیں اب بھی باقی ہیں۔ کہتی ہے کہ ان کے پاس ایک فلیٹ تھا جس میں دو کمرے تھے۔ ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا۔ چھوٹے کمرے کو رسوئی کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور بڑے کمرے میں ان کے ابا میٹنگیں کیا کرتے تھے۔ جو لوگ میٹنگ کے لیے آتے تھے انہیں فرش پر ہی بیٹھنا پڑتا تھا کیونکہ اور کوئی انتظام نہیں تھا۔ نجمہ کہتی ہیں کہ وہ اس وقت بہت چھوٹی تھی اس لیے وہ ان میٹنگوں کا مقصد نہیں سمجھ پاتی تھی لیکن اکثر بہت سے ادیب اور شعرا تشریف لاتے تھے جن میں سردار جعفری، کرشن چندر، جوش صاحب اور کیفی اعظمی شامل تھے۔

عمر کم ہونے کے باوجود نجمہ محسوس کرتی تھی کہ لوگ ان کے ابا کی بہت عزت کرتے تھے بلکہ کیفی صاحب اور شوکت کی شادی ہی ان کے گھر میں ہوئی تھی۔ اگر چہ شوکت کے گھر والے اس شادی کے حق میں نہیں تھے لیکن ان کے ابا کی کوششوں سے سرے چڑھ ہی گئی۔ اس شادی کے متعلق نجمہ کہتی ہیں کہ جو سرخ جوڑا ان کی امی نے اپنی شادی پہ پہنا تھا وہی اس نے موتی چچی (شوکت اعظمی) کو پہننے کے لیے دیا تھا۔ چونکہ کیفی چچا شیعہ تھے اور موتی چچی کے گھر والے سُنّی تھے اس لیے شادی میں دو مولوی ہونے تھے لیکن نجمہ کے ابا نے ایک ہی مولوی سے نکاح پڑھوالیا تھا۔ اس شادی میں جوشؔ صاحب بھی شریک ہوئے تھے۔

گھر کا خرچ کیسے چلتا تھا اس کے بارے میں نجمہ کہتی ہیں کہ ابا کو اخبار میں کام کرنے کے صرف 45 روپے ہر مہینے ملتے تھے۔ اس کے علاوہ سروز یرحسن، نجمہ کے دادا اور سجاد ظہیر کے والد بھی دوسو روپے ماہوار بھیجتے تھے جس سے گھر بخوبی چل جاتا تھا۔

لکھنؤ میں رہائش پذیر ہونے کے بارے وہ لکھتی ہیں کہ 1946 میں ان کے دادا کی طبیعت خراب ہوئی جس کی وجہ سے انہیں لکھنؤ جانا پڑا۔ اگلے ہی سال سروز یرحسن انتقال فرما گئے اور وہ سب لوگ وہیں وزیر منزل میں جوان کا خاندانی گھر تھا اس میں رہنے لگے اور لوٹ کر بمبئی کبھی نہیں گئے۔ جب بنّے بھائی پاکستان میں تھے تو ان کی بیوی اور بچیاں ہندوستان میں تھیں اس لیے ان سے ملاقات نہیں ہو پاتی تھی۔ پھر بھی نجمہ کو ایک ملاقات یاد ہے جس کی روداد وہ اس طرح سناتی ہیں۔ ہم لوگ ابا سے ملنے پانی کے جہاز سے کراچی پہنچے۔ یہ ملاقات نجمہ کو پوری طرح یاد ہے۔ ان دنوں نجمہ کا ننھیال کراچی میں مقیم تھا۔ ان کے سب سے چھوٹے ماموں امداد حسین پاکستان پولیس میں ڈی۔ آئی۔ جی تھے اور ان کے پاس ہی ٹھہرے تھے۔ غالباً یہ 1951 سے پہلے کی بات ہے کیونکہ نجمہ کہتی ہے کہ وہاں کی پولیس ان کے ابا کو تلاش کر رہی تھی اور وہ روپوش تھے۔ وہ کہتی ہے کہ ان کے ابا اکثر رات کے وقت بھیس بدل کر ان سے ملنے آتے تھے۔ رضیہ پریشان تھیں کہ وہ اپنے بھائی کو خطرے میں ڈال رہی ہیں لیکن کیا کرتیں۔ وہاں ان کی ایک خالہ کی شادی ہوئی تھی جس میں ان سب لوگوں نے شرکت بھی کی تھی۔ نجمہ کہتی ہے کہ اس وقت یہ سوال اٹھا تھا کہ ہم لوگ ہندوستان میں رہیں کہ باقی لوگوں کی طرح پاکستان چلے جائیں لیکن سب کے مشورے سے یہ فیصلہ ہوا کہ انہیں

ہندوستان ہی میں رہنا۔

وہ بہت ہی پریشان کن وقت تھا۔ گھر کی تمام ذمہ داری محض رضیہ پر ہی تھی جو بالکل اکیلی تھیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ان دنوں میں اگر کوئی حوصلہ افزائی کا ذریعہ تھا تو وہ ابا کے خطوط تھے۔ انہیں ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کا خیال رہتا تھا جس کے بارے میں وہ اپنے خطوں میں لکھا کرتے تھے۔ تمام خط سنسر ہو کر آتے تھے۔ چونکہ ان کی دادی لیڈی وزیر حسن جنہیں سبھی بوبو کہتے تھے بالکل ان پڑھ تھیں اس لیے انہیں وہ خطوط پڑھ کر سنانے کے لیے ایک سیکریٹری مقرر تھے۔ وہ سیکریٹری اتنے قابل تھے کہ خط کا سنسر کیا ہوا حصہ بھی پڑھ لیتے تھے۔ یہ بات نجمہ نے بھی کہی ہے کہ فیض احمد فیض جو جیل میں ان کے ابا کے ساتھ قید میں تھے جب کوئی غزل یا نظم تخلیق کرتے تو ان کے ابا اس کا ذکر اپنے خطوں میں ضرور کرتے تھے۔

نجمہ نے ایک بڑی عجیب بات کہی ہے۔ وہ یہ کہ جب سجاد ظہیر پاکستان سے رہا ہو کر ہندوستان آئے تو ان کے پاس ہندوستانی شہری حقوق نہیں تھے۔ اس پر کچھ لوگوں نے ان کے ہندوستان لوٹنے کی مخالفت بھی کی تھی۔ ان دنوں سردار ولبھ بھائی پٹیل اندرونی محکمے کے منسٹر تھے۔ وہ اس نظریے کے تھے کہ سجاد ظہیر کو ہندوستان نہیں آنا۔ لیکن کوئی تین سال کے عرصے کے بعد انہیں شہریت عطا کر دی گئی۔ لوٹنے کے بعد انہوں نے لکھنؤ میں ہی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس 1956 کی اور لگاتار کوشش کرتے رہے کہ انجمن پھر سے بحال ہو جائے اور اپنی پرانی آن وبان حاصل کرے۔

اپنے ابا کی مصروفیت کے بارے میں نجمہ نے کہا کہ وہ سفر بہت کرتے تھے اور ادیبوں کو انجمن میں لانے کوشش لگاتار کرتے رہتے تھے۔ نئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور انہیں آگے بڑھنے میں مدد بھی مہیا کرتے تھے۔ نجمہ کہتی ہیں کہ ان کے ابا اور امّی دونوں بہت بلند پایہ کے ادیب تھے۔ ویسے ہی ادیب ان کے خاوند علی باقر بھی تھے لیکن انہیں خود سائنس داں بننے کا شوق تھا اس لیے ادیب نہ بن سکیں۔ نجمہ نے ایک اور بات کا بھی ذکر کیا ہے جو بہت کم لوگوں کے علم میں ہے انہوں نے کہا کہ ان کے ابا جو سب سے بڑا کام کرتے تھے وہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کی سفارش کیا کرتے تھے۔ سجاد ظہیر کی بہت اہم اور بڑے لوگوں سے واقفیت تھی۔ حالانکہ انہوں نے کبھی کسی سے کوئی مالی امداد نہیں لی مگر جو ضرورت مند ان کے پاس آیا اس کی سفارش ضرور کی۔ یہ سب لوگ جانتے ہیں نہرو

یملی سے ان کے بہت قریب کے تعلقات تھے۔ یہی بات نادرہ نے بھی کہی ہے۔ نجمہ کہتی ہیں کہ ایک بار وہ اپنی بیٹیوں کو اندرا گاندھی سے ملانے لے گئے اور ان سے کہا کہ یہ میری بیٹیاں ہیں، ان کی سرپرستی کیجئے۔ مذہب پر ان کے اعتقاد کے متعلق وہ کہتی ہیں کہ وہ مذہب کو نہیں مانتے تھے لیکن روایت کی بہت قدر کرتے تھے۔ حمید اختر نے بھی یہی بات کہی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ بنے بھائی اپنی روایات کی پاسداری کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ حمید اختر نے یہ بھی لکھا ہے کہ سجاد ظہیر کا عید کے متعلق یہ نظریہ تھا کہ عید مذہبی تہوار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تہذیبی اجتماع ہے بھی ہے اور فرمایا کہ ہمیں اپنی تہذیبی روایات کی پوری پوری پاسداری کرنی۔

ایک اور بات جو نجمہ اور نادرہ دونوں نے ایک ہی لہجے میں کہی ہے وہ سجاد ظہیر کے اپنے شعبے میں کامیابی کے متعلق ہے۔ دونوں کہتی ہیں کہ اگر ان کی امّی رضیہ کا ساتھ نہ ہوتا تو ان کے ابا ان بلندیوں تک کبھی نہ پہنچ پاتے جو ان کے حصے میں آئی ہیں۔ ان کے ابا کے ہر فیصلے میں ان کی امّی نے مکمل طور پر ساتھ دیا۔ نجمہ کہتی ہیں کہ اگر امّی نہ ہوتی تو سجاد ظہیر نہ ہوتے اور نہ ہی وہ اس مقام کو حاصل کر پاتے جس تک وہ اب پہنچیں ہیں۔

اپنے ابا کی پاکستان میں اسیری کے دوران گھر کا جو حال تھا اس کے متعلق نجمہ کہتی ہیں کہ وہ بے حد مشکل کے دن تھے۔ پیسے کی سخت تنگی تھی اور ان کی امّی کو تنہا ہی گھر کی دیکھ بھال اور بچیوں کی پرورش کرنی پڑتی تھی۔ آسائش کی بہت سی چیزیں گھر میں نہیں تھی۔ وہ کہتی ہیں کہ ان کی چھوٹی بہن نسیم نے نوکری شروع کی تو پہلی بار ان کے گھر میں ایک فریج کی آمد ہوئی۔

سجاد ظہیر کی دوسری بیٹی ڈاکٹر نسیم بھاٹیہ ایک وقت جے نارائن ویاس وشوودیالیہ جودھپور کی وائس چانسلر تھیں لیکن اب وہ ریٹائرڈ ہیں اور دہلی کے پاس گڑگاؤں میں قیام رکھتی ہیں۔ راقم کی ملاقات کی کوشش کامیاب نہیں ہو پائی لیکن انہوں نے ایک ڈاکٹر سورج پالیوال سے اپنے ابا کے متعلق بات چیت کی تھی جو کہیں شائع بھی ہوئی تھی۔ راقم اس مقالے میں جو کچھ لکھ رہا ہے وہ اسی حوالے سے ہے۔ پالیوال کہتے ہیں کہ نسیم کے پاس اپنے ابا کی کچھ ایسی یادیں ہیں جو بہت کم بیٹیوں کے پاس ہوتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بنے بھائی ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو بیٹیوں کی پیدائش پر ناخوش ہوتے ہیں کہ ان کی پرورش کو بوجھ تسلیم کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسے باپ تھے جو بیٹیوں کے لیے

والد اور دوست دونوں ہی تھے۔ انہوں نے ہمیں نڈر رہنے کی ترغیب دی تھی اور زندگی میں اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی جدوجہد میں جی جان سے حصہ لینے کا درس بھی دیا تھا۔ نسیم اپنے ابا کی شہرہ آفاق مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ادیب اور شعرا ان کی بہت عزت کرتے تھے، ملنے والے بڑی شدت سے ان سے پیار کرتے تھے، سیاسی اور سماجی کارکن ان پر مکمل اعتماد رکھتے تھے۔ نجمہ کہتی ہیں کہ ان چاروں بہنوں کو اس پر بڑا فخر ہے کہ ان کے ابا نے پارٹی کے لیے بہت کام کیا اور بہت ساری قربانیاں بھی دی۔ لیکن ایک بات پر انہوں نے افسوس ظاہر کیا کہ پارٹی نے ان کی قربانیوں کی قدر نہیں کی۔ نسیم کا یہ افسوس بالکل بجا ہے کیونکہ جب تک وہ پاکستان کی جیلوں میں سر دھنتے رہے پارٹی نے ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ بعد میں جب وہ لکھنؤ سے دہلی پہنچے تو سوائے ایک شخص کے پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی طرف سے کوئی بھی اہم اہلکار اسٹیشن پر ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے موجود نہیں تھا۔ نسیم کو یہ بات اب بھی ناگوار گزرتی ہے کہ وہ بہت چھوٹی عمر کی تھیں جب ان کے ابا پاکستان چلے گئے اور انہیں اپنے ابا کی غیر حاضری میں زندگی گزارنی پڑی۔ لیکن وہ اس بات پر فخر بھی محسوس کرتی ہیں کہ پاکستان میں جتنا بڑا کام ان کے ابا نے کیا ہے وہ کوئی دوسرا نہیں کرسکتا تھا۔ انہوں نے 1948 سے 1951 تک تین سال روپوشی کی زندگی گزاری اور 1955 تک جیل میں بند رہے جس دوران انہوں نے دو کتابیں 'روشنائی' اور 'ذکر حافظ' تخلیق کیں جو اردو ادب میں اپنا مخصوص مقام رکھتی ہیں۔

اس گفتگو میں نادرہ جو نسیم سے چھوٹی ہیں وہ بھی شامل تھیں۔ جب ان دونوں سے یہ سوال کیا گیا کہ بنّے بھائی اپنی چاروں بیٹیوں میں کس کے ساتھ زیادہ پیار کرتے تھے تو نسیم نے نادرہ کی طرف پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ وہ انہیں ہی سب سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ نسیم نے دوہرایا کہ مجھے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ نادرہ نے ان کے بیان پر تصدیق کی مہر لگاتے ہوئے کہا کہ واقعی وہ انہیں اور ان کے شوہر کو سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ کیا وجہ تھی کہ سب لوگ بنّے بھائی پر پورا بھروسا کرتے تھے اور ان کی ہر بات مانتے تھے تو نسیم نے بتایا کہ ان میں یہ خاصیت تھی کہ وہ ہر سامنے والے کو اپنا بنا لیتے تھے اس بات کی تائید کئی لوگوں نے اپنی اپنی تخلیقات میں کی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ ان کے ابا لوگوں کی ہر مشکل میں کام آتے تھے اور اسے یقین دلاتے تھے کہ وہ اکیلے نہیں ہیں۔ اس لیے ہر سامنے والا انہیں اپنا سمجھنے لگتا تھا۔ وہ ہر آدمی پر بھروسا

کرتے تھے اور اس کے لیے جو بھی کرنا پڑے کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ سجاد ظہیر کی وفات پر ان کی اہلیہ رضیہ نے ایک مقالہ لکھا تھا 'انتظار ختم ہوا انتظار باقی ہے'۔ اس میں بھی انہوں نے کہا تھا کہ میں حیران ہوں کہ ایک آدمی نے اتنے سارے انسانوں کو یہ یقین کیسے کروا دیا تھا کہ وہ ان کو اتنا چاہتا ہے جتنا کسی اور کو نہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ صرف اپنے لیے جینے والوں کے لیے لوگ اس قدر نہیں روتے اور نہ ہی ان کے گھر والوں کو بار بار جتاتے تھے ہیں کہ بنّے بھائی کے ان پر کتنے احسان ہیں۔

نسیم اپنے ابا کا ان کے ساتھ پیار کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقعہ بیان کرتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ ان کو بچپن سے ہی ریڈیو پہ خبریں سننا اچھا لگتا تھا۔ انہوں نے ابا سے ریڈیو کی فرمائش کی تو وہ لے آئے۔ نسیم کو معلوم تھا کہ ان کے پاس پیسوں کی تنگی رہتی تھی لیکن اس کے باوجود بھی انہوں نے ریڈیو خرید لیا۔ کہتی ہیں انہیں بچوّں اور پھولوں سے بہت پیار تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ چونکہ انہیں خوبصورتی بہت پسند ہے اس لیے اللہ نے انہیں چار چار خوبصورت بیٹیاں بخشی ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ان کی بیٹیاں اپنی شکل وصورت اور صحت کی طرف خاص توجہ دیا کریں۔ نسیم بھاٹیہ کو چھیڑتے ہوئے کہتے تھے کہ پنجابی سے شادی کر رہی ہو تو پنجابی پراٹھوں سے خبردار رہنا۔ وہ اپنی بیٹیوں سے نہایت بے تکلف تھے اور ان کی ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

ان کی سب سے چھوٹی بیٹی نور ظہیر نے اپنے والدین کی زندگی کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام 'میرے حصے کی روشنائی' ہے۔ اس میں وہ ایک واقعہ کا ذکر کرتی ہیں کہ ایک بار ایک بہت خوبصورت سا کشمیری نوجوان ابا کے پاس نوکری کی درخواست لے کر آیا۔ جب ابا نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ تمہیں یہ نوکری نہیں ملی حالانکہ تمہارے پاس وہ تمام (Qualification) ہے جو درکار ہیں۔ اس نے کہا وہ چار بار اسی نوکری کے لیے انٹرویو دے چکا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چیف منسٹر صاحب اپنا آدمی چاہتے ہیں۔ وہ سفارشی خط لے کر رخصت ہو گیا لیکن کوئی دو ہفتے بعد وہ پھر خالی ہاتھ لوٹا اور ابا سے ملنے آیا۔ اسے نوکری نہ ملنے پر ابا کو بہت تکلیف ہوئی اور ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ پوچھنے پر انہوں نے امّی سے کہا کہ ہم نے آزادی کی لڑائی اس لیے لڑی تھی کہ ہمارے ایسے نونہال بچے یوں بے روزگار رہیں اور در در کی ٹھوکریں کھائیں۔ نسیم بھاٹیہ نے نہ صرف اس بات کی تصدیق کی بلکہ اس بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ سب ان کی عادت میں شمار تھا۔ وہ اپنے

گھر آئے کسی آدمی کو خالی ہاتھ جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ کسی کو نفی میں جواب دینا ان کی فطرت میں بالکل نہیں تھا۔ جانا پہنچانا ہو یا انجانا جو شخص بھی ان کے پاس آجاتا تھا وہ اسے سفارشی خط دے دیتے تھے۔ کئی بار تو وہ ان کے ساتھ چل پڑتے تھے اور سفر کا خرچا اپنی جیب سے کرتے تھے۔

سجاد ظہیر اشتراکیت پر پورا عبور رکھتے تھے اور اس کی بہت قدر کرتے تھے۔ نسیم جب روس میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے گئی تو ایک مضمون لازمی تھا جسے پاس کرنے پر وہ پڑھائی جاری رکھ سکتی تھیں۔ نسیم کہتی ہیں کہ انہوں نے اس بابت ابا کو خط لکھا کہ وہ کسی طرح انہیں اس مضمون سے معذرت دلوادیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے ناراضگی ظاہر کی اور نسیم کو ڈانٹ لگاتے ہوئے کہا کہ اگر مارکسزم کی جانکاری نہیں ہوگی تو پڑھنا ہی بیکار ہے پھر وہ خود ہی انہیں مارکسزم سکھانے لگے تھے۔ نسیم کہتی ہیں کہ وہ رات دیر تک پڑھتے رہتے تھے اور ڈیڑھ بجے کے بعد ہی سوتے تھے۔ لیٹتے وقت کوئی نہ کوئی کتاب انگلیوں میں دبا کر پڑھتے رہتے تھے۔ جب نسیم سے یہ پوچھا گیا کہ کیا روس جیسا اشتراکی نظام ہندوستان میں کبھی وارد ہوگا تو انہوں نے بتایا کہ ابا کے ساتھ اس موضوع پر اکثر بحث ہوتی تھی اور ان کو اس بارے ذرا بھی غلط فہمی نہیں تھی کہ ہندوستانی نظام میں روسی طرز پر بر حال میں ترمیم ہوگی لیکن ہندوستان میں اونچی سطح پر کمیونسٹ سوسائٹی کا قیام کبھی نہیں ہوسکتا۔

آخر میں الما آتا میں ان کی وفات کا چرچا ہوا ہے۔ جب یہ پوچھا گیا کہ ایک دور دراز کے ملک میں حرکت قلب بند ہوجانے سے بنّے بھائی کی وفات ہوئی تو ان کی لاش کو ہندوستان کیسے لایا گیا تو انہوں نے کہا کہ "میرے ساتھ مشہور شاعر فیض احمد فیض اور ایک قزاک ادیب لاش کو لے کر ہندوستان آئے تھے۔ وہ نہایت دردناک موقع تھا لیکن اس موقع پر ہم اکیلے نہیں تھے۔ ادب' سماج اور سیاست کے حلقوں سے بہت سارے لوگ موجود تھے۔ ابا اپنے پیچھے کمیونسٹ آندولن اور ترقی پسند تحریک کی مضبوط بنیاد چھوڑ گئے تھے جسے آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں۔" کہنے لگی کہ انہیں یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوتی ہے اور فخر کا احساس ہوتا ہے کہ ان کی صد سالہ یوم پیدائش پر ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں جگہ جگہ سیمینار ہو رہے ہیں۔ ہندی اور اردو کے بے شمار جریدوں نے ان کے لیے خاص نمبر شائع کیے ہیں۔ وہ کہتی ہیں انہوں نے دہلی کے ایک سیمینار میں خود شرکت کی تھی اور یہ دیکھ کر بہت مسرور ہوئیں کہ کافی تعداد میں لوگ ان سے ملنے آئے اور ان کے ابا کے بارے میں بات

چیت کی۔ آخر میں نسیم نے بھی یہی بات کہی جو نجمہ نے اور نور نے بھی کہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ''میرے ابا ادیب تھے، بہت بڑے سیاستداں تھے۔ انہوں نے کمیونسٹ سیاست کے لیے جو کام کیا وہ کسی معنی میں کم نہیں تھا لیکن انہیں اس کا مناسب انعام نہیں ملا۔''

نادرہ ببر سجاد ظہیر کی تیسری لڑکی ہیں۔ ان کا قیام ممبئی میں ہے جہاں وہ جوہو کے علاقے میں رہتی ہیں۔ نادرہ ایک جانی پہنچانی اور مقبول ترین تھیٹر اداکارہ ہیں جنہوں نے کتنے ہی کامیاب ڈرامے لکھے ہیں اور کئی تھیٹروں میں ان کے شو کیے ہیں۔ انہی دنوں انہوں نے اپنے تھیٹر جس کا نام 'اک جٹ' رکھا ہے اسکے تیس سالہ قیام کا جشن کیا ہے جس سے متعلقہ ایک پلے Play پرتھوی تھیٹر جوہو میں منعقد کیا۔ وہ مشہور اداکار راج ببر کی اہلیہ ہیں اور اپنی بیٹی جوہی ببر کے ساتھ تھیٹر کے کام میں مصروف رہتی ہیں۔ وہ ایک نہایت ملنسار اور بے حد معاون شخصیت ہیں اور سجاد ظہیر کے دورِ اسیری سے متعلق مواد مہیا کرنے میں راقم کی بہت مدد کی ہے۔ نادرہ اور جوہی سے راقم الحروف کی کئی بار ملاقات ہوئی بلکہ نادرہ نے بھی اس قدر دلچسپی لی کہ کئی بار وہ راقم کی رہائش گاہ پہ بھی تشریف لائیں جہاں اس موضوع پر بحث ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ جب وہ آٹھ سال کی تھیں تو انہوں نے پہلی بار اپنے ابا کو دیکھا۔ ایک دن ان کے گھر میں صبح سے ہی بھیڑ لگنی شروع ہوگئی تھی کیونکہ پارٹی ورکرز آنے لگے تھے۔ وہ ان کے ابا کی آمد کا دن تھا۔ سب لوگ تیار ہوکر ریلوے اسٹیشن گئے۔ کہتی ہیں جب ابا گاڑی سے اترے تو ان کے چاہنے والوں نے ان کے گلے میں ہاروں کا انبار لاد دیا۔ بھیڑ کا ہر شخص ان سے ملنے کو بیقرار تھا۔ ابا بھیڑ کو چیرتے ہوئے ان کی طرف آئے اور لپک کر آئے اور نادرہ کو گلے لگا لیا۔ چونکہ اس وقت ہندی قومی زبان قرار دی گئی تھی اس لیے بنّے بھائی نے سب سے پہلے ہندی سیکھنے کا بندوبست کیا۔ انہوں نے ایک شاستری جی کی خدمات حاصل کی جو خود تو قابل تھے لیکن انکے ابا کے پاس وقت کی بہت کمی تھی۔ اس لیے وہ صبح پڑھانے آتے تھے جب گھر کے سب لوگ سو رہے ہوتے تھے۔ کہتی ہیں کہ ابا بہت جلدی اٹھتے تھے اور اپنے لیے، شاستری جی کے لیے اور امّی کے لیے خود ہی چائے بناتے تھے۔

اپنے ابا کے مزاج کے بارے میں نادرہ کہتی ہیں کہ انہیں کبھی غصہ نہیں آتا تھا۔ یہی بات نور اور نسیم نے بھی کہی ہے۔ نادرہ کہتی ہیں کہ ان کی انکساری پر کئی بار گھر والوں کو غصہ آتا تھا لیکن ان پر

کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ گھر کے لوگ اکثر ان پر ناراض ہوتے تھے لیکن وہ مسکرا کر ٹال دیتے تھے۔ کہتی ہیں کہ کمیونسٹ پارٹی کے فیصلے کی کبھی نافرمانی نہیں کی۔ پارٹی کے حکم سے پاکستان گئے وہاں بنا کسی گلے شکوے کے جیلوں کی صعوبتیں برداشت کیں۔ جب لوٹ کر آئے تو پارٹی نے پھر حکم دیا کہ دہلی جا کر اخبار شائع کرو تو دہلی پہنچ گئے۔ ان دنوں رضیہ کرامت کالج میں پڑھاتی تھیں اور بچیاں بھی وہیں پڑھ رہی تھیں۔ اس لیے ان کی امّی نے انہیں دہلی جانے سے منع کرنا چاہا لیکن انہوں نے پارٹی کے فرمان کو بیوی کے مشورے پر ترجیح دی۔ دہلی میں رہنے کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا اس لیے آصف علی روڈ پر پارٹی کے آفس میں ہی رک گئے۔ وہاں آفس کی چھت پر ایک چھوٹے سے کمرے میں سکونت اختیار کر لی۔ پلنگ کے طور پر ایک بینچ نما تختہ تھا اور ایک بے سرو پیر کا پنکھا تھا جو چیختا زیادہ تھا اور ہوا کم دیتا تھا۔ وہاں وہ پسینے میں شرابور رہتے تھے مگر گرمی کی شکایت نہیں کرتے تھے۔ جب رضیہ اور ان کی بیٹیاں انہیں ملنے گئیں تو وہ پسنے میں ترا سی تختے پر سو رہے تھے۔ دیوان غالب سینے پر رکھا تھا۔ شاید پڑھتے پڑھتے سو گئے تھے۔ ان تکلیفات سے بے نیاز وہ پارٹی کا اخبار نکالنے میں بڑی خوشی سے مصروف رہتے تھے۔

اپنے بمبئی کے گھر کے بارے میں نادرہ کہتی ہیں کہ وہاں ترقی پسند مصنفین کی بہت سی بیٹھکیں ہوتی تھیں۔ ہر وقت ادیبوں اور شاعروں کا جمگھٹ لگا رہتا تھا۔ وہی ایک گھر تھا جس کے دروازے ان لوگوں کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ کئی لوگ رات کو بھی رک جاتے تھے۔ نادرہ کے مطابق ان کے ابا کے خاص دوستوں کے ساتھ ان کی امّی اور ان کی بہنوں کا بہت قریب کا رشتہ ہوتا تھا۔ نادرہ عصمت چغتائی کی مثال دیتی ہیں کہ انہیں بہت عرصے بعد معلوم ہوا کہ وہ ان کی حقیقی خالہ نہیں ہیں ورنہ تب تک وہ انہیں اپنی اصلی خالہ ہی سمجھتی رہیں۔ اس طرح وہ بہت عرصہ کرشن چندر کو بھی اپنے اصلی چچا ہی کے طور پر جانتی تھیں۔ نور ظہیر اس بات کی پوری طرح تائید کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ انہیں کافی مدت تک یہ معلوم نہیں تھا کہ موتی چچی (شوکت اعظمی) ان کی اپنی چچی نہیں ہیں۔ نادرہ کہتی ہیں کہ کیفی چچا کی شادی بھی ان کے گھر پر ہوئی تھی اور شوکت آپا ان کی امّی کا چوتھی کا جوڑا پہن کر دلہن بنی تھیں۔ نادرہ نے بھی وہی بات کہی کہ شوکت کے گھر والے کیفی سے ان کی شادی کے حق میں نہیں تھے لیکن بنے بھائی انہیں چپکے سے بمبئی لے آئے تھے اور شادی کی پوری ذمہ داری اپنے

سر لے لی تھی۔ نادرہ کے کہنے کے مطابق ان کے ابا کو بنانے میں ان کی امی کا بہت ہاتھ تھا۔ نور ظہیر بھی یہی کہتی ہیں۔ اپنی کتاب 'میرے حصے کی روشنائی' میں انہوں نے لکھا ہے:

''اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سجاد ظہیر نے زندگی میں تحریک کا اتنا کام اس وجہ سے کر پائے کیونکہ رضیہ گھر چلانے کی ذمہ داری کو اکیلے سنبھالے ہوئی تھیں۔ یہ بات کافی حد تک صحیح بھی ہے لیکن ایسا کیوں تھا یہ کم لوگ جانتے ہیں۔ ابا کو گھر، خاندان اور بیٹیوں کے معاملے میں اپنے مقابلے میں امی پر کہیں زیادہ بھروسا تھا۔ وہ مانتے تھے کہ امی کی شخصیت میں ٹھہراؤ، جوکھم اٹھانے کا حوصلہ، تجربہ کرنے کی صلاحیت اور سب سے بڑھ کر دنیا داری کی سمجھ اتنی صحیح مقدار میں گھلی تھی جس کی وجہ سے گھر سے تعلق رکھنے والے بہت کم فیصلے غلط ہوتے تھے۔''

نور ظہیر سے راقم الحروف کی ملاقات نہیں ہو پائی جس کا سے افسوس ہے۔ لیکن انہوں نے والدین کی روداد بڑی قابلیت سے اپنی مندرجہ بالا کتاب میں درج کی جو بہت دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔ اگر وہ ملتیں تو بھی وہی باتیں بتاتی جو انہوں نے لکھی ہیں۔ لہٰذا یہ انٹرویو ان کی غیر حاضری میں ہی تکمیل تک پہنچا دیا گیا ہے۔

۳۰/نومبر ۲۰۰۹ء

☆☆☆☆☆☆

محترمہ شوکت کیفی اعظمی سے ایک گفتگو

شوکت اعظمی ترقی پسند ادب کے بلند پایہ شاعر کیفی اعظمی کی بیوہ ہیں اور ایک عظیم اداکارہ بھی ہیں۔ انہوں نے پرتھوی تھیٹر کے ڈراموں میں اور کئی فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی سب سے مقبول فلم 'امراؤ جان' ہے جو ایک یادگار فلم بن کر رہ گئی ہیں۔ ان کی بیٹی شبانہ اعظمی آج ملک کی صف اول فلم کی ایکٹریس اور تھیٹر آرٹسٹ ہیں اور اپنی اداکاری کی وجہ سے انہیں کئی ایوارڈز مل چکے ہیں۔ وہ راجیہ سبھا کی ممبر بھی رہ چکی ہیں۔ محترمہ شوکت کے شوہر جناب کیفی اعظمی انجمن ترقی پسند مصنفین کے انعقاد میں سجاد ظہیر کے ساتھ کافی عرصہ ہمقدم رہے اور کمیونسٹ پارٹی کے مستقل کارکن بھی رہے۔ اس لیے راقم کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ چونکہ کیفی اعظمی اب اس دنیا میں نہیں رہے تو ان کی بیگم سے ملاقات کی جائے اور بنّے بھائی کے متعلق ان کے تاثرات کا جائزہ بھی لیا جائے۔

شوکت اعظمی سے میرا تعارف نادرہ کی بیٹی جوہی ببر کے توسط سے ہوا۔ انہوں نے ملاقات کی تاریخ اور وقت مقرر کر کے مجھے اطلاع کردی تھی۔ شوکت جانکی کٹیر جوہو میں رہتی ہیں۔ جوہی نے مجھے بتایا کہ شوکت اعظمی پہلی اپریل 2010 کے تقریباً صبح دس بجے مجھ سے ملاقات کے لیے راضی ہوئی ہیں۔ چونکہ مجھے ان کی رہائش کا پتہ جانکی کٹیر کا ہی بتایا گیا تھا اس لیے میں مقررہ وقت پر وہاں پہنچا۔ لیکن جا کر معلوم ہوا کہ وہ ان دنوں اپنی بیٹی شبانہ اعظمی کے گھر پر قیام کرتی ہیں۔ شبانہ قریب ہی جوہو پوسٹ آفس کے پاس ہی ایک عمارت کی ساتویں منزل کے فلیٹ میں رہتی ہیں۔ ان

دنوں شبانہ کی پیر کی ہڈی ایک حادثے میں ٹوٹ گئی تھی جس کی وجہ سے ان کی ساری ٹانگ پر ایک موٹا پلستر لگا ہوا تھا اور وہ چلنے سے معذور تھیں۔ لہٰذا گھر میں ہی رہتی تھی۔ ان کے ساتھ بھی یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

اگرچہ شوکت کیفی مجھے پہلی بار ملی تھیں لیکن انہوں نے مجھے اس بات کا رتی بھر بھی احساس نہیں ہونے دیا۔ ان کا رویہ نہایت مشفقانہ تھا اور انداز اتنا مہذب کے جیسے حیدرآباد اور لکھنؤ کی تہذیبوں کی آمیزش ہے۔ ان سے گفتگو کر کے مجھے بے حد مسرت محسوس ہوئی۔ انہوں نے جس بے تکلفی سے بات چیت کی اس سے لگتا تھا کہ جیسے وہ کسی بھائی یا مہربان سے مخاطب ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک خودنوشت تالیف کی ہے جسے انہوں نے 'یاد کی راہ' کا نام دیا ہے۔ یہ میرے لیے بڑے فخر کی بات ہے کہ انہوں نے اپنی خودنوشت کی ایک نقل مجھے ذیل کی تحریر کے ساتھ پیش کی جو میرے لیے ایک قابل قدر تحفہ ہے:

''اندر بھان بھسین صاحب کے لیے جسکی شخصیت نے مجھے بہت متاثر کیا۔''

شوکت کیفی

1 . 4 . 2010

ایک محترمہ نصرین رحمٰن نے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جس کتاب کا نام ہے " Kafi & I "۔ اس کتاب کی بھی ایک نقل محترمہ شبانہ اعظمی جو ہندوستان کی مایہ ناز ایکٹر ہیں انہوں نے اپنے ہاتھوں سے endorse کر کے مجھے بھینٹ کی جو میں نے بہت سنبھال کر رکھی ہے۔ اس کے لیے میں ان دونوں ماں بیٹی کا بے حد مشکور ہوں۔ ہماری گفتگو میں شبانہ نے کافی دلچسپی لی اور اپنی یاداشت سے ہماری معلومات میں اضافہ کرتی رہیں۔ شوکت کیفی سے جو ہماری گفتگو ہوئی اس کا اختصار ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

سوال: کیفی اعظمی اور آپ کی ملاقات کب، کیسے اور کہاں ہوئی اور ملاقات عشق میں کیسے تبدیل ہوگئی؟

جواب: فروری 1947 میں حیدر آباد میں ترقی پسند ادیبوں کیا کانفرنس ہونا طے پائی تھی۔ اختر بھائی نے اپنی بڑی بہن گھر میں کیفی اعظمی اور مجروح سلطان پوری کوٹھہرانے کا انتظام کیا تھا۔ اسی رات کو مشاعرہ ہونا تھا۔ میں اور میرے بڑے بھائی مشاعرہ سننے کے لیے گئے۔ ہم ہال میں سامنے کی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اس موقع کے لیے بڑے خوبصورت کپڑے پہنے تھے۔ سفید کارگے کا کرتا، سفید شلوار اور بہت ہی محنت سے رنگا ہوا قوسِ قزاح کے رنگوں والا دوپٹہ۔ پیر میں سنہرے رنگ کا سلیم شاہی جوتا۔ میں اپنی طرف سے سب پر چھا جانے کی کوشش میں تھی۔ جب کیفی نے پڑھنا شروع کیا تو میں مبہوت ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ دراز قد، پتلا پرکشش نوجوان اور آواز خدا کی پناہ، اتنی گھن گرج۔ نظم کا عنوان تھا 'تاج'۔ اعلیٰ حضرت کے شہر میں انہی کے تاج کے خلاف اتنی طاقتور نظم۔

میرے بڑے بھائی بھی کیفی کی نظم سے بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ یہ عمر اور اتنی بے باک نظم۔

مشاعرہ ختم ہوا تو لوگوں کا ایک ہجوم کیفی، سردار جعفری اور مجروح سلطانپوری کا آٹوگراف لینے کے لیے ٹوٹ پڑا۔ نہ جانے کیوں میں نے کیفی کی بجائے سردار جعفری کا آٹوگراف مانگا جو غالباً کیفی کو ناگوار گزرا۔ اس لیے انہوں نے میری آٹوگراف بک پر ایک انتہائی مہمل شعر لکھ دیا۔ واپسی پر میں جان بوجھ کر کیفی کے ساتھ ساتھ چلنے لگی اور پوچھا کہ آپ نے میری بک میں ایسا گھٹیا سا شعر کیوں لکھا تو وہ شرارت سے مسکرائے اور کہا کہ آپ نے پہلے جعفری صاحب سے آٹوگراف کیوں لیا۔

اسی رات اختر بھائی نے تمام شاعروں اور ادیبوں کو اپنے گھر پر دعوت دے رکھی تھی۔ اختر حسن میری منجھلی بہن ریاست خانم کے شوہر ہیں۔ ان دنوں وہ اردو اخبار 'پیغام' کے ایڈیٹر تھے اور ترقی پسند شاعر بھی تھے۔ اس رات کھانا کھانے کے بعد چند لمحوں کے لیے کیفی سے تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع ملا۔ اس مشاعرے کی خاص بات یہ تھی کہ وہاں مجروح نے اپنی دلنواز اور خوبصورت آواز میں یہ غزل پڑھی تھی:

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
تیرا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

سردار جعفری نے اپنی خاص نظم 'نئی دنیا کو سلام' سنائی۔ مخدوم کی بھی ایک غزل بہت پسند کی

گئی تھی۔ پھر کیفی نے اپنی نظم 'عورت' سنائی۔ کیفی پورے اعتماد کے ساتھ آئے اور جلتی ہوئی سگریٹ کو انگلیوں میں تھامے اپنی نظم سنائی جس کے ہر بند کا آخری مصرعہ تھا:

اٹھ میری جان میرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

مجھے لگا یہ نظم انہوں نے میرے لیے ہی کہی ہے۔ بس اسی دم مجھے کیفی سے عشق ہو گیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ کیفی کی ہی دلہن بنوں گی ورنہ شادی نہیں کروں گی۔

حیدر آباد کی کانفرنس تین دن تک چلی۔ تیسرے دن سردار جعفری، سلطانہ اور مجروح سلطانپوری تو بمبئی لوٹ گئے لیکن کیفی وہیں رک گئے۔ حالانکہ ابا اور میری دونوں چھوٹی بہنیں کیفی کو پسند کرنے لگے تھے۔ میرے دونوں بڑے بھائی اور میری چھوٹی آپا کو کیفی سے میری نزدیکی بالکل گوارا نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ میں کیفی سے نہ مل سکوں۔ لہٰذا کیفی روتے ہوئے بمبئی لوٹ گئے لیکن مجھے ان سے ملنے نہیں دیا گیا۔ ان کے جانے کے بعد میں ان کے چھوڑے ہوئے تمام کاغذات کو بہت بے چینی سے الٹ پلٹ کر دیکھا تو ایک کاغذ ملا جس پر ایک خوبصورت نظم لکھی ہوئی تھی جس کا عنوان تھا 'شوکت کے نام'۔ نظم پڑھتے ہی میں نے بے ساختگی سے کیفی کو خط لکھا جس میں کھلے الفاظ میں کیفی سے اپنی محبت کا اعتراف کیا۔ پھر خطوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ان میں سے ایک خط جو کیفی نے مجھے لکھا تھا ابا جان نے پڑھ لیا اور بہت خوش ہوئے۔ لیکن باقی تمام لوگوں نے کیفی سے میری شادی کی سخت خلاف تھے۔

سوال : آپ یہ بتائیں کہ آپ دونوں کی شادی پھر کیونکر ہوئی اور کس کس نے اس معاملے میں آپ کی مدد کی؟

جواب : کیفی کو میرے خط بالکل نہیں مل رہے تھے۔ اس لیے روتے روتے ان کا برا حال ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ان کے ساتھیوں کو کیفی پر رحم آنے لگا تھا۔ ایک کامریڈ اشفاق بیگ تھے جو پیشے سے وکیل تھے مگر پارٹی کے مستقل کارکن تھے۔ وہ کیفی سے بہت ہمدردی کرتے تھے۔ انہوں نے نا جانے کیسے ابا جان کو کیفی سے میری شادی پر راضی کر لیا اور اسی رات ابا جان نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ بمبئی چل کر آپ خود فیصلہ کر لینا کہ تم کیا چاہتی ہو۔ اگر آپ کو کیفی کی زندگی پسند آئی تو میں وہیں

تمہاری شادی کردوں گا اور تمہاری بہن اور بھائیوں کی ناراضگی کی پرواہ نہیں کروں گا۔ اور ہم دونوں بمبئی آ گئے۔ وہاں ہم نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ کوئی سات بجے کیفی اور مہدی ہمارے ہاں آئے اور کہا کہ بنے بھائی (سجاد ظہیر) اور رضیہ آپا کو پتہ چل گیا ہے کہ آپ آ گئے ہیں۔ اس لیے انہوں نے آپ کو گھر پر بلایا ہے۔ ان کا گھر ملبار ہل میں سیکری بھون میں واقع تھا۔ اگلے روز ہم وہاں چلے گئے۔

رضیہ آپا اور بنے بھائی انتہائی خلوص سے ہمیں ملے جس سے ہمیں ایسا لگا کہ جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ وہاں ان کی دو پیاری سی بچیاں نجمہ اور بونا (نسیم) بھی تھیں۔ رضیہ آپا نے ہنس کر کہا کہ اچھا ہوا تم آ گئیں ورنہ یہ قالین کیفی کے آنسوؤں سے خراب ہو جاتا۔ پھر بنے بھائی ہمیں کمیون لے گئے جہاں کیفی رہتے تھے۔ ان کا کمرہ نہایت سادہ اور تنگ تھا جس میں بان کا پلنگ تھا۔ ایک دری، گدا اور چادر اس پلنگ پر بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ ایک چھوٹی سی میز کرسی بھی پڑی تھی جس پر کتابوں اور اخباروں کا ڈھیر لگا تھا۔ کھانے کے بعد ہر ایک اپنے برتن خود دھوتا تھا۔ کھانے کے لیے المونیم کی تھالی، ویسی ہی کٹوریاں، دو دو لکڑی کی چوکیاں تھیں۔ ایک چوکی پر بیٹھتے تھے اور دوسری پر کھانا رکھتے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد ہم بنے بھائی کے گھر لوٹ آئے۔ پھر ابا اور میں ٹہلنے کے لیے چوپاٹی چلے گئے جہاں ابا نے بڑی سنجیدگی سے مجھ سے کہا بیٹے تو یہ ہے ان لوگوں کی زندگی۔ اب آپ فیصلہ سنایئے کہ آیا اب بھی آپ کیفی سے ہی شادی کرنا چاہتی ہیں۔ یہ تو پارٹی کے ہول ٹائمر ہیں اور کچھ کماتے بھی نہیں۔ میں نے کہا ابا جان کیفی بہت اچھے انسان ہیں اور میں ان ہی سے شادی کروں گی۔ جب ہم واپس لوٹے تو ابا جان نے بنے بھائی سے کہا کہ کل آپ ان دونوں کا نکاح کر دیجئے کیونکہ مجھے دیر ہو رہی ہے۔

دوسرے دن صبح رضیہ آپا قالین پر بیٹھ کر میرے ہاتھوں میں مہندی لگا رہی تھیں۔ نہ جانے کیوں مجھے اچانک رونا آ گیا۔ پاس ہی بنے بھائی بیٹھے تھے۔ کہنے لگے "بھئی یہ لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ اپنی مرضی کی شادی ہو رہی ہے، اس میں بھلا رونے کی کیا بات ہے۔"

مجھے اپنی اماں یاد آ رہی تھیں مگر رضیہ آپا بالکل ماں کی طرح برتاؤ کر رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے اپنے بری کے کپڑے پہنائے اور سونے کی دو دو چوڑیاں بھی میری کلائیوں میں ڈال دیں۔ کیفی نے بھی سونے کی ایک چھوٹی سی انگوٹھی پہنائی۔

شام کو ایک قاضی صاحب نکاح پڑھانے آئے۔ گھر مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تمام ترقی پسند ادیب وہاں موجود تھے۔ جوش، مجاز، کرشن چندر، ساحر، پطرس، سکندر علی وجد، عصمت چغتائی، سردار جعفری، رفعت سروش وغیرہ سبھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ سکندر علی وجد اور سردار جعفری گواہ مقرر ہوئے اور اندر آ کر مجھ سے پوچھا ''کیا آپ کو اطہر حسین رضوی ولد فتح حسین رضوی سے نکاح قبول ہے؟'' تب مجھے کیفی کا اصلی نام معلوم ہوا۔ چونکہ کیفی شیعہ تھے اور ہم لوگ سُنّی تو شادی کے لیے دو قاضی درکار تھے۔ لیکن قاضی تو بہ مشکل ایک آ پائے تھے۔ چنانچہ بنّے بھائی نے مسکراتے ہوئے قاضی صاحب سے کہا 'حنفیہ المذہب' اور میرا نکاح ہو گیا۔

سوال : آپ کے والد حیدر آباد میں ایکسائز کے سپرڈنٹ تھے اور ترقی پسند ادیب ہونے کی وجہ سے وہ بہت آزاد خیالات رکھتے تھے اس لیے آپ سب عورتوں پر پردے کی کوئی پابندی نہیں تھی لیکن کیفی تو شیعہ تھے اور ان کے خاندان والے پرانے خیالات والے تھے۔ کیا اس وجہ سے آپ کو کسی دقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کیفی کے گھر والوں کا آپ سے کیسا سلوک تھا؟

جواب : 1948 میں جب میرا پہلا بچہ پیدا ہونے والا تھا تو کیفی نے سوچا کہ لکھنؤ میں ان کے گھر والے میرا اچھی طرح خیال رکھیں گے۔ اس لیے وہ مجھے لکھنؤ لے گئے۔ وہاں کیفی کے بڑے بھائی اور بڑی بہن واجدہ رہتے تھے۔ لیکن باوجود اس کے کہ میں سُنّی تھی اور وہ شیعہ، کیفی کے گھر والے مجھ سے بڑے پیار سے ملے۔ واجدہ باجی ہومیوپیتھی کی پریکٹس بھی کرتی تھیں۔ کیفی واجدہ آپا کے بہت چہیتے بھائی تھے اور پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھ سے بیحد پیار کرنے لگی تھیں۔ اچھن بھیا اور ان کی دلہن کا بھی میرے طرف بہت پیار بھرا رویہ تھا۔ میں واجدہ باجی کے ہاں ہی ٹھہری تھی لیکن میرا سارا خرچ اچھن بھیا ہی اٹھاتے تھے۔ وہ وہاں وکیل تھے اور ڈالی گنج میں رہتے تھے جبکہ واجدہ آپا کا گھر پرانے لکھنؤ میں تھا۔

شام کو میں اور کیفی اکثر حضرت گنج چلے جاتے تھے جہاں کیفی کے دوست منیش نارائن بھی وہاں پہنچ جاتے تھے اور ہم تینوں ایک کافی ہاؤس میں کافی پیتے تھے۔ جب باجی کو اس بات کو علم ہوا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ دلہن ہمارے یہاں بے پردگی کو عیب سمجھا جاتا ہے۔ میں کچھ جواب نہیں دیا لیکن شام کو اپنا عمل برقرار رکھا۔

کیفی کے والدین اعظم گڑھ کے ایک گاؤں مجواں میں درمیانہ طبقے کے زمیندار تھے۔ ایک بار مجھے دیکھنے لکھنؤ آئے اور بڑے پیار سے مجھے قبول کیا۔ کسی نے اشارتاً بھی مجھے اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا کہ میں شیعہ نہیں ہوں۔ وہ لوگ سیدھے سادے اور محبت کرنے والے شخص تھے لیکن پرانے خیالات کے تھے۔ پردے کے حق میں تھے اور لڑکیوں کو اسکول بھیجنے کے سخت خلاف تھے۔ میاں بیوی ایک پلنگ پر نہیں بیٹھتے تھے۔ لکھنؤ میں جب میرا پہلا بیٹا پیدا ہوا تو کیفی کی ماں نے سب سے کہا کہ بیٹی ہوئی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ بیٹے کو نظر لگ جاتی ہے۔ کچھ دنوں بعد کیفی کے والدین مجھے مجواں لے گئے جہاں مجھے چار مہینے رہنا پڑا۔ مجواں میں کیفی کا گھر تو کافی بڑا تھا لیکن گاؤں چھوٹا سا ہی تھا۔ اسٹیشن سے گاؤں تک کوئی سڑک نہیں تھی۔ صرف کھیت ہی کھیت تھے۔ نہ بجلی تھی نہ کوئی دکان نہ نل۔ لوگ کنویں سے پانی نکالتے تھے۔ ہمیں اندر کا ایک کمرہ دیا گیا تھا جہاں ایک فرشی پنکھا تھا۔ میز کرسی اور دو پلنگ تھے۔ ایک پلنگ پر میں اور میرا بچہ سوتے تھے اور دوسرے پر کیفی۔ مجواں میں چار مہینے بہت دشوار گزار ہوئے مگر یہ وقت بہت آسانی سے کٹ گیا کیونکہ کیفی کی والدہ اور واجدہ باجی مجھے کیفی کے بچپن کے قصے سناتی رہتی تھیں جو بہت ہی دلچسپ ہوتے تھے۔ باجی ٹی بی کی مریض تھیں لیکن بہت ہی ہمت والی تھیں۔ ایک بار قصہ سناتے سناتے انہیں دورہ پڑا جس سے ہم سب گھبرا گئے تھے۔ آخر باجی کا انتقال ہو گیا۔ پھر ہم لکھنؤ چلے گئے۔

سوال : کمیون کا ماحول آپ کو کیسا لگا اور آپ نے وہاں اپنے دن کیسے گزارے۔ ان دنوں کیفی کی کوئی خاص آمدنی بھی نہیں تھی۔ پارٹی سے جو ملتا تھا اسی پر گزر بسر کرنی پڑتی تھی۔ ان حالات سے آپ نے کس طرح سمجھوتہ کیا؟

جواب : کمیون میں کیفی کے کمرے کی حالت میں پہلے بیان کر چکی ہوں۔ جب نکاح کے بعد ہم ابا کو وی ٹی اسٹیشن چھوڑ کر کمیون پہنچے تو میں نے سارے کمرے میں جھاڑو لگایا، کتابوں سے مٹی ہٹائی ،اخبار بچھا کر اس پر گدا ڈالا اور ایک رنگین چادر بچھا دی۔ کرسی میزوں کو سلیقے سے رکھا۔ ایک گلاس میں چند پھول سجا دیئے۔ اب کمرے کا تمام حلیہ بدل چکا تھا۔ ساڑھی کو پھاڑ کر پردہ بنا لیا اور دوسری جو ضروری چیزیں درکار تھیں ان کی لسٹ بنائی جن کو خریدنے کے لیے ابا مجھے پانچ سو روپے دے گئے

[illegible] جب کمیون کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ وہاں آنگن میں ایک بڑے پتیلے میں چائے بن رہی ہے اور تمام کامریڈ اپنے اپنے مگوں میں چائے ڈالے اخبار پڑھنے میں مصروف ہیں۔ کامریڈ مرزا اشفاق کا پائجامہ کئی جگہوں سے پھٹا ہوا تھا مگر وہ اس سے بے نیاز تھے۔ چائے کے بعد کامریڈ نہاتے تھے اور پھر کھانا کھا کر اپنے اپنے کام میں مشغول ہو جاتے تھے۔ یہ دنیا میرے لیے نئی اور عجیب تھی وہاں کے لوگ نہایت روشن دماغ، انسان دوست اور ایسے لوگ تھے جو پریشان اور پچھڑے ہوئے انسانوں کے لیے ایک نئی دنیا کی تعمیر میں مصروف تھے۔ اگرچہ وہ سب ہندوستان کے الگ الگ علاقوں کے رہنے والے تھے لیکن سب ایک ہی گھر کے معلوم ہوتے تھے۔

ان دنوں ہر اتوار کو ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ بنّے بھائی کے مقام پر ہوتی تھی جہاں شعرا اور ادیب اپنا اپنا کلام سناتے تھے۔ ان پر بحث اور تنقید ہوتی تھی۔ بنّے بھائی کی نظر سب پر رہتی تھی اس لیے کوئی بھی غیر حاضر ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ شام کو رضیہ آپا سب کو چائے پلاتی تھیں۔

ان دنوں جو مشاعرے ہوا کرتے تھے ان میں ترقی پسند اور روایتی شعرا دونوں ہی شریک ہوا کرتے تھے۔ لیکن ترقی پسند شعرا جن میں کیفی، سردار جعفری، ساحر اور مجروح سلطانپوری اکثر مشاعرہ لوٹ لے جاتے تھے۔ اگلے دن جب سب لوگ بنّے بھائی کے گھر جمع ہوتے تو بنّے بھائی اپنے مخصوص انداز میں کہا کرتے تھے ''بھئی واہ! کل کا مشاعرہ تو ہمارے بچّوں نے لوٹ لیا۔'' ایک بار ایک مشاعرے میں کیفی نے لوگوں کو مرعوب کرنے کے انداز میں اپنی نظم 'حقیقتیں' سنائی جسے لوگوں نے بہت پسند کیا تھا۔ اگلے روز بنّے بھائی نے مجھ سے کہا کہ ''بھئی موتی (میرا گھریلو نام) تمہارے شوہر نے تو کل مشاعرہ ہی لوٹ لیا۔''

اگرچہ وہاں کی دنیا حیدرآباد کی دنیا سے مختلف تھی لیکن وہاں لوگ بہت اچھے تھے جن میں بنّے بھائی کو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں جب تک وہاں رہی بنّے بھائی اور رضیہ آپا نے مجھ سے بے حد پیار کیا اور مجھے اپنے ماں باپ کی کمی نہیں محسوس ہونے دی۔ ایک بار پارٹی کے جنرل سکریٹری پی سی جوشی میرے کمرے میں آئے اور بڑی محبت سے ملے۔ کہنے لگے کہ کمیونسٹ شوہر کی بیوی کو اپنے شوہر کے ساتھ مل کر کام کرنا اور پیسے بھی کمانے تاکہ جب بچّے پیدا ہوں تو ان کی بخوبی دیکھ بھال ہو سکے۔ اس ملاقات کے بعد میں نے بھی یہ فیصلہ کر لیا کہ میں بھی پیسے کماؤں گی۔ میں نے پریم

دھون سے جو فلموں میں گانے لکھتے تھے ان سے کہا کہ کسی کورس میں مجھے کام دلوائیں۔ اگلے دن وہ مجھے ساتھ لے گئے اور برمن دادا سے میرا تعارف کرایا جنہوں نے میری آواز پاس کردی۔ پھر دو دن ریہرسل کی اور ریکارڈنگ پر مجھے تیس روپے ملے۔ بعد میں مجھے ڈبنگ کا کام بھی ملنے لگا جس سے دو سو پانچ سو تک کی کمائی ہو جاتی تھی۔ اس طرح کچھ حد تک روپے پیسے کی کمی دور ہونے لگی تھی۔ پھر جب ہم لوگ بمبئی آئے تو میں نے پرتھوی تھیٹر میں کام کرنا شروع کر دیا جہاں سے مجھے سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ شام کو ایک لڑکے کو ٹیوشن بھی دیتی تھی جس سے پینتالیس روپے ملتے تھے۔

کیفی مزدوروں کے لیے کام کرتے تھے مگر کبھی کبھی چھوٹے پرڈیوسروں سے گانے یا کسی کہانی کے مکالمے لکھنے کا کام بھی مل جاتا تھا جس سے تقریباً پانچ ہزار روپے کی اجرت ہو جاتی تھی جس سے چند مہینوں کے لیے فراغت مل جاتی تھی۔ پھر ایک دن قسمت نے ایسا ساتھ دیا کہ کیفی کو گورو دت کی فلم 'کاغذ کے پھول' کے گانے لکھنے کا کام مل گیا۔ بعد میں کیفی نے کتنی ہی فلموں کے گانے لکھے جن میں 'شعلہ اور شبنم' اور 'اپنا ہاتھ جگن ناتھ' جیسی فلمیں بھی شامل تھیں۔ اگر چہ یہ تمام فلمیں فیل ہو گئیں مگر کیفی کے لکھے ہوئے گانے بہت کامیاب ہوئے۔ کچھ عرصے بعد چیتن آنند، مدن موہن اور کیفی اعظمی کا ایک گروپ بن گیا اور کیفی چیتن آنند کی تمام فلموں کے گانے لکھنے لگے۔ اس کے بعد ہماری تمام مالی مشکلات بالکل دور ہو گئیں۔

سوال : اب یہ آخری سوال ہے۔ آپ یہ بتانے کی نوازش کریں کہ بنّے بھائی نے اپنی اسیری کے دوران کیا کوئی خطوط آپ کے اور کیفی کے نام لکھے تھے جن میں انہوں نے جیل میں اپنی صعوبتوں کا ذکر کیا ہو؟

جواب : بنّے بھائی نے کیفی کو ایسے خطوط لکھے تھے جو پاکستان کی جیلوں سے لکھے تھے لیکن کسی بھی خط میں انہوں نے یہ بالکل نہیں کہا کہ انہیں جیل میں کسی بھی تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ہاں ان پر کوئی سختی برتی جا رہی تھی۔ کیفی کی طرح بنّے بھائی کے مزاج میں بھی شکوے و شکایت کا کوئی مقام نہیں تھا۔ لندن میں جب وہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا انعقاد کر رہے تھے تو وہاں انہیں کئی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہو گا لیکن انہوں نے تو زبانی اور نہ ہی اپنی کسی تحریر میں ان تکلیفات کا ذکر کیا ہے۔ بعد

میں دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ دو سال سے زائد عرصہ تک لکھنؤ سینٹرل جیل میں قید رہے جہاں سے انہوں نے سینکڑوں خط رضیہ آپا و دوسروں کو لکھے لیکن ان میں بھی سوائے قید تنہائی کی پریشانی کے اور کسی بھی مشکل کا حوالہ نہیں دیا۔ اس کے بعد سات سال پاکستان میں رہے جس کا کچھ حصہ روپوشی کی حالت میں اور باقی جیلوں میں گزرا۔ وہاں سے بھی انہوں نے کیفی، سردار بھائی اور فیض احمد فیض کو خطوط لکھتے رہے لیکن ان میں اکثر ادبی تنقید وغیرہ ہی ہوتی تھی۔ کسی صعوبت کا کسی طور پر ذکر نہیں کیا۔

وہ کیفی سے بہت محبت کرتے تھے اور کیفی ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ کیفی کو کانپور سے لکھنؤ لانے میں بنّے بھائی کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ روسی انقلاب کا زمانہ تھا اور پارٹی میں کیفی کی کوئی خاص شناخت نہیں تھی۔ اسے بنانے والے بنّے بھائی ہی تھے۔ کیفی کے تعلقات بنّے بھائی سے دوستانہ اور رفیقانہ تھے۔ 1973 میں جب کیفی پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ اسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے اس وقت بنّے بھائی کے خطوں نے انہیں بہت ہمت دلائی۔ اس وقت بنّے بھائی کیفی کی بیماری کی وجہ سے بہت تڑپ رہے تھے جو ان کے خطوں سے عیاں تھی۔ کیفی کہتے تھے کہ بنّے بھائی نے جس طرح ان کی بیماری کو ذاتی مسئلہ بنالیا تھا وہ انہیں اس تاریخی واقعہ کی یاد دلاتا تھا جب بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کی بیماری اپنے اوپر لے لی تھی۔

کیفی نے ایک مقالہ لکھا تھا جو 1973 کے سجاد ظہیر نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اگرچہ وہ مقالہ قومی جنگ کے متعلق تھا لیکن اس نے بنّے بھائی کی شخصیت کے بارے لکھا تھا:

> ''بنّے بھائی کے کارنامے بیان کرنے کی نہ مجھ میں صلاحیت ہے اور نہ کسی چھوٹے سے مضمون میں اس کی گنجائش ہے۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک ان کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اردو ادب میں اس کی دوسری کوئی مثال کم سے کم میری نظر میں نہیں ہے۔
>
> میرا تعلق ترقی پسند مصنفین سے بھی ہمیشہ رہا ہے اور مختلف ٹریڈ یونینوں سے بھی۔ اس لیے میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ادیبوں کی تنظیم سب سے مشکل کام ہے۔ بنّے بھائی نے جس کامیابی سے اس کام کو سرانجام دیا وہ، ہم سب کے لیے ایک مینارِ ہدایت ہے۔''

روس میں بنّے بھائی کا انتقال ہوا تو کیفی کو بہت صدمہ پہنچا۔ تب کیفی نے کہا تھا کہ گو ان کے والد کو مرے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا لیکن اس سے پہلے شاید یتیمی کا اتنا شدید احساس کبھی نہیں ہوا تھا جتنا بنّے بھائی کی موت سے ہوا۔ کیفی کی فطرت تھی کہ وہ اپنا دکھ کسی پر واضح نہیں ہونے دیتے تھے۔ لیکن اس منحوس خبر نے ان کو خاموش کر دیا۔ شاید اندر سے ٹوٹ گئے تھے۔

بنّے بھائی نے کیفی کو اور مجھے بہت خط لکھے تھے مگر اس طویل عرصے میں جو بار بار رہائش گاہ تبدیل کرنی پڑی اس وجہ سے وہ تمام خطوط تلف ہو گئے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ قیمتی اثاثہ اب ہمارے پاس نہیں رہا۔

خدا رکھے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ہماری شادی کے سلسلے میں بھی کیفی کی طرف سے بنّے بھائی ہی میرے ابا سے گفت و شنید کر رہے تھے۔ وہ اس میں اس قدر دلچسپی لے رہے تھے جیسے شادی کیفی کی نہیں ان کی اپنی ہی ہو۔ کئی روز تک بھاگ دوڑ کے بعد میرے ابا کو راضی کروا لیا کہ شادی ضرور ہو گی اور بنّے بھائی کے گھر پر ہی ہو گی۔ ایسے تھے سجاد ظہیر عرف بنّے بھائی۔

یکم ؍ اپریل ۲۰۱۱ء

☆☆☆☆

سجاد ظہیر کی موت پر مرثیے

فیض احمد فیضؔ

جامِ الوداعی

نہ اب ہم ساتھ سیر و گل کریں گے
نہ اب مل کر سرِ مقتل چلیں گے
نہ اب دشتِ جنوں کی شام غمگیں
نہ گل گشتِ بتاں کی صبح رنگیں
حدیثِ دلبراں باہم کریں گے
نہ خونِ دل سے شرحِ غم کریں گے
نہ لیلائے سخن کی دوستداری
نہ غم ہائے وطن میں اشک باری
سنیں گے نغمۂ زنجیر مل کر
نہ شب بھر مل کے چھلکائیں گے ساغر
بہ نامِ شاہدِ نازک خیالاں
بیادِ مستیِ چشمِ غزالاں
بہ نامِ انبساطِ بزمِ رنداں
بہ یادِ کلفتِ ایامِ زنداں

صبا اور اس کا اندازِ تکلم
سحر اور اس کا آغازِ تبسم
خلا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہی تو مسندِ پیرِ مغاں ہے
سحرگہ اب اسی کے نام ساقی
کرو اب ختم دورِ جام ساقی
بڑھاؤ شمعِ محفل بزم والو
پیو اب ایک جام الوداعی
پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو

☆☆☆☆

سردار جعفری

گُلِ عقیدت

اَے صبا، اِک گُل، میری جانب سے اُس دل کے لیے
جس کی دھڑکن میں نہاں تھا نغمۂ عالم کا دل
دشمنوں کے واسطے جو آہن و فولاد تھا
دوستوں کے واسطے تھا قطرۂ شبنم کا دل

☆☆☆☆

مجروح گورکھپوری

بہاراں کا سفیر

دوستو پھینک دو اب ہاتھ سے قرطاس و قلم ناخنِ غم سے کرو لوحِ جگر پر تحریر
نقشِ غم روزِ ازل سے ہے جو میراث اپنی اپنا سرمایہ یہی بنتی بگڑتی تصویر
آہ وہ ہاتھ کہاں ہے کہ اسے چوم تو لیں جس کے اک جام سے میخانے ہوئے ہیں تعمیر
چمنِ دہر سے کانٹوں کی ردا اوڑھے ہوئے کون سا دیس سدھارا وہ بہاراں کا سفیر

خاک رُخسار پہ مَل اے گلِ خورشید سحر
توڑ دے، آئینہ شام کو اے ماہِ منیر!

لے گیا دستِ اجل چھین کے دیوانوں سے ایسا غم خوارِ جنوں رُوئے گی جس کو زنجیر
خامشی اس کی نسیمِ سحری تھی گویا بیقراروں کو گھنی چھاؤں تھی اُس کی تقریر
بھر گیا لالہ وگل سے جسے جانے والا اب وہی راہ گذر لگتی ہے زخموں کی لکیر
شاید آوارہ کرے اور ابھی خوابِ سحر گردِ مژ گاں ہی رہے خوابِ سحر کی تعبیر
نقشِ دیوار سے خاموش ہیں اربابِ سخن صَوت افسردہ ہے الفاظ و معانی دلگیر

اشک آلودہ ہوئی میری غزل اس کے بعد
نام نغمے کا ہوا نوحہ سجاد ظہیر

☆☆☆☆

فارغ بخاری

میرے ساتھی، میرے ہمدم، میرے دوست

میرے ساتھی، میرے ہمدم، میرے دوست
تیرے مرنے کا یقیں ہو کیسے
آہٹیں ہیں تیرے قدموں کی
مری راہوں میں
لمس ہے تیری محبت کا
مری باہوں میں
قہقہے گونجتے ہیں تیرے
فضا میں اب تک
تیرے نغمات کی خوشبو ہے
ہوا میں اب تک
میرے احساس پہ چھایا ہے ابھی تک
تری آنکھوں کا خمار
میرے دل میں ہے مجسم
تری آواز کا پیار
تیرا فن زندہ ہے
اخلاص و وفا زندہ ہے
مسکراتی ہوئی باتوں کا نشہ زندہ ہے
تیرے مرنے کا یقیں ہو کیسے؟

☆☆☆☆

وامق جونپوری

چراغِ میکدہ

(پہلے احتشام صاحب اور اب بنّے بھائی)

ہمارے میکدے کا بجھ گیا اک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آرہا ہے سوئے ایاغ
وہ ایک غم تھا جو سیلاب بن کے اُمڈا تھا
اور ایک غم یہ ہے جو آگ بن کے پھیل گیا
سنانی پہ یہ سنانی ہے جگر ہے صد پارہ
ہمیں تسلیاں مت دو کہ ہم ہیں اہلِ وفا
ہے آج قابو کے اندر ہمارا دل نہ دماغ
ہمارے میکدے کا بجھ گیا اِک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آرہا ہے سوئے ایاغ
ستارے ٹوٹ رہے ہیں فلک پہ برسوں سے
نظارے ان گنت اوجھل ہوئے ہیں نظروں سے
منارے روز گرا کرتے ہیں بلاؤں سے
کنارے ہوتے ہی رہتے ہیں زیرِ موجوں سے
مگر یہ غم وہ ہے جس سے کبھی نہ ہوگا فراغ

ہمارے میکدے کا بجھ گیا اِک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آرہا ہے سوئے ایاغ
ہم آج ان کی زیارت سے ہوگئے محروم
پلک جھپکتے ہی شکلیں جو ہوگئیں معدوم
نتیجہ کچھ نہیں اس سوگ کا ہمیں معلوم
مگر بھلا نہیں سکتا انہیں دل مغموم

کہ شیشہ سے نہیں جاتا کبھی شکست کا داغ
ہمارے میکدے کا بجھ گیا اِک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آرہا ہے سوئے ایاغ
وہ شمع فکر ہے جو تا ابد ضیا بخشے
وہ جستجو ہے جو صحرا کو راستہ بخشے
وہ ' روشنائی ' ہے کہ لکھنے کی جو ادا بخشے
ہوں جن میں خوبیاں اتنی انہیں خدا بخشے
زبانِ حال قلم دے رہی ہے ان کا سُراغ
ہمارے میکدے کا بجھ گیا اِک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آرہا ہے سوئے ایاغ
ہماری سمت مگر کیا بڑھے گی ظلمت شب
کہ ہم ہیں وارثِ آتش بجان و شعلہ بہ لب
ہمارے ترکے میں آئے ہیں بار ہائے ادب
محافظِ ادب و شعر ہے ہمارا لقب
ہمیں ہیں بلبلِ گلزار شہر قلب و دماغ
ہمارے میکدے کا بجھ گیا اک اور چراغ

اندھیرا بڑھتا چلا آرہا ہے سوئے ایاغ
انہیں چراغوں کے گل سے جلیں گے کتنے چراغ
انہیں ایاغوں سے چھلکا کریں گے کتنے ایاغ
انہیں دماغوں سے مہکا کریں گے کتنے دماغ
انہیں نے فرق دکھایا میان بلبل وزاغ
انہیں کی کاوش و دانش سے ہے ادب کو بلاغ
ہمارے میکدے کا بجھ گیا اک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آرہا ہے سوئے ایاغ

☆☆☆☆

قمر ہاشمی

بیمار ادب کا مسیحا

(سجاد ظہیر کی خبرِ مرگ پر)

الما آتا سے آئی جو ٹھنڈی ہوا کی لہر
وہ اک عظیم دوست کا پیغامِ مرگ لائی
وہ دوست جو سفیرِ دیارِ علوم تھا
زندہ رہا تو
آبیاری چمن کی لہو سے کی
بچھڑا تو موتیوں کے خزانے لٹا گیا
زنداں اسے ڈرا نہ سکا
لب نہ سی سکا
وہ انقلاب دوست
وہ ظلمت کا شکار ادیب
لفظوں کی گرہیں کھول کے معنی بتا گیا
ہر پیش پا فتادہ ادب کی زمین کو
تاسیس انقلاب کے نغمے سنا گیا
لفظوں کو ضبطِ نفس کی تعلیم کس نے دی

وہ لوگ جو ہمیشہ حقائق گریز تھے

'انگارے' سے ہوئی یہ حقیقت بھی آشکار

توڑا حصارِ حرف اسی دل شکستہ نے

ذہنوں کو آگہی کا وہ زہراب دے گیا

جس میں کہ تلخیوں کا، حوادث کا تھا شعور

اب وہ ہمارے لفظ و بیاں میں ہے جلوہ گر

اب وہ ہماری رزم گہِ شعر کی سپر

☆☆☆☆

محسن بھوپالی

دُشنام یار
(نذرِ سجاد ظہیر)

حوادث کی سرکش چٹانوں سے ٹکرا کے،
جس نے نئی رہ گزر دی
نمو سے تہی سخت بنجر زمینوں کو جس نے
بہاروں کی شادابیاں بخش دیں
جس کی گمبھیر لہروں کی،
خاموش اور نرم رو سطح پر بہہ کے
کتنے سفینے، کئی کشتیاں اور تنکے ـــــ سبھی کچھ
نئی زندگی کے نئے راستوں سے شناسا ہوئے
شام کے وقت ـــــ جب وہ دریا تھما ہے
تو آسودہ تنکوں میں سرگوشیاں ہیں
یہ دریا ـــــ غلط بہہ رہا تھا!
یہ دریا ـــــ غلط بہہ رہا ہے!!

☆☆☆☆

مغیث الدین فریدی

سیف زباں سجاد ظہیر

۱۳۹۳ھ

سلام تجھ پہ کہ دار و رسن کی منزل سے
بڑے خلوص ، بڑے انہماک سے گزرا
ہے تیرے خون سے کشتِ وفا کی سیرابی
ہجومِ برق و بلا مشتِ خاک سے گزرا

تو سرفروش مجاہد تھا ، تیرا سوزِ دروں
وطن کی خاک کو برق و شرر بناتا تھا
تو رہنما ، تو سپاہی ، تو ایک مردِ خلیق
قدم قدم پہ تو شمع وفا جلاتا تھا

جبیں پہ محنتِ پیہم سے بانکپن کی ادا
نظر میں جلوۂ شامِ اودھ کی رعنائی
رفیق فاقہ کشوں کا ، عوام کا ساتھی
دلوں پہ کی ہے بغیر کلاہ ، دارائی

قلم کی نوک سے تو نے ، بہ فیضِ فکر و نظر
کبھی سناں کا ، کبھی مُو قلم کا کام لیا
نئے افق سے نکالے ، نئے مہر و خورشید
ادب کو حسنِ یقین ، فن کو اعتماد دیا

تو آج ہم میں نہیں ، تیری یاد باقی ہے
فضا کو رنگ ، چمن کو نکھار دے کے گیا
جنوں نے تیرے کھلائے ہیں آگہی کے چمن
وطن کو اپنے پیامِ بہار دے کے گیا

چمن سے دور فدائے چمن کو موت آئی
" یہ حادثہ بھی تہہ شاخِ آشیاں نہ ہوا "
ہوئی ہے شاملِ تاریخ تیری " آزادی "
" ترا نشان نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا "

☆☆☆☆

سجاد ظہیر

اک چراغ اور سرِ بزم ہوا گل یارو
ایک سر اور سردارِ وفا نذر ہوا
قید جاں سے ہوا آزاد لو اک اور اسیر
شجرِ وقت سے اک برگِ خزاں اور گرا
اور اک نجم سحر ٹوٹ گیا آخرِ شب
اور اک دست دُعا سرد ہوا آخرکار
اور کم ہوگیا لو شورِ سلاسل یارو
اور اک حلقۂ زنجیر لہو میں ڈوبا
درد میں ڈوب گئی اور کچھ آوازِ جرس
ہوگئی دور لو کچھ اور بھی منزل یارو
مِل گیا خاک میں اک لالہ صحرائی اور
چل بسا لیلیٰ جاں اک ترا سودائی اور
ایک گلگشتِ بہار اور ہوا وقفِ خزاں
اور اک گوہرِ نایاب ہوا گُم یارو
اور اک صاحبِ دل محفلِ دل سے اُٹھا
اور سوختہ جاں قریۂ جاں سے گذرا
آج لو ختم ہوا بابِ رفاقت اک اور
آج اس عہد کی آواز ہوئی گُم یارو

☆☆☆☆

وقارؔ خلیل

سفیرِ راہِ جنوں

بہت قریب سے دیکھا ہے اور سنا بھی ہے
مطالعہ میں رہا ہے شعور بخشا ہے
صدا کے دشت میں، محفل میں، کنجِ عزلت میں.
وہی مزاج، وہی تمکنت، وہی ٹھنڈک
وہ گفتگو میں طراوٹ، وہ بانکپن، وہ وقار
وہ سرسبز پیالوں میں سُرخ سُرخ شراب
نہ احتیاطِ تکلم نہ احتیاجِ نیاز
اصول ایسے کہ جیسے ہمالیہ کا ثبات
ستارے ہاتھوں میں، سورج سے دوستی اس کی
تمام شہرِ سخن، قصہ قدیم و جدید
تمام فکر و نظر، عطرِ گل، شرافتِ فن
بحر شناس مسافر، سفیر راہِ جنوں
تھکن سے چُور، لبوں پر اُڑی اُڑی خوشبو
ذرا جو لیٹا ہے بستر پہ اک فسانہ بنا

☆☆☆☆
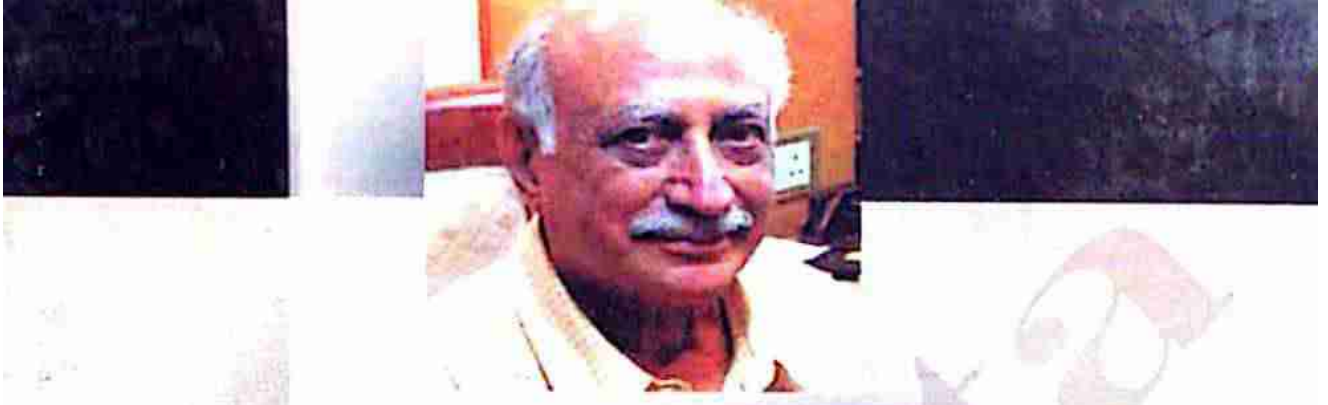
ڈاکٹر اندر بھان بھسین کی شخصیت کئی اعتبار سے لائق رشک ہے۔ آج جب کہ ان کی عمر ۷۸ برس سے تجاوز کر رہی ہے، اُن میں زندگی کرنے کا ایک ایسا زبردست اور توانا جذبہ موجود ہے۔ جو انھیں عام آدمی سے الگ بھی کرتا ہے اور نمایاں بھی۔ اُن تعلق یوں تو پاکستان کے اس علاقے سے ہے جو کبھی غیر منقسم ہندوستان میں 'کوہاٹ' کہلاتا تھا اور شمالی مغربی صوبہ سرحد کے ضلعوں میں سے ایک تھا۔ وہاں کی قبائلی آبادی میں پٹھانوں کی اکثریت تھی جس نے اندر بھان بھسین کی زندگی پر خاطر خواہ اثر ڈالا۔ شاید اسی لیے پٹھانوں کی طرح دوستی اور خلوص کو ان کے یہاں بڑی اہمیت حاصل ہے۔

تقسیم کے بعد ان کا خاندان جب ہندوستان پہنچا تو وہ اُن کی زندگی کا بڑا صبر آزما دور تھا۔ کافی محنت و مشقت کے ساتھ انھوں نے گورمنٹ کالج لدھیانہ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ پڑھنے اور علم حاصل کرنے کی لگن ان میں بے پناہ تھی لیکن خاندانی حالات کا تقاضا کچھ اور تھا اس لیے خاندان کی کفالت کی ذمہ داری ان کے سر آن پڑی۔ دھیرے دھیرے ترقی نے ان کا دامن پکڑا اور وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے گئے۔ ساری گھریلو ذمہ داریوں سے فراغت کے بعد انھوں نے اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لیے دوبارہ تعلیم کی طرف 2001 میں رجوع کیا اور اس عرصے میں انھوں نے جو سندیں حاصل کیں وہ حیران کن ہیں: 1) Dip in Sanskrit, 2) M.A. in Philosophy, 3) M.A. in Urdu, 4) Ph.D. in Philosophy, 5) Ph.D in Urdu. ان کے علاوہ سر دست انگریزی ادبیات میں ایم اے کر رہے ہیں۔ ان کی تصانیف کی فہرست یہ ہے: ۱) گلدستۂ سخن، ۲) اک شعلہ سیاہ پوش ۳) Philosophy of self realization of Swami Yogeshwaranand Saraswati. 4) Swami Yogeshwaranand Saraswati, a great Himalyan Yogi. اس کے علاوہ یوگا پر بھی ان کی انگریزی میں ایک کتاب آچکی ہے اور اردو میں زیر ترتیب ہے۔ یہ کتاب "سجاد ظہیر کا دور اسیری" ان کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر ممبئی یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔